خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

2017

معراج رسول

APRIL 2017

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books



Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books



سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: معراج رسول

جلد 47 • شمارہ 05 • مئی 2017 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 213 کراچی 74200 • فون: (021)35895313 فیکس: (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

157 دھکا / ثمر عباس	166 محفلِ شعر و سخن / قارئین
آزمائشوں کے دائرے سے نکلنے کے لیے ایک کٹھن مرحلے کا انتخاب	آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ
169 دھیان / علی اختر	177 کھوٹا سکہ / فوزیہ طیبہ
مغرب سے درآمد شدہ ایک ذہنیت کی عبرت اثر داستان	مغربی اور مشرقی ماحول اور انسانیت کا موازنہ، ڈیکتی کا سنسنی خیز احوال

192 وقت / حسام بٹ	227 تعزیت / محمد الیاس	231 کوزہ گر درویش / ضیا تسنیم بلگرامی
ایک بے غرض بازی گر کی بازی گری... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک ڈرامائی داستان	زندگی میں بھڑکتے شعلوں سے کھیلنے والے ایک نوجوان کا قصہ	حسب روایت قدم قدم پر امتحان سے گزرنے والے ایک اور درویش کا قصہ
245 عورت کا انتقام / شاکر لطیف	250 بھنور / سلیم فاروقی	*** کنکریٹس / ادارہ
سطر سطر چونکا دینے والے واقعات پر مشتمل ایک دلچسپ روداد	حسن کے جال میں الجھے مجاہد کا بے باک انداز، پس منظر کے پیش منظر کی آخری تحریر	دنیا بھر سے اُبھرتی مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: نوشابہ رسول، مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

اعتماد

جون ایلیا

میں کوئی اور رائے رکھتا ہوں اور تم کوئی اور رائے رکھتے ہو، میں کسی اور جماعت کے ساتھ ہوں اور تم کسی اور جماعت کے ساتھ ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے کبھی برا سمجھا گیا ہو یا برا سمجھا جانا چاہیے۔ یہ تو سچ کو تلاش کرنے کا ایک طور ہے۔ میں سچ کو دائیں طرف تلاش کرتا ہوں اور تم سچ کو بائیں طرف تلاش کرتے ہو پر یہاں کا جو طور ہے، جو طور رہا ہے وہ عجب کچھ ہے۔

یہاں ایک دوسرے سے جدا رائے رکھنے کا مطلب ہے ایک دوسرے کا دشمن ہونا۔ ایک دوسرے پر کسی بھی معاملے میں اعتماد نہ کرنا، کیا عقل و ہوش کی سلامتی اور سیاست کے یہی معنی ہیں۔ ایک جماعت کسی بھی معاملے میں دوسری جماعت پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو ملک کا دشمن اور قوم کا غدار خیال کرتے ہیں۔ ان دو لفظوں کے سوا اپنے حریف کے لیے ہمارے پاس اور کوئی لفظ نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر گروہ یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کائنات کی ساری سچائیاں اور اچھائیاں اس کی جیبوں میں جمع ہو گئی ہیں، وہ اس زمین کا سب سے منتخب، محبوب اور برگزیدہ گروہ ہے اور تاریخ نے آج تک کا جو سفر طے کیا ہے، اس کی غرض اور غایت ہی یہ تھی کہ اس منتخب، محبوب اور برگزیدہ گروہ کو اس دور کے حوالے کر سکے اور بس۔

تم کون ہو اور ہم کون ہیں؟ اور ہمارے گمان، ہمارے خیال اور ہماری رائے کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔ تمہارے ذہن کے کشکول میں آخر وہ کون سی دلیل اور وہ کون سی حجت ہے جس کے توڑ کے لیے ہمارے ذہن کے کشکول میں کوئی دلیل اور کوئی حجت موجود نہ ہو اور ہمارے ذہن کے کشکول میں آخر وہ کون سی دلیل اور وہ کون سی حجت ہے جس کے توڑ کے لیے تمہارے ذہن کے کشکول میں کوئی دلیل اور کوئی حجت موجود نہ ہو۔

کیا ہمارے باطن سے یا تمہارے باطن سے الہام کا کوئی رشتہ پایا جاتا ہے؟ ہم میں سے آخر وہ کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ ہم نے جب بھی سانس لیا تو سچ میں سانس لیا۔ ہم نے جب بھی سوچا تو سچ میں سوچا۔ سچ کے ساتھ سوچا، سچ کے لیے سوچا اور اول سے آخر تک سچ ہی سوچا!

سوچو اور یہ سوچنے کی نیک عادت ڈالو کہ دوسرے جو کچھ سوچ رہے ہیں، وہ بھی سچ ہو سکتا ہے، نہ تم آسمان سے اترے ہو اور نہ تمہارے حریف، تمہیں وجود میں لانے کے لیے زمین اور آسمان نے اتنی ہی مشقت اٹھائی ہے جتنی مشقت تمہارے حریفوں کو وجود میں لانے کے لیے اٹھائی ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ تم کسی بھی رائے اور کسی بھی خیال کے بارے میں اپنے سوا کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کی کوئی بھی اہلیت نہیں رکھتے؟ ایسا کیوں ہے کہ سچ اور سچائی کو تم نے بس اپنی ہی دستاویز کا ایک گوشوارہ سمجھ رکھا ہے؟ اور میرا یہی سوال تمہارے حریف سے بھی ہے۔

ایک ہی حق تو ہے جو تم بھی مانگتے ہو اور تمہارا حریف بھی مانگتا ہے اور وہ حق ہے، رائے رکھنے اور اسے ظاہر کرنے کا۔ تم وہ رائے رکھو جو تمہیں درست معلوم ہوتی ہو اور دوسروں کو وہ رائے رکھنے کی آسانی فراہم کرو جو انہیں درست معلوم ہوتی ہو اور تم دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے پر اعتماد کرو کہ جو کچھ دوسرا کہہ رہا ہے وہ اس کی رائے ہے، ریاکاری نہیں۔

اگر یہ اعتماد باقی نہ رکھا گیا اور اس بارے میں بھی بے اعتمادی کو کام میں لایا گیا تو بولو اور بتاؤ کہ پھر اس بات کا فیصلہ روئے زمین پر آخر کون کرے گا کہ جو تمہارا خیال ہے، وہ تو خیال ہے اور جو دوسرے کا خیال ہے وہ نیت کی خرابی اور خلل ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں اعتماد کو کام میں لاؤ اور پھر اپنے اپنے دعوے اور اپنی اپنی دلیلوں کی بساط بچھاؤ۔

بحث ہونی چاہیے اور جاری رہنی چاہیے۔ شکوہ کس بات کا ہے، شکوہ ہی اس بات کا ہے کہ یہاں بحث نہیں ہوتی۔ ہم لوگ ابھی تک بحث کے خوگر نہیں ہوئے ہیں، ہم تو بدگوئی اور بدبحثی کی عادت میں مبتلا ہیں۔

بحث ذہن کی دانشمندانہ اور دانش جویانہ حالت کا نتیجہ ہوتی ہے اور ہم ذہن کی دانشمندانہ اور دانش جویانہ حالت سے محروم ہیں، ہم جب تک ذہن کی اس حالت سے محروم رہیں گے، اس وقت تک ہمارے اور سچائی کی خواہش کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔

آؤ ایک دوسرے پر اعتماد کر کے اپنے اور سچائی کی خواہش کے درمیان وہ رشتہ قائم کریں جو شائستگی کی پہچان ہے اور بحث شروع کریں وہ بحث جو سچائی تک پہنچاتی ہے۔

☆☆☆





ایک خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

مئی 2017ء کا دلفریب شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ماہ کی یکم تاریخ حسب روایت ہر سال مزدوروں کے حوالے سے منائی تو جاتی ہے مگر اس شور شرابے میں ابھی تک مزدوروں کے مسائل کے لیے عملی قدم اٹھا کر کوئی مثال قائم نہیں کی گئی۔ شاید ہمارے یہاں تاریخیں منانا بس ایک فیشن بن گیا ہے اور فیشن تو بذات خود ایک بھیڑ چال کا نام ہے۔ ویسے ہمارے ادارے اور اہم شخصیات بڑے طریقے اور سلیقے سے مہنگائی کے تمام تر تقاضے نبھانے کی کوشش کرتے ہیں (جسے خاموش طریقۂ واردات بھی کہا جاسکتا ہے) جیسے کہ رمضان اور بجٹ سے قبل ڈیزل اور پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ...... پھر کچھ وقفہ...... اور پھر بجٹ کے نام پر مزید اضافہ...... اور اگلا مرحلہ رمضان میں بے حسی کی ہر حد کو پار کرلینا...... کمال کے سیاستدان اور کمال کے ادارے ہیں جنہیں مغرب کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کی اصول پسندی متاثر تو کرتی ہے مگر ان پر خود عمل کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔ خواہ عوام اس کمر توڑ مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوں یا نہ ہوں...... اس کے علاوہ دودھ کے نرخوں میں ہوش ربا اضافہ گویا معصوم بچوں سے خوراک چھیننے کے مترادف ہے...... تو کون ہے جو ان مسائل میں گھرے ہوئے عوام کا دکھ بجھ سکے۔ جانے کس گناہ کے طفیل مہنگائی کا عذاب ہمارے سروں پر ایسا مسلط ہوا ہے کہ اس سے چھٹکارا کسی طور ممکن نظر نہیں آتا۔ پچھلے دنوں کچھ تعطیلات کے بعد تعلیمی درس گاہیں پھر سے آباد ہوگئی ہیں اور ساتھ ہی والدین کے لیے...... بالخصوص ایسے غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے والدین جو اپنی حیثیت سے بڑھ کر پرائیویٹ سیکٹر میں انگلش میڈیم اسکولوں کی فیس ادا کرتے ہیں تاکہ ان کے بچوں کے لیے بہتر مستقبل کی راہیں کھل سکیں مگر ان پر دہرا عذاب یہ آتا ہے کہ ایسے پبلشر جو کورسز پرنٹ کرتے ہیں مگر وہ انہیں کمیشن کے لالچ میں مارکیٹ میں کتابیں لانے کے بجائے اپنے مطلوبہ اسکولوں تک محدود کردیتے ہیں جہاں کی انتظامیہ ان کورسز کو زیادہ قیمتوں میں طالب علموں کو فروخت کرتی ہے۔ کیا یہ پبلشر حضرات اپنی قوم پر اضافی بوجھ نہیں ڈال رہے اور فیسوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ الگ ہے...... یہ کیسا ستم ہے جبکہ تعلیمی نظام کی یہ حالت ہے کہ جس کا جو دل چاہتا ہے، نصاب ترتیب دے لیتا ہے۔ یہ تفریق کیا ذہنی استطاعت میں بھی فرق نمایاں نہیں کررہی ہے؟ ان معاملات پر کیا کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے؟ کیا انہی اصولوں پر چل کر ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ کی فہرست میں آتے ہیں...... طبعِ نظر کے لیے سوچ کے کئی در وا کرکے ہم تو چلتے ہیں اپنی خوبصورت محفل کی جانب جہاں تمام دوست اپنی رائے کا اظہار کررہے ہیں۔

٭ لاہور سے عامر خان آفریدی کی پہلی شرکت۔ ''میں سسپنس کا بہت پرانا قاری ہوں مگر دل چاہنے کے باوجود اس محفل میں شرکت نہ کرسکا۔ اس کی بھی وجہ ہے اور یہ کسی سے شاید ہضم نہ ہو کہ میں خطوط کسی اور سے لکھوانے کا خواہش مند رہا۔ لکھنے میں جان نکل جانے کی حد تک کاہل۔ (بہت خوب...تو پھر تعلیمی سلسلہ کس طرح برقرار رکھا اور رکھا بھی یا......؟) بہرحال سسپنس کے صفحات پر جو جو تبدیلیاں آئیں ان سے واقف رہا۔ اپنی زندگی میں بھی بہت سے نشیب و فراز آئے پر سسپنس سے ناتا نہیں توڑا۔ (بہت شکریہ سسپنس سے آپ کی محبت کا) اس بار سوچا، چاہے جو بھی ہو اپنی محفل میں شرکت کرہی لوں اور لیں جی میں آ گیا۔ اگرچہ محفل میں سلسلوں کی تعریف تو پڑھتا ہی رہتا ہوں مگر میں سسپنس کے آخری صفحات کا بالخصوص شیدائی ہوں۔ اس بار بھی نئے رائٹر نعمان اسحاق کی تحریر جواز پڑھی۔ دل کو بھائی تو مگر کہیں کہیں مصنف نے غوطہ لگا لیا ہے۔ بہت سے سوال چھوڑ دیے ہیں جن کے جواب باقی تھے۔ البتہ جذبات و احساسات کی منظر کشی اور کہانی میں جو چبھن تھی، وہ دل میں ایک کسک سی جگا گئی۔ امید ہے نعمان اسحاق اگلی بار اس سے زیادہ اچھی اور مکمل کہانی لائیں گے۔ شیش محل میں اسما قادری ماشاء اللہ اپنے قلم کا جادو جگا رہی ہیں۔ اگرچہ کہانی کبھی کبھی بہت سست رفتاری کا شکار ہوجاتی ہے مگر اچانک کوئی ایسا واقعہ رونما ہوجاتا ہے کہ قاری کی پوری توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ویلڈن اسما جی۔ پچھلے دنوں ماروی اپنے اختتام کو پہنچی مگر اللہ کرے...... بات وہی ہے کہ سلسلوں کی شروعات تو ہمیشہ بڑے دبنگ انداز میں ہوتی ہے مگر پھر آگے چل کر کچھ سلسلے بہت اچھے چل نکلتے ہیں اور کچھ میں پھیکا پن آجاتا ہے اسی طرح اب دیکھتے ہیں ماروی کی جگہ شروع ہونے والا نیا سلسلہ کیا رخ اختیار کرتا ہے فی الحال تو پہلی قسط نے ہی اپنا رنگ جما لیا ہے۔ آغاز تو مغربی ماحول سے ہوا ہے، آگے چل کر پتا چلے گا کہ معاملات کیا ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ہر تحریر یوں تو شاہکار ہوتی ہے مگر ٹوٹے ہوئے لوگ پڑھ کر دل کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ یہ مصنف ہمیشہ معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے۔ منظر امام کی بہ ظاہر پڑھی، اندازہ ہوا کہ کہانیاں لکھنا بھی ایک ایسا فن ہے جسے باقاعدہ سیکھنے کی



کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ویسے تو اردگرد بے شمار واقعات جنم لیتے ہیں مگر انہیں رقم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں...... اور اس میں جو کہانی بیان کی گئی محبت کی ایک ایسی قربانی جو ذہنوں میں شاید ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ تنویر ریاض کی معما پڑھی، سسپنس سے بھرپور تھی۔ اچھا لکھتے ہیں مگر کبھی کبھی کمزور تحریر بھی لکھ جاتے ہیں۔ کرشمہ سلیم انور کی بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ لالچ میں انسان ایسے ہی خوف کا شکار ہو کر غلطی کر جاتا ہے۔ اولاد کے پھانسنے میں وہ خود ہی اپنے بچھائے جال میں پھنس گیا۔ شاہکار مہتاب خان کی تحریر بھی دلچسپ رہی۔ معلوم نہیں یہ خاتون ہیں یا مرد۔ بہرحال تحریر میں پختگی ہے۔ مصور حالانکہ معاشرے کا ایک ایسا کردار ہوتا ہے جو بہت نرم دل اور دل میں اتر جانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا۔ اس کے علاوہ تاریخی صفحات پر اس بار ڈاکٹر ساجد امجد جلوہ گر ہوئے۔ تاریخ کا بھی اپنا ایک الگ ہی مزہ ہے۔ البتہ مصنف کا قلم اس کے الگ الگ رنگ نمایاں کر جاتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے قطب الدین منور کا احوال پڑھا۔ جو بھی ہے یہ سلسلہ دلچسپ اور معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی ہے۔ معلوم نہیں میری یہ پہلی انٹری کامیاب ہوگی یا ناکام مگر میں نے اپنی زندگی کا دلچسپ اور بڑا کارنامہ انجام دیتے ہوئے حاضری دے دی ہے۔''

✠ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''خط لکھنے کے بعد اور کسی کا آیا ہوا خط پڑھنے کے بعد اطمینانِ قلب بھی ایک فرحت بخش احساس دلاتا ہے جیسے سسپنس ڈائجسٹ کے ٹائٹل پہ خوبصورت دوشیزہ کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا ہے اور اسی طرح سویٹ سی دوست طاہر گجر ار بھی اطمینانِ قلب سے سرشار ہو رہی ہوں گی۔ ارے بھئی تبصرہ پہلے نمبر پر آنے کی خوشی میں، مبارک ہو جی۔ باقی جون ایلیا کا حاصل کلام تو اس دفعہ انگل پر ہی تھا لیکن ان کی انگل بھی اتنی گہری ہوتی ہے کہ کم ہی اس کی سمجھ آتی ہے اور حاصل کلام یہ کہ امن و محبت اور رواداری کو فروغ دیا جائے تو سمجھو انسانی معاشرتی زندگی میں بہار آ گئی اور مئی کا مہینا ہے تو اس حوالے سے پسینے میں شرابور محنت و مشقت سے بھرپور مزدوروں کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ زرین آفریدی، بینش صدیقی، بابر عباس اور فضا شاہ کے بھرپور تبصرے بہت عمدہ رہے۔ لاہور کینال روڈ پر بابر عباس سے ملاقات ہوئی، بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے اور ہمیشہ خوش رکھے۔ اس کے علاوہ محمد خواجہ، دوست محمد اور مہیش کمار نے بھی اچھی تبصرہ نگاری کی۔ شیش محل میں اڈے کے ساتھی ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے ہیں۔ رین دادا، جانی برادر کے بعد اب معصوم گولو بھی جان کی بازی ہار گیا۔ رامو نئے روپ میں سامنے آ گیا اور فاروق اتنے حادثات سہہ کر عزم و ہمت کی چٹان نظر آ رہا ہے اور جولیٹ کو فی الحال آرام و سکون کے لیے فیملی میسر آ گئی ہے۔ کہانی زبردست جا رہی ہے...... اور وقت کے ساتھ قدم ملا کے چلو گے تو کامیاب ہو گے۔ ''وقت'' میں علی وقت کے ساتھ تو ٹھیک چلا ہے، اب شارد کے ساتھ دوستی میں کونسا دباؤ آنے والا ہے یہ بھی ''وقت'' ہی بتائے گا۔ جسام بٹ کی وقت نے شروعات بہت اچھے سے کی ہے۔ ''اپنے حصے کا پانی خود کنواں کھود کر نکالنا پڑتا ہے۔'' بے چاری خالدہ تو بدقماش حشمت کے ہتھے چڑھ کے جعلی پیر کی درندگی کا نشانہ بن گئی اور فرید بغیر کسی کنواں کھودے اور پانی کے چکر میں راہزنوں کے ہتھے چڑھ کر بے موت مارا گیا۔ ملک صاحب کسی کو بچا تو نہ سکے پھر بھی چلو ناسوروں کو سزا دلانے میں تو کامیاب ہوئے۔ مصلح جو معاشرتی المیہ ہے، عبرت انگیز تحریر تھی۔ شاہی دور بھی عجیب ہوتے تھے۔ بادشاہوں کے خلاف سازشیں ہوتیں یا بادشاہ جس کو چاہتے ایک حکم دیتے اور قتل کرا دیتے، وہیں سازشی بھی عبرت کا نشانہ بنتے اور ایسے بادشاہوں کا خود اپنا انجام بھی ہمیشہ برا ہی ہوا۔ علاؤالدین خلجی اور مبارک شاہ نے بھی جو بویا وہی کاٹا اور لوگوں کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑا ہونے والا غیاث الدین تغلق کامیاب ہوا اور خسرو خاں اپنی فتنہ پروری کے باعث ''کافر نعمت'' ٹھہرا۔ مغل شہزادی فاخرہ کا کہانی میں مختصر کردار بہت عمدہ رہا۔ تاریخی کہانی کافر نعمت بھی اچھی رہی۔ سبھی ''جواز'' ہی ڈھونڈتے رہے۔ بچپن میں ارسل اپنے باپ انتظار کے سامنے بخت بلند کے لیے جواز پیش کرتا اور کامیاب رہتا تھا اور جویریہ اپنی محبت کا جواز پیش کرنے کے بجائے ارسل کے انتظار میں رہی...... بالآخر کامیاب رہی۔ بخت نے انتظار کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنے دوست ارسل کو سرنج لگا کر اپنی دوستی کو قدغن لگا دی مگر اپنے آنسوؤں کا ''جواز'' پیش کر کے آخر اپنی دوستی بچا لی۔ امیر غریب کے درمیان تلخ و شیریں احساسات لیے ''جواز'' بہترین کہانی تھی۔ ''اللہ ہی کافی ہے، کیونکہ وہی باقی اور قائم ہے باقی فنا ہے۔'' قطب الدین منور جنہوں نے بادشاہ کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ مجبور کیا تو ہاتھ ملا کر ان کا غرور و تکبر خاک میں ملا دیا۔ اولیاء اللہ کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ پُراثر اسلامی تاریخی تحریر قطب الدین منور بہت عمدہ رہی۔ محفل شعر و سخن میں لبنیٰ وکیل، فضا شاہ اور حنظلہ شاہد کے اشعار زبردست رہے۔''

✠ ناہید یوسف اسلام آباد سے خط لکھ رہی ہیں۔ ''گھر سے نکلے تھے ہم یہ سوچ کر کہ موسم خوشگوار ہے تھوڑا سیر سپاٹا کریں گے اور تھوڑی سی شاپنگ...... مگر سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کیونکہ راستے میں ہی بک شاپ دیکھ کر وہاں پہنچے اور پھر کیا تھا...... سسپنس پہ جو نگاہ ٹھہری، سارا پروگرام بھول گئے اور سسپنس لے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ نہ کھانے کا ہوش رہا نہ پینے کا (ویسے ہم کھانا کھا چکے تھے کیونکہ یہ شام کا وقت تھا) ہوش میں تب آئے جب شوہر صاحب گھر آ کر خالی پیٹ دُہائی دینے لگے۔ فٹافٹ اٹھے اور جیسے تیسے کھانا بنایا۔ کھانے سے فراغت کے بعد ایک بار پھر سسپنس سنبھال کے بیٹھ گئے۔ اس دفعہ کا سسپنس تھوڑا الگ لگا۔ اس کی



وجہ سسپنس میں شروع ہونے والا نیا سلسلہ ہے۔ جی ہاں، وقت..... حسام بٹ صاحب کی وقت پڑھی مگر سچ پوچھیے تو کہانی میں ہمیں کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آئی۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ ابھی کہانی کا آغاز ہے، امید ہے جوں جوں کہانی آگے بڑھے گی، اس کی رفتار تیز ہوتی جائے گی اور ساتھ ساتھ ہماری دلچسپی بھی بڑھے گی۔ اس کے بعد اپنی من پسند تحریر یعنی شیر شاہ سید کی تحریر پڑھی۔ واہ کیا کہنے..... بہت خوبصورت انداز میں پارٹیشن کے بعد کی صورتِ حال کی منظر کشی کی۔ یہی اچھے رائٹر کی پہچان ہے کہ وہ الفاظ کا چناؤ اور موجودہ صورتِ حال کی کس طرح منظر کشی کرے..... کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جائے۔ ویلڈن شیر شاہ صاحب۔ پھر آئے شیش محل کی طرف۔ شروع شروع میں کہانی نے کافی بور کیا تھا مگر اب تو لگتا ہے اسما جی ایکشن ہی ایکشن چلا رہی ہیں۔ کہانی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور جملوں کی طوالت بھی کافی کم ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جولیٹ اپنے والد محترم سے کیسے ملتی ہے اور اپنے انتقام کی آگ کو کیسے بجھاتی ہے۔ فاروق ابھی ہندوستان میں ہی پھنسا ہوا ہے مگر امید ہے کہ جلد ہی وہ آغا کی تلاش میں کراچی پہنچے گا۔ رتن داوا اور گولو کی موت افسردہ کر گئی لیکن اسما صاحبہ نے ان کرداروں کو ختم کر کے ان کی کمی کو فاروق کی صورت پورا کر دیا جو مصنفہ کی خوبی ہے۔ فاروق کا ایکشن میں آنا اور مہارت سے اپنے دشمنوں کا صفایا کرنا اسے صحیح معنوں میں بہت اوپر لے آیا ہے اور اس کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ خیر، کہانی اب کافی اچھی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کافرنعت میں معلومات کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا سامان بھی موجود تھا۔ ساجد امجد صاحب نے خوبصورت انداز میں تاریخ پر روشنی ڈالی، حالانکہ ہم تاریخ پر گہری نظر نہیں رکھتے مگر پھر بھی دلچسپی سے پڑھی۔ منظر امام صاحب کے کیا کہنے..... بھئی ہم تو ان کے بہت بڑے فین پہلے ہی ہیں مگر اب تو ڈبل فین ہو گئے ہیں۔ سنجیدہ موضوع پر بہت ہی اچھی گرفت ہے ان کی اور انتہائی مختصر اور کم وقت میں کہانی کے ذریعے بہت گہرا پیغام چھوڑ جاتے ہیں۔ بہ ظاہر کہانی میں محبت کی اعلیٰ مثال قائم کی گئی۔ بہت زبردست، کافی دیر اس کے سحر میں کھوئے رہے۔ پھر کچھ پڑھنے سے پہلے اپنے لیے اور شوہر صاحب کے لیے چائے بنائی اور تھوڑی بہت ان سے سننے کو بھی مل گئی کہ کیا ہر وقت ڈائجسٹ میں سر گھسائے بیٹھی رہتی ہو۔ خیر جیسے تیسے انہیں سمجھایا اور پھر سسپنس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ملک صفدر حیات کی صلح جو بس گزارے لائق رہی۔ پھر ہم نے ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ ایمان افروز واقعات پڑھ کر دلی سکون ملا۔ تنویر ریاض کی معما واقعی معما ثابت ہوئی۔ ویلری اور رینی اس پریشانی میں مبتلا رہیں کہ ایک قتل ہوا ہے جبکہ مائیک نے یہ سارا کھڑاگ اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے پھیلایا تھا۔ کیونکہ وہ تھا ہی مارکیٹنگ کے شعبے کا۔ کہانی اچھی تھی۔ سلیم انور کی کرشمہ بہتر کہانی تھی۔ مہتاب خان جو کہ نیا نام معلوم ہوتا ہے، شاہکار کہانی واقعی اسم با مسمیٰ تھی۔ مصور کی خوبی بھی بیان کی گئی جبکہ معاشرتی بے حسی کو بھی بے نقاب کیا گیا کہانی میں۔ بہت ہی خوبصورت کہانی لکھی مہتاب خان نے۔ شاکر لطیف کی کہانی واپسی بھی دلچسپ تھی۔ ایک دوست کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی مگر اس نے دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دوست کو جس نے اس کے اعتماد کا خون کر ڈالا تھا، اسے معاف کر دیا۔ اچھی تحریر تھی۔ علی اختر کی سراب بھی اچھی کہانی تھی جس میں ایک مرد کی بے وفائی اور عورت کی محبت کو اجاگر کیا گیا۔ کہانی کا اینڈ کافی انٹرسٹنگ رہا۔ بہت خوب بھئی علی اختر صاحب۔ قلم کار بس سو سو رہی۔ جواز کہانی بھی اچھی رہی۔ مجموعی طور پر سسپنس بہت اچھا رہا۔ اُف وہ! تبصرہ کرتے کرتے یہ تو بھول ہی گئے کہ محفل کے دوستوں کا حال احوال دریافت کر لیں۔ بھئی سب سے بہت بہت معذرت۔ امید ہے ہماری پہلی غلطی سمجھ کر سب معاف کر دیں گے۔ خطوط کی محفل میں تھوڑے سے خط پڑھ پائے ہم۔ بہرحال سب دوستوں کے خطوط بہت اچھے لگے۔ اگلے ماہ موقع ملا تو پھر تبصرہ لکھیں گے، امید ہے جگہ ملے گی۔“

❀ اشفاق شاہین، لاہور سے شاملِ محفل ہیں۔ ”اس دفعہ پہلی بار اتنا خوار ہوا، 17 تاریخ کو دو بڑی مارکیٹس چھان ماریں، سسپنس ندارد۔ اتنی خبر تو مل چکی تھی کہ خط شامل ہوا ہے۔ بے چینی سی تھی کہ حسینہ سے جلد ملاقات ہو۔ حسینہ کا تو بہانہ ہوتا، اپنی محفل میں دوستوں سے ملاقات کا زیادہ اشتیاق ہوتا۔ 18 کو دن بھر ایک اسپتال میں کزن کے پاس رہا تو رات کو جا کے سسپنس کی حسینہ کا دیدار ہوا۔ مجھے لگا کہ میرے بارے میں ہی سوچ رہی ہے کہ شاہین اتنا بے چین کیوں ہے؟ (واہ واہ..... اسے کہتے ہیں خوش فہمی) خیر ملاقات مزے کی رہی۔ طاہرہ گلزار ایک مبارکباد ہماری طرف سے بھی، خوبصورت خط اور کرسیِ صدارت کی۔ والدہ کے لیے دعاؤں کا شکریہ۔ خود کو پا کر دلی اطمینان ہوا۔ زرین بہنا جب لوازمات پورے ہوں اور پھر بھی حاضری نہ لگے تو دکھ ہوتا ہے۔ آخر کو ہم اتنی تگ و دو کر کے بروقت خط بھیجتے ہیں اور ایک بات، جب کوئی مجھے خط لکھتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ اب خط کا کونسا دور ہے ان کو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا ایک مزہ ہے (بالکل درست کہا آپ نے) محمد خواجہ، صفدر معاویہ، دوست محمد، شہباز، زبیر بھی شاملِ بزم تھے۔ عبدالجبار رومی اور رضا شاہ کے خطوط محفل کا خاصہ تھے۔ مہوش کمار اور ساگر کلوکر بہت خوبصورت اضافہ ہیں محفل میں، خوش آمدید۔ حسبِ معمول سب سے پہلے شیش محل پڑھی بغیر کسی وقفے کے۔ اس بار گولو کا دکھ اٹھانا پڑا فاروق کو۔ راسول گیا، جولیٹ نے اسد اللہ کو نظر انداز کیا، اچھا نہیں لگا۔ تقسیم ہند کے حالات اس ماہ دکھی کر گئے کہ ہمارے اسلاف نے کتنی قربانیاں دیں۔ اب راٹھور کا قصہ رہ گیا اور لگتا ہے اگلے ماہ جولیٹ اور اسد اللہ کی ملاقات ہو جائے گی۔ نئی کہانی ”وقت“ بائی حسام بٹ۔ آغاز میں ہی سسپنس اور رنگینی و سنگینی کے ساتھ مار دھاڑ بھی ہے۔ امید ہے اپنا



رنگ جلد جمالے گی۔ ملک صفدر حیات کی صلح جو، انجام قدرے غیر متوقع تھا۔ اندازہ تھا کہ چھوٹا خان کسی طور ضرور ملوث نکلے گا، خوب رہی۔ آخری صفحات پر نعمان اسحاق نے ''جواز'' کے ساتھ اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے۔ بہترین تحریر رہی۔ حضرت قطب الدینؒ کے حالات سے آگاہی ہوئی، دل کو تسکین ہوتی ہے اولیاءاللہ کے واقعات زندگی جان کر۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام کی ''بہ ظاہر'' متاثر کن رہی، پسند آئی۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب لاجواب تھا۔ پہلے تین اشعار پر انعام کا اعلان کر کے حاتم طائی کی قبر پر آپ لات مار ہی دیں۔ انتظار رہے گا۔ کترنیں بھی لاجواب رہیں۔''

✽ سید شاہ عالم زمرد اکبرآبادی، راولپنڈی سے محفل کی زینت بن رہے ہیں۔ ''4 سال بعد شارجہ سے واپس آ گیا ہوں۔ وہاں بھی گاہے بگاہے پرچہ آتا تھا۔ میں سسپنس کے بغیر اور سسپنس میرے بغیر کیسے زندہ رہتا۔ ہماری اس سے ایک زمانے سے بلکہ طالب علمی کے زمانے سے یاداللہ ہے۔ الیاس سیتاپوری، ضیا تسنیم بلگرامی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ان کے پاس تحریروں کی جادوگری ہے۔ میری ایک بات مانیے۔ نئے سال کی تو آمد ہو گئی ہے۔ جون میں سسپنس کا منتخب کہانیوں کا یا افسانوی نمبر عالی شان طریقے سے شائع کریں۔ پرنٹنگ قدرے باریک ہے۔ سسپنس اب انٹرنیشنل ڈائجسٹ بن چکا ہے۔ اسے مزید دلربا رنگینیوں سے سجائے رکھیں۔ ہاں، سسپنس اب مقررہ وقت پر مل جاتا ہے۔ 3 ماہ ہو گئے پاکستان مستقل آ گیا ہوں۔ ہمارے ہاں سیاست پتنگ کے مانند ہے۔ جیسا ہوا کا رخ دیکھتی ہے، اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ملک میں فلاحی کام بند ہیں۔ کوئی کسی کا حکم ماننے کو تیار نہیں۔''

✽ ساگر نکوکر، چشمہ بیراج، میانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''دل آرام سسپنس بہت انتظار کے بعد ملا۔ سرورق دیدہ زیب اور من آویز تھا۔ خوبانِ جہاں کی محفل میں مہ و خورشید چمک رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے لوگ پڑھ کر دل سے اداسی لپٹ گئی۔ بظاہر کے لیے اتنا ہی کہوں گا لکھا سسپنس میں قصہ جو نادیہ ہمایوں کا تو اہل دل کو منظر امام نے لوٹ لیا۔ باعثِ زحمت بہت تیز رفتار کہانی تھی۔ ڈاکو بہت شاطر تھے۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ شاہکار کٹیلی تحریر تھی۔ فنکاروں کی نام نہاد نرم دلی کو مہتاب خان نے خوب عیاں کیا۔ انسان کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ صرف بے جان چیزوں کی قدر ہے۔ علی اختر حسب معمول دلچسپ کہانی لے کر آئے۔ عابہ کا آنا شارینہ کو یا درختاں کے گھنے جنگل میں لے گیا۔ سبھی کرداروں کے نام بڑے انوکھے تھے۔ شیش محل ایک نشست میں ختم کی۔ دادا کی موت سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ بے چارہ گولو بھی چھوڑ گیا۔ پولیس بہت مستعد نکلی۔ کیتھرائن پکڑی گئی۔ عاکف کی انجلی سے الفت اچھی لگی۔ جولیٹ اور اسداللہ پھر ملنے والے ہیں۔ صلح جو بہت دکھی رہی۔ فرید اور خالدہ قتل ہو گئے۔ شبہ چھوٹے خان پر تھا۔ قاتل گمسن پیر نکلا۔ ایسے ڈبا پیر اب بھی بہت ہیں۔ نہیں ہے تو صرف ملک صفدر جیسا آفیسر۔ جواز کسی نے ٹھیک کہا، دل دریا سمندروں ڈونگھے، ایک کہانی میں کتنی کہانیاں پنہاں تھیں۔ شاہکار کہانی تھی، مدتوں یاد رہے گی۔ نعمان اسحاق نے دل جیت لیا۔ قلم کار کچے نہیں پڑی۔ وقت حسام بٹ کی تحریر یقین نہیں آتا۔ وہ تو انتقال کر گئے ہیں۔ (ارے ارے...... نہیں جناب۔ یہ کیا غضب سوچ لیا آپ نے...... اللہ تعالیٰ حسام بٹ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ الحمدللہ وہ حیات ہیں)۔''

✽ زرین آفریدی، بینش صدیقی، حیدرآباد سے چلی آ رہی ہیں۔ ''ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ اپریل 2017ء بروقت مل گیا۔ سرورق بہت ہی خوبصورت اور شاندار رہا۔ سسپنس سرورق پر دوشیزہ بھی اپنے ڈائجسٹ کو خط لکھ کر صدارت کے خیال سے خوش ہو رہی تھی۔ انشائیہ میں حاصل کلام۔ 1 پڑھا۔ جون ایلیا صاحب اپنی انگلی سے ہمیں اور معراج رسول صاحب کو حیران کر رہے تھے۔ ویلڈن سرجی۔ اداریہ لاجواب اور بولڈ رہا۔ محفل میں انٹری کی تو آنٹی طاہرہ گلزار کی منت پوری ہوتی نظر آئی۔ طاہرہ جی کبھی ہنس دی لیا کرو۔ اب تو صدیوں بعد صدارت مل گئی۔ مبارک باد۔ فضا شاہ آسمان سے گری کھجور میں اٹکی۔ ڈیئر اپنی خیر مناؤ۔ ہم تو راضی و تندرست ہیں۔ سید محی الدین اشفاق کی تھوڑی سی غیر حاضری کے بعد حاضری اچھی لگی۔ رومی انصاری صاحب بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل کا حصہ رہے۔ مہیش کمار پہلی مرتبہ محفل میں آئے لیکن تبصرہ اچھا تھا۔ بابر عباس بھائی ہمیشہ سوبر انداز کا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ محمد خواجہ صاحب، دوست محمد، اشفاق صاحب، اور یس احمد خان صاحب بھی بہترین تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ اللہ رب العزت اپنے بندوں کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کرتا۔ خواہ بادشاہ ہو یا فقیر...... اعمال، نیت اور نتائج سے فرار ممکن نہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے کافر قسمت میں بھی بتایا ہے۔ مبارک شاہ اور خسرو خاں دونوں ہی کافر قسمت تھے۔ متاثر کن داستان تھی۔ وقت، حسام بٹ صاحب نے اور ادارہ سسپنس ڈائجسٹ نے ہمیں بہترین گفٹ دیا۔ ایسی شاندار تحریر، جس نے پہلی ہی قسط میں سپر پاور امریکا کی کئی ریاستوں اور ان کے علاقوں سے متعارف کروایا۔ وہ بھی ایسے کہ جیسے ہم خود وہاں گھوم رہے ہوں۔ علی کا کردار بہت ہی شاندار اور پاورفل لگ رہا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ شارہ بھی زبردست ہے۔ انکل سلطان ان کی بیٹی آمنہ تھی، لیونارڈو وغیرہ سب کردار اپنی جگہ فٹ، بہترین ٹاپک اور اعلیٰ موضوع، ویلڈن حسام بٹ صاحب۔ شیش محل اور اسما قادری صاحبہ کا تو اپنا ایک سحر ہے جس نے ہمیں جکڑا ہوا ہے۔



جولیٹ پاکستان لاہور پہنچ گئی، ساتھ ایک اچھی فیملی بھی مل گئی۔ ادھر اس کے والد اسد اللہ بھی پاکستان روانہ ہو رہے ہیں۔ فاروق دادا اپنے دشمنوں کا صفایا کر رہا ہے۔ گولو کی موت پر افسوس ہوا۔ جواز نعمان اسحاق صاحب نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی عمدہ تحریر خوبصورت اختتام، ویلڈن۔ محبتوں کی قدر اور آزمائش...... دکھوں کے لمحات میں ہی ہوتی ہے اور جو لوگ اس آزمائش پر پورا نہیں اترتے، انہیں دل سے بھی اتار دینا چاہیے۔ یہی عقل مندی اور وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔ لیکن ارسل جیسی بہشت کا رہنے والا خوبیاں بھی بہشتی تھیں اس کے اندر۔ بخت تو کم بخت نکلا، کم ظرف انسان۔ ملک انتظار کا کردار بہت خوبصورت اور سو بر تھا۔ ڈاکٹر عامر اور ان کی بیٹی جویریہ زبردست اور جن کی نیت صاف ہوتی ہے اللہ رب العزت ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اک عہد بہار ہے۔ آج کر لیتے ہیں کل کو سنوارتے ہیں۔ زندگی گزارتے ہیں۔ واہ صاحب! کیا کہنے۔ صلح جو اور ملک صفدر حیات صاحب نے اس بار بھی زبردست واقعہ پیش کیا۔ بے چاری خالدہ عرف خالو اور فرید بے موت مارے گئے۔ اللہ غارت کرے ان ڈاکوؤں کو۔ چھوٹے خان پر شک تو بہت تھا مگر وہ بچ گیا۔ ٹوٹے ہوئے لوگ اور ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب نے ہمیشہ کی طرح دل جیت لیا۔ قیام پاکستان کے دوران بے شمار داستانوں نے جنم لیا۔ یہ بھی واقعی ایک دل خراش داستان تھی۔ کلپنا کلثوم بن گئی۔ کانتا تو ہندوستان میں اپنے ہم مذہب کے ہاتھوں برباد ہو کر دنیا ہی چھوڑ گئی۔ رحمان سومرو اور روپ چند کی دوستی بھی لازوال تھی۔ قطب الدین منورؒ، اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے کے حالات و کرامات سے مستفید ہوئے۔ جزائے خیر ضیا تسنیم بلگرامی صاحب۔ بہ ظاہر منظر امام صاحب کی بہترین کاوش، ہر انسان ایک کہانی لیے ہوئے ہے۔ جویریہ میڈم کی بھی سیدھی، صاف اور بہت اچھی زندگانی و کہانی تھی۔ منظر صاحب آپ مزاح پر زیادہ اعلیٰ و شاندار لکھتے ہیں۔ پلیز، کچھ نظر کرم ہو جائے۔ محفل شعر و سخن بھی اپنے جوبن پر تھی۔ ساتھ مراسلے سے کافی لطف اندوز ہوئے۔ (پسندیدگی اور تبصرہ نگاری کا بے حد شکریہ)۔''

✻ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے تشریف لا رہے ہیں۔ ''اپریل کا سسپنس 19 مارچ کو صدر بازار پشاور سے جا کر خرید اور واپس پہنچے اپنے گھر مطلب پشاور میں پر۔ انکل نے اس سرورق پر ایک بہت ہی خوبصورت اور شاہکار ماڈل کو بہت ہی پیارے طریقے سے سجایا۔ ایک تو لیڈی خود خوبصورت اور دوسرا اس کے لباس نے چار چاند لگا دیے۔ اللہ پاک ہمارے ملک کو بھی ایسی خوبصورتی اور امن و امان کے چار چاند لگا دے۔ پھر گئے ایلیا جی کے پاس، ان کی پُراثر باتیں پڑھیں۔ انسان دنیا چھوڑ جاتے ہیں مگر ان کی یادیں خوبصورت لفظوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ایسے ہی جون ایلیا جی بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ایلیا جی کی شاعری بھی لاجواب ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا اور دعا گو ہیں کہ ہماری زمین پر بھی بہاروں کے جھونکے آئیں۔ امن اور سکون کے دن آئیں۔ معاشی ترقی کے راستے کھلیں اور عوام الناس تک اس کا ثمر پہنچے۔ ہماری افواج اب اسی مقصد کے لیے جان کی بازی کھیل چکی۔ اب انشاء اللہ جیت ہماری ہوگی۔ دوستوں کے پاس آئے تو بہت خوبصورت لوگوں سے سجی پڑی تھی محفل۔ زرین آفریدی، بینش صدیقی! میں سات مرلے نہیں بلکہ 1 کنال کا خط لکھتا ہوں مگر ادارے کی مہربانی سے گھٹ گھٹا کر یہی پانچ سات مرلے جتنا بچ جاتا ہے۔ (ہاہاہا......) باقی دوستوں میں محمد خواجہ نعیم، ساگر تلوکر، اشفاق شاہین، محمد شہباز، دوست محمد، بابر عباس فیصل، ادریس احمد خان، بینش کمار کو دیکھ۔ ردی صاحب ابرار احمد ساقی، نجم الدین اشفاق اور فضا شاہ سب اپنے بہترین تبصروں کے ساتھ محفل کو چار چاند لگا رہے تھے۔ کہانیوں میں شروعات کی شیش محل سے جہاں ایک اور غم کو اپنے دل پر سہنا پڑا۔ گولو اس طرح چھوڑ کر چلا گیا کہ دل اب تک اداس ہے۔ فاروق بھائی اب کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ دوسری طرف نواب فیملی بھی پاکستان پہنچ گئی تو جولیٹ بھی وہیں پر موجود۔ آخر میں لگتا ہے باپ بیٹی پھر ملنے والے ہیں۔ پھر ساجد امجد صاحب کی کافر نعمت پڑھی۔ واقعی خسرو کافر نعمت ہی تھا۔ مجھے تو اس وقت کے بادشاہوں پر غصہ آتا ہے کہ وہ اتنے پاگل تھے کہ انہیں پتا نہیں چلتا تھا کہ کون ہمدرد ہے اور کون دشمن۔ ہر شخص صرف اقتدار کی ہوس میں ہوتا تھا۔ تقریباً اب بھی ویسا ہی ہے، بس اب اقتدار کے لیے اتنی قتل و غارت نہیں ہوتی۔ آخر میں غازی ملک نے اپنے بادشاہ کا بدلہ خوب لیا۔ پھر تنویر ریاض کی معما پڑھی۔ نارمل تھی پر اچھی تحریر تھی۔ سلیم انور کی کرشمہ کافی انٹرسٹنگ رہی جس میں گریوز نے جو چال بین پر چلی، اس نے وہی اسی پر الٹ دی۔ بیچارہ زندگی کی بازی ہی ہار گیا۔ مہتاب خان کی شاہکار بھی اچھی تحریر تھی۔ بہت خوبصورت مثال ہے کہ ہر کوئی یہاں صرف مطلب تک ساتھ دیتا ہے جب مطلب ختم تو پھر تو کون میں کون۔ ملک صفدر حیات کے کیسوں میں ایک کیس پڑھنے کو ملا۔ دونوں مقتولوں کے قاتل ایک ہی گروپ سے تعلق رکھتے تھے پر ملک صاحب کا انداز تفتیش بہت ہی اچھا ہے۔ کاش ہمیں آج بھی پولیس میں ایسے آفیسرز میسر آ جائیں۔ شاکر لطیف کی واپسی میں لارڈ رچ ڈ کا کردار بہت پسند آیا۔ ایسے لوگوں سے تو دنیا چلتی ہے کہ دھوکا کھا کر بدلے کی طاقت ہونے کے باوجود معاف کر دینا۔ منظر امام کی بہ ظاہر پڑھی۔ واقعی ایسی قربانی دینا بہت مشکل ہوتا ہے، چاہے زندگی کا ایک ہی پل کیوں نہ رہتا ہو کوئی وقت سے پہلے نہیں جانا چاہتا۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ علی اختر کی سراب بھی بہترین رہی۔ باعث زحمت میں ٹھیک بیوقوف بنایا میاں بیوی نے بینک والوں کو۔ آ گیا وقت جس کا انتظار تھا۔ حسام بٹ کے قلم کی ابتدائی قسط میں تحریر کی اٹھان لفظوں پر

گرفت اور کہانی کا پلاٹ بہت عمدہ ہے۔ امید ہے یہ کہانی کافی شہرت حاصل کرے گی۔ امجد رئیس کی قلم کاری اچھی ہی رہی۔ قطب الدین منورؒ کے حالاتِ زندگی کی جان کاری ملی، پڑھ کر اچھا لگا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ٹوٹے ہوئے لوگ دکھی کر گئی۔ جواز نعمان اسحاق کے قلم سے بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ ارسل نے کیا کچھ نہیں کیا بخت کے لیے پر بخت نے ایک تھپڑ کے بدلے اسے موت کے منہ میں پہنچا دیا پر اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا رہا کہ اس نے غلط کیا، اپنے دوست کے ساتھ۔ آخر میں ارسل نے ایک دفعہ پھر میلا لوٹ لیا اس کو معاف کر کے۔ اس کو ہی تو کہتے ہیں سچی دوستی جیسے ہماری اور آپ کی۔"

✲ ادریس احمد خان کا تبصرہ ناظم آباد، کراچی سے۔ "سسپنس ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ سرورق توقع کے مطابق تھا۔ ذاکر صاحب کی صلاحیتوں کے دل سے معترف ہیں، بلاشبہ ان کے ہاتھوں میں اللہ نے جیسے جادو بھر دیا ہے۔ اللہ کرے مزید کامیابیاں سے ہمکنار کرے (آمین) اندر انشائیہ میں جیسے دل نکال کر رکھ دیا ہو۔ اداریہ بھی دورِ حاضر کی عکاسی کر رہا تھا۔ ناموں کی فہرست میں سرفہرست طاہرہ گلزار کا نام نظر آرہا تھا، بہت مبارک باد...... کہانیوں میں ڈاکٹر ساجد امجد کی "کافر نعمت" بہت اچھے انداز میں لکھی ہوئی تحریر تھی جس نے تاریخی واقعات کو بہتر طور پر آشکار کیا۔ تنویر ریاض کی "معما" اچھا تاثر لیے ہوئے تھی جس میں ایک ٹوٹتے ہوئے گھریلو معاملات کو خوشگوار مضبوط رشتے میں دوبارہ باندھ دیا۔ اس کے بعد خوبصورت تحریر "شیش محل" پڑھی۔ آخری سطر پڑھنے کے بعد محویت ٹوٹی۔ "کرشمہ" بھی اچھی کہانی تھی جس میں چارلی گریوز کو ایک وہم نے دنیا سے آزاد کر دیا اور بین کی دلی خواہش پوری ہوئی کہ وہ کیوریٹر کی نوکری جوائن کرلے۔ شاہکار میں ایک متکبر مصور کا احوال لکھا گیا حالانکہ مصور تو انسانی ہمدردی سے لبریز دل رکھتے ہیں مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ "واپسی" میں ایک نیک طینت انسان لارڈ رچرڈ سے دوستی کر کے ڈیوڈ نے دوستی کے نام کو لالچ کے سمندر میں ڈبو دیا۔ دوستی کے نام کو بدنام کیا۔ اپنے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے باوجود لارڈ نے ڈیوڈ کو معاف کر دیا۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے، بجائے اس سے بدلہ لینے یا سزا دلوانے کے اس کی خطا کو درگزر کر دیا۔ ڈیوڈ یقینی تباہی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ "بہ ظاہر" منظر امام کی بہت پُر اثر کہانی تھی۔ اشعار کی محفل میں بھی اچھے اور معیاری اشعار نے محظوظ کیا۔ درمیان میں کترنوں نے بھی مزہ دیا۔ "سراب" میں گھمنڈی کا غرور ٹوٹا، باطل کی شکست ہوئی۔ دولت کے نشے میں چور انسان نعوذ باللہ دولت کو ہی خدا سمجھتا ہے مگر جب برا وقت آتا ہے تو وہی دولت جس کو وہ نجات دہندہ سمجھتا ہے، گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ "باعثِ زحمت" بھی اچھی کہانی تحریر کی گئی۔ "وقت" نئی تحریر بہتر انداز میں شروع کی گئی کہانی ہے۔ امید ہے آخری سطر تک پسند کی جائے گی۔ "قلمکار" میں ایک لکھاری نے بڑے عجیب انداز میں اپنے تحریری مواد کو چھپوانے کے لیے ایڈیٹر کو مجبور کیا۔ اس مہینے قطب الدین منورؒ کا احوال پیش کیا۔ جو حضرت نظام الدین اولیاؒ جیسے بڑے پائے کے پیر کامل تھے جن کی شہرت سے آج کا بچہ بھی واقف نظر آتا ہے حالانکہ ان کی وفات کو ایک طویل عرصہ ہو گیا مگر آج بھی وہ ہزاروں لاکھوں دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ سیاہ باطن دنیا میں، اللہ کے بہت سے ولی ہر دور میں ہوئے ہیں اور رہتی دنیا تک آتے رہیں گے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند مرتبہ عطا کرے (آمین) ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر "ٹوٹے ہوئے لوگ" دلوں کو جھنجوڑ دینے والی کہانی تھی جس میں انہوں نے ہندوستان پاکستان پارٹیشن کے بعد کی معیشت و معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہے۔ آخری صفحات کی بہترین کہانی "جواز" تھی جس میں دو دوستوں کی دوستی اور دوستی کے لیے ایثار تھا۔ بہت ہی پسند آئی۔"

✲ احسان سحر، میانوالی سے شریکِ محفل ہیں۔ "انسان کو انسان سے فائدہ بھی ہوا، نقصان بھی...... دکھ بھی پہنچا اور سکھ بھی۔ زندگی سے ہم انسان زبردستی خوشیاں چھیننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں...... اور ان خوشیوں میں دوسروں کو اذیت اور دکھ دینے سے باز نہیں آتے۔ عجب دور ہے صاحب، انسان مکمل ڈوبا ہوا ہے خود غرضی میں۔ سسپنس ڈائجسٹ حبس زدہ شاموں میں تنہائی کا ساتھی بنا، بعض تنہائی کے ساتھی بڑے حسین لمحوں میں ملتے ہیں، نظر نہ آنے والی چیزیں بھی تو سکون دیتی ہیں۔ خیالی پیکر، خیالی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ پیا کا خط ملا جو سوچوں میں مبتلا کر گیا۔ میٹھی اور خوشگوار سوچیں اور یادیں جو انسان کے دل سے ایسی لپٹی رہتی ہیں جیسے پھول کے وجود سے خوشبو۔ حاصل کلام...... آنکھوں سے دیکھا، دل سے پڑھا اور دماغ میں بسا لیا...... بعض لفظوں کو قید میں رکھ کر عجیب سی خوشگواریت محسوس ہوتی ہے۔ انسان کسی کو قیدی بنا کر بھی بعض اوقات خوشی محسوس کرتا ہے، چاہے وہ لفظ کیوں نہ ہوں۔ طاہرہ گلزار کو نمبر ون دیکھ کر حیرت ہوئی۔ خیر مبارک ہو۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ آغاز ڈاکٹر ساجد امجد کے تاریخی مضمون سے کیا۔ تلخ موضوع کو سحر انگیز اندازِ بیاں میں بیان کرتے نظر آئے۔ ازل سے ابد تک ہوس انسان کے اندر موجود رہی ہے اور رہے گی...... اقتدار کا نشہ بہت سوں سے بہت کچھ چھین لیتا ہے۔ سب سے بڑی دولت سکون ہے۔ معما سادہ سی ہلکی پھلکی کہانی، مائیک کا کیا گیا ڈراما کامیاب رہا۔ ویلری اور ریبی اچھے کردار رہے۔ کیرول اور جوڈی کی بھاگ دوڑ کامیاب رہی...... شیش محل، پرانے کردار آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ روبن گیا اور اب گولو بھی اپنی معصومیت لیے کہانی سے آؤٹ ہو گیا۔ کیتھرائن کو لاہور میں نیا خاندان مل گیا۔ کرشمہ ایک خبطی انسان اور دوسرا فن کار...... ایک خبطی جان سے گیا دوسرا چور بہت کچھ پا گیا۔ شاہکار...... ہم انسان

یہاں رہ کر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی، الٹا اسے ہر وقت فکر رہے گی کہ کہیں کیتھی کو کچھ نہ ہو جائے۔ وہ پولیس کی حراست سے فرار ہوئی تھی اور کسی بھی وقت دوبارہ گھیرے میں آ سکتی تھی اس لیے اس کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ کیتھی نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ وہ بھی اپنا کام پورا کر کے پہلی فرصت میں پاکستان آ جائے گا۔ ستار بھائی نے اپنے تعلقات استعمال کر کے یہ انتظام کر دیا تھا کہ کیتھرائن پاکستان پہنچے تو اس کی اسپتال میں ملازمت کا بندوبست ہو جائے۔ ستار بھائی بڑے بڑے سیٹھوں اور سیاستدانوں کے لیے کام کرتا رہا تھا اور اس کے ہندو اور مسلمان سب طرح کے لوگوں سے گہرے تعلقات تھے اس لیے ان مخدوش حالات میں بھی اس نے سارے انتظامات کروا دیے تھے۔ وہی بعد میں فاروق اور کیتھی کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی بنتا۔

''جلد پاکستان آنے کی کوشش کرنا فاروق بھائی۔ میں بہت شدت سے آپ کی راہ دیکھوں گی۔'' کیتھرائن نے فاروق کا چہرہ نظروں میں سموتے گلوگیر لہجے میں اس سے کہا۔

''میں پوری کوشش کروں گا میری بہن کہ میں تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکوں۔ اپنا خاندان میں بہت پہلے چھوڑ چکا ہوں۔ وہ جو رگِ جاں ہے، اس کے لیے میری ذات بے معنی ہے اور دادا اور گولو کے بعد بمبئی میں بھی میرے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی۔ ایسے میں دیکھا جائے تو اس دنیا میں صرف تم ہی ہو جس سے کوئی رشتہ رہ گیا ہے۔ میں تمہاری بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔ بس مجھے میرے حصے کا قرض ادا کرنے دو، یہ قرض اتارنے کے بعد اگر میں سلامت رہا تو تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔'' فاروق نے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا تو کیتھی کی سسکی نکل گئی اور وہ شکوہ کرنے والے انداز میں بولی۔

''مرنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ گاڈ آپ کو بہت لمبی زندگی دے گا۔''

''زندگی بے ہی بڑی بے بھروسا شے کا نام۔ دیکھا نہیں کہ کیسے دادا اور گولو اچانک ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا، بس یہ چاہتا ہوں کہ تم بدترین حالات کے لیے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے اور زندگی کسی کے بغیر رکنے والی شے کا نام نہیں ہے۔ اسے کسی نہ کسی طور جاری رہنا ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے لیے اچھی زندگی کا انتخاب کرو۔ تمہارا ایک گھر ہو، اچھا سا زندگی کا ساتھی ہو اور پیارے پیارے بچے ہوں۔'' فاروق اس کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر کیتھی تھوڑا سا شرمائی پھر بولی۔

''اس سب کے لیے بھی مجھے آپ کی ضرورت ہوگی۔ میرے سرپرست اب آپ ہی ہیں اور میں آپ کی سرپرستی میں ہی اپنے لیے کوئی راہ منتخب کرنا پسند کروں گی۔''

''بہت ضدی ہو۔'' فاروق اس کی بات سن کر ہنس دیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ۔ تمہاری فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے نصیب میں کیا لکھا ہے۔''

''مجھے گاڈ پر بھروسا ہے، اس نے ہمارے لیے آگے اچھا ہی لکھا ہوگا۔'' کیتھی کے لہجے میں یقین تھا۔

''اللہ تمہارے بھروسے کو قائم رکھے۔'' فاروق نے بھی اس کی خوش امیدی کا ساتھ دیا۔ پھر وہ اسے گڈبائے کہتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ فاروق دیر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ کیتھی کے چلے جانے سے وہ خود کو کافی مطمئن اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ محبت کرنے والوں کا ساتھ اور قرب ہر ایک کو پیارا ہوتا ہے لیکن جب بات اپنے پیاروں کی سلامتی پر آ جائے تو پہلی ترجیح سلامتی ہی ہوتی ہے۔ کیتھرائن بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اس نے بہت مشکل حالات میں اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اب اس کی بقا اسی میں تھی کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے۔

کیتھرائن کی روانگی کے بعد وہ ٹیکسی لے کر سیدھا ستار بھائی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

''آؤ فاروق میاں! یہاں تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ کہو خیریت سے رخصت کر آئے بہن کو؟'' ستار بھائی نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی! آپ کی مہربانی سے وہ بخیر و عافیت یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ آپ بتائیے میرے دوسرے کام کا کیا ہوا؟ میں تاخیر سے بچنا چاہتا ہوں۔ میری اپنی پوزیشن ایسی ہے کہ ذرا سی بھنک ملنے پر بھی پولیس مجھے گرفتار کر لے گی اور میں اپنا کام پورا کیے بغیر نہیں پھنسنا نہیں چاہتا۔'' فاروق نظریں جھکا کر بیٹھا ستار بھائی کے روبرو اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔

''ہم تمہیں پھنسنے نہیں دیں گے جوان! اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ رہی تمہارے کام کی بات تو وہ میرا اپنا بھی کام ہے۔ ربن کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچائے بغیر خود مجھے بھی سکون نہیں مل سکتا۔ میرے آدمی حکم کی تعمیل

کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر میں ہی تمہیں اچھی خبر سننے کو ملے گی۔'' ستار بھائی نے اسے اطمینان دلایا اور پھر سامنے دھری چائے کی پیالی کی طرف اشارے سے توجہ دلائی۔ گفتگو کے دوران ہی ایک آدمی چائے پیش کر کے گیا تھا لیکن فاروق نے دھیان نہیں دیا تھا۔ ستار بھائی نے توجہ دلائی تو وہ خاموشی سے پیالی اٹھا کر بے دلی سے گھونٹ بھرنے لگا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ستار بھائی کے ایک گرگے نے کال ریسیو کرنے کے بعد احترام سے چونگا ان کی طرف بڑھایا۔

فاروق نے محسوس کیا تھا کہ ستار بھائی کے اڈے پر جدید سہولیات کا استعمال زیادہ تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ستار بھائی نے بااثر شخصیات سے خوب بنا کر رکھی ہوئی تھی اور یقیناً ان کے ایسے کام بھی انجام دے دیتا تھا جنھیں انجام دینا ربن کی اصول پسند طبیعت کو گوارا نہیں تھا۔ ربن تھا بھی ذرا قدامت پسند آدمی جب ہی تو بارودی اسلحہ خریدنے کے باوجود کبھی اس کے استعمال کا نہیں سوچا تھا۔ اس کے نزدیک چاقو کے استعمال میں جس ہنرمندی اور فنکاری کا اظہار ہوتا تھا پستول، بندوق یا ریوالور کے استعمال میں وہ بات نہیں آتی تھی۔

''اچھی بات ہے ہم لوگ بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ تم لوگ پوری طرح ہوشیار رہنا۔'' ٹیلیفون کا ریسیور کان سے لگا کر دوسری طرف کی بات پوری توجہ سے سننے کے بعد ستار بھائی نے ہدایات جاری کیں اور پھر چونگا واپس اپنے گرگے کو تھما کر فاروق سے مخاطب ہوا۔

''چلو فاروق استاد چلتے ہیں۔ میرے آدمیوں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ پولیس کی ایک جیپ اب ہمارے قبضے میں ہے اور میرے آدمیوں نے اسے ایک خالی گودام میں کھڑا کر رکھا ہے۔ موٹر میں بیٹھ کر ہم دس منٹ میں اس گودام تک پہنچ جائیں گے۔'' اس اطلاع کو پا کر فاروق پرجوش ہو گیا۔ ستار بھائی کے پاس آنا واقعی بے حد سودمند ثابت ہوا تھا اور بڑے بڑے کام آسانی سے ہو رہے تھے۔ کرفیو میں نرمی کے اوقات ختم ہو جانے سے قبل ہی وہ لوگ مذکورہ گودام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک فلور مل کا گودام تھا جو کچھ عرصے قبل بند ہو گئی تھی۔ گودام میں اب بھی گندم کی چند بوریاں رکھی تھیں اور ہر طرف گرد و غبار تھا۔ ستار بھائی کے ایک آدمی نے تین چار پولیس یونیفارم نکال کر دکھائے۔ فاروق نے اس میں سے اپنے ناپ کا یونیفارم نکال کر اپنے لباس پر ہی پہن لیا۔ باقی کے تین یونیفارم ستار بھائی کے آدمیوں نے چڑھا لیے۔

''دیکھو خیرو! فاروق استاد کے حکم پر جان دے دینی ہے لیکن ناکام واپس نہیں آنا۔'' ان کی تیاریوں کا جائزہ لیتے ستار بھائی نے اپنے آدمی کو مخاطب کر کے ہدایت کی۔

''آپ فکر نہ کریں بھائی! جان ایک دن جانے ہی کی چیز ہے اس لیے ہم میں سے کوئی جان دینے سے نہیں ڈرتا۔'' مخاطب نے ستار بھائی کو تسلی دی۔

''اب اجازت دیں بھائی۔'' سر پر پولیس والوں کی کیپ جماتے ہوئے فاروق، ستار بھائی سے بولا۔ پولیس کی یونیفارم اس پر بہت جچ رہی تھی اور وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا البتہ جس بے چارے کی یہ یونیفارم تھی، وہ اپنے ساتھیوں سمیت گودام کی ایک کوٹھری میں بندھا پڑا تھا۔ ستار بھائی کے آدمیوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے یہ کیا تھا کہ گاڑی سمیت پولیس والوں کو یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے پولیس کی ایک گشتی جیپ کو روک کر بڑی رازداری سے یہ اطلاع دی تھی کہ اس متروکہ گودام میں اس نے چند مسلمانوں کو کچھ سامان چھپاتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے یہ شک تھا کہ اس سامان میں اسلحہ بھی شامل ہے۔ اس اطلاع کو سن کر اس گشتی پارٹی کے انچارج نے فوری طور پر گودام کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ اصولاً اسے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دینی چاہیے تھی لیکن اس نے نہیں دی کہ امید تھی کچھ قیمتی مال بھی ہاتھ آ جائے گا اور وہ صرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ بانٹ کر زیادہ فائدے میں رہے گا۔ ہیڈ کوارٹر اطلاع کرنے کی صورت میں سب کچھ وہاں پہنچانا پڑتا اور انہیں کوئی حصہ دیے بغیر اوپر والے ہی سب ہڑپ کر لیتے۔ لالچ اور کریڈٹ لینے کے چکر میں انچارج اپنے ساتھیوں سمیت گودام میں جا پہنچا اور ستار بھائی کے آدمیوں نے ان لوگوں کو چھاپ لیا۔ اب وہ یونیفارم سے محروم ایک کوٹھری میں اس طرح بندھے پڑے تھے کہ ان کی آنکھوں پر بھی پٹیاں بندھی تھیں اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

''مالک کی امان میں جاؤ۔ تم نے روکا نہ ہوتا تو میں خود تمہارے ساتھ چلتا۔'' ستار بھائی اس سے بغلگیر ہوا۔

''آپ کا ساتھ نہ چلنا ہی ٹھیک ہے۔ آپ نے میرے ساتھ جتنا تعاون کیا ہے، اسی کے لیے میں مرتے دم تک آپ کا شکر گزار رہوں گا۔'' فاروق نے جواب دیا۔ وہ سچ مچ ستار بھائی کا بہت شکر گزار تھا لیکن عملی طور پر اس لیے اسے اپنے پروگرام میں شریک نہیں کیا تھا کہ وہ ایک جانی

پہچانی شخصیت تھا اور فوراً نظر میں آسکتا تھا۔ اس نے تو اپنا ساتھ دینے کے لیے بھی ان آدمیوں کا مطالبہ کیا تھا جو زیادہ سامنے نہ رہتے ہوں اور جنہیں ستار بھائی کے گروہ میں ہونے کے حوالے سے ہر ایک نہ پہچانتا ہو۔

"شکریہ وکریہ کچھ نہیں ہے، بس تم جاؤ اور اپنے مقصد میں کامیاب لوٹو۔" ستار بھائی اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اس سے الگ ہوگیا۔ فاروق اپنے ساتھیوں کے ساتھ گودام میں ہی کھڑی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ستار بھائی کا ایک آدمی بیٹھا اور ساتھ والی سیٹ خود فاروق نے سنبھال لی جبکہ باقی دو پیچھے بیٹھ گئے۔ جیپ باہر نکلی تو فاروق نے اپنے وجود میں سنسناہٹ سی پھیلتی محسوس کی۔ وہ راٹھور کے شکار کے لیے جا رہا تھا اور یقیناً وہ ایک مشکل شکار تھا۔ اس شکار کے بعد سلامتی کے ساتھ واپس آنا بھی ایک کارنامہ ہوتا لیکن وہ اس لیے مطمئن تھا کہ آغاز اچھا ہوا تھا اور اب تک سب کچھ حسب منشا ہی ہو رہا تھا۔ پولیس جیپ میں ہونے کی وجہ سے وہ کرفیو کے باوجود آسانی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے... بالآخر ڈرائیور نے ایک جگہ جیپ روک لی۔ اب انہیں راٹھور کی گاڑی گزرنے کا انتظار تھا۔

حاصل شدہ معلومات کے مطابق وہ روزانہ ان اوقات میں شہر کے مختلف علاقوں کے گشت پر نکلتا تھا۔ وہ چالاک آدمی تھا اور جانتا تھا کہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے ردعمل میں خود اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے زیادہ وقت اپنے دفتر میں چھپ کر ہی گزارتا تھا اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ گشت کے لیے بھی اس نے وہ وقت مقرر کیا تھا جب کرفیو لگا ہو اور خالی سڑکوں پر عوام سے مڈبھیڑ کا خطرہ نہ ہو۔ اسی لیے ان لوگوں نے بھی اس تک پہنچنے کے لیے یہ سارا چکر چلایا تھا اور اب اس کے دفتر سے کچھ فاصلے پر اس کے منتظر تھے۔ ان کا یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور انہوں نے پولیس کی ایک جیپ کو آتے ہوئے دیکھا۔ جیپ قریب سے گزری تو خیرو نے تصدیق کر دی کہ اس میں راٹھور موجود ہے۔ خود فاروق کا تو براہِ راست اس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا اس لیے وہ اسے پہچانتا بھی نہیں تھا۔

اس کی جیپ آگے نکل گئی تو ان کے ڈرائیور نے بھی اپنی جیپ اس کے تعاقب میں ڈال دی۔ وہ مناسب فاصلہ رکھ کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ مناسب جگہ دیکھ کر راٹھور کی جیپ کو رکوائیں گے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ راٹھور کی جیپ جامع مسجد کے قریب واقع بازار میں پہنچ کر ایک دکان کے سامنے جا رکی۔ بازار بالکل خالی پڑا تھا اور اطراف میں دو تین کتوں اور کوڑے کرکٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کی جیپ کے ڈرائیور نے رفتار بالکل کم کر لی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ راٹھور کی جیپ یہاں کیوں رکی ہے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جیپ سے دو سپاہی برآمد ہوئے اور دکان کے شٹر پر لگے تالوں کو لوہے کی سلاخوں سے توڑنے لگے۔ راٹھور جیپ میں ہی بیٹھا ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ فاروق والی جیپ اس کی جیپ کے پیچھے جا کر رکی تو ان لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک جیولر شاپ ہے، فوراً ہی واضح ہوگیا کہ قانون کے رکھوالے زبردست قانون شکنی کرتے ہوئے لوٹ مار کی کوشش کر رہے ہیں۔ دکان کے نام سے ظاہر تھا کہ وہ کسی مسلمان ستار کی دکان ہے اور مسلمانوں کو لوٹنا تو راٹھور جیسے بدمعاش قانون کے رکھوالے کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ ان کی جیپ راٹھور کی جیپ کے پیچھے رکی تو وہ اور اس کے ساتھی چونک کر دیکھنے لگے۔ پولیس جیپ اور یونیفارم کی وجہ سے انہیں آنے والوں کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی اور وہ صرف تجسس میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔ فاروق اور اس کے ساتھی پھرتی سے جیپ سے اتر کر ان کے گرد پھیل گئے۔ فاروق سیدھا اس طرف گیا جہاں راٹھور موجود تھا۔

"کون ہو تم لوگ، اپنی شناخت کرواؤ۔" راٹھور نے انگریزی میں رعب سے دریافت کیا۔ جواب میں ان لوگوں نے ہتھیار نکال لیے۔

"کہتے ہیں آدمی اپنی موت کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ تم کیسے آدمی ہو کہ مجھے پہچان نہیں سکتے۔" فاروق نے اپنا چاقو راٹھور کی گردن سے لگایا تو وہ اچھل پڑا۔

"فف...... فا...... فاروق۔" ایک ہی جملے نے اسے فاروق کی شناخت کروا دی تھی۔ وہ پولیس افسر تھا اور جانتا تھا کہ ربن کے قتل کے بعد فاروق کس طرح چن چن کر اس کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا رہا تھا اس لیے اس کے خود تک پہنچ جانے پر اس نے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"اچھی بات ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ کم از کم اب مجھے تمہیں تمہارا قصور نہیں بتانا پڑے گا۔"

"میرا کوئی دوش ہے بھی نہیں پھر بھی تم ایسا سمجھتے ہو تو میں تم سے ریکویسٹ کروں گا کہ تم مجھے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے ایک چانس دو۔" راٹھور نے تیزی سے خود

کو سنبھالا اور اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں فاروق سے بولا۔

''کیا کہو گے تم... یہی کہ ربن کے قتل میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں لیکن میں تمہاری اس بات کو نہیں مان سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ ربن کو مارنے کے لیے قاتلوں کا وہ ٹولا تم ہی اپنے ساتھ لائے تھے اور ربن کے سینے میں اترنے والی گولی بھی تم ہی نے چلائی تھی۔'' غم اور غصے سے فاروق کی آواز چیخنے لگی۔ اس جذباتی کیفیت میں شاید اس سے ایک ثانیے کی چوک ہوگئی تھی اور راٹھور کی گردن پر رکھے چاقو کی نوک کا دباؤ کم ہو گیا تھا جس کا راٹھور نے فائدہ اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا فاروق کی طرف والا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ دروازہ فاروق کو جا کر لگا تو وہ لڑکھڑا گیا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی گاڑی سے چند قدم دور چلا گیا۔ راٹھور نے اس مہلت کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنا ریوالور نکال کر اس کا رخ فاروق کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''کھیل ختم مسٹر فاروق۔ اس ریوالور کی گولی تمہارے چاقو سے زیادہ تیز رفتار اور خطرناک ہے۔ تم نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اپنی موت کے لیے تم خود ریسپانسیبل ہو گے۔''

یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ فاروق کا ساتھ دینے والے ستار بھائی کے آدمی بھی اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ انہوں نے دکان کا تالا توڑنے کی کوشش کرنے والے دونوں سپاہیوں کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا لیکن اس بات کو سمجھتے تھے کہ ..موجودہ صورتِ حال میں اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ راٹھور افسر تھا اور اپنے ماتحتوں کی زندگی بچانے کے لیے خود اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا اور خود ان کی یہ پوزیشن تھی کہ وہ فاروق کی زندگی کو قطعی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے۔

صورتِ حال کی اس نزاکت نے ان کی قوتِ عمل کو سلب کر لیا لیکن فاروق اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے آسمان پر اڑتے کسی عقاب کی طرح اپنے اور راٹھور کے درمیان موجود فاصلے کو نظروں سے ناپا اور نہایت پھرتی سے ہاتھ میں موجود چاقو اس کی طرف کھینچ مارا۔ راٹھور نے بھی جواباً پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریوالور سے فائر داغا اور خود کو ایک طرف جھکا کر چاقو کے وار سے بچنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں وہ مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکا اور چاقو اس کے ریوالور والے ہاتھ میں کہنی سے ذرا نیچے کھب گیا۔ نتیجے میں اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔

اس موقع پر ستار بھائی کے آدمیوں نے بھی پھرتی دکھائی اور اپنے نرغے میں موجود دونوں سپاہیوں کے سروں پر زوردار ضربیں لگا کر انہیں لمبے عرصے کے لیے خاموش کر دیا۔ ادھر فاروق بھی حرکت میں تھا۔ اس نے چاقو پھینکتے ہی خود کو زمین پر گرا لیا تھا، اس وجہ سے راٹھور کی چلائی گئی گولی نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن ایک نقصان ضرور ہوا تھا۔ فائر کی آواز ایسی تھی جس نے یقینی طور پر آس پاس کے علاقے میں ڈیوٹی کرتے قانون کے رکھوالوں کو چونکایا ہو گا اور ظاہر ہے وہ اس کا کھوج لگانے اس طرف ضرور آتے۔ ایسی صورتِ حال میں فاروق اور اس کے ساتھی پھنس سکتے تھے اور یہ بات فاروق سمیت انہوں نے بھی محسوس کر لی تھی اس لیے راٹھور کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے گھیر لیا۔ خود کو مسلح افراد کے نرغے میں دیکھ کر راٹھور کے ماتھے پر پسینا چمکنے لگا۔ اس کے باوجود اس نے سنبھالا لینے کی کوشش کی اور اپنی طرف بڑھتے فاروق سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''یوں گھیر کر مجھے مار ڈالنے سے تم خود کو بہادر ثابت نہیں کر سکتے۔'' جواباً فاروق کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ دوڑی اور وہ بولا۔

''مجھے تم سے بہادری کا سرٹیفکیٹ چاہیے بھی نہیں۔ ہاں تمہیں ضرور یہ احساس ہوا ہو گا کہ تم میں اور دادا میں کتنا فرق ہے۔ تم نے اسے اس سے کہیں زیادہ آدمیوں کی مدد سے گھیرا تھا پھر بھی وہ پوری بہادری اور استقامت سے ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا اور کسی سے کوئی رعایت نہیں مانگی۔ تمہاری تمام ترکمینگی کے باوجود میں دادا کا شاگرد ہونے کے ناتے تمہیں یہ رعایت دیتا ہوں کہ میرے آدمیوں میں سے کوئی تم پر گولی نہیں چلائے گا اور تمہیں صرف میرے مقابل کھڑا ہونا ہو گا۔''

فاروق نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ سیٹیوں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں اس کے لیے امتحان لیکن راٹھور کے لیے مژدۂ جاں فزا تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کھٹے انگور

منظر امام

خواہشوں کے پیچھے بھاگنا اور بھاگتے بھاگتے تھک کر بیچ راستے میں ہی گر جانا... یہ ایک ایسا عمل ہے جسے دیکھنے، سننے اور سمجھنے والے اگر نصیحت نہ پکڑیں تو یہ بھی ایک لمحہ فکریہ ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ گر جانے کی خجالت سے بچنے کے لیے طرح طرح کی دلیلیں کبھی لباس کی گرد صاف نہیں کرسکتیں۔

ان انگوروں کی روداد جو کبھی لومڑی کے ہاتھ نہ آسکے



میں اپنی کہانیوں میں.... ایسوپ کی کہانیوں کے حوالے کئی بار دے چکا ہوں۔ یہ عظیم کہانی گو قدیم یونان کے شہر ایتھنز میں رہتا تھا۔ ایک غلام تھا اور چوراہے پر کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اس کی کہانیاں دانش کا خزانہ تھیں۔

اس کی کہی ہوئی ہر کہانی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ میں نے پڑھی ہے۔ میرے باپ نے پڑھی یا سنی ہوگی اور ان سے پہلے ان کے باپ نے۔ اس طرح یہ سلسلہ... تین ہزار سال پہلے تک چلا گیا ہے۔

آپ نے بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا، ضرور پڑھی ہوگی۔ پیاسا کوا ضرور پڑھی ہوگی۔ کچھوا اور خرگوش کی کہانی بھی آپ کو یاد ہوگی۔ جی ہاں، یہ ساری کہانیاں ایسوپ ہی کی تھیں۔

اس کی ایک مشہور کہانی انگور کھٹے ہیں، وہ بھی آپ جانتے ہوں گے کہ ایک لومڑی انگور کے ایک درخت کے نیچے سے گزری۔ انگوروں کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے انگوروں کی طرف جست لگائی لیکن نہیں پہنچ سکی۔ پھر جست لگائی نہیں پہنچ سکی۔ ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''ارے جانے دو۔ یہ انگور تو ویسے بھی کھٹے معلوم ہو رہے ہیں۔''

پھر وہ اپنے آپ کو تسلی دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یہ جملہ آج تک دہرایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تو یہی کہہ کر خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔

تو یہ ہے ایسوپ کی... سنائی ہوئی اصل کہانی۔ اب ہم اس کہانی کو آج کے تناظر میں دیکھتے ہیں کہ آج اگر ایسی صورتِ حال ہوتی تو پھر کیا ہوتا۔

☆☆☆

لومڑی کو دو دنوں سے کھانے کو کچھ نہیں مل سکا تھا۔ دو دنوں پہلے تک اس کے عیش تھے۔ اس کے محلے کے قریب ہی ایک پولٹری فارم تھا جس کا مالک کچھ لاپروا قسم کا بندہ تھا۔ اس لیے اس کی مرغیاں اکثر باہر نکل آتیں اور لومڑی کے ہتھے چڑھ جاتیں۔ لومڑی بہت چالاک تھی۔ اس نے ایک دن میں ایک مرغی کا حساب رکھا تھا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ قناعت پسندی بہت اچھی چیز ہوتی ہے اور قناعت سے گزارہ کرنے والا کبھی پریشان نہیں ہوتا۔

اس لیے اس نے ایک مرغی، ایک دن کا حساب رکھا ہوا تھا تاکہ مالک کو شبہ نہ ہو لیکن پھر کیا ہوا کہ مالک نے دو کتے پال لیے جو بہت زیادہ کتے تھے۔

انہوں نے پہلے ہی دن لومڑی کو خوفزدہ کر کے بھگا دیا تھا۔ اب وہ بے چاری دو دنوں سے بھوکی گھوم رہی تھی کہ اچانک اسے ایک لان میں انگور کا ایک درخت نظر آ گیا جس میں انگوروں کے خوشے لٹک رہے تھے۔

لومڑی کی رہائش چونکہ انسانی آبادی کے قریب ہی تھی اس لیے وہ جانتی تھی کہ لان کیا ہوتا ہے۔ پارک کسے کہتے ہیں۔ کھیت کس چیز کا نام ہے اور باغ کیا ہوتا ہے۔ لومڑی کو یہ ساری معلومات حاصل تھیں اس لیے اس نے پہچان لیا کہ یہ درخت کسی کے لان میں لگا ہوا ہے۔

وہ لان ایک بڑے سے مکان کا تھا جس کے گیٹ کے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ گیٹ کے سامنے میدان میں دو تین اونچے اونچے درخت تھے۔ لومڑی ایک درخت کے پیچھے چھپ کر لان کی طرف دیکھتی رہی۔

انگور کا وہ درخت لان کی ایک دیوار کے ساتھ ہی تھا اور اتنی زیادہ بلندی بھی نہیں تھی۔ لومڑی ایک جست میں دیوار تک پھر درخت تک پہنچ سکتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت اس لان میں شاید کوئی تقریب ہو رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ اس کے باوجود ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو رہی تھی۔ اتنے بلب لگائے گئے تھے کہ رات میں بھی دن کا سماں لگ رہا تھا۔ انگور کا وہ درخت اس لیے لومڑی کو دکھائی دے گیا تھا کہ چاروں طرف روشنی تھی۔ لان میں بہت سے لوگ تھے۔

کچھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ لان میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ گیٹ کے باہر دیوار کے ساتھ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں بھی کچھ لوگ تھے۔ شاید گاڑیوں کے ڈرائیور ہوں گے۔ لومڑی ان کی نگاہوں کے سامنے انگور تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

وہ سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک قدموں کی آہٹ گونجی۔ لومڑی جس درخت کے پیچھے تھی، اس طرف کوئی آ رہا تھا۔ وہ اور دبک کر رہ گئی۔

آنے والا ایک نوجوان تھا۔ بہت خوب صورت۔ اس کو دیکھ کر لومڑی کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر وہ لومڑی نہیں ہوتی، انسان ہوتی تو اس سے اظہارِ عشق کر دیتی۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔

پھر اس نے کسی اور کو درخت کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت، جوان۔ اس کے لانبے لانبے بال اس کی کمر تک آ رہے تھے۔ اس کی پلکیں اتنی گھنی تھیں جیسے درختوں نے سایہ کر رکھا ہو۔

اس حصے میں اگرچہ زیادہ روشنی نہیں تھی، اس کے باوجود لومڑی اس لڑکی کے حُسن کا جائزہ لے سکتی تھی کیونکہ وہ لومڑی تھی اور جانوروں کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہیں۔

وہ لڑکی اس نوجوان کے پاس آ گئی۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ لومڑی کو اس وقت اس لڑکی سے جلن محسوس ہونے لگی تھی۔ لومڑیانہ رقابت کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔

''کمبخت کس طرح لہک لہک کر مل رہی ہے۔'' لومڑی نے دل ہی دل میں اس لڑکی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔

''ارشد! تم کو اندازہ ہے کہ میں کس طرح چھپ کر تم سے ملنے آئی ہوں۔'' لڑکی نے اس نوجوان سے کہا۔

''ہاں ڈارلنگ۔ جانتا ہوں میں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''کیونکہ میں لان میں تمہارے ڈیڈی اور ممی کو دیکھ چکا ہوں۔''

''آخر یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' لڑکی نے پوچھا۔ ''ہم کل کہیں مل سکتے تھے۔''

''نہ جانے کیوں میرے دل میں تم سے ملنے کی خواہش ہونے لگی تھی۔'' نوجوان نے کہا۔ ''تم اسے میرے دل کا پاگل پن کہہ سکتی ہو پھر برداشت نہیں ہوا اور میں نے تمہیں یہاں بلالیا۔''

''کیا سلطان صاحب نے تمہیں نہیں بلایا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''مجھے کیوں بلانے لگے۔'' نوجوان کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میرا ان سے واسطہ ہی کیا ہے۔ میں ان کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ بس یہ ہے تعلق۔ تو ایک ٹیوٹر کو وہ اپنی پارٹی میں کیوں بلانے لگے۔''

لومڑی کو اس نوجوان کی باتیں سن کر اس پر افسوس ہونے لگا تھا...... بے چارہ۔

''اچھا۔ اب ہم مل لیے نا۔'' لڑکی نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہاں مجھے تلاش کررہے ہوں۔''

''جویریہ! ایک بات تو کہنے دو۔''

''ہاں کہو۔''

''تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔'' نوجوان نے کہا۔ ''تمہارے یہ خوب صورت گھنے بال اور تمہاری یہ گھنی پلکیں، قیامت ڈھا رہی ہیں۔''

''اچھا بس بس۔'' لڑکی مسکرا دی۔ ''ماسٹر صاحب! ذرا سوچ سمجھ کر تعریف کریں۔ ایسا نہ ہو کہ میں مغرور ہوجاؤں۔''

''میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم مغرور ہوجاؤ پوری دنیا کے لیے۔'' نوجوان نے کہا۔ ''سوائے میرے۔''

''اچھا، اب اجازت دو...... اور کل ضرور ملنا۔''

لڑکی کے جانے کے بعد وہ نوجوان بھی چلا گیا تھا۔

لومڑی کچھ دیر تک وہیں دبکی بیٹھی رہی پھر اس نے لان کی طرف دیکھا۔ لان میں اب مہمانوں کی تعداد اور زیادہ ہوگئی تھی۔ اب زیادہ چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ لومڑی کو ایک دو بار وہ لڑکی بھی گیٹ کے سامنے سے گزرتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ وہ یقیناً اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوگی۔

لومڑی نے اس طرف دیکھا جہاں دیوار کے ساتھ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور حضرات اب وہاں سے کچھ دور ہٹ کر گروپ کی شکل میں باتیں کررہے تھے۔ لومڑی کے دل میں ان کی باتیں سننے کا شوق پیدا ہوگیا۔ خدا نے اس کو یہ صلاحیت دی تھی کہ وہ انسانوں کی باتیں سمجھ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے اس لڑکی اور اس نوجوان کی باتیں سمجھ لی تھیں۔

وہ درخت کے پیچھے سے نکلی اور گاڑیوں کی آڑ لیتی ہوئی اس بڑی گاڑی کے پیچھے پہنچ گئی جس کے ساتھ وہ ڈرائیور حضرات کھڑے ہوئے باتیں کررہے تھے۔

''یار! ہم لوگوں کی قسمت میں ڈرائیوری ہی لکھی ہوئی ہے۔'' ایک نے شکوہ کیا۔

''اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔ ''ہم تعلیم سے مار کھا گئے ہیں۔''

''یار! تعلیم سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔'' تیسرے کی آواز آئی۔ ''ہمارے صاحب کے بچوں کو ایک ماسٹر پڑھانے کے لیے آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ صاحب سے بھی زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ لیکن کیا ہے، بے چارہ جوتیاں

چنچناتا پھرتا ہے۔''

''ہاں بھئی، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔'' چوتھے نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ جس کو چاہے بے حساب دے دے اور جس کو چاہے ہم جیسا کنگال کر دے۔''

سب اس کی بات کو سن کر ہنس پڑے۔ لومڑی ان پر سے دھیان ہٹا کر دیوار کی طرف متوجہ ہوگئی۔ دیوار اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ ڈرائیوروں کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ وہ ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔

وہ ایک جست میں دیوار کے پاس پہنچ گئی اور دوسری جست میں دیوار کے اوپر تھی اور اسی وقت نیچے ایک تماشا ہوگیا۔

وہ لڑکی جو درخت کے پاس نوجوان سے ملنے آئی تھی، جس کے بال بہت لمبے تھے اور جس کی پلکیں بہت گھنی تھیں...... وہ اس وقت گھر کے ایک ملازم پر بری طرح ناراض ہو رہی تھی کیونکہ اس ملازم نے غلطی سے اس کے سر پر جوس کا گلاس گرا دیا تھا۔ جس سے اس کے بال بھیگ گئے تھے اور پورا چہرہ جوس سے تر ہوگیا تھا۔

اس دوران دوسری لڑکی اس کے پاس آگئی۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولنے لگی۔ ''جویریہ پلیز! تم ایسا کرو میرے کمرے میں جا کر اپنے بال سکھا لو۔ سوری، ملازم کی غلطی سے یہ سب ہوگیا۔ تم آؤ، میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے جویریہ نام کی لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

جویریہ بک بک کرتی ہوئی اس دوسری لڑکی کے ساتھ چل پڑی جو شاید اسی گھر سے تعلق رکھتی تھی۔ لومڑی دیوار پر بیٹھی ان دونوں کو دیکھتی رہی تھی۔

وہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس وقت اوپر کے کمروں کی روشنیاں بند تھیں۔ لومڑی نے ایک کمرے میں روشنی ہوتے ہوئے دیکھی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہاں سے وہ کمرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ جویریہ نام کی لڑکی کو کمرے میں لانے والی دوسری لڑکی نے ایک تولیا دے دیا اور خود کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد جویریہ نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس نے لومڑی کو حیران کر دیا۔ اس نے اپنے لمبے گھنے بال اتار کر ایک طرف رکھ دیے تھے۔

لومڑی اس وقت انگور ونگور سب بھول گئی تھی۔ وہ حیران ہو کر اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے اپنے خوب صورت بال اتار کر ایک طرف رکھ دیے تھے۔

پھر اس نے اپنی گھنی پلکیں بھی اتار دیں۔ اب وہ خوب صورت لڑکی انتہائی بدصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا سارا حسن مصنوعی تھا۔

لومڑی کے کانوں میں اس نوجوان کے جملوں کی بازگشت ہونے لگی۔ اس نے لڑکی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ تمہارے یہ لمبے بال اور گھنی پلکیں قیامت ڈھا رہی ہیں۔''

لومڑی کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اس نوجوان کو بلا کر لے آئے اور اسے یہ منظر دکھا دے تاکہ اس کے عشق کا بھوت اتر جائے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ وہ جس کے عشق میں گرفتار ہوگیا ہے، اس کا حسن مصنوعی ہے۔ اس لڑکی کی ادائیں مصنوعی ہیں لیکن وہ تو صرف ایک لومڑی تھی۔ وہ کہاں ان انسانوں کے چکر میں پڑتی۔ اس نے اس لڑکی کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی اور انگوروں کے خوشوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے ایک جست لگائی اور انگوروں کے ایک خوشے تک پہنچ گئی۔ وہ پورا خوشہ اس کے منہ میں آگیا تھا۔

خوشہ منہ میں دبائے وہ پھرتی کے ساتھ دیوار سے اتری اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ کچھ دور پہنچ کر اس نے ایک پُرسکون جگہ کا انتخاب کیا اور آرام سے بیٹھ کر انگور چبانے لگی۔ ذرا سی دیر میں اس کا منہ کچر کچر ہوگیا تھا۔

انگور ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان اور جبڑے کو زخمی کرنے لگے تھے۔ اس نے بوکھلا کر انگور تھوک دیے اور اس وقت اسے پتا چلا کہ وہ انگور پلاسٹک کے تھے۔

وہ پودا آرائشی اور مصنوعی تھا اور اس میں لٹکے ہوئے انگور بھی مصنوعی تھے۔ اس لڑکی کے حسین بالوں اور گھنی پلکوں کی طرح۔

اس دن کے بعد سے لومڑی نے انگوروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ یہاں کے نہ صرف انگور کھٹے ہیں بلکہ سب کچھ کھٹا ہے۔

اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ اگر آپ بھی لومڑی کی فطرت رکھتے ہیں تو یہ سوچ لیں کہ ہر طرف جعلی چیزوں کی بھرمار ہے۔ دوائیں جعلی، کھانے کی اشیا جعلی، مرچیں جعلی، مسالے جعلی اور سب سے بڑھ کر حسن بھی جعلی۔ کسی کے حسین بالوں اور گھنی پلکوں کی طرف نہ جائیں کیونکہ یہ پورا معاشرہ دھوکے کا ہے۔ ہم اور آپ سب دھوکے کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ بے چاری لومڑی کی کیا حیثیت!



ٹیڑھی کھیر

سلیم انور

یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے جہاں آئے روز کوئی نہ کوئی ڈراما ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی مسیحائی کے روپ میں خنجر لیے گھوم رہی تھی اور جب اس کا شکار مطلوبہ ہدف تک جا پہنچا تو پیٹھ پر اسی خنجر سے وار کر ڈالا۔

اپنے تحفظ پر ذوقِ کر کے پل میں پینترا بدلنے والی وکیل کی مہارت

"ہیلو ہانڈا! میں میرینا بول رہی ہوں۔ تم یقیناً تمہیں اس نے گزشتہ شب مجھ سے اعتراف کرلیا ہے۔ میں گھر سے باہر سے فون کررہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ جیری ہماری گفتگو سن لے۔ میں اس معاملے میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ میں اسی وکیل کی خدمات حاصل کرنا چاہوں گی جس نے تمہارے کیس کی پیروی کی تھی۔"

"تم نے بہت اچھا سوچا ہے۔" میرینا کی دوست ہانڈا ولیس نے جواب دیا۔ "ٹی ولیمز ہے...... طلاق کے



دوسروں کی پریشانیوں کو بھی کیش کرانے سے باز نہیں آتے۔ آزر جیسے انسانوں کی مثالیں بھی ہر جگہ ملتی ہیں۔ ایسے انسانوں نے ہی انسانیت کو گرایا ہوا ہے۔ منظر امام بھی اس دفعہ پھر سے اچھوتا موضوع لے کر آئے۔ واقعی ایسی خود غرضی دیکھنے والوں کو خود غرضی ہی لگتی پر محسوس کرنے اور بھگتنے والوں کے لیے محبت تھی۔ محبت کی مثالیں اور قربانیاں بھی بڑی عجیب ہیں۔ باعثِ زحمت...... شاطرانہ طریقے سے سب کو بے وقوف بناتا جوڑا مسٹر اینڈ مسز گروبر کامیاب ٹھہرا۔ قلم کار بھی اچھی کاوش رہی۔ قطب الدین منورؔ خوبصورت گوشوں کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا۔ بہت ہی شاندار۔ مراسلہ جات میں سب کے سب اچھے رہے۔ اشعار معیاری رہے۔ آخری صفحات پر نعمان اسحاق کا ناول جواز تا دیر نظروں کی گرفت میں ٹھہرا رہا۔ لفظ ہونٹوں کے وجود سے ٹکراتے رہے، دل کو خوشی غمی، مسکراہٹ ہر طرح کا احساس دلاتے رہے۔ ارسل اور بلند بخت کا بچپن ہمک ہمک کر بے غرضی اور خوشیوں کے جھولے میں جھولتا آگے بڑھتا رہا...... سفر جیسا بھی ہو، اتار چڑھاؤ تو آتے ہی ہیں...... یہاں بھی آتے رہے۔ کبھی پیار پلتا رہا، کبھی نفرت۔ پسند ناپسند ایک جیسی لیکن کم بخت محبت بھی کیسا جذبہ ہے جتنا بھی برا ہو جائے، وہ ختم نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ روح میں پیدا ہو جائے تو دنیا کی لاکھ نفرتیں بھی اسے کبھی ختم نہیں کر سکتیں۔ ارسل بھی تو آخر اسی محبت کا اسیر تھا، کیسے معاف نہ کرتا۔ ایک شاندار اور زندگی سے بھرپور ناول سراب ایک تلخ اور حقیقی سچائی کی عکاس زہریلی تحریر۔ عروۃ الوثقیٰ اور اس کی والدہ جیسے رذیل لوگوں کو بے نقاب کرتی تحریر، انجام کچھ اچھا نہیں ہوا۔ ٹوٹے ہوئے لوگوں کی کہانی...... کئی زخم دے کر چلی جاتی ہے آزادی، پر افسوس اتنے زخم کھا کر بھی ہم آزاد نہیں ہیں...... ذہنی غلامی کا شکار ہیں ہم۔ ملک صفدر حیات کی کاریگری بھی اس دفعہ سسپنس سے بھرپور رہی۔ ویلڈن۔ واپسی بھی اچھی کاوش رہی۔ آخر میں محبت نامہ ختم کرتے ہوئے پُرامید ہوں کہ ان تمام دوستوں کے گلے شکوے دور ہو چکے ہوں گے جو پچھلے کچھ عرصے سے اپنی ناراضی کا اظہار کرتے رہے۔ یہ ناراضی نما محبتیں بھی عجیب ہیں، بہت کچھ کرا دیتی ہیں۔''

❊ بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس گلیانہ روڈ کھاریاں سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''سر جی! آپ کی وعدہ خلافی کے عین مطابق سسپنس اس بار بھی 15 کے بجائے 17 تاریخ کو صحرا میں کسی سراب کی طرح ملا۔ سرورق بالکل طاہرہ گلزار کا عکس لیے ہوئے تھا، بہت خوب ذاکر صاحب۔ کرسیِ صدارت پر طاہرہ گلزار اپنے بھرپور اور زبردست تبصرے کے ساتھ ایسے موجود تھیں جیسے پاکستان میں را کے ایجنٹ۔ مبارک ہو بی بی پرساتوں کی۔ جلدی سے اپنے خط کو تلاش کیا تو ایک کونے میں اپنے معصوم سے خط کو موجود پایا۔ خط کی حالت دیکھ کر شاک سا لگا۔ (کیوں بھئی) ساگر لوکر صاحب، وہ آئے ہماری محفل میں خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی بے چاری محفل کو دیکھتے ہیں، اللہ خیر کرے۔ بھیا محمد شہباز ناز صاحب زبردست، بہت اچھے، واہ واہ کیا کہنے۔ انداز بیاں خوب تھا۔ آپ کا مختصر ساخط قدرے بہتر تھا۔ دوست محمد گھکوری صاحب آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ سسپنس آپ کو ہی نہیں، ہم سب کو بھی بہت عزیز ہے۔ آپ ابھی کل کے بچے ہیں جبکہ میں عرصہ دراز سے سسپنس اور جاسوسی پڑھ رہا ہوں۔ فضا شاہ صاحبہ آپ نے ڈرتے ڈرتے بہت لمبا خط لکھ دیا ہے اور سر جی نے بھی کمال محبت سے آپ سے ڈرتے ڈرتے آپ کا خط شائع کر دیا ہے۔ سب سے پہلے وقت پڑھی کہ دیکھیں حسام بٹ صاحب نے وقت کے ذریعے ہمیں کیا وقت دیا۔ وقت پڑھ کر یہی لگا کہ میں امریکا میں گھوم رہا ہوں۔ انجان تو اچھی ہے۔ دوسرے نمبر پر شیش محل پڑھی۔ یقین کریں سر جی بور کرنے لگی ہے۔ اس بار آخری صفحات پر سسپنس والوں نے نعمان اسحاق کو موقع دیا۔ زبردست نعمان اسحاق صاحب۔ آپ نے جواز کے ذریعے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ یادگار تحریر تھی۔ سر جی اس بار آپ نے میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے شروع کے صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو موقع دیتے ہوئے کافر نعمت کے ذریعے پیش کیا۔ حسام بٹ صاحب نے ملک صفدر حیات کے ذریعے اس بار صلح جو کو پیش کیا۔ حسام بٹ صاحب نے وہی روایتی طریقہ اپناتے ہوئے ملک صفدر حیات صاحب کا کیس حل کر دیا۔ ٹوٹے ہوئے لوگ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی ایک اچھی اور معیاری تحریر تھی۔ جبکہ بہ ظاہر کے ذریعے منظر امام صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کی ہر تحریر کمال کی ہوتی ہے۔ ضیاء تسنیم بلگرامی صاحب اپنے قلم کے ذریعے ہمارے دلوں کو منور کر رہے ہیں۔ وہ اس بار قطب الدین منورؔ کے حالاتِ زندگی لے کر آئے۔ باقی کی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

❊ رمضان پاشا، گلشنِ اقبال، کراچی سے محفل کی رونق بن رہے ہیں۔ ''اس بار شمارے میں دو ہی چیزیں دیکھنے کو ملیں، اول یہ کہ پرچے میں نئے قلمکاروں کی آمد، دوم یہ کہ حسام بٹ صاحب اب قسط وار آنے لگے۔ دونوں چیزیں بہت ہی خوش آئند ہیں۔ دیکھ کر، پڑھ کر دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ بٹ صاحب کی کہانی بھی شاندار اور جاندار تھی۔ ''وقت'' پڑھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور اب دیگر کہانیوں پر تبصرہ۔ ''کرشمہ'' جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے، یہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ کہانی دل کو لگی جبکہ معما پسند نہیں آئی۔ ''شیش محل'' کی اس قسط کو پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ ابھی مزید اتنی ہی قسطیں اور چلیں گی جتنی گزر چکی ہیں۔ کہانی شاہکار بھی بہت پسند آئی۔ صلح جو ملک صاحب نے اس بار ایک نہیں، کئی مجرموں کو اندر کر دیا۔ ''واپسی'' کافی متاثر کن تھی۔ لالچ بری

سلسلے میں میری بے حد مدد کی تھی۔ لی نے میرے بدمعاش شوہر سے جس حد تک ممکن ہوسکتا تھا، رقم اینٹھ لی ہے اور اسے کنگال کر دیا ہے۔ جہاں تک جیری کا تعلق ہے، میرے خیال میں تم اس کیڑے کو جتنی جلدی گھر سے نکال باہر کرو گی، تمہارے لیے اتنا ہی بہتر رہے گا۔''

''شکریہ، ہلڈا۔ تم میری ایک اچھی سہیلی ہو۔ میں چاہوں گی کہ مجھے وکیل سے ملاقات کے لیے کل کا وقت مل جائے۔ اوکے، بائی۔'' میرینا نے کہا۔

''گڈ لک اینڈ گڈ بائی۔''

پھر میرینا ولسن نے ایک اور فون ملایا۔

''جیری۔ میں ایک وکیل سے اپائنٹمنٹ لے رہی ہوں۔ ہلڈا نے مجھے اس وکیل کا نام دیا ہے جس کی خدمات اس نے فرینک سے طلاق لینے کے سلسلے میں حاصل کی تھیں۔ مجھے جتنی جلدی ممکن ہوسکتا ہے، طلاق چاہیے۔''

''کیوں نہ ہم اپنے وکیلوں سے ملاقات سے قبل اپنے اثاثوں کی تقسیم کے بارے میں آپس میں بات چیت کرلیں۔ اس طریقے سے ہم میں سے ہر ایک کے حق میں بہتر رہے گا۔''

''نہیں جیری! میرے خیال سے وکیل آپس میں بحث کر کے اس کی بہتر تقسیم کا فیصلہ کرلیں گے۔ میں کل اپنے وکیل سے بات کرنے جارہی ہوں۔ میں اس عورت کا نام جاننا چاہتی ہوں جس نے تمہیں اپنے دام میں پھنسایا ہوا ہے۔'' میرینا نے حقارت سے کہا۔ ''اس عورت کا نام کیا ہے؟''

''وہ میرا ذاتی معاملہ ہے، میرینا۔ اسے اس معاملے میں ملوث کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

''ویل، دیکھتے ہیں کہ میرا وکیل اس بارے میں کیا کہے گا۔''

میرینا نے غصے سے کھولتے ہوئے اچانک رابطہ منقطع کردیا۔ اس نے اپنے جذبات کو سرد کرنے اور اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے قریبی پارک میں جا کر چہل قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسے چہل قدمی کرتے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ''ٹاک'' کا بٹن دبایا تو اس کے کانوں میں ایک غضب ناک آواز سنائی دی۔ وہ جیری تھا۔

''تمہیں میرے وکیل سے بات چیت کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' جیری نے جاننا چاہا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' میرینا نے جواب دیا۔ ''میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ تمہارا وکیل کون ہے؟''

''تم نے لی ولیمز سے بات کی ہے اور اس سے کل کا اپائنٹمنٹ لیا ہے۔ اس ملاقات کو کینسل کردو۔''

''میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔'' میرینا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لی ولیمز کا نام مجھے میری دوست ہلڈا نے دیا تھا۔ مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں جس وکیل کو چاہوں، وہ میری نمائندگی کرے۔''

''یہ اپائنٹمنٹ لی کی دلچسپی سے متصادم ہوگا۔ اس اپائنٹمنٹ کو منسوخ کردو۔'' یہ کہہ کر جیری نے فون کردیا۔

میرینا نے فوراً ہلڈا کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہلڈی! وہ اژدہا میرے وکیل کو مجھ سے چوری کرنے کی کوشش کررہا ہے۔''

''لی ولیمز کو..... اس کا وکیل بھی وہی ہے؟''

''ہاں، کیا تمہیں کوئی آئیڈیا ہے کہ ایسا کیونکر ہوا؟''

''نہیں۔ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں۔''

''کیا تم یقین سے کہہ رہی ہو کہ تمہیں معلوم نہیں؟ یہاں کوئی سازش تو نہیں ہورہی ہے؟''

''اگر کسی قسم کی کوئی سازش ہے تو مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔''

''ہلڈا! مجھے یہ سوال کرتے ہوئے خود سے نفرت سی محسوس ہورہی ہے لیکن تم اور جیری دونوں ہی نہایت پرجوش جوڑی لگتے ہو۔ کیا یہ تم ہی ہو جس کا جیری کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے؟''

''نہیں!'' ہلڈا چیخ پڑی۔ ''تمہاری یہ سوچنے کی جرأت کیسے ہوئی۔'' دوسری جانب سے ریسیور پٹخنے کی آواز سنائی دی اور فون منقطع ہوگیا۔

میرینا نے جیری کو فون ملایا۔ ''تم ہلڈا سے پینگیں لڑا رہے ہو..... ہے نا؟''

''کس سے؟''

''تم بخوبی جانتے ہو کہ کس سے! میری نام نہاد سہیلی ہلڈا ایلس سے اور کس سے؟ میں نے ابھی ابھی اس سے بات کی ہے، اس نے اس عشق کا اعتراف کرلیا ہے۔''

''کیا پاگل پن کی باتیں کررہی ہو، میرینا! میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔''

''تو پھر اور کون ہے؟''

''تم کچن میں جا کر انڈا فرائی کرو۔''

جیری نے فون بند کر دیا۔

میرینا تلملاتے ہوئے پارک کی نزدیکی بینچ پر بیٹھ گئی۔

اس کے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔

اس نے ''ٹاک'' بٹن پر انگلی ماری اور بولی۔

''ہاں؟'' دوسری جانب ہلڈا تھی۔

''تم نے جیری سے کہا ہے کہ میں اس کے ساتھ عشق لڑا رہی ہوں؟''

''میں اس بارے میں پُریقین ہوں۔''

''تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔'' ہلڈا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔

میرینا نے ''ٹاک'' کے بٹن پر انگلی ماری اور چیخنے لگی۔ ''اگر تم معذرت کرنا چاہتی ہو تو اسے بھول جاؤ۔''

''میں لی ولیمز ہوں۔ کیا تم سمجھ رہی تھیں کہ کوئی اور ہے؟''

''ہاں لی، میں نے جس لہجے میں تم سے بات کی ہے، اس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، میرینا۔ ہمیں اپنا کل کا اپائنٹمنٹ کینسل کرنا ہوگا۔ میں تمہاری نمائندگی کرنے سے قاصر ہوں۔''

''کیوں، فارگاڈ سیک!'' میرینا نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تمہارے شوہر کی نمائندگی کرنی ہے۔''

''اس شکرے کی!''

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔''

''کیا تم اسے چھوڑ کر اس کے بجائے میری نمائندگی نہیں کر سکتیں؟ ایک عورت ہونے کے ناتے تمہیں ایک عورت کا ساتھ دینا چاہیے۔''

''نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی۔''

''آخر کیوں؟ ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''اس لیے کہ وہ دوسری عورت میں ہی ہوں مسز اولسن جس کی خاطر تمہارے شوہر نے اتنے پاپڑ بیلے ہیں۔ میں تمہیں یہ بات اس لیے بتا رہی ہوں کہ جلد یا بدیر تمہیں اس حقیقت کا علم ہو جانا تھا۔''

یہ سنتے ہی ریسیور میرینا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

خوبصورت: اچھے ہیں وہ لوگ جو زندگی کی تلخیوں کی وجہ سے خود تلخ نہیں ہوتے۔ جو مسکراتے ہیں اور ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے اور سنتے ہیں۔ یقین جانیے کہ زندگی ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے خوبصورت ہے۔

مقابلہ: جب دل میں میل، طبیعت میں ضد اور الفاظ میں مقابلہ ہو جائے تو یہ تینوں جیت جاتے ہیں، بس رشتے ہار جاتے ہیں۔

کامیاب: کامیاب ہے وہ شخص جسے ہدایت مل گئی، ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور اس نے اس پر قناعت کر لی۔

آواز: ضمیر انسان کے اندر خدا کی پوشیدہ مگر واضح آواز ہے۔

دعا: دعا کے موقع پر دعا دینا اپنی جگہ احسن سہی مگر بددعا کے موقع پر دعا دے جانا شیوۂ پیغمبری ہے۔

لگاؤ: انسان کو جتنا لگاؤ رزق سے ہے اگر اتنا لگاؤ رزق دینے والے سے ہو تو اس کا مقام فرشتوں سے بھی افضل ہو جاتا ہے۔

اعتدال: پھلدار شاخ جھکی ہوئی ہوتی ہے لیکن حد سے زیادہ جھکی ہوئی شاخ راہ چلتے لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ ہر چیز اعتدال میں ہی اچھی لگتی ہے۔ خواہ وہ عاجزی ہی کیوں نہ ہو۔

سکون: لوگوں کی دی ہوئی تکالیف کو نہیں بلکہ لوگوں کی دی ہوئی محبتوں کو یاد رکھیں۔ ہمیشہ پُرسکون رہو گے۔

خواہشات: خواہشات اپنی مرضی سے اٹھایا ہوا بوجھ ہیں۔ اگر اپنی پرواز بلند رکھنی ہے تو خواہشات کا بوجھ ہلکا رکھیں۔

خوشی: زندگی گزر گئی دوسروں کو خوش کرنے میں مگر جو خوش ہوئے وہ اپنے نہ تھے اور جو اپنے تھے، وہ کبھی خوش نہ ہوئے۔

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاک پتن شریف

عزت دار

مرزا امجد بیگ

کہتے ہیں کہ عورت، زمین اور گھوڑی راس نہ آئے تو تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے لیکن... جو چیز کمبل کے مانند انسان کو لپیٹ لے اس سے کیسے جان چھڑائی جائے... لالچ میں انسان اندھا ہوکر چمکتی ہوئی چیز کو اپنا تو لیتا ہے مگر اس کا ساتھ ایک ایسا عذاب بن جاتا ہے جس سے سوائے تکلیفوں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا... اس نے بھی ایک ایسے ہی کنویں میں چھلانگ لگادی تھی۔ شاید اس نے سمندر، دریا اور کنویں کے پانی کو ایک جیسا ہی جانا ہو... اسی لیے کہتے ہیں عقل و شعور کی دولت جس کے پاس نہیں اس کی غربت کا کیا کہنا... ایسے میں ناانصافی یا کسی نہ کسی جرم کے سرزد ہوجانے کا امکان قوی ہوجاتا ہے...

اور یہ قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ثابت ہوا۔ جو دولت سے عزت خریدنے نکلی تھی اور رسوائی کا طوق گلے میں ڈالے واپس آگئی۔

ایک اور بے گناہ ملزم کا حصار اور بیگ صاحب کے تحیر خیز دلائل

ایک روز میں عدالت سے فارغ ہوکر اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا کہ پارکنگ لاٹ میں ایک شناسا شخص سے ملاقات ہوگئی۔ ملک نعیم تیزی سے چلتے ہوئے میری جانب آرہا تھا۔ میں رک گیا۔

''السلام علیکم بیگ صاحب!'' وہ میرے قریب آکر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کافی دیر سے آپ کو تلاش کررہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے آپ کو دیکھ لیا، ورنہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوجاتی تو آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہوچکے ہوتے۔''

میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ ''ملک صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ مجھے کیوں تلاش کررہے تھے۔ کیا میں کہیں کھو گیا تھا......!''

''خیریت نہیں ہے بیگ صاحب!'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''میرا ایک دوست مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا کیونکہ میرے دوست کو آپ ہی اس مشکل سے نکال سکتے ہیں۔''

ملک نعیم [illegible] تھی۔ وہ بجلی کے محکمے میں لائن مین تھا۔ ملک نعیم سے میرا واسطہ دو سال پہلے اس وقت پہلی مرتبہ پڑا تھا جب اس محکمے کی مہربانی سے میرے گھر کا بل ساٹھ ہزار کا آگیا تھا۔ آج کل اس مہنگائی کے دور میں بھی کسی گھر کا نارمل الیکٹرک کا بل ساٹھ ہزار ہوش رُبا ہے جبکہ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ آپ تصور کریں کہ ساٹھ ہزار کا بل دیکھ کر اس وقت میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ بہرحال، یہ ایک طولانی قصہ ہے کہ میں نے کس طرح بجلی کے محکمے کے خلاف فائٹ کرکے اپنے بل کو ایک نارمل بل میں تبدیل کروایا تھا۔ انہی دنوں لائن مین ملک نعیم سے میری اچھی خاصی علیک سلیک ہوگئی تھی جو بعدازاں اچھے دوستانہ تعلقات میں بدل گئی تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار ہماری ملاقات ہوجایا کرتی تھی۔

''آپ کا دوست کس قسم کی مشکل میں پھنس گیا ہے؟''

Watch Us On

YouTube



خالص شہد کی پہچان





چہرے کی جھُریوں کا

بہت ہی آسان علاج



میں نے پوچھا۔ ”اور میں اس کی کیا مدد کرسکتا ہوں......؟“

”بیگ صاحب! میرے دوست کا نام وحید خان ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”طارق روڈ پر اس کا کتابوں کا بزنس ہے۔ وہ بیرونِ ملک سے کتابیں امپورٹ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے آفس میں مارکیٹنگ یعنی اشتہارات کا کام بھی ہوتا ہے۔ اس کی کمپنی کا نام خان بک سیلرز ہے اور یہی وحید خان اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے۔“

”اوہ......“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”پولیس نے آپ کے دوست کو کس چکر میں گرفتار کیا ہے؟“

”اس پر قتل کا الزام ہے۔“ ملک نعیم نے بتایا۔

میں چونک اٹھا۔ ”کس کے قتل کا الزام؟“

”اپنی سیکریٹری سعدیہ کے قتل کا الزام۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جبکہ میں جانتا ہوں کہ وحید اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتا۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس معاملے میں الجھایا گیا ہے۔“

”ہوں......“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”وحید خان کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟“

”اس کی رہائش واقع شادمان ٹاؤن سے۔“ ملک نعیم نے بتایا۔ ”اور یہ گرفتاری گزشتہ روز شام سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔“

”اگر پولیس نے وحید خان کو کل گرفتار کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج صبح اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرلیا گیا ہوگا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جی بالکل۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”آج صبح پولیس نے وحید خان کو عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہے۔“

”آپ اس واقعے کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بیگ صاحب! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ تھانے جا کر وحید سے ایک ملاقات کرلیں۔ وہ آپ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کردے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”میں آج آفس سے فارغ ہونے کے بعد وحید خان سے ملاقات کرلوں گا۔“ پھر میں نے پوچھا۔ ”وہ کس تھانے میں ہے؟“

ملک نعیم نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کون ادا کرے گا؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ تمام مالی امور کا بندوبست ہوجائے گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”وحید خان سے میں مل چکا ہوں اور اسی کے ایما پر میں آپ کو اس کا وکیل مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ مالی معاملات کے بارے میں وحید آپ کو بتا دے گا۔“

”ٹھیک ہے...... لیکن ایک بات ذہن میں رہے ملک صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فیس کا معاملہ تو اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے ہی لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ اہم بات کیس کے حوالے سے اطمینان حاصل کرنا ہے۔ جب تک میری تسلی نہ ہوجائے، میں کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا بیگ صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”تسلی کرنا آپ کا حق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ وحید خان سے ملنے کے بعد مطمئن ہوجائیں گے۔ یہ فرضِ محال، اگر کسی مرحلے پر آپ کو محسوس ہو کہ وحید خان ملزم نہیں، مجرم ہے تو آپ اسی وقت یہ کیس چھوڑ سکتے ہیں۔“

”ملک صاحب! یہ کی نا آپ نے اصول کی بات۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیگ صاحب! میری ایک درخواست ہے۔“

”جی بولیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری خواہش ہے کہ آج رات جب آپ وحید خان سے ملاقات کرنے تھانے جائیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”اوکے...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ آج ساڑھے آٹھ بجے تک میرے آفس آجائیں۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگیا۔

یہ میرا معمول ہے کہ عدالتی بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد میں سٹی کورٹ کے ایریا ہی میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کرتا ہوں۔ اس کے بعد دفتر چلا جاتا ہوں جہاں آخری کلائنٹ کی موجودگی تک بیٹھنا ہوتا ہے۔ میرا آفس سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں ہے۔ مذکورہ عمارت میں وکلا ہی کے آفس ہیں یا پھر اکا دکا مالیاتی اداروں کے دفاتر بھی ہیں۔ ان اداروں کا لاء ایسوسی ایٹس کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ نزدیکی بھی اسی سبب ہے۔

☆☆☆

ملک نعیم اپنی بائیک پر سوار ہو کر آیا تھا اور میں اپنی گاڑی میں تھا۔ لگ بھگ ساڑھے نو بجے ہم متعلقہ تھانے پہنچ گئے۔ میں نے اپنی گاڑی تھانے کی دیوار کے ساتھ پارک

لی اور تھانے کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ملک نعیم میری تقلید میں ساتھ چل رہا تھا۔

اتفاق سے اس وقت انچارج تھانے میں وجود تھا۔ وہ مجھے اور میں اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور بولا۔ اس کے لہجے میں تیکھاپن تھا۔

''بیگ صاحب! آج ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟''

''بس جناب! آپ کی یاد نے ستایا تو میں چلا آیا۔''

اس نے طنز کیا تھا، میں بھی جواب دینے میں چوکا نہیں۔ ''کافی دنوں سے آپ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔''

وہ شک آمیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''رہنے دیں بیگ صاحب۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ صرف مجھ سے ملنے کے لیے تھانے چلے آئے ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب! اگر آپ کو میری محبت کا یقین نہیں ہے تو پھر آپ کا جو جی چاہے، سمجھ لیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے ایک بے گناہ شخص کو اپنے تھانے میں بند کر رکھا ہے!''

وہ ایک دم بے حد محتاط ہوگیا پھر سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''آپ کس شخص کی بات کر رہے ہیں؟''

''وحید خان کی......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''خان بک سیلرز کے مالک وحید خان۔''

''اوہ......!'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''جناب! آپ جس شخص کو بے گناہ قرار دے رہے ہیں وہ مجرمانہ حملے اور قتل کی واردات کا مجرم ہے۔''

''مجرم؟'' میں نے سوالیہ نظر سے انچارج کی طرف دیکھا۔

''بالکل!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''کل دوپہر لگ بھگ ڈھائی بجے یعقوب علی نامی ایک شخص نے تھانے فون کر کے اطلاع دی کہ شادمان ٹاؤن کے بنگلا نمبر چونتیس میں سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آرہی ہیں جیسے کسی عورت پر تشدد کیا جارہا ہو۔ میں نے فوراً ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبلوں کو صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے دقوعہ کی جانب روانہ کردیا۔ کم وبیش تین بجے سب انسپکٹر نے تھانے فون کر کے مجھے بتایا کہ بنگلے کے اندر ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ میں نے چند لوگوں کو ساتھ لیا اور سوا تین بجے مذکورہ بنگلے پر پہنچ گیا اور پھر ٹھیک پانچ بجے ہم نے قاتل کو گرفتار کرلیا۔''

''یعنی...... آپ نے وحید خان کو گرفتار کرلیا؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''یس!'' وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

''زبردست۔'' میں نے چوٹ کی۔ ''تو آپ نے ملزم کو گرفتار کرتے ہی، بغیر کورٹ کچہری کے جھمیلے میں پڑے مجرم ثابت کردیا بلکہ...... اسے قاتل قرار دے دیا...... سبحان اللہ!''

''بیگ صاحب! یہ عدالت کا کمرا نہیں، میرا تھانہ ہے لہٰذا آپ میرے الفاظ کو پکڑنے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ ''قانون کی زبان میں آپ اسے ملزم یا مبینہ قاتل کہہ سکتے ہیں۔''

''اوکے......'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''مقتولہ کے بارے میں بھی آپ نے کافی تفتیش کرلی ہوگی؟''

''یقیناً...... یہ تو ہمارے فرائض میں شامل ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مقتولہ کی شناخت ہوچکی ہے۔ وہ لڑکی ملزم کی ملازمہ تھی اور اس کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ ملزم اپنی سیکریٹری یعنی مقتولہ کے ساتھ محبت کا کوئی ڈراما بھی پلے کر رہا تھا اور اکثر و بیشتر وہ مقتولہ کے گھر بھی جاتا تھا۔''

''کیا آپ نے آلۂ قتل برآمد کرلیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ باقی انکشافات تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہوں گے البتہ یہ بتادوں کہ......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، باقی کے سوال میں اپنے مؤکل سے کرلوں گا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا اب آپ ملزم سے ملاقات کریں گے؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''انچارج صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے وکیل سے ملنا ملزم کا حق ہے۔ آپ مجھے اس کام سے روک نہیں سکتے۔''

اس نے چند لمحے سوچا اور پھر بادل ناخواستہ بولا۔ ''ٹھیک ہے بیگ صاحب لیکن آپ اکیلے حوالات کی طرف جائیں گے۔''

''اوکے!'' میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔

میں نے ملک نعیم کو برآمدے میں بٹھایا اور ایک کانسٹیبل کے ہمراہ وحید خان سے ملنے حوالات میں پہنچ گیا۔

وہ حوالات کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر اکڑوں بیٹھا

ہوا تھا۔ کانسٹیبل نے اسے بتایا کہ اس کا وکیل ملنے آیا ہے۔ وحید خان نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں نے معنی خیز انداز میں کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور بتیسی نکالتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ کو پتا ہے، کتنی مہنگائی ہوگئی ہے۔ سوکھی تنخواہ میں بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ممکن نہیں رہا۔''

میں نے تھوڑی دیر پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ دیا تھا کہ میں وحید خان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں لہٰذا وہ چلتا پھرتا دکھائی دے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا اور جواباً مہنگائی کا رونا رو کر اس نے بھی مجھے ایک اشارہ دے دیا تھا چنانچہ اس کے اشارے کو سمجھنا مجھ پر لازم تھا۔

میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا بٹوا نکال کر کھولا پھر اس کے اندر سے پچاس روپے کا ایک کرارا نوٹ نکال کر کانسٹیبل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ میری طرف سے مہنگائی الاؤنس سمجھ کر رکھ لو۔ آج تم اپنے بیوی بچوں کے لیے چکن، تازہ پھل اور مٹھائی لے کر جانا۔''

وہ خوش ہوگیا۔ پچاس روپے کے کڑک نوٹ کو میرے ہاتھ سے لے کر اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونسا اور ہاتھ پیشانی پر رکھ کر مجھے سلام کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ لوگ آرام سے بات کریں۔ میں اس طرف کسی کو نہیں آنے دوں گا۔''

قائداعظم محمد علی جناح کی ان تھک محنت اور جہد مسلسل کے نتیجے میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو سب کو اس دھان پان شخص کی طاقت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ آج قائداعظم ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی طاقت کا مظاہرہ قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے...... ان کی فوٹو کے طفیل جو...... کرنسی نوٹوں پر چھپی ہوتی ہے اور...... چٹکی بجاتے ہی ہر بند تالے کو کھول دیتی ہے......!

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں وحید خان کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ کافی خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس کے قریب قریب لگایا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک متناسب البدن شخص تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے کہا۔

''وکیل صاحب! کیا آپ کو ملک نعیم نے یہاں بھیجا ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ ملک صاحب باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ ہم پہلے ضروری باتیں کرلیں۔ اس کے بعد میں کوشش کروں گا کہ ملک نعیم سے بھی آپ کی مختصر بات ہوجائے۔''

اس کی آنکھیں بھر آئیں، گلوگیر آواز میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ یقین کریں، میں نے سعدیہ کو قتل نہیں کیا۔ میں تو اس قسم کی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے یہ شگفتہ کی کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔''

سعدیہ اس کی مقتولہ سیکریٹری کا نام تھا جبکہ شگفتہ اس کی بیوی تھی۔ میں نے اس کی بات کی تائید میں سر کو اثباتی جنبش دی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ یہ مجرمانہ حملے اور قتل کی واردات ہے؟''

''مجرمانہ حملہ......'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب! یہ کیسے ممکن ہے۔ سعدیہ سے اگلے مہینے میری شادی ہونے والی تھی۔ میں اس کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کیسے کرسکتا ہوں؟''

''اوہ......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ بات اور کس کس کو پتا تھی کہ آپ سعدیہ سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''بہت سے لوگوں کو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جن میں میری بیوی شگفتہ بھی شامل ہے۔''

''تو کیا آپ کی بیوی نے اس موضوع پر آپ سے جھگڑا وغیرہ نہیں کیا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''کوئی ایسا ویسا جھگڑا جناب!'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''شگفتہ کے ساتھ شادی میری زندگی کی ایک بھیانک غلطی تھی۔ میں لالچ میں آگیا تھا۔ اس اتنی من کی دھوبن سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے بزنس کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ رقم کی فوری ضرورت تھی اور شگفتہ کی ماں کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میری قسمت خراب کہ میں ان ماں بیٹی کے چنگل میں پھنس گیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں ایک غلط فیصلے کے نتیجے میں مصیبت میں مبتلا ہوچکا ہوں۔ میری شادی کو لگ بھگ بارہ سال ہوگئے ہیں اور میرا ایک دس سال کا بیٹا بھی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ بارہ سال کے بعد تو گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ لگتا ہے، میں گھورے (کوڑے، کچرے) سے بھی گیا گزرا ہوں......''

''ایسی بات نہیں ہے وحید خان۔'' میں نے تسلی آمیز

لہجے میں کہا۔ ''اپنی قسمت کو دوش نہ دیں۔ آپ بہت اچھے ہیں اور عنقریب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''جب آپ کی بیوی شگفتہ کو پتا چلا کہ آپ اپنی سیکریٹری سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو اس نے کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا؟''

میں وحید خان کو باتوں میں لگا کر اس کے دل کا غبار دھونا چاہتا تھا اور اس دوران میں سامنے آنے والے اہم نکات کو میں اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں شگفتہ کے ساتھ مزید زندگی نہیں گزار سکتا تو میں نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ سعدیہ میری سیکریٹری تھی اور مارکیٹنگ کا شعبہ بھی دیکھتی تھی۔ اس کا مزاج اور عادتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ہمارے بیچ پسندیدگی کا رشتہ قائم ہو گیا اور پھر یہ پسندیدگی محبت میں بدل گئی۔ نتیجتاً ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں سعدیہ کے والدین کی مرضی بھی شامل تھی۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں ہماری شادی ہونے والی تھی۔ آپ خود سوچیں، چند روز بعد جس لڑکی سے میری شادی ہونے والی تھی، میں اس پر مجرمانہ حملہ کیوں کروں گا اور پھر اس کا قتل...... ناممکن ہے۔'' اس نے ایک جھرجھری لی پھر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو اس ڈرامے کے پیچھے شگفتہ ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے کیونکہ جب اسے میرے ارادے کا پتا چلا تھا تو اس نے خوب ہنگامہ برپا کیا تھا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے تو شگفتہ نے میرے آفس میں آ کر سعدیہ کو بہت برا بھلا کہا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ اس ہنگامہ آرائی کے بعد وہ روٹھ کر میکے چلی گئی اور دس سالہ کامران کو بھی ساتھ لے گئی۔ پھر میری ساس مہر النسا نے مختلف طریقوں سے مجھے جھکانے کی کوشش کی لیکن میں بھی ڈٹ گیا۔ بالآخر ایک روز شگفتہ خود ہی گھر واپس آ گئی، ہم دونوں ایک ہی گھر میں زندگی بسر کرنے لگے تاہم ہمارے بیچ بول چال کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اسی دوران میں ایک وکیل صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے قانون کی روشنی میں چند مشورے دیے۔ اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو یہ قصہ بھی میں آپ کے علم میں لاتا ہوں تاکہ میرا کیس سمجھنے میں آپ کو آسانی رہے؟''

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''وحید صاحب! میں یہاں پر آپ کی کہانی سننے ہی آیا ہوں لہٰذا آپ بے فکر ہو کر بولتے چلے جائیں اور کوشش کریں کہ آپ کا فوکس اہم پوائنٹس پر رہے۔''

''جی ضرور، میں کوشش کروں گا۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ان وکیل صاحب نے مجھے کیا مشورہ دیا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولا۔

''وکیل صاحب نے مجھے بتایا کہ از روئے قانون پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، شگفتہ کبھی مجھے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی، ناممکن...... کیا اس کے بغیر میرا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا...... یعنی میں شگفتہ کی اجازت کے بغیر اگر سعدیہ سے شادی کر لوں تو اس میں کیا قباحت ہے؟''

''قباحت کا میں ذکر کر چکا ہوں۔'' وکیل صاحب نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 494 کے مطابق، اگر کوئی شوہر اپنی پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر اس کی زندگی میں دوسری شادی رچائے گا تو اسے کسی ایک قسم (قید محض یا قید بامشقت) کی سزائے قید اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو ہفت سال ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی سبب ہوگا۔''

''اوہ......!'' میں نے پریشان نظر سے وکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اور قانون نے اس کے لیے پہلی بیوی کی اجازت کی شرط لگا دی ہے اور میں جانتا ہوں، شگفتہ بھی مجھے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ میں شگفتہ کو طلاق دے کر سعدیہ سے شادی کر لوں لیکن میں اپنے بیٹے کی خاطر ایسا نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں نے ساری صورت حال آپ کو بتا دی ہے۔'' وکیل صاحب نے کہا۔ ''اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے......!''

چند روز کے بعد میں دوبارہ ان وکیل صاحب سے ملا کیونکہ میں شگفتہ کو طلاق دینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور پوچھا۔

''وکیل صاحب! اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟''

''طریقۂ کار بہت سادہ ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”میں طلاق کے کاغذات یعنی ”طلاق نامہ“ تیار کردوں گا۔ آپ اپنی بیوی کے مہر کا چیک بنائیں گے جو اس طلاق نامے کے ساتھ منسلک کردیا جائے گا پھر یہ تمام کاغذات بہ ذریعہ رجسٹرڈ ڈاک شگفتہ کو بھیج دیے جائیں گے۔ ان کاغذات کی ایک نقل یونین کونسل کو بھی بھیجی جائے گی۔ آپ کی بیوی آپ کے اس فیصلے کو چیلنج نہیں کرسکتی البتہ وہ یونین کونسل کے چیئرمین کو بیچ میں ڈال کر مصالحت کی کوشش کرسکتی ہے۔ اگر نوّے دن کے اندر مصالحت نہ ہوسکے تو پھر یہ طلاق مؤثر ہوجائے گی۔“

”اوکے......“ میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ طلاق کے کاغذات تیار کردیں۔ میں شگفتہ کے مہر کا چیک آپ کو کل دے دوں گا۔“

یہاں تک پہنچنے کے بعد وحید خان رکا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا ان وکیل صاحب نے آپ کی بیگم کے نام وہ کاغذات پوسٹ کردیے تھے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا...... یہ بھی بتائیں کہ یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”جناب! ان وکیل صاحب نے بارہ مئی کو وہ کاغذات شگفتہ کے نام رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کیے تھے جو یقیناً پندرہ مئی تک شگفتہ کو موصول ہوگئے ہوں گے۔“ وحید خان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میری معلومات کے مطابق، شگفتہ نے وہ رجسٹری وصول نہیں کی تھی۔ اس کے دو ہفتے بعد یونین کونسل کی جانب سے فریقین یعنی میرے اور شگفتہ کے نام سمن جاری کردیا گیا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی یونین کونسل نہیں جاسکا۔ میں اتنی پریشانی میں تھا کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شگفتہ سے بات چیت کا سلسلہ بھی کافی دنوں سے موقوف تھا اور پھر میرے وکیل صاحب کسی ضروری کام سے پاکستان سے باہر چلے گئے تو یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ ان وکیل صاحب کی واپسی دو سال کے بعد ہوگی۔ ابھی میں اس سلسلے میں کسی اور وکیل سے مشورہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ نئی مصیبت کھڑی ہوگئی اور اب میں حوالات میں بیٹھا ہوں......“

”اگر ہم فرض کریں کہ پندرہ مئی کو وہ رجسٹرڈ ڈاک شگفتہ کے پاس پہنچی تھی تو اس حساب سے آپ کی گرفتاری تک نوّے دن کی مدت گزر چکی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”شگفتہ نے وہ رجسٹری وصول کی یا نہیں کی اس سے اس لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یونین کونسل اس معاملے میں انوالو ہوچکی تھی جبھی آپ کی عدم توجہی کے باعث یونین کونسل کی جانب سے آپ لوگوں کے نام سمن جاری کیے گئے تھے لہٰذا ازروئے قانون تو یہ طلاق مؤثر ہوجاتی ہے خیر......“ میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وحید خان! پولیس نے آپ کو کتنے بجے گرفتار کیا تھا؟“

”کل سہ پہر میں لگ بھگ پانچ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یعنی بیس اگست کی شام سمجھ لیں اور آج اکیس اگست ہے۔“

”اور آپ کی گرفتاری کہاں عمل میں آئی تھی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میرے بنگلے پر سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کل شام میں جب میں گھر پہنچا تو اپنے گھر کے باہر چند لوگوں کو جمع دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شگفتہ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ننھے کامران کا چہرہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ میں جھٹ سے آگے بڑھا تو گیٹ پر موجود ایک سپاہی نے مجھے روک لیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس بنگلے کا مالک ہوں تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ وہاں تھانہ انچارج اور دیگر پولیس والے موجود تھے۔ ان لوگوں نے میری بات سنے بغیر مجھے ہتھکڑی پہنادی۔“

”کیا آپ روزانہ پانچ بجے ہی اپنے گھر واپس آیا کرتے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں......“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”میں عموماً رات کو آٹھ بجے کے بعد ہی گھر پہنچتا ہوں۔“

”پھر...... وقوعے کے روز جلدی گھر آنے کی کوئی خاص وجہ؟“

”اصل میں کل ایک کاروباری پارٹی سے لنچ پر میری میٹنگ تھی۔“ وحید خان نے بتایا۔ ”جب میں میٹنگ سے فارغ ہوا تو چار بج رہے تھے پھر میرا آفس کی جانب جانے کا موڈ نہیں ہوا۔ میرا سر کافی بھاری ہورہا تھا اور میں تھکن بھی محسوس کررہا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ گھر جاکر آرام کرتا ہوں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ گھر پر موت کے فرشتے میرا انتظار کررہے ہوں گے۔“

”کیا آپ نے اس پارٹی سے اپنے آفس سے باہر کہیں میٹنگ کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کی بات سے مجھے ایسا ہی تاثر ابھر رہا ہے......!“

تھانہ انچارج تھوڑی دیر پہلے مجھے بتاچکا تھا کہ کم و بیش ڈھائی بجے یعقوب علی نامی کسی شخص نے تھانے فون کرکے اطلاع دی تھی کہ شادمان ٹاؤن کے بنگلا نمبر چوتیس کے اندر

سے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس اطلاع پر جب پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو انہیں اس بنگلے کے ایک بیڈروم میں ایک لڑکی کی تشدد زدہ لاش ملی تھی جسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بعدازاں مقتولہ کی شناخت ملزم کی سیکریٹری سعدیہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس تناظر میں یہی نظر آتا تھا کہ سعدیہ کی موت ڈھائی اور تین بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ میں وحید خان سے یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ وقوعہ کے روز یعنی بیس اگست کی دوپہر وہ دو اور تین بجے کے درمیان کہاں تھا اور کیا کررہا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جی وکیل صاحب! یہ میٹنگ ایک مقامی ہوٹل میں ہوئی تھی۔''

اس نے مذکورہ لگژری ہوٹل کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں یہاں پر اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔

''آپ اس ریسٹورنٹ جانے کے لیے کتنے بجے آفس سے نکلے تھے؟''

''ایک تیس پر۔'' میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

''اور ریسٹورنٹ کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''یہی کوئی پندرہ بیس منٹ میں۔''

''مطلب ٹھیک دو بجے آپ مذکورہ ریسٹورنٹ میں موجود تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اپنی کاروباری پارٹی کے ساتھ!''

''جی بالکل!'' اس نے پُر وثوق انداز میں کہا۔

''پھر آپ جب لنچ اور میٹنگ سے فارغ ہوئے تو سہ پہر کے چار بج رہے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ ریسٹورنٹ سے نکل کر آفس نہیں گئے بلکہ.... اپنے گھر چلے گئے تھے؟''

''جی ..... ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں وحید صاحب!'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ دوپہر دو بجے سے سہ پہر چار بجے کے درمیان ایک لمحے کے لیے بھی اس ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تھے؟''

''نہیں!'' اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا وقوعہ کے روز آپ کی سیکریٹری سعدیہ آفس آئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی آئی تھی لیکن وہ ایک بجے چھٹی کرکے گھر چلی گئی تھی۔''

''وقت سے پہلے چھٹی کا کوئی خاص سبب؟''

''اس کی والدہ ایک مفلوج خاتون ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''شاید وہ اپنی والدہ کے سلسلے میں چھٹی لے کر گئی تھی۔''

''کیا آپ کی سیکریٹری یعنی مقتولہ سعدیہ کو آپ کے آؤٹ ڈور لنچ اور کسی پارٹی سے کاروباری میٹنگ کا علم تھا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی بالکل!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اسی لیے میں نے اسے چھٹی بھی دے دی تھی کہ مجھے آفس میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میری سیکریٹری تھی۔ میرے دن بھر کے اسکیجوئیل کا اسے علم ہونا کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں۔''

''بالکل اچنبھے کی بات نہیں وحید صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کے دفتر میں کل کتنے افراد کام کرتے ہیں؟''

''میں ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے علاوہ خالد مقبول (منیجر + کیشیر) ہے۔ سعدیہ تھی، مصطفیٰ علی مارکیٹنگ اور اشتہارات کے معاملات دیکھتا ہے۔ جاوید احمد اور حبیب اللہ نامی دو افراد سیلز میں ہیں جن کی ڈیوٹی صرف کتابوں تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ چپراسی حمید ہے جو آؤٹ ڈور کے کام بھی کرتا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس گفتگو کے دوران میں وحید کا اعتماد خاصی حد تک بحال ہوگیا تھا۔ اب وہ پہلے جیسا ڈرا سہما اور گھبرایا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔

''آپ کے اسٹاف میں جو لوگ شامل ہیں، کیا آپ ان سب پر بھروسا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سوائے منیجر کے میرے خیال میں باقی سب قابلِ بھروسا ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''منیجر یعنی خالد مقبول؟''

''جی، میں اسی کی بات کررہا ہوں۔''

''جب آپ خالد مقبول کو قابلِ بھروسا نہیں سمجھتے تو پھر آپ نے اسے اتنا اہم شعبہ کیوں سونپ رکھا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''فنینجگ اور کیش ہینڈلنگ بہت حساس کام ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ خالد مقبول، شگفتہ کا کزن ہے اور اسے میں نے مہرالنساء یعنی اپنی ساس کی سفارش پر اپنے پاس ملازم رکھا تھا پھر جب مجھے پتا چلا کہ خالد مجھ سے زیادہ شگفتہ کا وفادار ہے تو میں نے اسے ملازمت سے برخاست کردیا۔ اس پر وہ میرے قدموں

ہلا ہے۔...... "بہ ظاہر" منظر امام صاحب فنی مذاق والی تحاریر سے دستبردار ہوگئے ہیں۔ وہ اب مسلسل دردناک کہانیاں لکھنے لگے ہیں۔ بہ ظاہر کا اختتام بھی دردناک تھا۔ "سراب" علی اختر نے دوسری بار ایک اچھی کہانی ہمیں پڑھنے کو دی لیکن کرداروں کے نام عجیب ہیں، حلق سے نہیں اتر رہے ہیں...... "باعثِ زحمت" کافی مزیدار کہانی تھی۔ اختتام پر ڈاکو کا خط پڑھ کر پولیس افسر نے اپنے بال نوچ لیے ہوں گے۔ اس کہانی کے مصنف کا نام بھی عجیب ہے، موصوف کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا دین دھرم کیا ہے نام سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ "فنکار" بھی پُرلطف کہانی تھی۔ "ٹوٹے ہوئے لوگ" شیر شاہ صاحب ایک بار پھر منفرد عنوان کے ساتھ تشریف لائے ہیں، کہانی پُراثر تھی۔ "جواز" کہانی بہت ہی شاندار تھی۔ اشعار کی محفل میں ریاض بٹ اور قدرت اللہ نیازی کے قطعات اچھے لگے۔ ماریہ چودھری کا شعر بھی دل کو بھایا۔"

٭ محمد شہباز ناز، گجر کالونی ضلع سرگودھا سے حاضرِ محفل ہیں۔ "بڑے انتظار کے بعد 22 مارچ کو سسپنس سے ملنے کا موقع ملا۔ اتنی محبت کے ساتھ ٹائم نکال کر لکھتے ہیں جب سسپنس ملتا ہے تو اس میں صرف خط ہوتا ہے۔ شعر اور لطیفہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہمارا دل بہت دکھتا ہے۔ (دل دکھانے سے بہتر ہے کہ اچھے اور معیاری اشعار اساتذہ کے بھیجیں۔ یہ تک بندی نہ بھیجیں) سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا جس میں جون ایلیا نے دانش مندانہ باتیں کیں۔ اس کے بعد حسام بٹ کی کہانی "وقت" پڑھی۔ نقارا بے چارہ غنڈوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد اپنی پسندیدہ کہانی "شیش محل" پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی "ٹوٹے ہوئے لوگ" پڑھی۔ بہت ہی دکھی کہانی تھی۔ اس کے بعد ملک صفدر حیات کی کہانی "صلح جو" پڑھی۔ صفدر صاحب اس بار ایک انوکھی کہانی لے کر آئے۔ منظر امام صاحب کی کہانی "بہ ظاہر" پڑھی۔ بہت ہی دل ہلا دینے والی تحریر تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی کا فرغنت پڑھی بہت ہی دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور تھی۔ میرے خیال کے مطابق سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن کا فرغنت بہت ہی اچھی لگی۔ معروفیت کی وجہ سے اتنا ہی، باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ بابر عباس صاحب سے میں اتنا کہوں گا کہ میں بوڑھا نہیں ہوں، ماشاءاللہ سے جوان اور ہینڈسم ہوں۔ آپ نے بوڑھا کہہ کر زیادتی کی۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔"

٭ مہتاب احمد کا تبصرہ حیدرآباد سے۔ "سسپنس ڈائجسٹ کا انتظار بڑی شدت سے رہتا ہے اور ہم اسی لیے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتے ہیں تاکہ کم سے کم انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ گو کہ حسینہ نے پورا خط اپنے وجود تلے چھپا رکھا تھا تاہم آخر کے دو الفاظ "آپ کا"...... پڑھ ہی ڈالے مگر پھر بھی یہ کھوج لگانے میں ناکام رہے کہ یہ خط کس کی جانب سے بھیجا گیا ہے۔ خیر اپنے ذہن کو مزید بوجھل کرنے سے بہتر تھا کہ ہم اس کھوج کو یہیں پر روک دیں اس لیے دوستوں کی محفل میں جا پہنچے جہاں سب اپنے اپنے تاثرات بیان کر رہے تھے۔ اس دفعہ طاہرہ گلزار مسندِ صدارت پر براجمان تھیں، مبارکباد۔ کہانیوں میں پہلے شیش محل سے آغاز کیا۔ ہمارے فیورٹ ربن داود دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے اور گولو بھی رخصت ہوگیا۔ اسماء جی آپ نے یہ اچھا نہیں کیا مگر ایک چیز آپ نے بہت اچھی کی کہ فاروق ایکشن میں آ گیا اور ایسا آیا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ خدا خیر کرے۔ کہیں فاروق بھی...... نہیں نہیں، ابھی تو اس کے سہرے کے پھول بھی کھلنے ہیں۔ کہانی کافی اچھی جا رہی ہے۔ صلح جو میں ملک صفدر حیات صاحب نے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے تاریخ سے روشناس کرایا۔ انتہائی سبق آموز تحریر رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے ایمان تازہ کر دیا۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کے واقعات اور حالاتِ زندگی پڑھ کر راہنمائی ملتی ہے۔ حسام بٹ صاحب کا نیا سلسلہ وقت...... وقت نکال کر پڑھا۔ کہانی میں ابھی فی الحال تیزی نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ آگے چل کر کافی ایکشن آنے والا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں نمبرون دو کہانیاں رہیں۔ ایک تو ڈاکٹر شیر شاہ صاحب کی کہانی تھی جبکہ دوسری کہانی منظر امام صاحب کی تھی۔ دونوں ہی کمال لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی سحر انگیزی میں کھو جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر تو آنکھوں میں نمی اتر آتی ہے۔ دونوں حضرات سے گزارش ہے کہ اس طرح کی تحریر لکھتے وقت ہاتھ تھوڑا ہلکا رکھا کریں...... کیونکہ ہم ٹھہرے حساس طبیعت، دل اداس ہو جاتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے یہی سچ اور حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہزار ہا واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ بس اس کے لیے دل کا حساس ہونا ضروری ہے۔ معما تو پر ریاض کی بس ٹھیک تھی۔ جواز نعمان اسحاق کی بہترین کہانی تھی۔ دوستی کی اعلیٰ مثال تھی۔ ایک دوست نے دوسرے کو موت کے منہ میں پہنچا دیا مگر اس نے اسے معاف کر دیا۔ بہت زبردست۔ باقی کی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں کیونکہ ہم تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھ رہے ہیں۔ امید کرتا ہوں میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔ اتنا اچھا پرچہ شائع کرنے پر اسٹاف سسپنس کو مبارکباد۔ اللہ آپ کے ادارے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

محمد ذریان سلطان، اردو بازار کراچی۔ روزینہ صادق، لاہور۔ عرشیہ غزل، ملتان۔ محمد آذرین رضوان، کورنگی کراچی۔ راحیل الیاس، دادو۔ آصف محمود، گوجرانوالہ کینٹ۔ انعم کمال، حیدرآباد۔ صابحہ، کراچی۔

میں گر گیا اور آنسو بہاتے ہوئے اس نے مجھ سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ صرف اور صرف میرا وفادار رہے گا اور یہ کہ آئندہ وہ شگفتہ یا اس کی ماں مہرالنسا سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے اسے نوکری پر بحال کر دیا۔''

''جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس سے پہلے شگفتہ کا آپ کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ہمارے بیچ بات چیت بالکل بند تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں کے بیڈ روم اور کھانا پینا سب کچھ الگ الگ ہو چکا تھا۔ وہ جب واپس آئی تھی تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ کامران کی پڑھائی کی وجہ سے مجبوراً لوٹ آئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔''

''اور حقیقت کیا تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے واپس آئی تھی۔'' اس نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ''وہ غصے میں کامران کو لے کر میکے تو چلی گئی تھی لیکن پھر اسے احساس ہوا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ یہ احساس اسے مہرالنسا نے دلایا ہو کہ اس طرح تو تمہارے شوہر کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی......''

''آپ کے گھر میں آپ تینوں کے علاوہ بھی کوئی شخص رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''کوئی ڈرائیور یا ملازم وغیرہ؟''

''ڈرائیونگ تو میں خود ہی کرتا ہوں۔ کبھی شگفتہ کو گاڑی لے کر جانا ہوتا ہے تو وہ بھی خود ہی ڈرائیو کرتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''البتہ گھریلو کام کرنے کے لیے شگفتہ نے ایک ماسی رکھی ہوئی ہے جس کا نام شکیلہ ہے۔ شکیلہ لگ بھگ گیارہ بجے کام پر آتی ہے۔ جھاڑو، پونچھا، برتن اور کپڑوں کی دھلائی وغیرہ کے بعد وہ ایک بجے کے قریب واپس چلی جاتی ہے۔''

''کیا وقوعہ کے روز شکیلہ کام پر آئی تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں صبح دس بجے آفس جانے کے لیے گھر سے نکل جاتا تھا اور شکیلہ میرے بعد آیا کرتی تھی لہٰذا میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کل کام پر آئی تھی یا نہیں۔''

''جیسا کہ آپ نے بتایا، مقتولہ سعدیہ کو آپ کی کسی پارٹی کے ساتھ میٹنگ کا علم تھا۔'' میں نے ایک خاص انداز میں سوال کیا۔ ''سعدیہ کے علاوہ اور کس کس کو آپ کے اس پروگرام کی خبر تھی؟''

''یہ بات خالد مقبول کے بھی علم میں تھی۔'' وحید خان نے بتایا ''لیکن خالد کل آفس نہیں آیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس نے فون کر کے آفس میں کسی کو بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا وہ آج چھٹی کرے گا۔''

''کل جب آپ گھر سے آفس کے لیے نکل رہے تھے تو کیا اس وقت آپ کی بیوی شگفتہ گھر پر ہی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور آپ کا بیٹا کامران......؟''

''وہ اسکول گیا ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن کم و بیش بارہ بجے کامران نے مجھے فون کر کے بتایا کہ آج اسکول سے جلدی چھٹی ہو گئی ہے لہٰذا وہ ممی کے ساتھ نانو کے گھر جا رہا ہے۔''

''اور آپ کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں کہ سعدیہ آپ کے بنگلے پر کیوں اور کیسے پہنچی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

میں نے تمام اہم پوائنٹس نوٹ کر لیے اور وحید خان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سمجھ لیں کہ میں نے آپ کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس والے مختلف انداز میں آپ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے اور ہو سکتا ہے کیس ہلکا کرنے کے سلسلے میں وہ آپ سے بھاری رقم کی ڈیمانڈ بھی کریں۔ آپ نے کسی کو ایک روپیہ بھی نہیں دینا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی، بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آپ نے جو بیان مجھے دیا، پولیس کو بھی بالکل یہی بیان دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ اپنے من پسند تحریر شدہ کسی بیان پر زبردستی آپ کے دستخط لینا چاہیں تو چپ چاپ ان کی بات مان لیں۔ جو بھی ہوگا، میں کورٹ میں سنبھال لوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''آپ کو پتا ہے، کورٹ کچہری کے معاملات میں پیسا پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔'' میں نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ تو پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔ آپ کے بعد مالی معاملات کی ڈیلنگ کون کرے گا؟''

کیا آپ کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار ہے؟"

"نہیں۔ میرا کوئی قریبی رشتے دار ایسا نہیں جس پر میں آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ "البتہ ملک نعیم پر مجھے اعتماد ہے۔ یہ بندہ میرے ساتھ مخلص ہے۔ آپ نعیم کو اپنے ساتھ اٹیچ رکھیں۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ ضرورت پڑنے پر وہ کہاں سے رقم حاصل کر سکتا ہے۔"

"او کے...... نعیم باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ میں ابھی آپ سے اس کی ملاقات کرواتا ہوں۔" میں نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے ایک ضروری کام ہو جائے۔"

وحید خان سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے بریف کیس کے اندر سے وکالت نامہ، درخواستِ ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات نکال کر ان پر وحید خان کے دستخط لے لیے پھر کانسٹیبل کی مدد سے ملک نعیم اور وحید خان کی مختصر سی ملاقات بھی کرا دی۔ اس کے بعد ہم تھانے سے باہر نکل آئے۔

ملک نعیم نے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے۔ وحید خان اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گا؟"

"آپ کے خیال میں وحید خان نے اپنی سیکریٹری معدیہ کو قتل کیا ہے؟" جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "وحید خان مجرمانہ حملے کا مرتکب ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کی جان لینے کا سوچ سکتا ہے۔"

"مطلب یہ کہ آپ اپنے دوست کو بے گناہ سمجھتے ہیں؟"

"جی، بالکل۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا آپ کو میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر بھروسا اور اس قادرِ مطلق پر کامل یقین رکھنا چاہیے۔ ان شاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ......!" وہ دل سے بولا۔

"لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ایک الجھا ہوا پیچیدہ کیس ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وحید خان کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے لہٰذا ہمیں مضبوط گواہوں کا بندوبست کرنا ہوگا اور یہ انتظام آپ کرو گے۔"

"میں......" اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ "مگر میں تو گواہوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"میں تو جانتا ہوں نا......" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں اس سلسلے میں پوری طرح آپ کی راہنمائی کروں گا۔ باقی کی بھاگ دوڑ آپ کو کرنا ہوگی۔"

"جی...... وہ میں کر لوں گا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اب وحید خان کے مالی معاملات بھی آپ کے ہاتھ میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لہٰذا تمام عدالتی مراحل میں پیسا آپ کے ہاتھ سے خرچ ہوگا اور...... اس سلسلے کا پہلا مرحلہ ہے، وکیل کی فیس!"

"جی بالکل بیگ صاحب! میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا۔" وہ گردن کو فرماں بردارانہ خم دیتے ہوئے بولا۔ "میں کل آپ کی فیس پہنچا دوں گا۔"

میں مزید پندرہ منٹ تک اسے مختلف ہدایات دیتا رہا۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے روٹ پر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ اسی روز میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی ضمانت کی درخواست بھی عدالت میں دائر کر دی اور اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک معزز فرد ہے جسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی ضمانت کو منظور کیا جائے۔"

"یور آنر! ملزم کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔" وکیل استغاثہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "یہ مجرمانہ حملے اور قتل کا ایک کیس ہے۔"

"جنابِ عالی! میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میرے مؤکل نے کسی پر مجرمانہ حملہ کیا اور نہ ہی وہ کسی کی جان لینے کا مرتکب ہوا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟" وکیل استغاثہ نے چمک کر پوچھا۔

جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ "بیگ صاحب! آپ کے پاس کس قسم کا ثبوت ہے؟"

"جنابِ عالی! صرف ایک نہیں بلکہ میرے پاس ایسے کئی ثبوت اور شواہد موجود ہیں جنہیں میں آگے چل کر

عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر پیش کروں گا۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''سرِدست ان چیزوں کا سامنے آنا انصاف کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔''

جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلا دی۔

میں نے وکیل استغاثہ کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ مجرمانہ حملے اور قتل ہی کا ایک کیس ہے؟''

''دریں چہ شک......!'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

''میری معلومات میں فارسی کے چند الفاظ کا اضافہ کرنے کی کوشش کا شکریہ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی بات کو چند لمحات کے لیے درست مان لیتا ہوں کہ یہ مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس ہے۔ چالان میں بتایا گیا ہے کہ مقتولہ کے جسم کے بعض حصوں پر تشدد کے نشانات بھی پائے گئے ہیں اور اسے باقاعدہ گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''ایبسولیوٹلی رائٹ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''میرے فاضل دوست! جب کسی عورت پر مجرمانہ حملہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنے دفاع میں ضرور ہاتھ پاؤں چلاتی ہے۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب مقتولہ کے جسم کے بعض حصوں پر تشدد کے نشانات پائے گئے ہیں تو یقیناً اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بھی ضرور کوشش کی ہوگی جس کے نتیجے میں ملزم کے بدن پر بھی خراش یا زخم کا کوئی نشان آنا چاہیے۔ کیا آپ نے میرا مطلب ہے، پولیس نے گرفتاری کے فوراً بعد ملزم کا طبی یا طبی معائنہ کرایا تھا؟''

''وہ کس لیے......؟'' وکیل استغاثہ بوکھلا گیا۔ ''طبی یا طبی معائنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ اس لیے کہ پتا چل سکے کہ مقتولہ نے اپنے تحفظ کے لیے جو کوششیں کی تھیں ان کے نتیجے میں ملزم کے بدن پر کہاں کہاں نشان ثبت ہوئے......!''

''آپ نے شاید پوسٹ مارٹم رپورٹ کو توجہ سے نہیں پڑھا۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''اسی لیے اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''میں نے پولیس کا پیش کردہ چالان اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کو بغور پڑھا ہے۔'' میں نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ مقتولہ کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد میں نشہ آور دوا کے اجزا پائے گئے ہیں۔ اسے چائے کے ذریعے نشہ آور دوا دی گئی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر تھی تو پھر وہ مزاحمت کیسے کر سکتی تھی؟''

''سبحان اللہ......!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! آپ نے تو میرا کام آسان کر دیا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''بہت ہی سادہ اور سمجھ میں آنے والی بات ہے میرے فاضل دوست۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب مقتولہ کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں تھی تو پھر پولیس کو اطلاع دینے والے یعقوب علی نامی شخص نے شادمان ٹاؤن کے بنگلا نمبر چونتیس کے اندر سے کسی عورت کی چیخوں کی آوازیں کیسے سن لی تھیں۔ کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر کوئی شخص چیخنے چلانے کا کیوں کر مظاہرہ کر سکتا ہے؟''

وہ کھسیانا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کی رپورٹ کے مطابق، معدیہ کو مجرمانہ حملے کے بعد قتل کیا گیا ہے۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتولہ کو چائے کے ذریعے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر مقتولہ کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر تھی تو پھر اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں کیسے پیدا ہوئیں اور وہ بھی اتنی بلند آہنگ چیخیں کہ جو ایک راہ گیر بھی سن لے؟ علاوہ ازیں...... نشہ آور دوا کے زیر اثر اگر کوئی عورت اپنی عزت کی حفاظت کے سلسلے میں مزاحمت کے قابل نہیں رہتی تو پھر اس کے ساتھ ایمپیسڈ ہو جانا چاہیے جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسی کسی کارروائی کی جانب اشارہ نہیں کیا گیا۔ پولیس نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کی روشنی میں فی الفور ملزم کا طبی معائنہ ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس میں پولیس کی کوئی مصلحت تھی یا یہ ان کی سنگین غلطی تھی مگر میں سمجھتا ہوں، یہ سراسر ان کی بدنیتی ہے۔''

وکیل استغاثہ نے ایک لنگڑی دلیل دیتے ہوئے کہا۔

''ملزم کی گرفتاری اس واردات کے ڈھائی تین گھنٹے بعد عمل میں آئی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد طبی معائنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔''

الغرض...... دونوں جانب سے اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیے گئے لیکن میں وحید خان کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ دراصل، یہ دُہرا کیس تھا۔ اول، مجرمانہ حملہ۔ دوم، قتل۔ مجرمانہ حملے کے سلسلے میں تو میں نے کافی انکشاف کردیے تھے۔ ابھی بہت سے اہم پوائنٹس میری مٹھی میں بند تھے۔ جہاں تک قتل کے مقدمے کی بات ہے تو قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے لہٰذا مجھے اپنی ناکامی... کا افسوس نہیں تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کچھ ذکر ہوجائے۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، مقتولہ سعدیہ کی موت بیس اگست کی سہ پہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کے جسم کے بعض حصوں پر تشدد کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ جس بیڈ پر سعدیہ کی لاش پڑی ملی تھی، اس بیڈ کی شیٹ پر خون کے چند دھبے بھی ملے تھے۔ رپورٹ کے مطابق، یہ دو مختلف افراد کے خون کے نشانات تھے۔

کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ بھی ساتھ ہی منسلک تھی جس کے مطابق، مقتولہ کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد کے تجزیے سے پتا چلا تھا کہ مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی اور یہ دوا چائے کے ذریعے مقتولہ کے معدے تک پہنچی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کے نام پیش کیے گئے تھے جن میں ''حسان بک سیلرز'' کے منیجر خالد مقبول اور ملزم کی بیوی شگفتہ کا نام سرفہرست تھا۔ ان کے علاوہ ایک اہم نام عبدالغفار کا تھا۔ میں نے ملک نعیم کے توسط سے جب اس شخص کے بارے میں تھوڑی چھان بین کی تو پتا چلا کہ وہ کچھ عرصہ مہر النسا کے بنگلے پر ڈرائیور رہ چکا تھا اُس وقت شگفتہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ملک صاحب کی رپورٹ کے مطابق، وہ ایک لفنگا اور اوباش شخص تھا جو اپنی گھٹیا حرکتوں کے باعث مختلف بنگلوں سے کئی بار نکالا جاچکا تھا۔ وہ صورت شکل کا اچھا تھا۔ اس کے بارے میں عمومی شکایت یہی تھی کہ وہ بیگمات کے ساتھ فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ سب سے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر شگفتہ سے ملتا رہتا تھا۔ ایک دو پیشیاں عدالت کی ابتدائی کارروائی کی نذر ہوگئیں۔

☆☆☆

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز لگ بھگ دو ماہ کے بعد ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا اور استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ قبل اس کے کہ پہلا گواہ کٹہرے تک رسائی حاصل کرتا، میں نے کہا۔

''جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت دی جائے۔''

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر یعنی آئی او کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کیس کا تفتیشی افسر سب انسپکٹر خادم حسین تھا۔

جج کی اجازت پا کر آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ میں کٹہرے کے قریب چلا آیا اور خادم حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''آئی او صاحب! کیا آپ کو اپنے نام کے معنی معلوم ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہیں کررہا تھا اس لیے تھوڑا سا الجھ گیا تاہم اس نے فوراً ہی اپنی الجھن پر قابو پالیا اور قدرے مضبوط لہجے میں بولا۔

''جی بالکل معلوم ہیں۔ خادم حسین کا مطلب ہے حسینؓ کا خدمت گار۔''

''حسینؓ تاریخ اسلام کی ایک لازوال اور بے مثال ہستی تھے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جنہوں نے حق کی راہ میں جان دے دی لیکن باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ پوری انسانیت پر یہ ان کا احسان ہے۔''

''جی، یہ بات تو ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ خادم حسین ہیں۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ بھی انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے کچھ سوچتے ہیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''جس حد تک ممکن ہو، کوشش ضرور کرتا ہوں۔''

''ملزم وحید خان کو آپ نے جو مجرمانہ حملے اور قتل کے کیس میں یہاں تک پہنچایا ہے، یہ بھی آپ کی کسی ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہے نا......؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں

استفسار کیا۔

"جی ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"پھر کیسی بات ہے؟"

"ملزم نے اپنی سیکریٹری پر پہلے مجرمانہ حملہ کیا پھر اس کوشش میں ناکام... ہونے کے بعد بدنامی کے خوف سے اس نے مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔" آئی او نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"بہت شکریہ آئی او صاحب۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ کہہ کر کہ ملزم مجرمانہ حملے میں ناکام... رہا تھا۔ آپ نے میرا اور معزز عدالت کا بہت سا قیمتی وقت بچالیا ہے ورنہ مجھے ملزم کے طبی معائنے کے سلسلے میں آپ سے ڈھیروں سوالات کرنا پڑتے اور آپ کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا، نتیجتاً آپ کو بھری عدالت میں خفت اٹھانا پڑتی۔"

میرے تبصرے پر وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے وکیل استغاثہ کو مجرمانہ حملے کے حوالے سے خوب رگڑا لگایا تھا۔ شاید اسی لیے آئی او نے اس سلسلے میں محتاط رویہ اپنایا تھا۔

"آئی او صاحب!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور پولیس رپورٹ کے مطابق، گلا گھونٹنے والا یہ کام میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم وحید خان نے کیا تھا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا آئی او صاحب؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ نے حقیقت بیان کی ہے۔"

"کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ بتاتی ہے کہ گلا گھونٹنے سے پہلے مقتولہ کو چائے کے ذریعے کوئی نشہ آور دوا بھی دی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "مقتولہ کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد میں نشہ آور ادویہ کے آثار پائے گئے ہیں۔"

"جی ایسا ہی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "پہلے ملزم نے چائے میں کوئی نشہ آور دوا ملا کر مقتولہ کو دی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ مقتولہ کو قابو کرنے میں آسانی رہے۔ وہ ملزم کے "ارادے" کی تکمیل کے راستے میں کوئی "رکاوٹ" کھڑی نہ کر سکے اور ملزم اپنے "مشن" میں سرخ رو ہو جائے لیکن جب اس نشہ آور دوا نے خاطر خواہ اثر نہیں کیا اور ملزم کے "عمل" کے جواب میں مقتولہ نے چیخ چلا کر اپنا "ردعمل" ظاہر کیا تو ملزم کو اپنی ناکامی یقینی دکھائی دینے لگی تو اس نے "نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری" کے مصداق مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا۔"

آئی او بہت سوچ سمجھ کر بول رہا تھا کہ میں اسے کسی جال میں نہ پھنسا سکوں لیکن میں نے تو اس کے لیے ہم رنگِ زمین جال تیار کر رکھا تھا جو اس کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔

"آئی او صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ اس بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟"

"صد فیصد!" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔

"آپ کے خیال میں ملزم نے کس چیز کی مدد سے مقتولہ کا گلا گھونٹا ہوگا۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "زنبور سے، پھندے سے، شکنجے سے یا......؟"

"جناب! ملزم نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے مقتولہ کا گلا گھونٹا تھا۔" وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ایسی کوئی رپورٹ تو منسلک دکھائی نہیں دیتی......"

"کیسی رپورٹ؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے سادگی سے کہا۔ "گلا گھونٹنے کی رپورٹ۔"

"کیا ایسی بھی کوئی رپورٹ ہوتی ہے؟" اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

"ہاں ہوتی ہے۔" میں نے بڑی معصومیت سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "اور اسے کہتے ہیں فنگر پرنٹس رپورٹ۔"...... لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے سوالات میں تندی بھرتے ہوئے پوچھا۔

"آئی او صاحب! کیا آپ نے مقتولہ کے گلے یعنی گردن پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟"

"نن...... نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"جب پانچ بجے ملزم اپنے گھر پہنچا اور آپ لوگوں نے اسے گرفتار کر لیا تو کیا اس وقت ملزم کی انگلیوں کے نشانات لیے گئے تھے؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "اور ان فنگر پرنٹس کا مقتولہ کی گردن پر پائے جانے والے قاتل کی انگلیوں کے نشانات سے موازنہ کیا تھا؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''کیوں ......؟'' میں نے بہ آوازِ بلند استفسار کیا۔

''مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور قاتل آپ کی گرفت میں تھا پھر فنگر پرنٹس لینے سے کیوں اجتناب برتا گیا...... کیوں؟''

آئی او کے پاس کوئی معقول جواب موجود نہیں تھا لہٰذا وہ کھسیانا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جنابِ عالی! استغاثہ کے مطابق، یہ ایک مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس ہے لیکن ان دونوں سنگین الزامات کے سلسلے میں پولیس نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ مجرمانہ حملے کے ملزم کا طبی اور طبعی معائنہ بہت ضروری ہوتا ہے جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ملزم نے حملہ مذکور کا ارتکاب کیا تھا یا نہیں لیکن میرے مؤکل کو ایسے کسی معائنے سے نہیں گزارا گیا۔ دوسری جانب قتل کا معاملہ ہے۔ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا لہٰذا مقتولہ کی گردن پر قاتل کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا لازمی بات ہے لیکن پولیس نے مقتولہ کی گردن سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات کو اٹھانا ضروری سمجھا اور نہ ہی ملزم کے فنگر پرنٹس سے ان نشانات کا موازنہ کرنے کا انہیں خیال آیا۔ یہ بہت ہی عجیب سی بات ہے جو پولیس کی کسی مصلحت یا کوتاہی یا بدنیتی کو ظاہر کرتی ہے۔''

میں خاموش ہوا تو جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر گردن اٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو آئی او سے کچھ اور تو نہیں پوچھنا؟''

''صرف ایک سوال یور آنر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوکے!'' جج نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

میں تفتیشی افسر خادم حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آئی او صاحب! پولیس کے روزنامچے کے مطابق، بیس اگست کی سہ پہر دو بج کر تیس منٹ پر یعقوب علی نامی ایک شخص نے تھانے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ شادمان ٹاؤن کے بنگلا نمبر چونتیس کے اندر سے اس نے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اسی اطلاع کے نتیجے میں جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں آپ کو مقتولہ سعدیہ کی لاش ملی۔ میری نظر میں اور قانون کی نگاہ میں یعقوب علی نامی یہ شخص بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں یعقوب علی کا نام شامل نہیں۔ اس کا کوئی خاص سبب؟''

''ہم نے یعقوب علی کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہمیں کہیں مل نہیں سکا۔'' آئی او نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں، وہ کہاں غائب ہو گیا تھا حالانکہ اس کی گواہی واقعی بہت اہمیت رکھتی ہے۔''

''وہ کہیں غائب ہو گیا یا اسے غائب کر دیا گیا، اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''عین ممکن ہے کہ یعقوب علی کو کسی سازشی شخص نے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کر کے منظر سے ہٹا لیا ہو......!''

میرے سنسنی خیز خیالات پر آئی او نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! مجھے آئی او صاحب سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے عبدالغفار نامی ایک گواہ کو شہادت کے لیے پیش کیا گیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو شگفتہ کی شادی سے پہلے اس کی ماں مہرالنسا کے بنگلے پر ڈرائیور رہ چکا تھا۔ عبدالغفار کے حوالے سے ملک نعیم نے مجھے خاصی چونکا دینے والی معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ ایک خوش شکل شخص تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے آس پاس لگایا۔ اس کے گال پھولے پھولے تھے جیسا کہ عموماً ننھے بچوں کے ہوتے ہیں۔ اس کے بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور اس نے عمدہ تراش کا لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان کے مطابق، وہ بیس اگست کی دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان اتفاقاً بنگلا نمبر چونتیس واقع شادمان ٹاؤن کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس نے میرے مؤکل کو ایک طرح دار حسینہ کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھا۔ میرے مؤکل نے جیب سے چابی نکال کر بنگلے کا گیٹ کھولا پھر گاڑی کو بنگلے کے اندر لے گیا اور گیٹ کو بند کر دیا۔

وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا پھر گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر غفار! کیا آپ کو یقین ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے ملزم ہی کو کسی لڑکی کے ساتھ اپنے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟''

''جی بالکل......'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔''

''اس لڑکی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں جو

واقعہ کے روز ملزم کے ساتھ تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے استفسار کیا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اس لڑکی کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔''

وکیلِ استغاثہ نے اپنی فائل میں سے سعدیہ کی ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو نکال کر گواہ کی جانب بڑھایا اور کہا۔ ''اس فوٹو کو غور سے دیکھ کر بتائیں، کیا یہی لڑکی واقعہ کے روز ملزم کے ساتھ اس کے بنگلے میں گئی تھی؟''

''جی ہاں!'' اس نے پُرشوق انداز میں گردن ہلائی۔ ''بالکل وہ یہی لڑکی تھی۔''

وکیلِ استغاثہ نے جرح موقوف کردی۔

اپنی باری پر میں استغاثہ کے گواہ عبدالغفار کے قریب چلا گیا اور ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''غفار صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ بعض حلقوں میں آپ اے جی (AG) کے نام سے مشہور ہیں۔ کہیں میری معلومات غلط تو نہیں ہیں؟''

''جی نہیں، آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اے جی کا مطلب ہے، عبدالغفار۔ بس، کہیں شارٹ نیم اور کہیں فل نیم......!''

اس نے آخری جملہ بڑے اسمارٹ انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''ماشاء اللہ! آپ کافی ہینڈسم اور اسمارٹ شخص ہیں۔ خاص طور پر جنسِ مخالف کے لیے آپ کے اندر بہت زیادہ کشش پائی جاتی ہے۔ کیا میں آپ کو AG کہہ کر مخاطب کرسکتا ہوں؟''

''جی ضرور......!'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

''اے جی صاحب!'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی بات چیت کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ کم از کم آپ گریجویٹ تو ہوں گے ہی۔ آپ نے کس سن میں گریجویشن کیا تھا؟''

''جناب میں ایم اے پاس ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بس، گھر کے حالات اچھے نہیں تھے ورنہ میری خواہش تو یہی تھی کہ گریجویشن کروں مگر جو اللہ کو منظور۔''

اے جی کے اس جواب پر عدالت کے کمرے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ''ایم اے پاس'' اور ''گریجویشن'' کا فرق ہر کوئی سمجھتا تھا لہٰذا اے جی کے معکوس جواب نے سب کو محظوظ کیا تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود بعض افراد کی تو باقاعدہ ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ اس صورتِ حال پر گواہ خاصا کبیدہ خاطر ہوا اور پریشان نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

وکیلِ استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ ''جنابِ عالی!'' اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیلِ صفائی، استغاثہ کے معزز گواہ کو بھری عدالت کے سامنے شرمندہ کررہے ہیں۔ عبدالغفار یہاں گواہی دینے آیا ہے، کسی نوکری کے لیے انٹرویو دینے کے لیے نہیں۔ پتا نہیں، میرے فاضل دوست اس نوعیت کے سوالات سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں!''

''مجھے کچھ بھی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''کیونکہ استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر اے جی نے سب کچھ خود ہی ثابت کردیا ہے۔''

''کیا ثابت کردیا ہے گواہ نے؟'' وکیلِ استغاثہ نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''یہی کہ وہ بڑی صفائی کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہے!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''مسٹر اے جی! کیا تمہیں پتا ہے کہ عدالت میں دروغ گوئی کی کیا سزا ہے؟''

''ن...... نہیں......'' اس نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔

''پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 191 کے مطابق......'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''اگر کوئی شخص حلف کے ذریعے یا قانون کے کسی صریحی حکم کے ذریعے سچ سچ بیان کرنے کا قانونی طور پر پابند ہوتے ہوئے یا قانون کے ذریعے کسی امر کے بارے میں کوئی بیان دینے کا پابند ہوتے ہوئے کوئی ایسا بیان دے جو مبنی بر دروغ ہو اور جس کا جھوٹ ہونا یا تو وہ جانتا ہو یا جس کا سچ ہونا وہ باور نہ کرتا ہو تو کہا جائے گا کہ اس شخص نے جھوٹی گواہی دی ہے......''

''وکیل صاحب! آپ نے تو میرا دماغ گھما دیا ہے۔'' اے جی دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔''

''جو شخص عدالت میں جھوٹی گواہی دیتا ہے۔'' میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے دفعہ 193 کے تحت دو (قیدِ محض/قیدِ بامشقت) میں سے کوئی ایک

سزائے قید اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو ہفت سالہ یعنی سات سال ہو سکتی ہے اور وہ جھوٹا شخص جرمانے کا مستوجب بھی ہو گا۔“

”لیکن...... میں نے تو کوئی...... جھوٹ نہیں بولا......“ وہ خوفزدہ اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

”بس، تو پھر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے تفریح لی۔ ”کیا یہ سچ ہے نا کہ تم صرف ایف اے پاس ہو اور گھریلو حالات کی وجہ سے گریجویشن نہیں کر پائے تھے حالانکہ تمہیں گریجویٹ بننے کا شوق تو بہت زیادہ تھا......!“

”جی...... بالکل......“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”مسٹر اے جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟ میرا مطلب ہے، تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

”جی...... میں پراپرٹی کا کام کرتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی تم پراپرٹی ایجنٹ ہو؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے پوچھا۔ ”تمہاری ایجنسی کا نام کیا ہے؟“

”کمی اسٹیٹ۔“ اس نے جواباً بتایا۔

”کمی اسٹیٹ نامی یہ ایجنسی تمہاری ذاتی ملکیت ہے یا اس میں کوئی اور بھی پارٹنر ہے؟“

”یہ ایجنسی کسی اور کی ملکیت ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں وہاں بیٹھتا ہوں۔ میرے توسط سے جو سودا فائنل ہوتا ہے، اس کا کمیشن مجھے مل جاتا ہے۔“

”میری معلومات کے مطابق، اسٹیٹ ایجنسی کا کام تم نے حال ہی میں شروع کیا ہے۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس سے پہلے تم ڈرائیوری کیا کرتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

”کچھ عرصہ تم ملزم کی ساس مہر النسا کے ڈرائیور بھی رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی بالکل رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن اس زمانے میں میڈم مہر النسا ابھی ملزم کی ساس نہیں بنی تھیں۔“

”وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز تم نے جب ملزم کے ساتھ ایک جوان و حسین لڑکی کو دیکھا تو تم نے ملزم کو فوراً پہچان لیا تھا۔“

میں نے جرح کے سلسلے کو حسب منشا دراز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ملزم کو پہلے سے اچھی طرح جانتے ہو یا کم از کم اس کے صورت آشنا ضرور ہو......؟“

”جی، صرف صورت آشنا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں ملزم کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ جن دنوں میڈم مہر النسا کی بیٹی کے رشتے کا معاملہ چل رہا تھا تو میں نے ملزم کو ان کے گھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ملزم کی شگفتہ سے شادی ہو گئی تھی۔“

”ملزم اور شگفتہ کی شادی آج سے بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے کافی عرصہ پہلے مہر النسا کی ڈرائیوری کی تھی۔ کیا ان بارہ سالوں میں پھر بھی تمہارا مہر النسا کے گھر آنا جانا ہوا یا گھر سے باہر اور کہیں ان سے ملاقات ہوئی؟“

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“

”شگفتہ کی شادی کے بعد بھی اس سے میل جول رہا؟“ میں نے پوچھا۔

”قطعاً نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”مہر النسا کے یہاں سے ڈرائیوری چھوڑنے کا کوئی خاص سبب؟“

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”بس جی...... اللہ نے جس انسان کا جہاں جتنا رزق لکھا ہوتا ہے وہ اتنا ہی عرصہ وہاں نوکری کرتا ہے۔ خدائی معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے!“

”بے شک، خدائی معاملات میں کوئی دخل نہیں دے سکتا مگر انسانی معاملات میں دخل دیا جا سکتا ہے۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا نوکری چھوڑنے بلکہ...... نوکریاں چھوڑنے کا معاملہ چونکہ انسانی ہے لہٰذا میں اس میں لازمی دخل دوں گا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں!“ وہ گڑبڑا گیا۔

”تھوڑی دیر کے بعد سمجھاتا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ وقوعہ کے روز تم ملزم کے بنگلے کے قریب کیا کرتے پھر رہے تھے؟“

”جناب...... آپ کو بتایا تو ہے کہ آج کل میں پراپرٹی کا بزنس کر رہا ہوں۔“ وہ جلدی سے بات کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت ایک پارٹی میرے ساتھ تھی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میں اس پارٹی کو اسی علاقے میں ایک بنگلا دکھانے گیا تھا جہاں ملزم کی رہائش ہے۔“

”لیکن......“ میں نے ملک نعیم سے حاصل ہونے والی

معلومات کی روشنی میں استغاثہ کے گواہ مسٹر اے جی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کی اسٹیٹ کے مالک کا تو یہ کہنا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی بیس اگست کو تم نے ایجنسی سے چھٹی کی تھی......؟''

''جی......وہ......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ اس روز میں نے ایجنسی سے چھٹی کی تھی۔ اصل میں، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''کمال ہے، جس طبیعت کی خرابی کے سبب تم نے کی اسٹیٹ سے چھٹی کی تھی اسی ''طبیعت'' کے ساتھ تم پارٹی کو بنگلا دکھانے پہنچ گئے تھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ تمہیں تو گھر میں آرام کرنا چاہیے تھا۔''

''میں گھر میں پڑا آرام ہی کر رہا تھا جناب۔'' وہ میرے الفاظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن پارٹی نے بہت ضد کی اور میں گھر سے نکلنے کے لیے مجبور ہو گیا۔''

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ بیس اگست کی دوپہر تم ملزم کی بیوی شگفتہ سے ملنے اس کے بنگلے پر جانا چاہتے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور اسی مقصد کے لیے تم نے ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے کی اسٹیٹ سے چھٹی ماری تھی......؟''

''بالکل غلط......'' وہ ایسے اچھلا جیسے میں نے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ ''آپ کو کس نے یہ بات بتائی...... یہ ناممکن ہے...... میں تو بیس اگست کو میڈم شگفتہ کے بنگلے کے قریب بھی نہیں گیا تھا......!''

اپنے گواہ کا بیان سن کر وکیل استغاثہ کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ وہ گواہ سے ایسی احمقانہ بات کی ہرگز توقع نہیں کر رہا تھا۔ دراصل، مجھے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز اے جی کی ملزم کی بیوی سے کسی قسم کی کوئی ملاقات طے تھی۔ یہ میں نے تکا لگایا تھا جو تیر بہ ہدف ثابت ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ ہمارے بیچ چھلانگ لگاتا، میں نے بڑی سرعت سے کہا۔

''وہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر اے جی! ممکن ہے، کسی نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو۔ تم تو بیس اگست کی دوپہر بنگلا نمبر چونتیس واقع شادمان ٹاؤن کے قریب بھی نہیں گئے تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

''جی...... جی ہاں......'' وہ گلنت زدہ انداز میں بولا۔

''کیا تم ہمزاد کے کانسیپٹ پر یقین رکھتے ہو؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تاہم اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''تو پھر وہ تمہارا ہمزاد ہوگا جو وقوعہ کے روز کسی پارٹی کو جائے وقوعہ کے قریب کوئی بنگلا دکھانے لے گیا تھا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور اسی ہمزاد نے ملزم کو کسی خوب رو جوان لڑکی کے ساتھ بنگلا نمبر چونتیس کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ تم تو بیمار تھے اور...... وقوعہ کے روز تم ملزم کے بنگلے کے قریب بھی نہیں گئے......!''

وکیل استغاثہ سمجھ چکا تھا کہ میں نے اس کے گواہ کو اپنی جرح کے شکنجے میں کس لیا ہے لہٰذا اس نے اے جی کی حمایت میں کہا۔

''جناب عالی! میرے فاضل دوست خواہ مخواہ ہمزاد کے موضوع کو لے آئے ہیں جبکہ عدالت میں اس وقت مجرمانہ حملے اور قتل کے مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے۔ وکیل صفائی اپنے عجیب و غریب حربوں کی مدد سے معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''یور آنر......!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کا گواہ مسٹر عبدالغفار عرف اے جی اس بات کی حلفیہ گواہی دینے عدالت میں حاضر ہوا ہے کہ اس نے وقوعہ کے روز ملزم کو ایک حسین لڑکی کے ساتھ گاڑی میں بنگلے یعنی جائے وقوعہ کی طرف آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یعنی یہ اس واقعے کا عینی شاہد ہے۔ گواہ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد معزز عدالت کو بتا چکا ہے کہ وہ اتفاق سے بنگلا نمبر چونتیس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس نے ملزم کو ایک طرح دار حسینہ کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھا۔ ملزم نے جیب سے چابی نکال کر بنگلے کا گیٹ کھولا پھر گاڑی کو بنگلے کے اندر لے جانے کے بعد گیٹ بند کر دیا اور اب......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور اب اسی معزز گواہ کا دعویٰ ہے کہ یہ وقوعہ کے روز ملزم کے بنگلے کے پاس سے بھی نہیں گزرا۔ میرے فاضل دوست کو ''ہمزاد'' کے کانسیپٹ پر سخت اعتراض ہے۔ چلیں، ہم ہمزاد کے موضوع کو دفن کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں معزز گواہ کے دونوں بیانات میں سے کوئی ایک بیان ہی درست ہو سکتا ہے۔ یا تو یہ وقوعہ کے روز ملزم کے بنگلے کے سامنے سے گزرا تھا یا مذکورہ روز یہ اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔''

''تم کیا کہتے ہو مسٹر اے جی؟'' جج نے براہ راست گواہ سے استفسار کیا۔

''جج...... جی......'' وہ بری طرح گھبرا گیا۔ ''ہم......''

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

فتحِ مکرر

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ گواہ ہے کہ بعض اوقات معمولی ذرّوں پر قسمت کی دیوی یوں مہربان ہوتی کہ آفتاب بن کر ایک جہان روشن کردیا۔ وہ جو مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے غلام منڈی میں جا پہنچا تھا اور جس کی بولی سرِعام لگائی جارہی تھی... وہ گوہرِ نایاب سبکتگین تھا جس کے نزدیک بخارا کے بازاروں کی بھیڑ، مدرسوں کی رونق، اہلِ علم کی فراوانی گویا ایک خواب تھا۔ یہ مقدر کی مہربانی ہی تو تھی کہ وہ ایک غلام منڈی سے سفر کرتے ہوئے الپتگین کے عظیم الشان محل تک جا پہنچا دیا۔ اس غلام کی دلیری نے ایک ہی حملے میں غزنی کو مٹھی میں دبا لیا جس کی بدولت الپتگین غزنی کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا اور پندرہ سال تک نہایت کروفر سے غزنی پر حکومت کی۔ جس طرح غلام سبکتگین نے ایک ہرنی اور اس کے بچے پر رحم کیا اور ہرنی کی تشکر آمیز نگاہوں میں جو ممنونیت تھی شاید قدرت کو اس کی اسی ادا پر پیار آگیا تھا کہ ایک طاقت ور انسان نے ایک کمزور جانور پر رحم کرکے تاریخ میں ایک مثال قائم کردی اور مسندِ حکومت اس کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔



میں اس دن ملزم کے بنگلے...... کے سامنے سے گزر رہا تھا اور میں نے...... ملزم کے ساتھ ایک حسین لڑکی کو بنگلے کے اندر جاتے دیکھا تھا......''

''جناب عالی! استغاثہ کا معزز گواہ اپنی تعلیمی قابلیت کے حوالے سے ایک کھلا جھوٹ بول چکا ہے۔ جھوٹ نمبر دو، ابھی معزز عدالت کے سامنے آیا ہے۔ اس سے آگے بھی دروغ گوئی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اینی ہاؤ......'' میں نے روئے سخن گواہ کی جانب موڑا اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''مسٹر اے جی! کیا تمہارے اس بیان کو لاک کردیا جائے کہ تم وقوعہ کے روز ملزم کے بنگلے یعنی میڈم شگفتہ کے بنگلے یعنی جائے وقوعہ کے سامنے موجود تھے اور تم نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم وحید خان کو ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ اپنے بنگلے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ملزم کو تم نے فوراً پہچان لیا تھا لیکن مقتولہ یعنی وہ طرح دار حسینہ سعدیہ تمہارے لیے اجنبی تھی؟''

''جی بالکل۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''حقیقت صرف یہیں تک محدود نہیں مسٹر اے جی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میرے پاس کچھ ایسے شواہد بھی موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ وقوعہ کے روز تم بنگلا نمبر چونتیس کے باہر نہیں، بلکہ اندر تھے......!''

میرا یہ انکشاف ایٹم بم کی طرح گواہ کے سر پر گرا۔ وہ سراتی ہوئی آواز میں بولا ''آپ...... کو...... یہ بات...... کس نے بتائی ہے......؟''

''ایک ایسے شخص نے جو اس وقت بنگلے کے اندر موجود تھا۔'' میں نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ، اس روز تمہارے علاوہ بنگلا نمبر چونتیس میں اور کون کون موجود تھا؟''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ میرے فاضل دوست استغاثہ کے گواہ کو... خوامخواہ اپنے دباؤ میں لانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگر ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود ہے تو اس ثبوت کو عدالت میں پیش کریں۔''

وکیل استغاثہ نے ایک اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی ثبوت یا ایسا کوئی گواہ موجود نہیں تھا۔ وکیل استغاثہ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ میں اس کے گواہ کو دباؤ میں لانے کے لیے نفسیاتی حربہ استعمال کررہا تھا۔

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے کہ بیس اگست کو گواہ اے جی بنگلا نمبر چونتیس کے اندر موجود تھا؟''

''جی بالکل!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں یہ ثبوت عدالتی کارروائی کے دوران مناسب موقع پر سامنے لاؤں گا۔ سردست یہ انکشاف انصاف کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔''

جج نے کہا۔ ''ایسی صورت میں اعتراض درست تسلیم کیا جاتا ہے۔''

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''مسٹر اے جی!'' میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''میں نے سنا ہے، میڈم مہر النسا بہت فراخ دل خاتون ہیں۔ وہ تنخواہ کے علاوہ بھی تمہیں نوازتی رہتی تھیں۔ تمہاری ہر مالی ضرورت کو پورا کرتی تھیں؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مہر النسا میڈم واقعی ایک ہمدرد اور انسان دوست خاتون ہیں۔''

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تمہارے وہاں سے نوکری چھوڑنے کے بعد بھی میڈم مہر النسا نے تمہارا بہت خیال رکھا تھا۔'' میں نے اپنی جرح کے جال کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی، وہ تمہاری مالی مدد کردیا کرتی تھیں؟''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اب وہاں میرا جانا تو نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی بیٹی کے ذریعے میرا خیال رکھتی ہیں۔''

''بیٹی...... یعنی میڈم شگفتہ!'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ملزم وحید خان کی بیوی شگفتہ؟''

''جی۔ میں انہی کی بات کررہا ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے، تمہاری میڈم شگفتہ سے میل ملاقات رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... کبھی کبھار ملنا ہوجاتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ ملزم نے اپنی بیوی یعنی تمہاری چھوٹی میڈم شگفتہ کو طلاق کا نوٹس دے رکھا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

''جی...... میں نے ایسی بات سنی تو تھی......!''

''کس سے سنی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''خالد مقبول سے۔'' وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

''خالد مقبول یعنی ملزم کا منیجر۔'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔ ''کیا تمہارا خالد مقبول سے بھی ملنا جلنا رہتا ہے؟''

''بہت کم......'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''وہ میڈم شگفتہ کا کوئی قریبی رشتے دار بھی ہے۔''

''مسٹر اے جی!'' میرے لہجے میں درشتی در آئی۔ ''تمہارے پاس جھوٹ کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے یا کچھ باقی بھی بچا ہے؟''

''جی...... کیا مطلب......؟'' وہ الٹا مجھ سے مستفسر ہوا۔

''مسٹر اے جی! تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ تم نے شگفتہ کی شادی سے پہلے مہر النسا کی ڈرائیوری کی نوکری چھوڑ دی تھی اور ان بارہ سالوں میں تمہارا نہ تو مہر النسا کے گھر جانا ہوا اور نہ ہی باہر کہیں کبھی ان سے ملاقات ہوئی۔ جب میں نے پوچھا کہ شگفتہ کی شادی کے بعد کبھی تمہارا اس سے میل جول رہا تو تم نے بڑے قطعی انداز میں اس کی نفی کی تھی اور اب تم کچھ اور ہی بتا رہے ہو۔ تمہارا شگفتہ سے نہ صرف ملنا جلنا ہے بلکہ وہ اکثر و بیشتر... تمہاری مالی مدد بھی کرتی ہے اور یہ کہ تم...... میڈم شگفتہ کے گھریلو معاملات سے بھی بہ خوبی آگاہ ہو۔ تمہاری ہمدردی شگفتہ کے ساتھ ہے اور اسی کے ایما پر تم ملزم وحید خان کے خلاف گواہی دینے آئے ہو۔''

اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا لہٰذا وہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ملک نعیم نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آج آپ نے استغاثہ کے گواہ اے جی کو خوب رگڑا دیا ہے۔ بے چارے کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔''

''اے جی کو رگڑا لگانے کا صرف ایک مقصد تھا کہ اس کی دروغ گوئی عدالت کے ریکارڈ پر آ جائے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا اصل ٹارگٹ میرا مؤکل اور آپ کا دوست وحید خان ہے۔ مجھے اس کی بے گناہی ثابت کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب میں استغاثہ کو زیادہ سے زیادہ کمزور کر دوں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بیگ صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے عدالتی کارروائی میں مزہ بہت آتا ہے۔''

''آپ عدالت کے کمرے میں بیٹھ کر ضرور مزہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنی نوکری پر بھی توجہ دینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''جی...... میں تو جہ دے رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بس، جس دن پیشی ہوتی ہے، اس روز میں آدھے دن کی چھٹی کر لیتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اسے ہدایت کی۔ ''ملک صاحب! آپ نے آج کی پوری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہے، مجھے یقین ہے کہ اے جی شگفتہ یا خالد مقبول سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ اگر ممکن ہو تو اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے، کوئی کام کی بات سامنے آ جائے۔''

''جی، میں کوشش کروں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں اس سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر استغاثہ کی طرف سے ''خان بک سیلرز'' کے منیجر خالد مقبول کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ خالد مقبول کی عمر پینتالیس کے آس پاس تھی۔ جسم مائل بہ فربہی اور رنگت سیاہ، اس کی شکل سندھی ڈراموں کے ایک ویلن سے بہت ملتی جلتی تھی۔

خالد مقبول نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ ملزم کی فرم ''خان بک سیلرز'' میں کیشیر کم منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لہٰذا وہ ملزم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ......!

گواہ کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور گواہ سے پوچھا۔

''مقتولہ سعدیہ کو ''خان بک سیلرز'' میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''ایک سال سے کچھ کم۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ دس گیارہ ماہ۔''

''وہ کس حیثیت سے کام کر رہی تھی؟''

''ملزم کی سیکریٹری کے طور پر۔''

''کیا وہ اپنی اس جاب سے خوش تھی؟'' وکیل استغاثہ نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے، وہ خوش نہیں تھی۔''

"اس کے ناخوش ہونے کا کوئی سبب......؟"

"سب سے بڑا سبب تو ملزم ہی تھا۔" خالد مقبول نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے وحید خان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ملزم......!" وکیل استغاثہ نے پلکیں جھپکا کر اپنی مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ کیسے؟"

"جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ ملزم بہت ہی دل پھینک قسم کا شخص واقع ہوا ہے۔" وہ ناپسندیدہ نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسے فوراً ہی اپنی سیکریٹری سے محبت ہوجاتی ہے۔ مقتولہ سعدیہ سے پہلے کئی لڑکیاں ملزم کی انہی حرکتوں کے باعث ملازمت چھوڑ کر جا چکی تھیں۔"

"اوہ......!" وکیل استغاثہ نے کندھے اچکاتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "کیا ملزم کو مقتولہ سے بھی کوئی عشق وشق ہو گیا تھا؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن مقتولہ کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا۔ وہ اکثر مجھ سے باس کے رویّے کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ انیس اگست کو مقتولہ نے مجھے بتایا کہ آئندہ روز یعنی بیس اگست کو باس نے اسے اپنے بیٹے کی سالگرہ پر گھر میں مدعو کیا ہے۔ اس وقت میں نے مقتولہ کی بات پر دھیان نہیں دیا اور اگلے روز میری طبیعت خراب ہوگئی لہٰذا میں نے آفس سے چھٹی کر لی۔ بعد ازاں مجھے یاد آیا کہ بیس اگست کو کامران کی سالگرہ نہیں ہوتی لیکن جب تک مقتولہ اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچ چکی تھی......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ملزم نے اپنی سیکریٹری کے ساتھ بیٹے کی سالگرہ کے حوالے سے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ یہ ملزم کی ایک شاطرانہ چال تھی۔ اس نے مقتولہ کو فریب دے کر اپنے بنگلے پر بلا لیا اور اسی روز اپنی بیوی کو بیٹے سمیت میکے بھیج دیا۔ اسی دن گھریلو ملازمہ کو بھی چھٹی دے دی گئی تاکہ ملزم اپنے دل کے ارمان پورے کر سکے۔ مقتولہ، ملزم کے منصوبے سے بے خبر تھی لہٰذا اس نے دفتر سے چھٹی کی اور ملزم کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد بنگلا نمبر چونتیس پر جو کچھ ہوا وہ پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہے......"

وکیل استغاثہ نے جرح کا سلسلہ موقوف کیا تو میں نے گواہ کو گھیر لیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

"خالد مقبول! میری معلومات کے مطابق، آپ ملزم کی بیوی شگفتہ کے کزن ہیں اور ملزم کی فرم میں آپ ایک اعلیٰ عہدے پر بھی فائز ہیں گویا، ملزم سے آپ کا دہرا تعلق بنتا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جی، دہرا تعلق تو بنتا ہے۔"

"عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ منیجر یا اسی نوعیت کے دیگر اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے افراد اپنے باس کے خاص وفادار ہوتے ہیں اور ان کی تمام تر ہمدردیاں اپنے باس کے لیے ہوتی ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس دکھائی دے رہا ہے۔ آپ کے بیان اور بعد ازاں وکیل سرکار سے ہونے والی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے باس سے کوئی خاص قسم کی دشمنی رکھتے ہو۔ ایسا کیوں؟"

"وکیل صاحب! بات یہ ہے کہ انسان کی عزت اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "جو باس اپنی عزت کروانا چاہتے ہیں انہیں اپنے ملازمین کے سامنے بلند کردار کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور اپنے تمام ملازمین کے ساتھ ہمدردی اور اپنائیت کا رویہ رکھنا پڑتا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوگا اور باس اپنے بیوی بچوں کو پس پشت ڈال کر سیکریٹری کے عشق کے بخار میں مبتلا ہو کر اوچھی حرکتوں پر...... اتر آئے گا تو بتائیں، کون اس کی عزت کرے گا......؟"

"خالد مقبول! کیا یہ درست ہے کہ آپ کو ملزم کی ساس مہرالنسا کی سفارش پر "خان بک سیلرز" میں ملازمت پر رکھا گیا تھا؟" میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

"ملازمت کے لیے پہلی شرط انسان کی قابلیت اور اہلیت ہوتی ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "اور مجھے اسی بنا پر یہ ملازمت ملی تھی۔ ہاں، یہ درست ہے کہ آنٹی مہرالنسا نے ہی مجھے ملزم کے پاس بھیجا تھا۔"

"مسٹر خالد! کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ جب ملزم کو پتا چلا کہ آپ اس سے زیادہ اس کی بیگم شگفتہ سے حقِ وفاداری نبھا رہے ہیں تو اس نے آپ کو ملازمت سے برخاست کروا دیا تھا؟"

"جناب! حقیقت یہ ہے کہ ملزم ایک شکی مزاج شخص ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اسے وہم ہو گیا تھا کہ میں شگفتہ کی سائیڈ لیتا ہوں اور یہ کہ اس کا وفادار نہیں

ہوں حالانکہ شگفتہ کی سائڈ لینے کی چند وجوہات تھیں......!''

''مثلاً کون سی وجوہات؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نمبر ایک...... شگفتہ میری کزن ہے۔ اسے خوش دیکھنا میری خواہش ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر میں اس کے حقوق کے تحفظ کے لیے سوچتا تھا تو میرے خیال میں اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ ملزم کے کرتوت میرے سامنے تھے۔ اگر میں نے مقتولہ کے حوالے سے بھی کوئی بات اپنی کزن شگفتہ کو بتادی ہوگی تو مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں ہے۔''

''لیکن آپ ملزم کے تنخواہ دار ملازم تھے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پہلے حق نمک ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد رشتے داری نبھانے کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ آپ کی منت سماجت پر ملزم نے آپ کو دوبارہ ملازمت پر بحال کردیا تھا؟''

''آپ اسے منت سماجت تو نہیں کہہ سکتے۔'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''البتہ، میں نے ملزم کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اب میں مکمل طور پر اسی کا وفادار رہوں گا۔''

''اور ملزم نے آپ سے یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ آئندہ آپ شگفتہ یا مہر النسا سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، یہ ملزم کی خواہش تھی اور میں نے از روئے مصلحت اپنی نوکری بچانے کے لیے اس سے یہ وعدہ کرلیا تھا لیکن زمینی حقائق کی روشنی میں یہ عملاً ممکن نہیں تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''شگفتہ اور مہر النسا سے میری رشتے داری ہے۔ میں ان سے ملنا جلنا کیسے ترک کرسکتا تھا؟''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم سے ایفائے عہد کرنے کے باوجود بھی آپ شگفتہ اور مہر النسا سے رابطے میں تھے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور دفتر کی ساری رپورٹیں پہنچا رہے تھے......؟''

''شگفتہ اور مہر النسا میری رشتے دار ہیں اور رشتے داروں سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''مگر یہ غلط ہے کہ میں انہیں آفس کی رپورٹنگ کیا کرتا تھا۔''

''خالد صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم نے بہانے سے مقتولہ کو اپنے بیٹے کی سالگرہ کا بتا کر گھر بلایا تھا بلکہ وہ مقتولہ کو خود اپنے ساتھ لے کر بنگلے پر پہنچا تھا کیونکہ مقتولہ کے حوالے سے اس کے ذہن میں ایک خاص نوعیت کی پلاننگ تھی۔ اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ملزم نے وقوعہ کے روز یعنی بیس اگست کو گھریلو ملازمہ کو چھٹی دے دی اور اپنے بیوی بچوں کو بھی نانی کے گھر یعنی آنٹی مہر النسا کے گھر بھیج دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' میں نے بات ختم کرکے سوالیہ نظر سے خالد مقبول کی طرف دیکھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کون سی معلومات؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''نمبر ایک...... ملزم نے مقتولہ کو اپنے بیٹے کی سالگرہ پر گھر بلایا تھا بلکہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے گیا تھا؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''نمبر دو...... اس روز ملزم نے گھریلو ملازمہ کو چھٹی دے دی تھی؟ نمبر تین...... اس روز ملزم نے شگفتہ اور کامران کو مہر النسا کے گھر بھیج دیا تھا...... وغیرہ وغیرہ۔''

''دیکھیں جناب! میں بتا چکا ہوں کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی انیس اگست کو مقتولہ نے خود مجھے یہ بات بتائی تھی کہ بیس اگست کی دوپہر ملزم نے اسے اپنے بیٹے کی سالگرہ پر گھر میں مدعو کیا ہے۔'' وہ اپنے لہجے کو توانا ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ اور ملزم ایک ساتھ بنگلے پر پہنچے اس امر کی گواہی پچھلی پیشی پر استغاثہ کے گواہ مسٹر عبدالغفار نے بھی دی تھی۔ شگفتہ اور کامران کو مہر النسا کے گھر بھیجنے کے بارے میں مجھے شگفتہ نے بتایا تھا اور جہاں تک گھریلو ملازمہ کو چھٹی دینے کی بات ہے تو ظاہر ہے، ملزم گھریلو ملازمہ شکیلہ کی موجودگی میں تو مقتولہ کے ساتھ گل چھرے نہیں اڑا سکتا تھا......!''

''گویا شکیلہ کو چھٹی دینے کے بارے میں آپ نے قیاس کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس حوالے سے آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت یا دلیل نہیں ہے؟''

''آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا پھر تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا قیاس آرائی پر بھی کوئی دفعہ لگائی جاسکتی ہے؟''

''بالکل لگائی جاسکتی ہے' بہ شرطیکہ اس قیاس آرائی

کے کسی شخص یا کسی پارٹی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "میری معلومات کے مطابق، وقوعہ سے کافی عرصہ پہلے ملزم اور اس کی بیوی شگفتہ میں بول چال کا سلسلہ موقوف تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بیس اگست کو ملزم نے اپنے بیوی بچوں کو مہر النسا کے گھر جانے کے لیے کہہ دیا ہو؟"

"یہ تو آپ ملزم سے پوچھیں یا پھر شگفتہ سے۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے شگفتہ نے جو بتایا وہ میں نے بیان کیا ہے۔"

"گڈ......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ملزم سے تو میں سب کچھ پوچھ چکا اور جب شگفتہ گواہی دینے آئیں گی تو ان سے بھی بہت کچھ پوچھ لوں گا۔ فی الحال، آپ مجھے یہ بتائیں کہ......" میں نے لحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ درست ہے کہ ایک روز شگفتہ نے "احسان بک سیلرز" کے آفس میں آکر خوب ہنگامہ مچایا تھا۔ اس نے مقتولہ کو بہت برا بھلا کہا تھا اور ملزم سے کہا تھا کہ وہ فی الفور مقتولہ کو نوکری سے نکال دے لیکن اس موقع پر مقتولہ نے بھی شگفتہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور خوب کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے، یہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"مم......میں نے شور کی آوازیں تو سنی تھیں......" وہ بہانے بازی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس جھگڑے کے دوران میں ان کے بیچ کیا باتیں ہوئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ نے ان تینوں کی باتیں نہیں سنی تھیں۔" میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ "لیکن میں نے اس جھگڑے کا سبب پوچھا ہے......؟"

"شگفتہ کو اس بات کا علم تھا کہ ملزم، مقتولہ کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم کا مقتولہ کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ ملزم مختلف طریقوں سے مقتولہ سے شادی کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہا تھا اور ملزم کی یکطرفہ خواہش تھی۔ مقتولہ ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔"

"اوکے......" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "خالد مقبول صاحب! آپ ملزم کی فیملی کے بہت قریب ہیں لہٰذا آپ کو یقیناً یہ بات تو پتا ہی ہوگی کہ ملزم نے گزشتہ مئی کے مہینے سے اپنی بیوی شگفتہ کو طلاق کا نوٹس دے رکھا ہے اور ملزم اپنی گرفتاری کے سبب طلاق والے معاملے کو فائنل نہیں کرسکا تھا؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "مجھے ایسے کسی نوٹس کا کوئی علم نہیں ہے۔"

"کیا واقعی......؟" میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

"جی بالکل، میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"آپ کا یہ سچ کہیں آپ کے خلاف نہ چلا جائے خالد صاحب۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لیں۔"

"جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کردی۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اور حقیقت کو سو بار بھی بیان کیا جائے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔"

"اوکے......" میں نے پکا کرنے کے بعد اسے گھیر لیا۔ "خالد صاحب! آپ نے اپنے بیان میں ایک جگہ استغاثہ کے گواہ اے جی اور پچھلی پیشی کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے، یہ پیشی کتنے دن پہلے ہوئی تھی؟"

"ٹھیک دس دن پہلے۔" اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"استغاثہ کے گواہ عبدالغفار عرف اے جی نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ وہ ملزم کی طلاق کے نوٹس والی بات سے بخوبی آگاہ تھا۔" میں نے خالد مقبول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو پتا ہے، یہ بات اے جی کو کس نے بتائی تھی؟"

"مجھے کیسے پتا ہوسکتا ہے جناب۔" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔"

"اسی سے پوچھنے پر تو حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا خالد صاحب۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"کیسا انکشاف؟" وہ پریشان دکھائی دینے لگا۔

"یہ انکشاف کہ استغاثہ کے گواہ اے جی کو آپ ہی نے بتایا تھا کہ ملزم نے اپنی بیوی کو طلاق کا نوٹس بھجوا رکھا ہے......" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مم......میں تو......اے جی کو جانتا تک نہیں......" وہ بدحواس ہوگیا۔ "جب میں......اس بارے میں خود کچھ نہیں جانتا تو......اسے کیا بتاؤں گا......اس نے جھوٹ بولا ہے......میں تو اے جی سے ملا تک نہیں......"

وہ پوری طرح میرے شکنجے میں آچکا تھا۔ میں نے

اپنی جرح کے جال کو غیر محسوس انداز میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''خالد صاحب! آپ معزز عدالت کے روبرو تھوڑی دیر پہلے یہ اقرار کرچکے ہیں کہ آپ کو ملزم کے اپنی بیوی شگفتہ کو بھیجے گئے طلاق کے نوٹس کا علم نہیں ہے۔ اگر یہ فرضِ محال آپ کی بات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر ظاہر ہے، آپ نے اس نوٹس کے حوالے سے اے جی کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ اے جی نے جہاں اور بہت سے جھوٹ بولے ہیں یا وہاں اس کی یہ بات بھی جھوٹ ہی ہوگی لیکن ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ کی اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ آپ اے جی کو جانتے تک نہیں اور ...... یہ کہ آپ اس سے ملے تک نہیں......؟''

''جی ...... وہ میرا مطلب یہ تھا کہ ......'' وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولا'' کہ ...... میں نہ تو اے جی سے ملا اور نہ ہی میں نے اسے طلاق والے کسی نوٹس کے بارے میں بتایا......''

''مطلب ...... آپ اسے جانتے تو ہیں نا؟''

''جی ...... بس اس حد تک کہ وہ کسی زمانے میں آنٹی مہر النسا کے ہاں ڈرائیوری کرتا تھا۔'' وہ صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔

''مگر یہ تو لگ بھگ بارہ سال پہلے کی بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''جی ...... اتنا عرصہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''آخری مرتبہ اے جی سے آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے اچھی طرح یاد نہیں جناب۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا'' کافی عرصہ گزر چکا ہے۔''

''کافی عرصہ مطلب ...... کئی سال؟''

''جی ...... کئی سال۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''خالد مقبول صاحب!'' میں نے اپنے لہجے میں درشتی بھرتے ہوئے کہا'' آج سے ٹھیک نو دن پہلے یعنی گزشتہ پیشی کے اگلے روز استغاثہ کا گواہ عبدالغفار عرف اے جی دوپہر کے وقت ملزم کی بیوی شگفتہ سے ملاقات کرنے اس کے بنگلے پر گیا تھا۔ کیا آپ اس بات سے بھی انکار کرتے ہیں؟''

میں نے پچھلی پیشی پر ملزم کے دوست ملک نعیم کی یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ اے جی پر گہری نگاہ رکھے۔ ملک صاحب نے مجھے خاصی اہم اطلاعات فراہم کی تھیں۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' میں دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں نہیں رہتا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔'' لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے معاملات کی تو پوری خبر ہوگی ...... ہیں نا؟''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔'' میں سمجھا نہیں......!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔'' میری معلومات کے مطابق، اسی روز گواہ اے جی نے شگفتہ سے ملاقات کرنے کے بعد آپ سے رابطہ کیا تھا اور......''

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو کسی نے مس گائیڈ کیا ہے۔''

''اور آپ لوگوں کے بیچ شام میں طارق روڈ کے ایک معروف کیفے میں ملاقات طے پا گئی تھی۔'' میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔'' آپ دونوں شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک مذکورہ کیفے میں بیٹھے گمبھیر معاملات پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ وہ گمبھیر معاملات کیا تھے؟''

''آپ بکواس کررہے ہیں ......'' وہ ایک دم غصے سے اکھڑ گیا۔'' آپ مجھے جانتے نہیں ہو کہ میں ......''

''کہ تم کتنے بڑے غنڈے ہو۔'' میں نے ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے اس کا جملہ مکمل کردیا۔'' ہیں نا ......؟''

''وکیل کے بچے! میں تمہیں دیکھ لوں گا۔'' وہ آپے سے باہر ہوگیا۔

''آرڈر ...... آرڈر ......!'' جج نے تحکمانہ انداز میں کہا پھر براہِ راست گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے تنبیہ کی۔

''مسٹر خالد! سوچ سمجھ کر الفاظ کو زبان سے نکالو۔ یہ عدالت کا کمرا ہے، تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں۔ اگر تم نے عدالت کے وقار کا خیال نہ رکھا تو میں تمہیں جیل بھجوادوں گا۔''

وکیل استغاثہ اس موقع پر اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔'' میرے فاضل دوست! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ استغاثہ کے گواہان اے جی اور خالد مقبول نے طارق روڈ کے کسی کیفے میں نو دن پہلے کوئی ملاقات کی تھی؟''

''اس کیفے کا منیجر اور ایک ویٹر۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وکیل استغاثہ نے بھویں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

''اس شام خالد مقبول اور اے جی اپنے معاملات میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ کیفے سے اٹھتے وقت خالد نے کھانے کے بل کے برابر ویٹر کو ٹپ دے دی تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''ویٹر نے جاکر اپنے منیجر کو بتایا تو منیجر نے کہا تھا...... سالے نشے میں لگتے ہیں۔ اگر معزز عدالت ضروری سمجھے گی تو میں مذکورہ کیفے کے منیجر اور ویٹر کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کردوں گا۔''

''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟'' جج نے خالد مقبول سے استفسار کیا۔

''مم...... میں کیا کہوں سر......'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میں تو...... کسی کیفے میں نہیں...... گیا تھا......''

''بیگ صاحب! آپ آئندہ پیشی پر اس منیجر اور ویٹر کو عدالت میں پیش کریں گے۔'' جج نے مجھ سے کہا پھر وکیل استغاثہ کو ہدایت کی۔''وکیل صاحب! اگلی پیشی پر آپ خالد اور اے جی کو بھی عدالت میں حاضر کریں گے تاکہ شناخت کا مرحلہ آسانی سے طے ہوجائے۔''

وکیل استغاثہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آئندہ پیشی پر میں دو ایسے افراد کو بھی عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی شہادت اس کیس کا نقشہ بدل دے گی۔''

وکیل استغاثہ نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن میں نے چونکہ بڑے مبہم انداز میں بات کی تھی لہٰذا اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔

''اوکے......'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

''خالد مقبول!'' میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔''مجھے پتا چلا ہے، بیس اگست یعنی وقوعہ کے روز تم نے آفس سے چھٹی کی تھی اور تم اسی دوپہر شگفتہ سے ملنے اس کے بنگلے پر گئے تھے...... کیا کوئی خاص کام تھا؟''

میرے استفسار پر وہ اس طرح اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔''آپ کو بالکل غلط پتا چلا ہے۔''

''مطلب...... کیا غلط پتا چلا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔''کیا وقوعہ کے روز یعنی بیس اگست کو تم نے آفس سے چھٹی نہیں کی تھی؟ یا اس روز تم ملزم کے بنگلے پر نہیں گئے تھے؟ یا اس روز تم نے شگفتہ سے ملاقات نہیں کی تھی؟''

''مم...... میری طبیعت خراب تھی اس لیے میں نے آفس سے چھٹی کی تھی۔'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن...... میں ملزم کے بنگلے کی طرف نہیں گیا...... اور......''

''اور شگفتہ سے ملاقات کی تھی!'' میں نے اس کی لکنت کو بریک لگاتے ہوئے کہا۔''ہیں نا؟''

''نن...... نہیں......'' وہ بدحواسی کے عالم میں گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔''مم...... میرا خیال ہے...... وہ کوئی اور دن تھا شاید......''

''وہ کوئی اور دن نہیں بلکہ بیس اگست ہی تھا یعنی وقوعہ والا دن......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگا۔

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔''کیسی عجیب بات ہے کہ بیس اگست کو استغاثہ کے گواہ عبدالغفار عرف اے جی نے اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث کی اسٹیٹ سے چھٹی کی لیکن وہ جائے وقوعہ یعنی بنگلا نمبر چونتیس کے آس پاس موجود تھا۔ بیس اگست ہی کو استغاثہ کے دوسرے گواہ اور ملزم کے کیشیئر کم منیجر خالد مقبول کی بھی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ بھی آفس نہیں جاسکا۔ اسی روز ملزم کی بیوی شگفتہ اپنے بیٹے کے ہمراہ مہر النسا کے گھر چلی گئی۔ اسی روز ملزم کی ملازمہ کو بھی چھٹی دے دی گئی۔ ''چھٹی دے دی گئی'' کے الفاظ اس لیے استعمال کررہا ہوں کہ میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے اور یہ ثبوت میں آئندہ تاریخ پر عدالت میں پیش کروں گا کہ گھریلو ملازمہ شکیلہ نے وقوعہ کے روز ازخود چھٹی نہیں کی تھی۔ اسی روز مقتول سعدیہ نے اپنی مفلوج والدہ حاجرہ بیگم کے لیے ایک بجے دفتر سے چھٹی کی اور پھر وہ بنگلا نمبر چونتیس میں موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ یہ سب اتفاقات نہیں ہوسکتے۔ یقیناً ان کے پیچھے کوئی گہری سازش چھپی ہوئی ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر دوبارہ خالد مقبول کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کیا تم اس بات سے واقف تھے کہ وقوعہ کے روز شگفتہ اپنے بیٹے کامران کے ساتھ مہر النسا کے گھر گئی تھی؟''

''جی مجھے پتا چلا تھا......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''ملزم نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گھریلو ملازمہ کو بھی چھٹی دی اور بیوی بچوں کو بھی سسرال بھیج دیا تھا۔'' گواہ کی ڈھٹائی کی جوتا کاری کے لیے میں نے ملک نعیم سے حاصل ہونے والی معلومات کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔''مجھے پتا چلا ہے کہ وقوعہ کے روز اپنے میکے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد شگفتہ کامران کو اس کی نانی مہر النسا کے

پاس چھوڑ کر تمہارے ساتھ کہیں گئی تھی......؟"

وہ چونکنا انداز میں مجھے تکنے لگا پھر جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں...... اس روز میں شگفتہ سے بالکل نہیں ملا۔"

"بیس اگست یعنی وقوعہ کے روز تم دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان کہاں تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کافی دن گزر گئے ہیں......" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "اب مجھے یاد نہیں۔"

"اس دن کی ایک ایک سرگرمی تمہیں ازبر ہے۔" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ "اور اگر یاد نہیں تو صرف یہ کہ......تم خود کہاں تھے......؟" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ وقوعہ کی دوپہر تم اور شگفتہ مہرالنسا کے گھر سے ایک ساتھ نکلے تھے اور......ملزم کے گھر بنگلا نمبر چونتیس واقع شادمان ٹاؤن پہنچے تھے......!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!"

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عبدالغفار عرف اے جی اور خالد مقبول عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔ استغاثہ کی جانب سے اے جی کی بیماری کا سرٹیفکیٹ داخل کردیا گیا تھا اور خالد مقبول کو اچانک حیدرآباد جانا پڑ گیا تھا۔ استغاثہ کے مطابق، وہاں اس کے کسی عزیز کا انتقال ہوگیا تھا۔ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ایسی کوئی صورتِ حال پیش آسکتی ہے لہٰذا میں نے اس سچویشن سے نمٹنے کے لیے متبادل بندوبست کررکھا تھا۔

میری جانب سے طارق روڈ والے کیفے کا منیجر اور بیرا عدالت کے کمرے کے باہر موجود تھے۔ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! جیسا کہ پچھلی پیشی پر میں نے ایک اہم انکشاف کیا تھا کہ مذکورہ پیشی سے نو دن پہلے طارق روڈ کے ایک کیفے میں استغاثہ کے گواہان اے جی اور خالد مقبول نے ایک خفیہ ملاقات کی تھی لیکن گزشتہ پیشی پر خالد مقبول نے بڑی شدت سے اس امر کی تردید کی تھی۔ آج اگر استغاثہ کے گواہان عدالت میں موجود ہوتے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجاتا تاہم مذکورہ کیفے کا منیجر اور ویٹر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہوتو میں انہیں اندر بلاکر چند اہم سوالات کرلوں تاکہ استغاثہ کے دونوں گواہان کے جھوٹ کا پول کھل جائے۔"

جج نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

اگلے ہی لمحے صفائی کے دونوں گواہان وٹنس باکس میں موجود تھے۔ ان دونوں کو چونکہ ایک ہی بات کی تصدیق کرنا تھی لہٰذا انہیں مشترکہ ٹرائل سے گزارا گیا۔

میں نے اپنی فائل میں سے دو فوٹو برآمد کیے۔ یہ وہ بندوبست تھا جو میں نے کسی ایمرجنسی کے لیے کیا تھا۔ یہ فوٹو ملک نعیم نے مجھے مہیا کیے تھے۔ ان میں سے ایک فوٹو اے جی کا اور دوسرا خالد مقبول کا تھا۔ میں نے مذکورہ دونوں فوٹو صفائی کے گواہان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آج سے لگ بھگ سولہ دن پہلے ایک شام یہ دونوں افراد آپ کے کیفے میں آئے تھے۔ کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟"

"بالکل پہچانتے ہیں جناب!" ویٹر نے پُروثوق انداز میں کہا۔ "انہوں نے ایک ایسی حرکت کی تھی کہ انہیں بھلایا ہی نہیں جاسکتا۔"

"مثلاً......کون سی حرکت؟" میں نے پوچھا۔

"جب یہ لوگ کیفے سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے بل کی رقم کے برابر ویٹر کو ٹپ دی تھی۔" منیجر نے جواب میں بتایا۔ "ویٹر نے آکر مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو میں نے اس سے کہا......رکھ لو میاں! سمجھو، آج تمہاری عید ہوگئی۔"

"آپ نے اس موقع پر ایک خاص نوعیت کا تبصرہ بھی کیا تھا؟" میں نے منیجر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس جناب، وہ میرا ایک فوری خیال تھا۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے کہا تھا کہ لگتا ہے یہ دونوں نشے میں ہیں ورنہ کوئی انسان بہ قائمی ہوش و حواس بل کے برابر ٹپ نہیں دیتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یا تو نشے کی حالت میں انسان اس قسم کی حرکت کرتا ہے یا پھر وہ جب حد سے زیادہ خوش ہو......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر منیجر سے استفسار کیا۔

"کیا آپ نے ایسا محسوس کیا تھا کہ یہ دونوں افراد اس وقت بہت زیادہ خوش ہوں......؟"

"میں نے غور نہیں کیا کیونکہ میں نے براہِ راست

انہیں نہیں دیکھا تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''اس سلسلے میں یہ ویٹر آپ کی راہنمائی کرسکتا ہے۔''

میں منیجر کو چھوڑ کر ویٹر کی جانب متوجہ ہوگیا اور اس سے سوال کیا۔ ''وہ دونوں کتنے بجے تمہارے کیفے میں آئے تھے؟''

''لگ بھگ چھے بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور گئے کتنے بجے تھے؟''

''آٹھ بجے۔''

''اوہ......تو انہوں نے پورے دو گھنٹے تمہارے کیفے میں گزارے تھے۔'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''اس دوران میں انہوں نے کیا کھایا پیا تھا؟''

''پہلے اورنج جوس۔ اس کے بعد کلب سینڈوچ اور چائے۔'' ویٹر نے بتایا۔

''کیا وہ اس دو گھنٹے کی میٹنگ کے دوران میں خوشی سے قہقہے بھی لگاتے رہے تھے؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں بہت چپ چپ اور خاموش تھے۔ وہ جب بات کرتے لہجے کو دھیما رکھتے تھے۔ میں ان کی باتیں تو نہیں سن سکا تاہم اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کسی گمبھیر مسئلے کو لے کر کافی پریشان نظر آتے تھے۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''وہ اس شام نہ تو نشے میں تھے اور نہ ہی کسی بات پر بہت زیادہ خوش تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سعد یہ مرڈر کیس کے حوالے سے بہت زیادہ فکر مند تھے اور اسی پریشانی کے عالم میں انہیں مطلق احساس نہ ہوسکا کہ وہ تمہیں کس قدر تگڑی ٹپ دے کر جا رہے ہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے صفائی کے گواہان سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ پیشی پر آپ نے بتایا تھا کہ اس پیشی پر آپ دو ایسے گواہوں کو پیش کریں گے جن کی گواہی اس کیس کا نقشہ بدل دے گی۔ کیا مذکورہ افراد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں؟''

''یس، یور آنر......'' میں نے کراری آواز میں کہا۔ ''ان میں سے ایک شخص کاروباری دورے پر اس وقت ملک سے باہر ہے البتہ، دوسرا گواہ اس وقت عدالت میں حاضر ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو مذکورہ گواہ کو ابھی پیش کرتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے مخصوص لہجے میں کہا۔

ایک مرتبہ پھر صفائی کے گواہ کو وٹنس باکس میں پہنچا دیا گیا۔ میں جج کی اجازت سے جرح کے لیے آگے بڑھا اور گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ نجم الدین ہیں؟''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میرا نام نجم الدین شیخ ہے۔''

''آپ کے بزنس پارٹنر شبیر شاہ صاحب اس وقت بیرونِ ملک دورے پر ہیں۔''

میں نے دھیمے انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ کے پارٹنر کون سے ملک گئے ہوئے ہیں؟''

''یوکے!'' اس نے جواب دیا۔

''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو آپ کا بزنس امپورٹ ایکسپورٹ سے متعلق ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''جس میں کتابوں کی امپورٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے انگلی سے اکیوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ان کا نام وحید خان ہے اور یہ ''خسان بک سیلرز'' کے نام سے کتابوں کا بزنس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مارکیٹنگ کے شعبے کو بھی ڈیل کرتے ہیں۔''

''آخری بار......میرا مطلب ہے، آج سے پہلے ملزم سے آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے استفسار کیا۔

''ایک ہوٹل میں لنچ پر ہماری میٹنگ ہوئی تھی۔'' اس نے ہوٹل کا نام لیتے ہوئے بتایا۔ ''اور یہ واقعہ پچھلے سال اگست کا ہے۔''

اب اس کیس کو عدالت میں لگے چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لہٰذا ''پچھلے سال'' کے الفاظ استعمال کرنا درست تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اگست کی کون سی تاریخ؟''

''بیس اگست۔'' اس نے جواب دیا۔

"آپ کو اچھی طرح "بیس اگست" یاد ہے یا اندازے کی بنا پر یہ تاریخ بتا رہے ہیں؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔" وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

"اس لیے کہ ہم لوگ باقاعدہ اپائنٹمنٹ لے کر ملے تھے اور آپ جانتے ہیں، ایسے تمام بزنس اپائنٹ منٹس کو ڈائری میں نوٹ بھی کیا جاتا ہے لہٰذا تاریخ کے بارے میں کسی اندازے یا ابہام کی گنجائش نہیں۔ ہم پچھلے سال بیس اگست کی دوپہر ہی کو ملے تھے۔"

"اس وقت آپ کے ساتھ آپ کے بزنس پارٹنر شبیر شاہ بھی موجود تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جی بالکل۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "یہ میٹنگ ہم تینوں کے درمیان ہی ہوئی تھی۔"

"ملزم کتنے بجے مذکورہ ہوٹل پہنچا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ "دو بجے دوپہر یا چند منٹ پہلے۔"

"چند منٹ پہلے۔" میں نے اس کے الفاظ کو دہرایا پھر سوال کیا۔ "کیا یہ چند منٹ دو بجے کے بعد بھی ہو سکتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہمارے بیچ رسمی علیک سلیک ہو گئی اور ویٹر آرڈر لینے کے لیے آیا تو میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا تھا اور وہاں دوپہر کے دو بج رہے تھے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وحید خان دو بجنے سے پانچ دس منٹ پہلے ہی ہوٹل پہنچ گیا تھا۔"

"اوکے......" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور سوال کیا۔ "شیخ صاحب! عدالت یہ جاننے کی خواہش مند ہے کہ ملزم بیس اگست کی دوپہر کتنے بجے تک آپ کے ساتھ رہا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ملزم کتنے بجے ہوٹل سے رخصت ہوا تھا؟"

"لگ بھگ چار بجے۔" اس نے جواب دیا۔ "یا زیادہ سے زیادہ سوا چار بجے۔"

"چار بجے سے پہلے تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں......!"

میں نے پوچھا۔ "کیا ملزم اس دوران میں میٹنگ سے اٹھ کر ہوٹل سے باہر بھی گیا تھا؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ملزم تمام وقت ہمارے ساتھ مصروف رہا تھا۔"

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور بااعتماد انداز میں بولنا شروع کیا۔ "جناب عالی! نجم الدین شیخ صاحب اس معاشرے کے ایک باعزت اور سلجھے ہوئے قابلِ بھروسا انسان ہیں۔ ان کی گواہی کو کسی شک و شبہے کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ملزم کا بھی یہی بیان ہے کہ وقوعہ کے روز وہ ایک کاروباری میٹنگ کے لیے دوپہر ایک بج کر تیس منٹ پر اپنے دفتر سے نکلا تھا اور کم و بیش دو بجے وہ مذکورہ ہوٹل پہنچا تھا پھر چار بجے سہ پہر تک وہ نجم الدین شیخ اور شبیر شاہ کے ساتھ کاروباری میٹنگ میں مصروف رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی وہ ہوٹل سے اٹھ کر کہیں باہر نہیں گیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ سیدھا اپنے گھر کی طرف گیا اور واقعات کے مطابق، وہ ٹھیک پانچ بجے اپنے گھر بنگلا نمبر چونتیس، واقع شادمان پہنچا تھا......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"یور آنر! پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ سعدیہ کی موت بیس اگست کی دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس وقت ملزم ایک مقامی ہوٹل میں کاروباری میٹنگ میں مصروف تھا لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ کسی بھی حوالے اور کسی بھی زاویے سے ملزم قتل کی اس واردات اور مجرمانہ حملے میں ملوث ہو۔ مجھے یقین ہے اور واقعات و شواہد بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ میرے مؤکل کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے مؤکل کو باعزت بری کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔"

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وکیل صاحب! آپ کی طرف سے فراہم کردہ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں صرف ایک نام باقی بچا ہے یعنی ملزم کی بیوی شگفتہ۔ کیا آپ شگفتہ کو اگلی پیشی پر عدالت میں پیش کر سکتے ہیں تاکہ یہ کیس جلد از جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے؟"

وکیل استغاثہ نے اثبات میں جواب دیا۔ "یس سر! اگلی پیشی پر شگفتہ کو حاضر کر دیا جائے گا۔"

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ شگفتہ کے ساتھ اس کے بیٹے کامران کو بھی عدالت میں طلب کیا جائے۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے اعتراض

کیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے فاضل دوست ننھے کامران کو کس حیثیت سے عدالت بلا رہے ہیں۔ صفائی کے گواہ کے طور پر یا استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے؟“

”میں سمجھتا ہوں مائی ڈیئر پراسیکیوٹر!“ میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ننھے کامران کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت بلانا چاہتا ہوں۔ میں کامران سے ایک یا دو سوال کروں گا۔ بس......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! اگر میں کامران کو الگ سے عدالت میں بلانے کی بات کروں گا تو اس صورت میں شگفتہ کو دو مرتبہ عدالت آنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی کیونکہ دس سالہ کامران اکیلا نہیں آسکے گا اور...... میں محترمہ شگفتہ کو ایسی زحمت نہیں دینا چاہتا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ ان کا شوہر پچھلے سات آٹھ ماہ سے قتل اور مجرمانہ حملے کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا رہا ہے۔“ میرے لہجے کی گہرائی میں کڑوا طنز چھپا ہوا تھا۔

”آپ کامران سے کون سے سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟“ وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

”یہ میں اسی وقت بتاؤں گا جب کامران وٹنس باکس میں پہنچے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو چند دن تک انتظار کی زحمت اٹھانا ہوگی میرے فاضل دوست۔“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

جج نے میری درخواست منظور کر لی اور ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو نعیم ملک نے کہا۔ ”بیگ صاحب! مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگلی پیشی پر اس کیس کا فیصلہ ہو جائے گا۔“

”میں آپ کے احساسات کو چیلنج تو نہیں کر سکتا البتہ آپ کے جملے میں چند الفاظ کا اضافہ ضرور کروں گا۔“ میں نے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کون سے الفاظ؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے اس کے جملے میں چند الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگلی پیشی پر اس کیس کا فیصلہ وحید خان کے حق میں ہو جائے گا۔“

”زبردست......!“ وہ اش اش کر اٹھا۔ ”ان شاء اللہ......!“

میں اس سے الوداعی مصافحہ کر کے اپنی گاڑی کی سمت بڑھا تو وہ متذبذب انداز میں مستفسر ہوا۔ ”بیگ صاحب! ایک بات تو بتائیں......!“

”ملک صاحب! پوچھیں کیا بات ہے؟“

”آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ...... میں آپ کے احساسات کو چیلنج تو نہیں کر سکتا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا کیا مطلب تھا؟“

”بھئی، چیلنج کرنے کا مطلب ہے، پنگا لینا۔“ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کا جس محکمے سے تعلق ہے اس سے پنگا لے کر کسی نے اندھیرے اور گرمی میں مرنا ہے کیا؟“

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور عدالت کے کمرے میں شگفتہ، کامران کے سوا دیگر تمام متعلقہ افراد موجود تھے۔ شگفتہ اور کامران باہر برآمدے میں بیٹھے اپنے پکارے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر...... مگر ان کی نگاہ سے اوجھل ایک اور شخصیت اس وقت عدالت سے باہر میرے اشارے کی منتظر بیٹھی تھی۔ اس شخصیت کو میں نے اس کیس میں صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بلایا تھا۔

جج کرسیٔ انصاف پر آکر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ استدعا کی۔

”جنابِ عالی! ملزم ایک معزز شخص ہے اور میری خواہش ہے کہ اس کا بیٹا اسے اس حال میں نہ دیکھے لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو کٹہرے باکس سے نکال کر تھوڑی دیر کے لیے پچھلی نشستوں میں سے کسی پر بٹھا دیا جائے۔“

میں توقع کر رہا تھا کہ وکیل استغاثہ ”آبجیکشن یور آنر“ کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں جست لگائے گا لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے اس معاملے سے لاتعلقی اور خاموشی کا اظہار کیا۔ جج نے میری درخواست پر ملزم وحید خان کو عقبی حصے میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اور اس کے سامنے دو کانسٹیبلوں کو کھڑا کر دیا تاکہ وٹنس باکس میں کھڑے کامران کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔ اس کے بعد کامران کو اندر بلا لیا گیا۔ شگفتہ کامران کے ساتھ ہی اندر آنا چاہتی تھی مگر میں نے پچے والے سے کہا کہ وہ شگفتہ کو باہر روک کر صرف کامران کو اندر آنے دے۔ پچے والے نے میری ہدایت پر عمل کیا اور جیسے ہی کامران نے عدالت کے کمرے

میں قدم رکھا۔ پیچھے والے نے دروازہ بند کر دیا۔ متعلقہ عدالتی عملے کی راہنمائی میں کامران کو وٹنیس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں پہنچا دیا گیا۔

کامران خاصا سہما ہوا تھا۔ اس کی عمر دس سال سے متجاوز تھی۔ وہ پھولے ہوئے گالوں والا ایک کیوٹ بچہ تھا تاہم اس وقت اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ میں کٹہرے کے قریب پہنچا اور دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

''کامران! کیسے ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں انکل......!'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔'' میں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے دو تین باتیں کروں گا پھر آپ باہر اپنی ممی کے پاس چلے جانا...... او کے!''

''او کے!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''آپ بہت اچھے بچے ہو۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور اچھے بچے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ میں آپ سے جو بھی پوچھوں، آپ اس کا سچ سچ جواب دو گے نا؟''

''جی انکل، میں سچ بولوں گا۔''

''آپ کس کلاس میں پڑھتے ہو؟''

''ففتھ میں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب سکستھ میں جاؤں گا۔''

''آپ کو وہ دن یاد ہے نا جب آپ کے بنگلے میں کسی لڑکی کو قتل کر دیا گیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''پھر آپ کے پاپا کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔''

''جی، مجھے یاد ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن اس دن میں گھر میں نہیں تھا۔''

''آپ اس دن اپنی نانی کے گھر گئے ہوئے تھے...... ہیں نا؟''

''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائید کی۔

''اور آپ اپنی ممی کے ساتھ نانی کے گھر گئے تھے؟''

''جی......'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

یہاں سے میں نے ملک نعیم کی فراہم کردہ معلومات کا استعمال شروع کیا اور کامران کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس روز تم اسکول تو گئے تھے نا؟''

''جی انکل، میں اسکول گیا تھا۔''

''اور اس دن آپ کی ممی نے آپ کو اسکول سے بہت جلدی لے لیا تھا...... تقریباً بارہ بجے۔'' میں نے بدستور ملائم لہجے میں استفسار جاری رکھا۔ ''جبکہ آپ کی چھٹی ایک بج کر تیس منٹ پر ہوتی ہے؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میری چھٹی ایک تیس پر ہی ہوتی ہے۔''

''اسکول سے نکلنے کے بعد آپ نے اپنے پاپا کو فون کر کے بتایا تھا کہ آج آپ کی چھٹی جلدی ہو گئی ہے اور آپ اپنی نانی کے گھر جا رہے ہیں......!''

''جی، میں نے یہی کہا تھا۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''اور یہ جھوٹ میں نے ممی کے کہنے پر بولا تھا۔ ممی نے کہا تھا کہ اگر میں نے پاپا کو بتایا کہ مجھے چھٹی سے پہلے اسکول سے نکالا ہے تو وہ ناراض ہوں گے اس لیے میں نے جھوٹ بولا کہ آج جلدی چھٹی ہو گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ آپ فکر نہیں کرو۔ یہ جھوٹ آپ نے اپنی ممی کے کہنے پر بولا تھا اس لیے آپ کو پنش نہیں کیا جائے گا۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے بدلے میں آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا!''

''کیا وعدہ؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''یہ وعدہ کہ آج کے بعد آپ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے!''

''پکا وعدہ۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''کامران بیٹا! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ اس روز تم اپنی ممی کے ساتھ کتنے بجے اپنی نانی کے گھر پہنچے تھے؟'' میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''ساڑھے بارہ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا دن کا باقی حصہ تم اپنی نانی کے گھر ہی میں رہے تھے؟''

''جی انکل......''

''اور تمہاری ممی......؟''

''وہ تھوڑی دیر کے بعد کہیں چلی گئی تھیں۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں چلی گئی تھیں؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا......'' وہ معصومیت سے بولا۔

''اچھا، یہ بتائیں کہ آپ کی ممی اکیلی ہی گئی تھیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی گیا تھا؟'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ انکل خالد کے ساتھ گئی تھیں۔'' کامران نے سادگی سے جواب دیا۔

''کیا آپ ان انکل کی بات کر رہے ہو جو آپ کے

پاپا کے آفس میں منیجر ہیں۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''جن کا پورا نام خالد مقبول ہے؟''

''جی انکل وہی......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ہم نانی کے گھر پہنچے ہی تھے کہ انکل خالد وہاں آگئے پھر ممی انکل خالد کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی تھیں۔''

''آپ کی ممی کتنے بجے واپس آئی تھیں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''چار بجے کے بعد۔'' اس نے معصومیت بھرے لہجے میں بتایا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کامران سے اور کچھ نہیں پوچھنا لیکن معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ کامران کو عدالت کے کمرے سے باہر بھیجنے سے پہلے اس کی ممی شگفتہ کو اندر بلالیا جائے۔ اگر شگفتہ کی گواہی سے پہلے ماں بیٹے کو بات کرنے کا موقع مل گیا تو اس سے آنے والی عدالتی کارروائی متاثر ہوسکتی ہے۔''

جج میرے نکتے کو سمجھ گیا لہٰذا اس نے فوراً میری درخواست منظور کرتے ہوئے پہلے شگفتہ کو اندر بلایا پھر کامران کو باہر بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی جج کے حکم پر وحید خان کو واپس اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں پہنچا دیا گیا۔

شگفتہ کی عمر پینتالیس کے اریب قریب تھی تاہم وہ اپنے موٹے اور بھدے بدن کے طفیل پچاس سے زیادہ کی دکھائی دیتی تھی۔ اس طویل و عریض جسم کے ساتھ ماشاءاللہ! اس نے گہرا سانولا رنگ بھی پایا تھا۔ اگر آپ کبھی سوڈان گئے ہوں یا سوڈانی عورتوں کو کہیں دیکھا ہے تو چشم تصور سے خود ہی نظارہ کرلیں کہ وحید خان نے پچھلے بارہ تیرہ سال کس جثے اور کس غصے والی عورت کے ساتھ گزارے ہوں گے۔ میں اگر کچھ عرض کروں گا تو شکایت ہوگی......!

شگفتہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ ''میں اس عدالت کے علم میں لانا چاہتی ہوں مقتولہ سعدیہ ایک معصوم اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اس کا تعلق ایک معزز اور شریف گھرانے سے تھا۔ وہ جب وحید کے پاس ملازمت کے لیے آئی تو میں نے موقع پاکر ایک دن اسے نصیحت کی تھی کہ وہ اپنے باس یعنی وحید خان کی طرف سے بہت محتاط رہے۔ میں وحید کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ بہت ہی دل پھینک اور آوارہ شخص ہے۔ مقتولہ سے پہلے ملزم کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے کئی لڑکیاں ملازمت چھوڑ کر جاچکی تھیں لیکن افسوس کہ میری بات مقتولہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ ملزم کی لچھے دار باتوں میں آگئی۔ ملزم نے اس طرح مقتولہ کو اپنی فریبی محبت کے شیشے میں اتارا کہ وہ بے وقوف لڑکی اپنی جان ہار بیٹھی۔''

شگفتہ کا بیان سراسر ملزم کے خلاف تھا۔ وکیل استغاثہ گواہ کے قریب پہنچا اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''شگفتہ جی! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ مقتولہ سعدیہ کو وحید خان ہی نے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''اس میں یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔'' وہ نفرت آمیز انداز میں ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سعدیہ اس کی سیکریٹری تھی۔ آفس ٹائم میں وہ اپنے باس کا ہر حکم ماننے کی پابند تھی لہٰذا محبت کا فریب دے کر اس شخص نے مقتولہ کو اپنے چنگل میں پھنسالیا اور جب وقوعہ کے روز اس بات کا پتا چلا کہ میں اپنی امی کے گھر چلی گئی ہوں اور بنگلا خالی پڑا ہے تو اس نے موقع غنیمت جانا اور ہوس کے ہاتھوں مجبور ہوکر کامران کی سالگرہ کا بہانہ کرکے یہ مقتولہ کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اگر اس نے اس معصوم لڑکی کو قتل نہیں کیا ہوتا تو آج یہ ندامت سے گردن جھکائے کٹہرے میں نہ کھڑا ہوتا۔''

''شگفتہ جی! ملزم کے کردار کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ''آپ نے لگ بھگ بارہ سال اس شخص کے ساتھ گزارے ہیں۔ آپ کی رائے کی بڑی اہمیت ہے۔''

''اگر آپ اس شخص کے بارے میں میری رائے جاننا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گی......'' اس نے ناپسندیدہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''انتہائی گھٹیا اور شرم ناک!''

وکیل استغاثہ نے مزید ایک دو سوالات کے بعد جرح ختم کردی۔

میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''شگفتہ صاحبہ! کیا یہ درست ہے کہ آپ نے مقتولہ کو ملزم کی جاسوسی کرنے کے لیے کہا تھا؟''

''یہ درست نہیں ہے۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''میں نے صرف اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ملزم کی

طرف سے بہت محتاط رہے ورنہ اس کی زندگی برباد ہو جائے گی اور یہ بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا......''

اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے استفسارات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''اور مقتولہ نے آپ کی بات پر کان نہیں دھرے۔ وہ ملزم کی جاسوسی کرنے کے بجائے اس کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہو گئی، نتیجتاً وہ ملزم کے بہت زیادہ قریب ہو گئی۔ ملزم ایک دو بار مقتولہ کے گھر بھی گیا تھا۔''

''میں مرنے والی کی برائی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اسے قدرت کی طرف سے جو سزا مل چکی ہے وہ کافی ہے۔''

''مسز وحید! مجھے پتا چلا ہے کہ......''

''ایکسکیوز می...... '' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ ''میں اب مسز وحید نہیں، شگفتہ فاروق ہوں۔''

''اوہ سوری...... کیا آپ نے کسی فاروق صاحب سے شادی کر لی ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے اور خاصی برہمی سے بولی۔ ''فاروق میرے والد کا نام ہے۔''

گویا اس نے خود کو وحید خان کی زوجیت سے خارج کر لیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ''سوری'' کیا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''شگفتہ صاحبہ! کیا آپ اس بات سے انکار کریں گی کہ ملزم کے دفتر میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی رپورٹ آپ تک پہنچ جایا کرتی تھی؟''

''ہاں، یہ بات درست ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں چونکہ ملزم کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے مجھے اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا پڑتی تھی۔''

''آپ نے اس سلسلے میں مقتولہ سے کام لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آپ کے چکر میں آنے کے بجائے ملزم کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ کس کس ذرائع سے آفس کی خبر گیری کیا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ آفس کی سرگرمیوں کے بارے میں آپ کو کون بتایا کرتا تھا؟''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' وہ وہ رکھائی سے بولی۔

میں نے اس کی رکھائی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے ذرائع نے مجھے بتایا ہے کہ ملزم کا منیجر اور آپ کا کزن اس سلسلے میں آپ کے لیے مخبری کیا کرتا تھا؟''

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا اشارہ خالد مقبول کی طرف ہے۔''

''میں آپ کا اشارہ سمجھ گئی ہوں لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں۔ ایسی کیا بات نہیں؟'' میں نے پلکیں جھپکائیں۔ ''کیا خالد مقبول کے علاوہ دفتر کا کوئی اور شخص بھی یہ خدمات انجام دے رہا تھا؟''

''کوئی عورت اپنے شوہر کو بے لگام نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اور شوہر بھی ایسا جس کا کوئی دین ایمان نہ ہو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے غضب ناک نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کو گھورا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''لہٰذا میں نے بھی اس شخص کی حرکتوں سے باخبر رہنے کے لیے کچھ بندوبست کر رکھا تھا اور...... یہ ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے اس ''انتظام'' کی وضاحت بھی کروں۔''

''اگر آپ ضروری نہیں سمجھتیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔'' میں نے مصلحت بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ جب آپ کو پتا چلا کہ آپ کے شوہر اور مقتولہ کے بیچ کافی سنجیدہ معاملات چل رہے ہیں تو آپ طیش کے عالم میں ملزم کے آفس پہنچ گئی تھیں اور مقتولہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا؟''

''تو کیا اس قسم کی گھٹیا حرکتوں پر میں اس کمینی کو گلے سے لگاتی اور پھولوں کا ہار پہناتی؟'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کیا پتا کہ اس بدذات نے میرے سامنے کس طرح زبان چلائی تھی یہاں تک کہ اس نے اپنی اور ملزم کی شادی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔''

میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ غصے میں ایک اہم راز سے پردہ اٹھا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا، میں نے سوالات کے سلسلے کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شگفتہ صاحبہ! جب مقتولہ نے آپ کے سامنے آفس میں ملزم سے اپنی شادی کا اعلان کیا تو اس موقع پر ملزم نے کس قسم کا ردعمل ظاہر کیا تھا؟''

"اس کے من میں تو اس وقت لڈو پھوٹ رہے تھے۔" وہ انگلی سے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ دونوں بدمعاش اندر سے ملے ہوئے تھے۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ملزم بھی مقتولہ سے شادی کا خواہاں تھا؟" جج نے براہ راست شگفتہ سے سوال کیا۔

"اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی۔" وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔ "اگر ملزم میں ذرا سی بھی شرم وحیا ہوتی تو وہ بیوی بچوں والا ہوتے ہوئے دو ٹکے کی سیکریٹری سے عشق پیچا کیوں لڑاتا اور...... جب وہ آوارہ لڑکی میرے سامنے زبان چلا رہی تھی تو ملزم کو چاہیے تھا کہ اس کا منہ توڑ دے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ یہ دونوں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شادی کرنے والے تھے۔"

"آخر کوئی تو وجہ ہوگی جو ملزم دوسری شادی کا ارادہ رکھتا تھا؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا ملزم آپ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے بلند آواز میں کہا۔ "میرے فاضل دوست استغاثہ کی معزز گواہ کی ازدواجی زندگی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جناب عالی!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ قتل میاں بیوی کی ازدواجی چپقلش کے سبب ہوا ہے لہٰذا معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ملزم کی نجی زندگی کو زیر بحث لانا ناگزیر ہے۔ اب تک کی عدالتی کارروائی کے دوران میں متعدد مقامات پر استغاثہ کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی ہوچکی ہے اور استغاثہ کے بعض گواہوں کی دروغ گوئی بھی کھل کر سامنے آچکی ہے۔ میرا موکل اور اس مقدمے کا ملزم وحید خان بے گناہ ہے۔ کسی گہری سازش کے تحت اسے اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔"

جج نے وکیل استغاثہ کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے گواہ کو حکم دیا کہ وہ میرے سوال کا جواب دے۔

"اگر ملزم مجھ سے مطمئن نہیں تھا تو میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس نے دوسری شادی کا فیصلہ کرلیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور......!"

"محترمہ شگفتہ صاحبہ!" میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "جب آپ کو یقین ہوگیا کہ ملزم دوسری شادی کا فیصلہ کرچکا ہے تو آپ نے اسے دوسری شادی کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے بعد ملزم نے آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک طلاق نامہ بھیجا تھا لیکن آپ نے وہ رجسٹری وصول نہیں کی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "مجھے اس طرح کی کوئی رجسٹری نہیں ملی تھی۔"

میں نے واپس شدہ رجسٹرڈ طلاق نامے کا لفافہ اپنی فائل میں سے نکال کر جج کو دکھایا اور پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! یہ ہے وہ لفافہ جسے استغاثہ کی گواہ اور ملزم کی بیوی شگفتہ نے لینے سے انکار کردیا تھا۔ اس پر ڈاکیے کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ الفاظ بھی درج ہیں ...... "مکتوب الیہ رجسٹری وصول کرنے سے انکاری ہے۔"

یہ رجسٹرڈ طلاق نامہ گزشتہ سال پندرہ مئی کو روانہ کیا گیا تھا اور انیس مئی کو مذکورہ ریمارکس کے ساتھ واپس موصول ہوگیا تھا۔ اس طلاق نامے کی ایک نقل متعلقہ یونین کونسل کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ یونین کونسل کی جانب سے استغاثہ کی گواہ شگفتہ کو ایک سمن بھی بھیجا گیا تھا۔"

"بی بی!" جج نے شگفتہ سے استفسار کیا۔ "آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔ کیا آپ اس بات سے بھی انکاری ہیں کہ یونین کونسل کی جانب سے آپ کو کوئی سمن موصول ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے ......" وہ متامل انداز میں بولی۔ "یونین کونسل کی طرف سے مجھے ایک سمن ملا تو تھا۔"

"خیال کا اظہار نہیں، ٹھیک بات کریں۔" جج نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "ہاں یا نہ میں جواب دیں......!"

"جج ...... جی ......" وہ "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" کی کیفیت میں گرفتار تھی۔ "مجھے ایسا سمن ملا تھا۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"شگفتہ صاحبہ!" میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "طلاق کا نوٹس ملنے کے باوجود بھی آپ اپنے شوہر کے گھر کیوں ٹھہری رہی تھیں حالانکہ آپ کی والدہ مہر النسا ایک عالی شان بنگلے میں رہتی ہیں۔ آپ ان کے پاس قیام کرسکتی تھیں کیونکہ طلاق کے نوٹس کی ترسیل کے بعد اگر نوے دن کے اندر متعلقہ یونین کونسل میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرانے میں کامیاب نہ ہو تو وہ طلاق مؤثر سمجھی جاتی ہے اور ...... یہ مدت پچھلے سال پندرہ اگست کو پوری ہوگئی تھی!"

"مم ...... میں ......" اس نے غضیلی نظر سے ملزم کی طرف دیکھا اور معاندانہ انداز میں بولی۔ "میں اس شخص کو اپنی سیکریٹری کے ساتھ گل چھرے اڑانے کے لیے کیسے

Watch Us On

YouTube

خالص شہد کی پہچان





چہرے کی جھُریوں کا

بہت ہی آسان علاج





آزاد چھوڑ سکتی تھی......؟"

"جنابِ عالی! استغاثہ کی معزز گواہ کا آخری جملہ فکر انگیز اہمیت کا حامل ہے۔" میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اس نکتے کی وضاحت مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں کروں گا۔"

جج نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"محترمہ شگفتہ! آپ نے میرے مؤکل یعنی اس مقدمے کے ملزم وحید خان کو کئی مرتبہ خطرناک اور حساس نوعیت کی دھمکیاں بھی دی تھیں مثلاً ...... جب آفس میں آپ کی مقتولہ سعدیہ کے ساتھ بحث و تکرار ہوئی تو آپ نے کہا تھا...... "میں تم دونوں کو وہ سبق سکھاؤں گی کہ کبھی دوسری شادی کا نام بھی تمہارے ذہنوں میں نہیں آئے گا۔" ایسی ہی ایک دھمکی آپ نے ایک موقع پر ملزم کو علیحدگی میں ان الفاظ میں بھی دی تھی ...... "اگر تم نے کبھی مجھے طلاق دینے کے بارے میں سوچا بھی تو میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی۔" کیا آپ اپنی ان دھمکیوں کی وضاحت کریں گی؟"

"میرے پاس......" اس کی برداشت جواب دینے لگی۔ "آپ کے ان بے ہودہ اور فضول سوالات کا کوئی جواب نہیں۔"

جج نے اسے تنبیہ کی۔ "بی بی! عدالت کے وقار کا خیال رکھیں۔"

وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پچھلے سال دس اگست کو آپ نے یونین کونسل کی طرف سے طلاق کا سمن وصول کیا اور ٹھیک دس دن کے بعد یعنی بیس اگست کو سعدیہ کو آپ کے بنگلے میں قتل کر دیا گیا اور اسی روز آپ نے میکے جانے کا فیصلہ کیا......"

"میں جب چاہوں، اپنے میکے جا سکتی ہوں۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی جارحانہ انداز میں بولی۔ "وکیل صاحب! آپ کو میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہے؟"

"فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "بشرطیکہ یہ فیصلہ آپ کا ہو!"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ عجیب سی نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

"شگفتہ صاحبہ! استغاثہ کے ایک معزز گواہ اور آپ کے کزن خالد مقبول نے عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کی خاطر، میدان صاف کرنے کے لیے آپ کو کامران کے ساتھ میکے بھیج دیا تھا۔ خالد مقبول نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات آپ نے اسے بتائی تھی ......" میں نے بہ دستور اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا فرماتی ہیں؟"

"میں نے تو خالد سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" وہ الجھ کر بولی۔

"تو پھر خالد نے یقیناً غلط بیانی سے کام لیا ہوگا۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ملزم نے آپ کو میکے جانے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ آپ خود اپنی مرضی سے مہرالنسا یعنی اپنی ممی کے گھر گئی تھیں؟"

میں غیر محسوس انداز میں اسے اپنی جرح کے نادیدہ جال میں جکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا، متذبذب انداز میں جواباً بولی۔

"جی...... اس دن کامران کی جلدی چھٹی ہوگئی تھی اس لیے میں اسے لے کر اپنی ممی کے گھر چلی گئی تھی اور کامران نے فون کر کے اپنے باپ کو بتا دیا تھا کہ ہم نانی کے گھر جا رہے ہیں۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ بیس اگست کو کامران کی جلدی چھٹی ہوگئی تھی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"کیوں......؟" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ کو کوئی شک ہے کیا؟"

"یس......!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہ صرف مجھے بلکہ معزز عدالت کو بھی شک ہے اور اس شک کا ایک ٹھوس سبب بھی ہے۔"

"کون سا سبب؟" وہ چونکنا انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

"تھوڑی دیر پہلے آپ کے صاحب زادے کامران نے معزز عدالت کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ اس روز اس کے اسکول کی چھٹی جلدی نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ نے اس کے اسکول پہنچ کر چھٹی سے پہلے اسے پک کرلیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کامران کی چھٹی ایک بج کر تیس منٹ پر ہوتی ہے اور آپ نے اسے ٹھیک بارہ بجے پک کرلیا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔" وہ پیشانی پر ابھر آنے والے پسینے کے ننھے قطروں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے

ہوئے بولی۔ ''میں نے کامران کو محض اس لیے جلدی پک کرلیا تھا کہ وہ زیادہ وقت اپنی نانی کے گھر گزار سکے۔''

''اوکے......'' میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔'' آپ اپنی ملازمہ شکیلہ کے بارے میں کیا کہیں گی؟''

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں بڑی سرعت سے پلکیں جھپکائیں۔'' آخر آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''میری معلومات کے مطابق، آپ کی گھریلو ملازمہ شکیلہ روزانہ گیارہ بجے سے ایک بجے تک آپ کے گھر میں کام کرنے آتی ہے۔ چند منٹ اوپر نیچے ہو سکتے ہیں مگر ٹائم یہی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ غلط نہیں کہہ رہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔'' لگتا ہے، آپ وکالت کے علاوہ جاسوسی کا کام بھی کرتے ہیں۔ آپ نے میرے گھر پر بڑی گہری نظر رکھی ہوئی ہے!''

''میں وکالت کے علاوہ جتنے بھی کام کرتا ہوں وہ وکالت کے لیے ہی کرتا ہوں۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا پھر تیز لہجے میں استفسار کیا۔'' وقوعہ کے روز یعنی بیس اگست کو شکیلہ آپ کے بنگلے پر کام نہیں کرنے آئی۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی...... کیوں؟''

''میں کیا بتاؤں۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔'' یہ بات تو آپ شکیلہ سے جا کر پوچھیں جس نے اس روز چھٹی کرلی تھی۔''

''میں نے شکیلہ سے پوچھا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اور اس نے بتایا ہے کہ اس نے از خود چھٹی نہیں کی تھی بلکہ آپ نے اسے چھٹی دی تھی اور وہ بھی وقوعہ سے ایک دن پہلے یعنی انیس اگست کو جب وہ گھر کا کام ختم کرکے آپ کے بنگلے سے جانے لگی تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ کل وہ چھٹی کرلے یعنی بیس اگست کو وہ کام پر نہیں آنا...... آپ کیا کہتی ہیں بیچ اس مسئلے کے؟''

''اگر شکیلہ نے...... ایسا کہا ہے...... تو سراسر بکواس کی ہے...... اس نے......'' وہ بدحواسی کے عالم میں بولی۔'' میں نے اسے...... کوئی چھوٹی وٹی نہیں...... دی تھی......''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔'' میں ملزم کی گھریلو ملازمہ شکیلہ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا شکیلہ اس وقت عدالت میں موجود ہے؟'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

''یس سر...... وہ عدالت کے کمرے کے باہر ابھی شہادت کی منتظر ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

شگفتہ نے کسی اونٹنی کے مانند گردن اٹھا کر عدالت کے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ میں نے چوٹ کی۔

''وہ کمرے کے اندر نہیں، باہر ہے۔''

''مگر...... باہر تو میں بھی کافی دیر تک بیٹھی رہی ہوں۔'' وہ کسی احمق ایسے لہجے میں بولی۔''وہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔''

''وہ آپ کو نظر نہیں آسکتی تھی......!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیوں؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''اس لیے کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔'' شکیلہ نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے۔''

وہ کھا جانے والی نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔'' بیگ صاحب! آپ اپنی گواہ کو پیش کرسکتے ہیں۔''

اگلے چند منٹ نہایت ہی سنسنی خیز تھے۔ شگفتہ کی الجھن بھری حیرت بجا تھی کیونکہ میں نے شکیلہ کو باہر ایسی جگہ بٹھایا تھا کہ جدھر شگفتہ کی نگاہ نہیں جاسکتی تھی۔ اسی لیے وہ خاصی پریشان بھی تھی۔

شکیلہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا جس کا لب لباب وہی تھا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ انیس اگست کی دوپہر جب وہ کام ختم کرکے اپنے گھر جارہی تھی تو شگفتہ نے اسے آئندہ روز یعنی بیس اگست کو چھٹی کرنے کو کہا تھا۔

میں نے صفائی کی گواہ سے کوئی سوال کرنا ضروری نہیں سمجھا تاہم وکیل استغاثہ پانچ منٹ تک گھما پھرا کر اس پر جرح کرتا رہا لیکن وہ کچھ حاصل نہ کرسکا لہٰذا شہادت مکمل ہونے کے بعد گواہ کو عدالت کے کمرے سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میں دوبارہ شگفتہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

وہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ شکیلہ کی گواہی کے بعد اس کے تعزیے ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ میں نے اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس پر تابڑ توڑ حملے شروع کردیے۔

''محترمہ شگفتہ! میری تحقیق یہ کہتی ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کامران کے ساتھ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے اپنی ممی کے گھر واقع گلشن اقبال پہنچی تھیں پھر ٹھیک پندرہ منٹ کے

بعد یعنی بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر آپ اپنے کزن اور ملزم کے منیجر خالد مقبول کے ساتھ کہیں چلی گئی تھیں جہاں سے آپ کی واپسی کم وبیش چار بجے ہوئی تھی۔ معزز عدالت یہ جاننے میں گہری دلچسپی رکھتی ہے کہ آپ دونوں کہاں گئے تھے اور اس دوران میں آپ نے کیا، کیا تھا؟''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' وہ ایک دم جھٹکے سے اکھڑ گئی۔ ''میں کسی کے ساتھ، کہیں نہیں گئی تھی۔ میں تمام وقت اپنی ممی کے گھر ہی میں رہی تھی......''

''مائنڈ یور لینگویج......'' جج نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بی بی! اگر تم نے عدالت کے وقار کا خیال نہ رکھا تو میں تمہیں توہین عدالت کے جرم میں یہاں سے سیدھا جیل بھجوا دوں گا۔ تمہارا بیٹا کامران اپنی گواہی میں عدالت کو بتا چکا ہے کہ وقوعہ کے روز تم ان اوقات میں خالد مقبول کی ساتھ کہیں گئی تھیں۔''

کامران کی گواہی کا سن کر جیسے اس کے جسم سے جان ہی نکل گئی۔ قبل اس کے کہ وہ خود کو سنبھالتی یا وکیل استغاثہ اس کی حمایت میں کوئی نعرۂ مستانہ بلند کرتا، میں نے اگلا وار کر دیا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ یہ آئیڈیا فی الفور میرے ذہن میں آیا تھا۔

''میرے پاس ایک ایسا گواہ بھی موجود ہے جس نے تمہیں وقوعہ کے روز خالد مقبول کے ساتھ بنگلا نمبر چونتیس واقع شادمان ٹاؤن میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کوئی بیان نہیں دوں گی۔ کوئی مجھے بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا...... میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ میرا نام گواہوں کی فہرست سے نکال دیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ وٹنس باکس سے باہر آنے لگی تو جج نے فوراً اسے ڈانٹ پلائی۔ ''بی بی! کٹہرے میں شرافت سے کھڑی ہو جائیں۔ آپ پابند گواہ ہو۔ آپ کو وکیل صفائی کے سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔''

وہ خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''محترمہ شگفتہ!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میں اب باقاعدہ ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا تھا۔ ''تم وقوعہ کے روز ایک بجے سے لے کر چار بجے تک اپنے کزن کے ساتھ کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھیں؟''

''میں خالد کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی۔'' وہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کامران کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''کامران تو معصوم اور بھولا بھالا بچہ ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اسے غلط فہمی ہو سکتی ہے مگر عبدالغفار عرف اے جی کا کیا کیا جائے......!''

''اے جی کو کیا ہوا؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''اے جی کے بیان کے مطابق، وقوعہ کے روز اس نے یہ کہہ کر چھٹی کی تھی کہ وہ تم سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے ترش لہجے میں بتایا۔ ''اور وقوعہ کے روز دوپہر میں وہ جائے وقوعہ کے آس پاس موجود تھا۔ کیا تم عدالت کو بتاؤ گی کہ تم نے اے جی کو وقوعہ کے روز دوپہر میں کس مقصد سے اپنے بنگلے پر بلایا تھا؟''

''وہ بکواس کرتا ہے...... جھوٹ بولتا ہے۔'' وہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولی۔ ''میں نے اس کو اپنے بنگلے پر بلایا اور نہ کسی سے ملی۔''

''کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ جس بیڈ پر مقتولہ سعدیہ مردہ حالت میں پائی گئی اس بیڈ کی شیٹ پر دو مختلف قسم کے خون کے دھبے پائے گئے تھے۔ ایک خون تو مقتولہ سعدیہ کا ہے۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ دوسرا خون کس کا تھا؟''

''یہ...... یہ آپ......'' اب وہ بے حد خوفزدہ ہو چکی تھی۔ ''مم...... مجھ سے کیوں...... پوچھ رہے ہیں......؟''

''ٹھیک ہے، میں تم سے کچھ نہیں پوچھتا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بلکہ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ چار افراد کے خون کا بیڈ شیٹ پر پائے جانے والے خون کے دھبوں سے موازنہ کرائے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ وہ خون کس کا تھا!''

''کون چار افراد؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''نمبر ایک، میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم وحید خان۔'' میں نے جواب دیا۔ ''نمبر دو، خالد مقبول۔ نمبر تین، اے جی اور نمبر چار...... تم یعنی شگفتہ فاروق......!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر شگفتہ اپنے قدموں پر ڈگمگائی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اسے چکر آ گیا ہو۔ وہ کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ میں نے استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے ہتھوڑی اٹھالی۔

''جناب عالی! میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک دھوکے اور گہری سازش کے ذریعے اس مقدمے میں

پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعات و شواہد چیخ چیخ کر اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ ملزم کے پاس مقتولہ پر مجرمانہ حملہ کرنے یا اسے قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ وہ چند روز بعد ستمبر کے پہلے ہفتے میں شادی کرنے والے تھے۔ کوئی ہوش مند شخص اپنی شادی سے چند دن پہلے اپنی ہونے والی بیوی پر نہ تو مجرمانہ حملہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ اگر واقعات کی ترتیب اور استغاثہ کے گواہوں کی غلط بیانیوں کے تناظر میں اس کیس کی اسٹڈی کی جائے تو صاف پتا چل جائے گا کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقتولہ کی جان سے کھیل کر میرے مؤکل کو اس کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ خالد مقبول، اے جی اور شگفتہ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ خون کے دوسرے دھبوں کا راز کھل سکے۔ اس کے ساتھ ہی میرے مؤکل کو باعزت بری کر کے پولیس کو اس کیس کا نیا چالان تیار کرنے کا حکم دیا جائے۔"

شگفتہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گری اور پھر سنبھل کر کٹہرے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملتجیانہ انداز میں بولتی جا رہی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ میں نے سعدیہ کو قتل نہیں کیا۔ میں ساری حقیقت بتانے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے صرف ایک موقع دے دیں......"

"اس کا مطلب ہے، آپ اقبالی بیان دینا چاہتی ہیں؟" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"جی......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے سعدیہ کو سمجھانے کے لیے اپنے گھر بلایا تھا کہ وہ وحید کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس کے لیے وہ جتنا پیسا کہے گی، میں دینے کو تیار ہوں۔ وہ مجھ سے میٹنگ کرنے کے لیے راضی ہو گئی اور اس نے اپنی ماں کی بیماری کی آڑ میں دفتر سے چھٹی کی اور میرے گھر پہنچ گئی۔ مجھے اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیے۔ وہ میری سننے کے بجائے اپنی بولنے لگی۔ اس نے بڑے حقارت آمیز انداز میں کہا کہ ملزم مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے، پھر بڑے فخر سے بتایا کہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں وہ دونوں شادی کرنے جا رہے ہیں۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ میرا گھر برباد نہ کرے لیکن وہ جھٹے سے اکھڑ گئی اور مجھ سے ہاتھا پائی پر اتر آئی۔ اس کارروائی میں میری چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں جس کی وجہ سے میری کلائی زخمی ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بیڈشیٹ پر میری زخمی کلائی کا خون گرا ہوگا......" لمحاتی توقف کر کے اس نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنے اقبالی بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اس ہاتھا پائی اور چھینا جھپٹی میں سعدیہ بھی زخمی ہو گئی تھی لہٰذا اس کے خون کے دھبے بیڈشیٹ پر ثبت ہو گئے۔ اس دوران میں وہ چیخ چلا بھی رہی تھی۔ اس صورتِ حال نے خالد اور اے جی کو حواس باختہ کر دیا اور انہوں نے سعدیہ کو پکڑ لیا تاکہ اسے چپ کرا سکیں۔ میں دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سعدیہ کے ساتھ کیا ہوا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، وقوعہ کے روز خالد مقبول اور اے جی تمہارے بنگلے پر موجود تھے؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "انہوں نے سعدیہ کو چپ کرانے کے بجائے دائمی خاموشی سے ہمکنار کر دیا اور جب مقتولہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تو اس کے قاتل کے خانے میں میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم وحید خان کو فٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ بانسری کا قصہ تمام ہو چکا تھا، بانس کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا تاکہ آئندہ کے لیے کسی بانسری کے بجنے کا امکان باقی نہ رہے......!"

شگفتہ نے اپنے جرم کے اقرار میں گردن جھکا دی۔

آئندہ روز پولیس نے خالد مقبول اور عبدالغفار عرف اے جی کو حراست میں لے لیا۔ صورتِ حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہو چکی تھی لہٰذا اصل مجرموں کی زبانیں کھلوانے کے لیے پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ خالد مقبول نے سعدیہ کو قابو کرنے اور اے جی نے اس بدنصیب کا گلا گھونٹنے کا اقرار کر لیا تھا چنانچہ شگفتہ، اے جی اور خالد مقبول کو "حصہ بہ قدرِ جثہ" کے مصداق، ان کے کالے کرتوتوں کے طفیل جیل بھیج دیا گیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل وحید خان کو باعزت بری کر دیا تھا۔

عزت اور ذلت پر صرف اور صرف خدا کا اختیار ہے۔ وحید خان ایک عزت دار اور بے گناہ شخص تھا لہٰذا قدرت نے اس کی عزت رکھ لی تھی اور اس کے دشمنوں کو ذلت اور رسوائی کے عمیق گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

بڑے سے تنے اور بہت ساری شاخوں والے درخت کے نیچے وہ کھڑی تھی۔

خوبصورت ایسی کہ ایک دفعہ نظر پڑ جائے تو ہٹ نہ سکے۔ میں نے بہت ساری سیاہ فام خوش شکل عورتیں دیکھی ہیں لیکن اس کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لیے لفظ گری کی ضرورت تھی۔ عام الفاظ میں اس کے حسن کی تشریح ممکن ہی نہیں تھی۔ دراز قد، جسم کا ہر حصہ مکمل ناپ تول کے ساتھ تراشیدہ۔ چہرے پر کچھ ایسی معصومیت کہ ملنے اور بات کرنے کو جی چاہے۔ مکمل طور پر سیاہ چہرے پر موٹے موٹے پرکشش انگیز نمایاں ہونٹ جن کے پیچھے قطاروں میں سجے ہوئے موتیوں جیسے چمکتے سفید دانت، سر پر گھنگھریالے بھرے بھرے بال جنہیں اس نے عام افریقی لڑکیوں کی طرح سنوارا ہوا تھا لیکن اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ بھرپور اس کی آنکھیں تھیں۔ گہری بہت دور تک ڈوبی ہوئی، اداس چھلکتی ہوئی آنکھیں۔

بوڑھے درخت کے سامنے ہی روڈ کی دوسری طرف اسپتال کا بورڈ لگا ہوا تھا مگر پھر بھی میں نے اس سے محض بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر نیلسن کا اسپتال یہی ہے؟“

”یہی ہے۔“ اس نے میرے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سورج ڈھل رہا تھا اور سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو رہے تھے۔ میں نے پھر اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا معترف ہو کر رہ گیا۔ درخت کے سامنے میں سفید بلاؤز اور ہلکے نیلے رنگ کی لنگی جیسے کپڑے میں وہ کسی ایسی دلہن کی طرح حسین لگی جس کا دولہا

انوکھی ریت

ڈاکٹر شیر شاہ سید

یوں تو کرنے والے محبت کی بے شمار داستانیں رقم کر گئے مگر... جانے کیوں زیر نظر قصہ پڑھ کر دل میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے۔ اگر کوئی نہ جانتے ہوئے بھی بے وفائی کا مرتکب ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا مقصد پوشیدہ ہے۔ اس نے بھی دنیا کا غم اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا کر اسے خوشیاں دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی مقدر ٹھہری۔

چاہتوں کی ایک بے نظیر کہانی جو شاید آنکھ میں آنسو بھر جائے



غلام منڈی میں اس وقت سخت ہنگامہ برپا ہوگیا جب ایک غلام کے دو خریدار بہ یک وقت سامنے آگئے۔ ایک خریدار کا دعویٰ تھا کہ غلام پر پہلے اس نے ہاتھ رکھا تھا۔ دوسرا کہتا تھا، اسے رقم نکالنے اور گننے میں دیر ہوگئی ورنہ بھاؤ تاؤ اس نے پہلے کیا تھا۔ شور سن کر لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ اس شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کہ کس کا دعویٰ غلط ہے، کون صحیح کہہ رہا ہے۔ بعض کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن یہ سب دیکھ رہے تھے کہ جھگڑنے والے دونوں ہی افراد نہایت بااثر ہیں۔ ان میں سے ایک قاضیِ شہر تھا، دوسرا نہایت متمول تاجر نصر حاجی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو معاملہ قاضی کی عدالت میں لے جایا جاتا لیکن یہاں تو قاضی خود فریق تھا۔ شور سن کر شاہی کارندے بھی آگئے۔ یہ کارندے قاضی پر تو ہاتھ ڈال نہیں سکتے تھے۔ وہ ہنگامہ کرنے کے الزام میں نصر حاجی کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے لیکن وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ اس ہنگامے میں قاضی بھی شریک ہے لہٰذا اسے بھی گرفتار کیا جائے۔ وہ خود ملزم ہے لہٰذا دونوں کو گرفتار کرکے قاضی القضاۃ کے پاس لے جایا جائے، وہ جو بھی فیصلہ کرے گا مجھے منظور ہوگا۔

جب یہی آوازیں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف سے بھی آنے لگیں اور قاضی کو یقین ہوگیا کہ اسے بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے تو اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے ایک تجویز پیش کی۔

''سوداگر سے پوچھا جائے کہ اس غلام کی قیمت پہلے کس نے لگائی تھی...... میں نے یا نصر حاجی نے؟''

وہاں موجود تمام لوگوں نے اس صائب فیصلے کی تائید کی اور سوداگر کو سامنے لایا گیا۔ وہ ان دونوں شخصیات سے اتنا ڈر گیا تھا کہ کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے کر اپنی جان مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر بے خبر بن گیا۔

''یہ سب اتنی جلدی میں ہوا کہ اب تو مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ پہل کس نے کی تھی۔ میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔''

''تو جھوٹ بکتا ہے۔ پہل میں نے کی تھی۔ نصر حاجی بعد میں آیا تھا۔''

''قاضی صاحب آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ پہل میں نے کی تھی۔ میرا تو کام یہی ہے کہ میں قابلِ ذکر غلام خرید کر انہیں دوسرے ملکوں میں لے جا کر اچھے داموں فروخت کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے غلاموں کی پہچان ہے۔ میں نے جب اس غلام پر ہاتھ رکھ دیا تو آپ نے سوچا ہوگا اس میں ضرور کوئی خوبی ہوگی، آپ بھی اس کے دعویدار بن گئے۔'' نصر حاجی نے اپنی دلیل پیش کی۔

''یہ مجھ پر بہتان ہے کہ مجھے غلاموں کی پہچان نہیں۔ غلام بھی انسان ہوتے ہیں اور مجھے انسانوں کی پہچان تم سے زیادہ ہے۔'' قاضی صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

جھگڑا پھر وہیں سے شروع ہوگیا، شاہی سپاہیوں کے آنے سے پہلے جہاں سے شروع ہوا تھا۔ اب کی مرتبہ سوداگر نے ہوشیاری دکھائی۔

''جس غلام کے آپ دعویدار ہیں، میری مانیے تو خود اس سے پوچھ لیں۔ وہ ایسا بچہ بھی نہیں ہے اور نہایت ذہین بھی ہے۔ وہ جس کے ساتھ جانا چاہے، فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے۔''

تجویز معقول تھی۔ فیصلہ غلام پر چھوڑ دیا گیا۔

''پہلے آپ دونوں حضرات مجھے اپنی اپنی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔''

''اگر تیری مراد مالی حیثیت سے ہے تو میں تجھے سونے میں تولنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔'' نصر حاجی نے کہا۔

''میری مالی حیثیت تو نصر حاجی جیسی نہیں لیکن میرے پاس علم و فضل کی دولت ہے۔ میں تجھے علوم سے آگاہ کردوں گا۔'' قاضی نے کہا۔

''آپ دونوں نے غلط سمجھا۔ میں آپ دونوں کے پیشوں سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔''

''میں تاجر ہوں۔ ترکستان سے غزنی تک بلکہ کبھی کبھی ہندوستان تک بھی میرے قافلے جاتے ہیں۔ میں مال و اسباب ہی نہیں غلام بھی فروخت کے لیے لے کر جاتا ہوں۔ جو غلام جس لائق ہوتا ہے اس کو اسی بارگاہ تک پہنچاتا ہوں۔''

غلام نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''جب فیصلہ مجھ پر چھوڑ ہی دیا گیا ہے تو میں نصر حاجی نامی تاجر کے ساتھ جانا چاہوں گا۔'' غلام نے اپنے مالک سوداگر سے کہا۔

قاضی نے اسے پھنکارا۔ ''تو کیسا علم دشمن ہے کہ میرے ساتھ جانے سے انکار کردیا اور نصر حاجی کی دولت پر ریجھ گیا۔''

آنے سے پہلے ہی چل بسا ہو۔ مکمل طور پر تیار، اداسی کے بادلوں میں گھری ہوئی، لپٹی ہوئی دلہن۔

میں دوپہر کو ہی عدیس آبابا پہنچا تھا۔ ائرپورٹ پر تھوڑی سی مشکلات کے بعد جو ہمارے جیسے غریب ملکوں میں عام ہیں، جہاں امیگریشن سے لے کر کسٹم کے ہر کارکن کو اپنے لیے تھوڑا بہت پیسے بنانے کی فکر ہوتی ہے، وہاں پر تھوڑی سی مشکلات عام ہوتی ہیں۔ کبھی بحث ہوتی ہے اور کبھی کچھ دینا پڑتا ہے۔

ائرپورٹ سے مجھے ٹیکسی مل گئی جو مجھے ویباشاہی ہوٹل لے کر آئی۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ صاف ستھرے کمرے، صاف ستھرے ٹوائلٹ، گرم اور ٹھنڈا پانی، بہت ہی زیادہ مستعد عملہ۔ شہنشاہ ہیل سلاسی کے بعد آنے والے انقلابات نے ایتھوپیا کا تیا پانچا کرکے رکھ دیا تھا۔ حالات سے بے بہرہ کمیونسٹ حکومت، پھر ملک کے اندر لڑائیاں اور سرحدوں پر جنگ لڑتی ہوئی فوج، مکمل طور پر غربت اور بدحالی کا شکار ہوکر رہ گیا تھا۔ ملک میں وہ سب کچھ ہورہا تھا جو ان حالات میں ہوتا ہے۔ بدعنوانی، بے ایمانی، سڑکوں پر بکھرے ہوئے فقیروں کی فوج ظفر موج۔ جسم بیچتی ہوئی کمسن لڑکیاں اور عورتیں اور گلیوں میں پلنے والے بے شمار ناجائز و جائز بچے۔

یہ وہی ایتھوپیا تھا جس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تھی، جس کی ثقافت کا ذکر ہر آسمانی کتاب میں ہے۔ جہاں کی ملکہ شیبا نے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام سے شادی کی تھی۔ جس کے دور کے کھنڈرات آج بھی پُرشکوہ ہیں۔ ایسا ماضی اور ایسا حال، میں سوچتا ہی رہ گیا۔

میں نے غسل کیا اور ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کر سخت قسم کی ایتھوپین کافی کی کئی پیالیاں پی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ دوسرے دن صبح صبح ڈاکٹر ہیملٹن کے اسپتال جاؤں گا مگر نجانے کیوں یہ خیال آیا کہ شام کو سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی کم از کم اسپتال تو دیکھ کر آجاؤں۔ مجھے یہاں چھ ہفتے رہنا تھا۔ کئی سال پہلے جب ڈاکٹر ہیملٹن جوان تھے تو اپنی بیوی کے ساتھ آسٹریلیا سے ایتھوپیا کام کرنے آئے۔ شاہ ہیل سلاسی کا زمانہ تھا۔ حکومت کو امراض نسواں کے ماہر کی ضرورت تھی اور دونوں میاں بیوی کو غریب ملک میں کام کرنے کا شوق۔ سرکاری اسپتال میں کام کرنے کے شروع ہی دنوں میں انہوں نے دیکھ لیا کہ وارڈ ایسی نوجوان عورتوں سے بھرا ہوا ہے جو زچگی کے دوران کئی کئی دن تک تڑپنے کے بعد پیدا ہونے والے مرے ہوئے بچے کی کہانی لے کر آتی ہیں۔ جن کی پیشاب کی تھیلی میں سوراخ ہوجاتا ہے جسے فسٹیولا کہتے ہیں۔ ان لڑکیوں کے پیروں کی انگلیوں کے درمیان ہر وقت پیشاب لگتے رہنے سے زخم بن جاتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو ان کے شوہر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ اپنے خوابوں کا کفن لیے اپنے ارمانوں کی دلہن کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھروں میں واپس آجاتی ہیں۔

ڈاکٹر ہیملٹن نے عدیس آبابا میں ایک زمین لے کر فسٹیولا اسپتال کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسپتال بننے کے پہلے دن سے مریضوں کی لائن لگ گئی۔ ایتھوپیا سے، کینیا سے، سومالیہ سے، سوڈان سے، تنزانیہ سے، لیبیا سے اور نجانے کہاں کہاں سے مریضوں نے آنا شروع کردیا تھا۔ اب تک ان دونوں میاں بیوی نے ہزاروں کی تعداد میں لڑکیوں کے آپریشن کیے تھے اور سیکڑوں کی تعداد میں ڈاکٹروں کی تربیت کی تھی جو اس قسم کے آپریشن کرسکتے ہوں۔

میں بھی پاکستان سے یہی آپریشن سیکھنے آیا تھا۔ پاکستان میں بھی ہزاروں لڑکیاں اسی قسم کے مسائل کا شکار تھیں۔

میں اپنی انگلستان کی تربیت کے باوجود پاکستان آکر ناکارہ ہوکر رہ گیا تھا۔ دس سال انگلستان میں کام کرنے کے دوران میں نے فسٹیولا کے ساتھ کوئی مریض نہیں دیکھا۔ ہر قسم کی ٹریننگ ملی مجھے۔ لاولدی اور بانجھ پن کا علاج، ٹیسٹ ٹیوب بے بی بنانے کا طریقہ، حمل کے دوران ہر قسم کی مشکلات سے نمٹنے کی تدبیر، عورتوں کے کینسر کا لیزر سے علاج اور نجانے کیا کیا۔

میں تو خوش و خرم عورتوں کو دیکھنے کا عادی تھا جو شادی اور بغیر شادی کے بھی حمل کے ساتھ آتی تھیں۔

مجھے یاد ہے میں نے اپنے پروفیسر کو لندن خط لکھا کہ مجھے لگتا ہے کہ میری ساری ٹریننگ بے کار ہوگئی ہے۔ میں یہاں پاکستان میں روپے تو کما سکتا ہوں مگر میں ان لڑکیوں کا علاج نہیں کرسکتا جو ..... فسٹیولا کا شکار ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری تعلیم ادھوری رہ گئی ہے، میری ٹریننگ بے کار اور میرا وجود صرف روپے بنانے کی مشین کی طرح ہے۔

مجھے بڑی خوشگوار سی حیرت ہوئی جب لندن سے میرے باس کا خط آیا کہ میں عدیس آبابا چلا جاؤں۔ رائل کالج نے ویباشاہی ہوٹل میں میرے ایک ماہ رہنے کا بندوبست کردیا ہے اور ڈاکٹر کیتھرین ہیملٹن سے بات ہوگئی ہے وہ مجھے آپریشن سکھانے کو تیار ہیں۔

میں بھی فوراً ہی تیار ہوگیا۔

ویباشاہی ہوٹل کے بڑے سے لاؤنج میں کافی کے

کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ شام کو ہی اسپتال کا چکر لگالوں تو اچھا ہوگا۔ ہوٹل کے باہر ہی مجھے ٹیکسی مل گئی تھی۔ کزن چس کے علاقے سے ہوتی ہوئی جمار وڈ پر ٹیکسی نکلی تھی۔ راستے میں ہی شاہ ہیل سلاسی کا شاہی قلعہ تھا جس میں انقلابی فوج نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہوا تھا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کے بعد ہی دائیں جانب فوجیوں کا اسپتال تھا۔

اسپتال کی عمارت سے کافی کچھ اندازہ ہوگیا تھا میں نے سوچا انصاف شاید ایک ایسی چڑیا کا نام ہے جسے سینگ والے جن نے ایک ایسے پنجرے میں بند کر دیا ہے جس کی چابی شاید کبھی کسی کو بھی نہیں مل سکے گی۔ غربت ایک ایسی مستقل لعنت ہے جس سے چھٹکارا کوئی بھی نہیں دلا سکا۔

ٹیکسی میکیکو کے بازار سے ہوتی ہوئی جمار وڈ کے دونوں جانب غریب آبادی اور غیر ممالک کے سفارت خانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی عدیس آبابا کے دیہی علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ میں مطلوبہ اسپتال تک پہنچ گیا۔

کارخانے کے ساتھ سڑک پر مڑتے ہی وہ بڑا سا، پرانا، گھنا سا بزرگ درخت مجھے نظر آیا۔ جیسے جیسے میں اس کے قریب جاتا گیا، ویسے ویسے وہ میرے نزدیک ہوتی گئی۔ شام کی، مرتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس دن پہلی دفعہ میں نے حلیمہ کو دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ ایسی ہی خوبصورت، ایسی ہی مکمل اور ایسی ہی حسین تھی۔

اسپتال میں مریض بھرے ہوئے تھے۔ شام کو چار بجے آپریشن ختم کر کے ڈاکٹر کیتھرین اسپتال کے ساتھ ہی بنے ہوئے بنگلے میں چلی گئی تھیں۔ نرسوں سے میں نے اپنے آپ کو متعارف کرایا۔ میزبان اور ملنسار نرسوں نے اپنے ہی کمرے میں مجھے بٹھالیا تھا۔ اسپتال کے بارے میں روزانہ کے معمولات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا۔ وہاں پر اس وقت ہر دوسرے دن آپریشن ہو رہے تھے اور ہر آپریشن والے دن چھ سے آٹھ آپریشن ہوتے تھے۔ اگلا دن آپریشن کا دن نہیں تھا۔

انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ وارڈ اور اسپتال سے باہر مریضوں کا رش لگا ہے۔ صبح آٹھ بجے ڈاکٹر کیتھرین اپنا راؤنڈ شروع کرتی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ ڈاکٹر ہیملن کی طبیعت خراب ہے اور کام کا سارا بوجھ کیتھرین پر پڑ گیا ہے۔

میں نے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا اور اسپتال کا ایک چکر لگا کر اپنے ہوٹل کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسپتال کے باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں نے اطراف میں اس لڑکی کو آنکھوں آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ کارخانے کی بلڈنگ، اسپتال، بوڑھا درخت اور ان سب سے دور چھوٹے چھوٹے گھروں میں ٹمٹماتی ہوئی روشنی مگر وہ نظر نہیں آئی۔

دوسرے دن میں صبح جلدی اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر کیتھرین کو میری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر مجھے اسپتال گھمایا، اپنے راؤنڈ میں شامل کیا۔ راؤنڈ کے بعد ان کے ساتھ ہی میں نے چائے پی۔ بن اور مکھن سے میری تواضع کی گئی۔ انہوں نے بہت سارے مریضوں کی کہانی مجھے سنائی۔ اس کے بعد ان کے ہی کمرے میں ان کے ساتھ کئی مریض دیکھے۔

دور دراز سے آئی ہوئی نوجوان لڑکیاں، زیادہ تر لڑکیوں کے ساتھ ان کی مائیں تھیں یا باپ تھا یا وہ اکیلی تھیں۔ اسی دن دوپہر کے کھانے کے بعد آٹھ لڑکیوں کو اسپتال سے رخصت بھی کیا گیا۔ ایک خاص کمرے میں یہ آٹھ لڑکیاں نئے کپڑے پہنے کھڑی تھیں۔ آپریشن کے تین ہفتوں کے بعد اب وہ جسمانی نقص کے بغیر تھیں۔

ڈاکٹر کیتھرین نے بتایا کہ ہر دوسرے دن او پی ڈی کے بعد ڈسچارج ہونے والی لڑکیوں کو نئے کپڑے کے جوڑے دیے جاتے ہیں جو ایک طرح سے اشارہ ہوتا ہے کہ ان نئے کپڑوں کی طرح اب ان کی زندگی بھی نئی ہے۔ وہ اپنے گھروں کو جائیں، اپنے گاؤں دیہاتوں میں اپنے شوہروں کے پاس یا نئی شادیاں کریں۔

میں نے خوشی کے بے شمار آنسو ان ڈسچارج ہونے والی لڑکیوں کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے دیکھے۔ میں اپنے آنسوؤں کو بھی ضبط نہیں کرسکا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ڈاکٹر ہیملن اور ڈاکٹر کیتھرین موجودہ زمانے کے وہ صوفی ہیں جو صرف خوشیاں ہی بانٹ سکتے ہیں۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ایتھوپیا کے شہر عدیس آبابا کے نواحی علاقے میں فسٹیولا کا آپریشن کرنے والے موجودہ دور کے وہ ولی ہیں جن کے لیے نجانے کہاں کہاں دعائیں کی جاتی ہوں گی۔ نجانے کتنی ہزار لڑکیوں کو انہوں نے مکمل کیا ہوگا، ان کی زندگی میں خوشیاں بکھیری ہوں گی، انہیں دوبارہ اس قابل کیا ہوگا کہ وہ سماج میں آنکھیں اٹھا کر چلیں، سر جھکا کر نہیں۔

اس دن، دن بھر مجھے حلیمہ کا کئی بار خیال آیا مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ اسپتال سے باہر نکل کر سہ پہر کی چمکتی دھوپ میں، میں اس بوڑھے درخت کے نیچے تھوڑی دیر کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ شاید وہ نظر

آ جائے مگر کوئی نہیں تھا۔

واپسی کے وقت میں نے فیصلہ کیا کہ بجائے ٹیکسی کر کے اپنے ہوٹل جاؤں' بہتر ہے کہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا چلوں تاکہ عدیس آبابا کے شہر کو دیکھوں اور محسوس بھی کر سکوں۔ لمبی سڑک پر چلتے چلتے بہت آگے جا کر ایسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بوڑھا درخت بھی نظر آیا اور اس کے سائے میں... کھڑی ہوئی سفید بلاؤز اور نیلی لنگی میں ملبوس ننھی سی حلیمہ بھی نظر آئی۔ میں تھوڑی دیر تک دور سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے آج دن کے سارے کام ہو گئے ہیں اور پھر میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا ہوٹل واپس پہنچ گیا تھا۔

اس روز رات دس بجے تک میں عدیس آبابا کے خوبصورت شہر کی تاریخی گلیوں، بازاروں، چوکوں میں گھومتا رہا۔ ملکہ شیبا کی حکمرانی میں رہی ہوئی ہزاروں سال پرانی یہ قوم ملکہ شیبا کی طرح ہی پراسرار ہے، ملکہ شیبا کی طرح ہی حسین۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ شہر بھی میرا ہی شہر ہے اور میں یہاں رہ سکتا ہوں۔

دوسری صبح آپریشن کا دن تھا۔ میں صبح صبح آپریشن تھیٹر پہنچ گیا۔ اندر جا کر میں نے ہرے رنگ کا آپریشن تھیٹر کا لباس پہنا اور ڈاکٹر کیتھرین جہاں آپریشن کر رہی تھیں اس کمرے میں پہنچ کر میں نے گڈ مارننگ کہا ہی تھا کہ میری نظر اس پر پڑی۔ وہی تھی حلیمہ۔ تھیٹر کے کپڑوں میں ملبوس، سر ڈھکا ہوا، ہونٹ منہ ناک چھپا ہوا۔ مگر وہ آنکھیں، میں انہیں لاکھوں کروڑوں آنکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کیتھرین کی مدد کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تھیٹر کی نرس تھی۔

وہ دن اور اس کے بعد کے سارے دن خوب گزرے۔ میں روزانہ اسپتال جاتا رہا۔ شام کو دیر تک رکتا رہا۔ ہر آپریشن میں ڈاکٹر کیتھرین کی معاونت کرتا رہا۔ پندرہ دنوں کے بعد میں نے پہلا آپریشن خود کیا۔ ڈاکٹر کیتھرین، حلیمہ، موراج گا، اکوکیشی، زودی ناتا اور بہت ساری دوسری اسپتال کی نرسوں نے میری مدد کی۔ اس دن کے بعد شروع میں آسان والے آپریشن' میں ان نرسوں کی مدد سے کرتا رہا۔ کچھ مشکل اور ٹیڑھے آپریشنوں میں ڈاکٹر کیتھرین نے میری معاونت کی اور بہت جلد میں بھی اس قابل ہو گیا کہ یہ آپریشن خود ہی کر سکوں۔

ہفتے تیزی سے گزر رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ جتنا جلدی جتنا سیکھ سکوں، سیکھ لوں کیونکہ پھر شاید کوئی سکھانے والا نہیں ہوگا۔ میں اکثر دیر تک شام گئے آپریشن تھیٹر سے نکلتا یا اسپتال میں ہی آپریشن کے بعد والے مریضوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ کئی دفعہ میں نے دیکھا کہ شام کے وقت حلیمہ اسی درخت کے نیچے انہی مخصوص کپڑوں میں کھڑی ہے۔ اپنی اداس آنکھوں کے ساتھ اور اپنے بھرپور وجود کو لیے۔

وہ بڑی مستعد اور کام والی نرس تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھرین نے مجھے آپریشن کے طریقے سکھائے اور حلیمہ نے تھیٹر کے اندر آپریشن کے لیے ہونے والی مختلف سرگرمیوں میں مجھے طاق کر دیا۔ آپریشن کے بعد مریض کا خیال کیسے رکھنا ہے؟ آپریشن ناکام ہو جائے تو کیا کرنا ہے؟ مریض سے کیسے بات کرتی ہے؟ حلیمہ کو اس کا شدید احساس تھا۔

پھر ایک دن مجھے پتا لگا کہ حلیمہ، ابی بہتو، کیروی اور مریم جو نرسیں تھیٹر میں کام کرتی ہیں' درحقیقت نرسیں ہیں ہی نہیں۔ یہ لڑکیاں وہ تھیں جو گزشتہ سالوں میں ایسے بڑے فسٹیولا کے ساتھ آئی تھیں جن کا علاج ممکن ہی نہیں تھا۔ کئی بار ان کے آپریشن ہوئے اور ناکام ہو گئے۔ جس کے بعد یہ اسپتال سے واپس گئی ہی نہیں۔ آیا کی طرح کام شروع کیا' وارڈ کے بستر بنانے لگیں۔ ڈاکٹر ہیملن اور کیتھرین نے جن کو ذہین پایا، لگن دیکھی، انہیں وارڈ اور تھیٹر کی نرسوں کا کام سکھا دیا۔ تھیٹر میں کام کرتے کرتے آپریشن کی معاونت کرنے لگیں۔ تھیٹر کا سارا اسٹاف انہی لوگوں پر مشتمل تھا۔

گھروں سے نکالی ہوئی، پیشاب کی بدبو سے پریشان یہ لڑکیاں اپنی ہی جیسی لڑکیوں کا آپریشن کر رہی تھیں، کروا رہی تھیں۔ یہ اسپتال ان کا میکا تھا، یہی اسپتال ان کا سسرال تھا۔ اس جگہ یہ پیدا نہیں ہوئی تھیں مگر شاید اس جگہ دفن ہو جائیں گی۔

میرا سر عقیدت سے جھک گیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ حلیمہ کا بظاہر مکمل نظر آنے والا جسم اتنا زخمی ہے۔ کاش میرے ہاتھ میں کوئی تریاق ہوتا، کوئی پیر فقیر ولی مجھے مل جاتا جو کسی طرح اس کے جسم کا یہ سوراخ بند کر دیتا۔ اس کی پریشانی اور عذاب کا اندازہ لگا کر مجھے ایسا لگا جیسے اس دنیا میں زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے، اب میں سمجھتا تھا کہ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں سمندروں جیسی اداسی کا سیلاب کیوں امڈا رہتا ہے۔

میرے قیام کا وہ آخری ہفتہ تھا اور مجھے یہ سوچ کر ڈپریشن سا ہو رہا تھا کہ اب میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرے دن بہت اچھے گزر رہے تھے کام کرتے ہوئے، سیکھتے

ہوئے، ہنستے ہوئے، اداس لمحوں کے ساتھ جس نے مجھے احساس دلایا کہ غریبوں، ذلت کے مارے ہوئے انسانوں کی بیٹیوں کا علاج بھی ہو سکتا تھا۔ ان کے چہروں پر بھی رونق آ سکتی ہے۔ یہ سیاستدان، فوجی حکمران، وڈیرے، سرمایہ دار، جاگیردار تو کچھ نہیں کریں گے۔ یہ بیماری ان کی بیماری تو نہیں ہے۔ ان کی بیویوں، بیٹیوں پہ تو یہ عذاب کبھی نہیں اترے گا۔ یہ تو غریبوں کی بیماری ہے، ان غریب ماؤں، باپوں کی بیٹیوں کا دکھ ہے جن کے ووٹوں کی طاقت سے حکمران، حکمران تو بن سکتے ہیں مگر وہ ان کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتے۔

حلیمہ سے میری دوستی بڑھ گئی۔ میں روزانہ اس سے ملتا۔ وہ کم بولتی تھی مگر جب بھی بولتی اداسی کے پُروقار لہجے میں کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں؟ شوہر نے تو چھوڑ دیا ہوگا مگر ماں باپ بھائی بہن اس کے ساتھ ہیں یا وہ بھی؟ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتی ہے۔ بڑی عرق ریزی سے اس نے مجھے آپریشن تھیٹر کی جزئیات سے آگاہ کیا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بتایا کہ آپریشن کے دوران گوشت، پٹھے اور مختلف قسم کی تہوں میں کس قسم کے دھاگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ سب مجھے اچھا اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ انہیں اندازہ تھا کہ وہ لڑکیاں کس طرح سے رہ رہی ہوں گی جن کے جسموں میں فسٹیولا نے گھر کر لیا ہے۔

اس شام مجھے پھر دیر ہو گئی۔ میں نکل کر جیسے ہی اسپتال کے باہر آیا حلیمہ اسی بزرگ درخت کے نیچے مجھے کھڑی ہوئی مل گئی۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، میں بھی خوش ہوا، قریب گیا۔ میں نجانے کیوں یکایک بے جھجک پوچھ بیٹھا کہ روز شام ڈھلے وہ اس درخت کے نیچے کیا کر رہی ہوتی ہے؟

میرا سوال ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں سے موتی اُمڈ اُمڈ کر گالوں پر بہنا شروع ہو گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا کہ وہ یکایک دوڑتی ہوئی اسپتال کی طرف بھاگ نکلی۔

دوسرے دن اسپتال کا کام ختم ہونے کے بعد میں اس سے ملنے تھیٹر گیا۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا کہ میری کسی بات سے اسے ایسی تکلیف ہوئی کہ جس کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ گزری ہوئی شام کا مجرم تھا۔ میں اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا سب کچھ لاعلمی سے ہو گیا مجھ سے۔ مجھے وہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے بڑی اداس مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، یہ میری قسمت ہے۔ جب تمہیں پتا ہی نہیں ہے تو تم کیا کر سکتے ہو۔ سوال تو پوچھو گے ہی۔“ یہ کہہ کر وہ رکی پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں یہاں چھ سال پہلے آئی تھی، اس وقت میری عمر اکیس سال تھی۔ سولہ سال کی عمر میں میری شادی عمر سے ہوئی۔ میں گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی، وہ گاؤں کا سب سے اچھا لڑکا تھا۔ مجھ سے پانچ سال بڑا تھا وہ، جس طرح سے غریب کسانوں کے بچوں کی شادی ہوتی ہے ویسے ہی میری بھی شادی ہو گئی اور شادی کے شروع کے دنوں ہی میں مجھے پتا لگ گیا کہ عمر میرا کتنا دیوانہ ہے۔ جتنا دیوانہ وہ تھا اتنی ہی پاگل میں تھی۔ اس کے بغیر ایک لمحہ، ایک دن، ایک شام، ایک رات نہ گزرتی اور جب شادی کے تین مہینوں میں، میں حاملہ ہو گئی تو خوشی کا اندازہ تم لگا سکتے ہو۔

”گاؤں کے دوکھیا نے میرے حمل کی تصدیق کی اور کہا کہ بچہ پیدا ہونے میں بڑی مشکل ہو گی۔ پھر وہی کچھ ہوا جو روز میرے جیسی ہزاروں لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں چار دن تک بچے کو کوکھ میں لیے تڑپتی رہی پھر پانچویں دن دوکھیا نے نجانے کیسے مرا ہوا بچہ پیدا کیا اور پھر میں آج تک پیشاب نہیں روک سکی۔

”میں اکثر سوچتی تھی کہ مجھے اگر کسی گناہ کی سزا ملی ہے تو فسٹیولا کی صورت میں کیوں ملی؟ مجھے اوپر والے نے اندھا کر دیا ہوتا۔ اندھے سے کوئی نفرت نہیں کرتا۔ لوگ اس کی مدد کرتے ہیں، اسے سڑک کے کنارے پہنچاتے ہیں، اسے بھیک دے دیتے ہیں۔ فسٹیولا والی لڑکی کی کیا زندگی ہے؟ شوہر گھر سے نکال دیتا ہے، جسم سے اٹھتی ہوئی بدبو والی عورت سے کون محبت کر سکتا ہے مگر میرا شوہر مجھ سے آخر تک محبت کرتا رہا۔ وہ ایسا ہی تھا، بالکل پاگل، میرا دیوانہ، میرا شوہر، میرا دوست۔

”میری اس بیماری سے وہ تو جیسے پاگل ہو گیا۔ پھر نجانے اس کو کس نے اس فسٹیولا اسپتال کا بتایا اور ہم دونوں اپنے ماں باپ سے تھوڑی بہت بچت کے پیسے لے کر عدیس ابابا کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔“

یہ کہہ کر وہ رکی، میں مبہوت اس کے خوبصورت چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کا بولنا بھی اس کی شخصیت کا مسحور کن حصہ تھا۔ عمر کی دیوانگی کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ حلیمہ نے پھر بولنا شروع کیا۔

”اس نے شادی نہیں کی۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر، ملک

ملک میں اور سڑکوں پر چڑھتے اترتے راستے میں کہیں کام کر کے چند پیسے کما کر دونوں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ درختوں کے سائے میں، ٹوٹے ہوئے بس اسٹاپ پر اور بڑے شہروں کے فٹ پاتھوں پر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتا، میرا سر تھام لیتا۔ حلیمہ... حلیمہ! تو ٹھیک ہو جائے گی۔ تو ٹھیک ہو جائے گی۔ تقریباً تین سال لگ گئے ہمیں اس اسپتال پہنچنے میں۔ اس جگہ پر ایسی ہی لڑکیاں آتی ہیں۔ افریقا کے دور دور کے دیہاتی شہروں سے لٹی پٹی گھنٹوں کا سفر مہینوں اور سالوں میں کرتی ہوئی اس جگہ پہنچتی ہیں۔

”پھر ڈاکٹر ہیملن نے میرے سات آپریشن کیے، ایک کے بعد ایک اور ہر آپریشن سے پہلے ہم دونوں دعا کرتے کہ اب یہ بیماری ختم ہو جائے گی اور میں واپس اپنے گاؤں ماں باپ کے پاس چلی جاؤں گی۔ ہمارا ایک گھر ہوگا، میں ہوں گی، عمر ہوگا، ہمارے بچے ہوں گے، ہم اپنے کھیتوں میں کام کریں گے اور اپنے بچوں سے کھیلتے ہوئے بوڑھے ہو جائیں گے۔

”ڈیڑھ سال کے بعد ڈاکٹر ہیملن نے کہہ دیا کہ میرا علاج نہیں ہو سکتا۔ یہ سوراخ بند نہیں ہوگا۔ زندگی ایسے ہی گزارنی ہوگی۔ رونے کے لیے میرے پاس آنسو نہیں تھے۔ سفر اور اس اسپتال نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا اور سمجھا دیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر عمر کو بتایا کہ میں اب اس کے لیے بے کار ہوں، میرا علاج نہیں ہو سکتا، میں ماں کبھی نہیں بن سکوں گی۔ میں نے اپنے دل کو جیسے اپنی مٹھی میں بند کر کے زور سے دبایا اور اس سے کہا تھا کہ وہ واپس نائیجیریا چلا جائے۔ اسی گاؤں میں کسی لڑکی سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہے، اس کے بچے ہوں اور وہ باپ بنے۔ میں اگر بے کار ہو گئی ہوں تو وہ کیوں سزا کاٹے۔ اس کی اپنی زندگی ہے۔ وہ کیوں اسے خراب کرے۔ ایک بے کار عورت کے لیے۔ میں اب اسی اسپتال میں رہوں گی، کسی اور جگہ نہ میرا کام ہے اور نہ ہی مقام ہے۔ نجانے کس طرح میں نے آنسو روکے، نجانے کس طرح میں نے اس سے یہ سب کچھ کہا۔ وہ دن آج بھی میرے دل کے زخموں کی طرح ہرا ہے۔

”عمر نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اسپتال کے باہر پتھروں کے اس چبوترے پر، اس بوڑھے درخت کے پتوں کے نیچے شام کی ڈوبتی روشنی میں مجھے تکتا رہا، روتا رہا، روتا رہا، تکتا رہا۔ میں چاہتی تھی وہ چیخے، کچھ بولے، مجھ سے ناراض ہو جائے، کچھ غصہ کرے، کوئی گالی دے مگر اس نے کچھ نہیں کیا۔ جب اندھیرا بڑھ گیا تو میں خاموشی سے سر جھکائے ہوئے اسپتال میں اپنے بستر پر واپس چلی گئی۔

دوسرے دن میں نے ہی اسے دیکھا تھا۔ صبح سویرے عادت کے مطابق پچھلی شام کو بھلاتے ہوئے اسپتال سے باہر آئی کہ عمر کھڑا ہوگا۔ چائے، بسکٹ، کوئی ڈبل روٹی، بن لیے۔ جب سے اس اسپتال میں تھی یہی ہو رہا تھا۔ مگر وہ باہر نہیں تھا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں میں پہلی بار میں عمر کے بغیر تھی۔ وہ گاؤں واپس چلا گیا۔ میں یہی سمجھی، مگر جیسے ہی روشنی بڑھی وہ مجھے نظر آ گیا، اس درخت کے نیچے۔ اس نے رات کسی وقت اس درخت سے رسی باندھ کر گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔“

اس کی آنکھیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ ہر شام اس بوڑھے درخت کے نیچے وہ مخصوص کپڑوں میں کیوں کھڑی ہوتی ہے۔

میں اپنے آنسو نہیں روک سکا۔ یہ دنیا، یہ ترقی، یہ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں، چاند کو سر کرنے والا انسان مریخ، جیوپیٹر اور اپنے نظام شمسی سے بھی آگے نکل جانے والے ہمارے آلات، سمندر کی گہرائیوں میں گھس کر ہزاروں لاکھوں سال پہلے ڈوب جانے والی تہذیبوں اور نسلوں کی معلومات۔ سب کچھ تو تھا ہمارے پاس اور اگر نہیں تھا تو کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جس سے حلیمہ کا پیشاب بند ہو سکتا کہ عمر مرتا نہیں، خودکشی نہیں کرتا۔ اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر حلیمہ کی آنکھوں میں ڈوبتا تیرتا نہ کہ درخت کی ڈالیوں میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیتا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ساری دھرتی کا بوجھ حلیمہ کے کاندھے پر ہے۔

میں نے بھیگی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میں کیا کرتی؟ وہ تو جوان تھا، حسین تھا، اس کی تو زندگی تھی۔ ابھی شادی کر لیتا، بچے ہوتے۔ نائیجیریا کے اسی گاؤں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش رہتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ہمیشہ یہیں رہے گا، میرے پاس۔ میں اس کے پاس آتی ہوں ہر روز شام کو۔“

یہ حلیمہ کی خوش قسمتی تھی کہ فسٹیولا جیسی بیماری کے باوجود عمر کے دل سے حلیمہ کی محبت کم نہ ہوئی تھی مگر ساتھ ہی افسوس بھی کہ جو ساتھ نبھانا چاہتا تھا اسے یوں خود سے جدا کرنے پر مجبور کیا ہوتا جبکہ دیگر دوسرے ممالک بالخصوص پاکستان جیسے ملک میں ایسی لڑکیوں کے ساتھ ہر کوئی تعلق توڑ لیتا ہے۔ عمر نے محبت کی یہ کیسی مثال قائم کر دی کہ حلیمہ تمام زندگی اس ڈوری سے خود کو باندھے رکھے گی۔

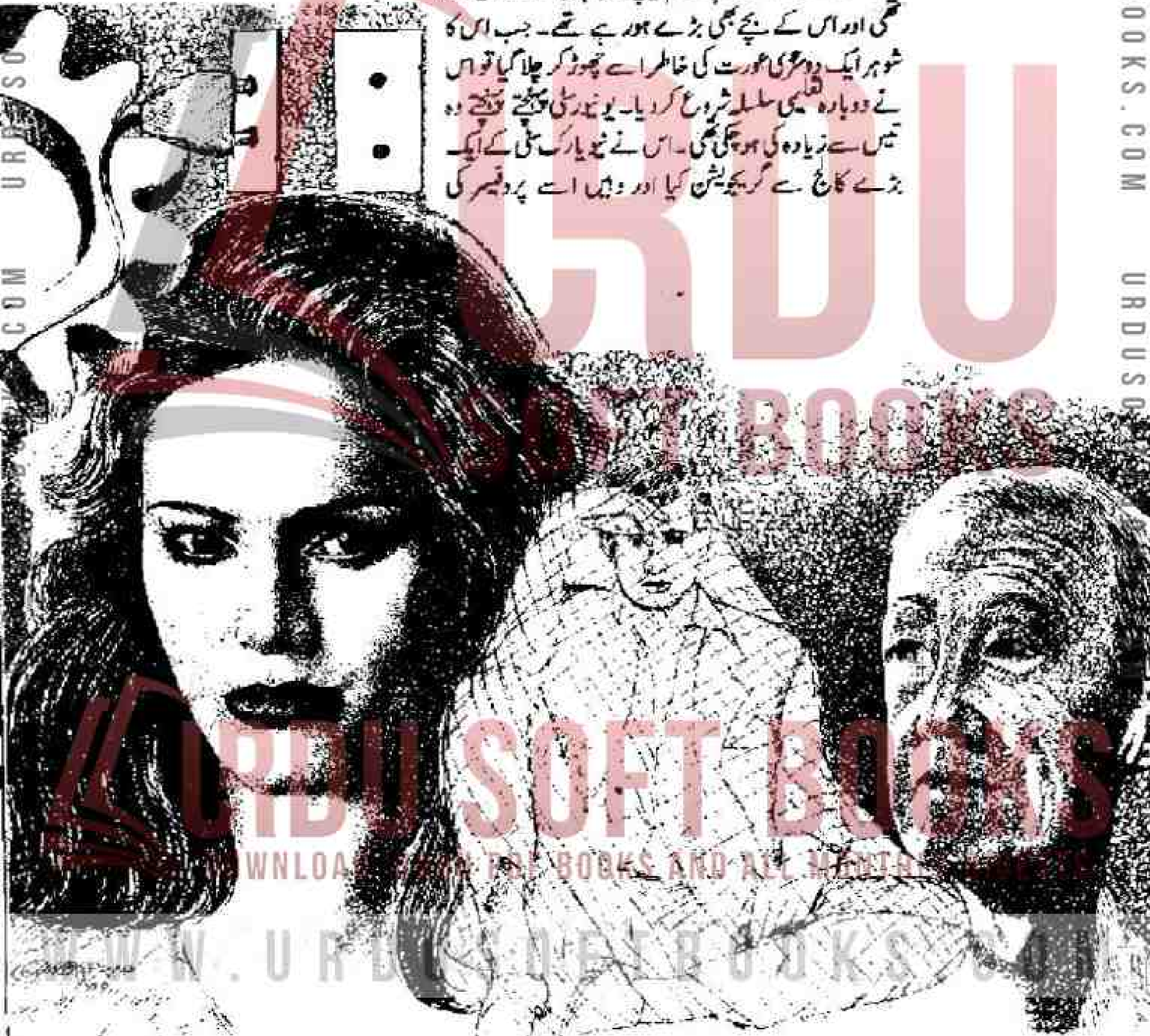
دھکا

شمر عباس

اپنا ہدف پانے کے لیے اس نے ایک لمبی جدوجہد کی مگر وہ بھول گئی تھی کہ غلط راستے سے منزل کا فاصلہ پتا نہیں مل سکتا... اور جب اسے اس بات کا ادراک ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی... ایسے میں اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔

آزمائشوں کے دائرے سے نکلنے کے لیے ایک کٹھن مرحلے کا انتخاب

وہ پروفیسر تھا گو کہ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے، کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ اس نے زندگی میں ہر چیز دیر سے سیکھی ہے۔ تقدیر نے بھی اس کے ساتھ عجیب مذاق کیا تھا۔ وہ بڑی کوششوں اور جدوجہد سے دو قدم آگے بڑھتی کہ اچانک ہی اسے ایسا دھکا لگتا کہ وہ چار قدم پیچھے چلی جاتی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ جب اس کا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر اسے چھوڑ کر چلا گیا تو اس نے دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا۔ یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے وہ تیس سے زیادہ کی ہو چکی تھی۔ اس نے نیویارک سٹی کے ایک بڑے کالج سے گریجویشن کیا اور وہیں اسے پروفیسر کی



شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

اس وقت تک وہ کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے کئی کتابیں لکھی تھیں جنہیں بیسٹ سیلنگ کا اعزاز حاصل ہوا۔ طلبہ اس کی کلاس میں بڑے شوق سے حاضر ہوتے۔ وہ دراز قد، بھورے بالوں، گلابی گالوں اور فربہ جسم کا مالک تھا اور وہ جب مسکراتا تو اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ وہ بہت خوش لباس تھا۔ وہ ایک دلچسپ، کامیاب اور ذہین لیکچرر تھا جو پڑھائی کے دوران بھی تفریح فراہم کرتا تھا۔

صنفِ نازک کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ بادامی آنکھیں، میٹھی آواز، لمبے اور مضبوط ہاتھوں نے لڑکیوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ساندرہ اس کی کلاس میں بیٹھی اس کے بازوؤں کی حرکت دیکھتی رہتی جنہیں وہ فضا میں لہرا کر خوش بیانی کے جوہر دکھاتا اور وہ اس کی آواز کے زیر و بم میں کھو جاتی۔ وہ کئی برس فرانس میں رہا تھا اور عرصہ دراز سے اس نے کسی کو اتنی خوبصورتی سے انگریزی بولتے نہیں سنا تھا۔ پروفیسر اپنے لیکچر میں کبھی کبھی دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کرتا اور وہ کھڑکی سے باہر درخت سے پتوں کو گرتا ہوا دیکھتی رہتی اور کلاس میں اپنی موجودگی پر اطمینان محسوس کرتی۔

وہ کلاس میں زیادہ تر اپنے بارے میں باتیں کیا کرتا اور اپنے طالب علموں کو دوسرے مشہور مصنفوں سے ملاقات کے قصے سنایا کرتا۔ اس کا انداز اتنا دلچسپ اور دل نشین ہوتا کہ طالب علم اس کے سحر میں کھو جاتے اور انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ پروفیسر پٹری سے اتر گیا ہے اور نصاب سے ہٹ کر فالتو قصے سنا رہا ہے جبکہ ساندرہ سمجھتی تھی کہ ان ملاقاتوں کا احوال بیان کر کے وہ اپنے طالب علموں کے علم میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس طرح وہ جان جائیں گے کہ نامور مصنفین کو اس مقام تک پہنچنے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

سمسٹر کے دوران پروفیسر نے اپنے طالب علموں کو گھر پر مدعو کیا۔ اس کا عالی شان مکان واشنگٹن اسکوائر میں واقع تھا۔ جب وہ اس کے پرہجوم لیونگ روم میں داخل ہوئی تو اسے دیکھ کر اسے معروف مصنف ہنری جیمس کا خیال آ گیا۔ پورا کمرا کتابوں سے بھرا ہوا تھا جو دیواروں میں نصب الماریوں میں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ سبز پتوں سے لدی بیلیں کھڑکی کی چوکھٹ کے گرد بل کھاتے ہوئے سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھیں کمرے میں جا بجا نیلے اور سفید رنگوں میں چین کے بنے ہوئے پورسلین کے ظروف رکھے ہوئے تھے جو دیکھنے میں ہی کافی قیمتی لگ رہے تھے۔ پرانی طرز کے انگلش فرنیچر کو خوبصورتی سے پالش کیا گیا تھا اور لکڑی کے فرش پر دیدہ زیب مشرقی طرز کے قالین بچھے ہوئے تھے۔

اس پارٹی میں ہر فرد کو اپنی بوتل خود لانا تھی اور ان میں ساندرہ بھی شامل تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں بھی مقابلہ چل رہا تھا اور طالب علم ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بہترین شراب لے کر آئے تھے۔ پروفیسر نے عمدہ شراب کی تعریف کی اور ان بوتلوں کو الگ رکھتا گیا۔ ساندرہ بھی مشروب کی ایک بوتل لے کر آئی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ بھی اس میں سے چند گلاس لے سکے گی اس کی لائی ہوئی بوتل کی خاص طور سے تعریف کی گئی اور پروفیسر نے اسے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے ریفریجریٹر میں رکھ دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے کسی خاص موقع پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی یہ اشارہ دیکھ کر خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

پروفیسر نے مہمانوں کی تواضع پیزا سے کی جسے اس نے خود اپنے اوون میں گرم کیا تھا۔ اس دوران وہ قہقہے لگاتا اور اطالوی زبان میں مہمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتا۔ سبھی طالب علم اس پذیرائی پر بے حد مسرور تھے اور ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ایک مشہور اور قابل پروفیسر انہیں اتنی اہمیت دے رہا ہے۔ پروفیسر نے ایپرن پہن رکھا تھا اور خوشی کے عالم میں ایک بڑے چاقو سے پیزا کے چھوٹے ٹکڑے کر رہا تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے وہ ٹکڑے کاغذ کی پلیٹوں میں رکھ کر مہمانوں کو پیش کیے۔

ایسے مواقع پر اس کی بیوی موجود ہوتی تھی مگر اب وہ نہیں تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے اور شوہر کی بار بار بے وفائی نے اسے مزید بیمار کر دیا تھا۔ ساندرہ سمیت اس کا کوئی بھی شاگرد یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ پروفیسر جیسا نفیس انسان اپنی بیوی سے بے وفائی کر سکتا ہے لیکن لوگوں کی زبان کون روک سکتا ہے۔ اس پارٹی میں پروفیسر کی بیوی کی غیر موجودگی ساندرہ کو بری طرح کھٹک رہی تھی اور اچانک ہی اس کے دل میں اس سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی۔

اس شام مشروب کے چند گلاس پینے کے بعد ساندرہ کو باتھ روم جانے کی حاجت ہوئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ جب وہ ایک کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزری تو اسے ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ اس نے دروازے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ یقیناً پروفیسر کی بیوی کا بیڈ روم تھا۔ اسے چاند جیسے چمکتے ہیرے کی جھلک نظر آئی جو اونچے تکیوں پر لٹکا ہوا تھا۔

سنہری باتیں

☆ اچھی چھلانگ لگانے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹنا ضروری ہے۔

☆ پہلی ناکامی پر مت گھبراؤ، یہی تمہارے عروج کی پہلی سیڑھی ہے۔

☆ کچھ لوگ برائی کو ڈھونڈنے کے شائق ہوتے ہیں، بالکل اس مکھی کی طرح جو پورے جسم کو چھوڑ کر صرف زخم کا انتخاب کرتی ہے۔

☆ زندگی کی قدر آخری سانس لینے والے سے پوچھو۔

☆ زندگی نہ جانے کس کس کا انتظار کرتی ہے لیکن موت بن بلائے مہمان کی طرح آجاتی ہے۔

☆ سفر کا آغاز اگر تیزی سے کیا ہے تو دیکھو رکنا نہیں ورنہ تمہارا ہی غبار تمہیں گرد آلود کردے گا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

''کیا تم ایک منٹ کے لیے اندر آسکتی ہو؟'' اس عورت نے کہا۔

ساندرہ نے سن رکھا تھا کہ پروفیسر کی بیوی خود بھی ایک کامیاب مصنفہ رہ چکی تھی لیکن اب اسے پھیپھڑوں کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کے بارے میں ساندرہ کا خیال تھا کہ یہ بیماری کثرت تمباکونوشی سے لاحق ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے مریض کو سانس لینے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اسے یکایک ہی اس عورت سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

ساندرہ ہچکچاتے ہوئے اس کے بستر کی جانب بڑھی اور تاریکی میں کھڑی ہوگئی۔ وہ عورت سانس لیتے ہوئے بری طرح ہانپ رہی تھی اور اسے دیکھ کر ساندرہ کو بھی وہی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ فضا میں دواؤں کی ناگوار بو بسی ہوئی تھی اور ساندرہ نے محسوس کیا کہ اس حبس زدہ ماحول میں اسے بھی سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

''کیا وہ اب بھی لڑکیوں میں دلچسپی لے رہا ہے؟'' اس عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔

ساندرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ پروفیسر کی سرگرمیوں کے بارے میں بتا کر اس عورت کو مزید دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پروفیسر کی بیوی نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور اس کا ہاتھ اپنے سرد ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

ساندرہ نے اس کی خواہش کی تعمیل کی اور اس پر جھک گئی۔ اس عورت نے کہا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو۔'' پھر اس سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے بہت پرانی جان پہچان ہو۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میری ایک کتاب پر ٹائمز میں تبصرہ شائع ہوا۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ یہ کسی مصنف کے لیے کتنا بڑا اعزاز ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے پُرمسرت دن ہونا چاہیے تھا لیکن جب میں نے اسے سڑک پر ایک دوسری عورت کے بازو میں بازو ڈالے اور قہقہے لگاتے دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے کسی نے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ گلابی کمبل کے نیچے رکھ لیا جو بہت زیادہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ ساندرہ نے اسی سے اندازہ لگالیا کہ اس کی دیکھ بھال مناسب طریقے سے نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ کیا میں تمہاری کچھ مدد کرسکتی ہوں؟''

اس عورت نے گہری سانس لی اور افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہیں باتھ روم کی تلاش ہے تو وہ اس جانب ہے۔''

موسم بہار کا سمسٹر ختم ہونے والا تھا کہ ایک روز پروفیسر نے چائے پینے کے لیے ساندرہ کے اپارٹمنٹ آنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''میں تمہارے کام کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کروں۔ کیا چائے کا وقت مناسب رہے گا؟'' اس نے کلاس ختم ہونے کے بعد بڑے شائستہ اور نرم لہجے میں کہا۔ جب تقریباً تمام طالب علم کلاس روم سے باہر جاچکے تھے۔

''ہاں'' ساندرہ بے اختیار بولی۔ ''میرے بیٹے پانچ بجے سے پہلے گھر نہیں آتے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، میں ٹھیک تین بجے پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے کہا اور واقعی وہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

وہ ... چھوٹے سے ایک کمرے کے مکان میں اپنے دو نوعمر بیٹوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ پروفیسر کے آنے کا سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ گھر آتے ہی اس نے انتظامات شروع کردیے۔ سب سے پہلے اس نے پورے گھر اور فرنیچر کی صفائی کی اور ساتھ ہی میز اور کرسیوں کو پالش کرکے اچھی طرح چمکا دیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ پروفیسر بہت صفائی

پسند ہے اور ذرا سی گرد بھی برداشت نہیں کرتا۔

اس روز وہ فضول خرچی پر اتر آئی تھی۔ اس نے پروفیسر کی تواضع کرنے کے لیے سینڈوچ اور..... کیک بنایا۔ عمدہ قسم کی چائے خرید کر لائی بلکہ دو نفیس پیالیاں بھی خرید لیں پھر اس نے چائے پیش کرنے کے لیے اپنا اطالوی چاندی کا ٹی پاٹ نکالا جو اسے سسرال کی طرف سے شادی کے موقع پر تحفے میں ملا تھا۔ اسے بھی اس نے پالش کر کے خوب چمکایا اور سب چیزیں کافی کی میز پر سجادیں۔ جیسے ہی پروفیسر آتا، وہ چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔

اس موقع کے لیے لباس کا انتخاب بھی ایک مسئلہ تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد سادہ سلیٹی رنگ کا اسکرٹ، فلیٹ شوز اور کالر والی سفید قمیص منتخب کی۔ کندھے تک آئے ہوئے بالوں کو اس نے ربر بینڈ سے پیچھے کی جانب باندھ لیا۔ گو کہ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی لیکن اس روز اس نے لپ اسٹک اور گالوں پر ہلکا سا غازہ لگانا ضروری سمجھا اور اپنے جسم کو خوشبوؤں میں بسا کر وہ پروفیسر کے استقبال کے لیے تیار ہوگئی۔

جب وہ اس کے دروازے پر پہنچا تو اس نے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ساندرہ نے اس کے لیے جو اہتمام کیا تھا، اسے دیکھ کر وہ خاصا حیران ہوا لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ساندرہ کے استفسار پر اس نے کہا کہ وہ بیماری کے علاوہ کبھی چائے نہیں پیتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چائے کے وقت آئے گا اور چائے پیئے نہیں۔ یہ سن کر ساندرہ بہت مایوس ہوئی اور سوچنے لگی کہ اسے پروفیسر کی تواضع کے لیے اور کیا تیار کرنا چاہیے تھا۔

وہ دونوں صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے اور پروفیسر نے اس کے کام کے بارے میں بولنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ”تم منظر کشی بہت اچھی کرلیتی ہو ایسا لگتا ہے کہ تمہارا بچپن ایسی جگہوں پر گزرا ہے جہاں سورج کی روشنی خوب ہوتی ہے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کا بچپن افریقا میں گزرا جہاں وہ ایک تمباکو کے فارم پر رہا کرتی تھی۔

”تمہاری بہترین کہانی وہ ہے جس میں راوی اپنے باپ کے ساتھ چیتے کے شکار پر جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ تم بھی یہ کرتی رہی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”ہاں۔ میرے والد نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو رائفل چلانا سکھائی تھی۔ ہمارے گھر کے پیچھے پہاڑیوں میں چیتے ہوتے تھے یا کبھی کبھی ہمیں ہرن کا شکار بھی کرنا پڑتا۔“

”تم نے جانوروں اور پودوں کا تذکرہ بہت اچھی طرح کیا ہے۔ تمہاری کہانی میں اس درخت کا نام کیا تھا جسے تم نے اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا تھا جس پر ارغوانی رنگ کے پھول کھلتے تھے؟“

”جیکارندا۔“

”ہاں۔ یہی نام ہے۔ تم درختوں، پھولوں اور جانوروں سے جڑی رہو اور زمین پر اپنے قدم جمائے رکھو۔ یاد رکھو کچھ بھی اہم نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت ہوتی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا مضبوط ہاتھ ساندرہ کے گھٹنے پر رکھ دیا اور وہ سوچنے لگی کہ اسے اسکرٹ نہیں پہننا چاہیے تھا۔ اس نے ناگواری کا اظہار کیا اور اس سے کچھ دور ہوگئی لیکن پروفیسر پھر بھی باز نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس مرتبہ اس کی انگلیوں نے زیادہ مضبوطی سے ایک شکنجے کے مانند ساندرہ کے گھٹنے کو جکڑ لیا۔

اس نے پس منظر میں ایک آواز سنی اور اپنے گھٹنے کو پروفیسر کی انگلیوں سے آزاد کراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خوش قسمتی سے کوئی چیز باتھ روم کے فرش پر گری تھی جس کا روشن دان اس نے تازہ ہوا کی آمدورفت کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پروفیسر بھی یہ آواز سن کر گھبرا گیا اور اس نے پوچھا۔ ”کیا گھر میں کوئی اور بھی ہے؟“

”ہاں۔ صفائی کرنے والی عورت ہوگی۔“ ساندرہ نے بڑی مہارت سے جھوٹ بولا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کہ اب اسے چلے جانا چاہیے۔ وہ ناراضی کے عالم میں اٹھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

اس واقعے کو کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران ساندرہ کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں اور وہ ایک بار پھر اس ادارے میں آگئی جہاں کبھی اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ پروفیسر اب بھی وہیں پڑھا رہا تھا۔

اتنا عرصہ اس ادارے میں گزارنے کے بعد پروفیسر کے مرتبے میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک بڑا اور روشن دفتر تھا جہاں سے کالج کا کیمپس، اس کی لائبریری، سرسبز لان اور قدیم بلند و بالا درخت صاف نظر آتے تھے۔ وہ کافی عرصے سے ایک ہی کلاس میں پڑھا رہا تھا لیکن اسے مکمل طور پر سہولتوں کے ساتھ تمام مراعات حاصل تھیں جبکہ کافی عرصے سے اس کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔

پروفیسر کے مقابلے میں بہت کم تنخواہ پر وہ عارضی مددگار کی حیثیت سے اس ادارے میں آئی تھی۔ اسے نہیں

"اے قاضی! مجھے کسی کی دولت سے کیا سروکار اور نہ ہی علم دشمن ہوں لیکن خود میں موجود اپنی خوبیوں سے آگاہ ہوں۔ ایک جگہ تو پتھر پڑے ہوتے ہیں اور میں پتھر نہیں ہوں۔ مجھے نصر حاجی سے امید ہے کہ وہ مجھے قدر شناس ہاتھوں تک پہنچائے گا۔ اس لیے میں اس کے ساتھ جانے میں اپنی بہتری سمجھتا ہوں۔"

اس تقریر کے بعد قاضی نے مایوس ہو کر نصر حاجی کے حق میں دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ نصر حاجی نے پیسے گن کر سوداگر کے حوالے کیے اور غلام کو لے کر چل دیا۔

اس غلام کا نام "سبکتگین" تھا۔ وہ نسلاً ایران کے بادشاہ یزدجرد کے خاندان سے تھا۔ کسی جنگ میں گرفتار ہوا اور غلاموں کے زمرے میں آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان بھیڑ بکریوں کی طرح منڈیوں میں فروخت ہوا کرتے تھے۔ نہ انہیں بیچنا جرم تھا نہ خریدنا۔ سبکتگین بھی فروخت ہونے کا ذائقہ چکھتا ہوا مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا منڈی آ گیا اور اب نصر حاجی کے پاس تھا۔

"تو یہ کہو کہ تم ایرانی ہوئے۔" نصر حاجی نے اس کی زبانی اس کے حالات سنتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت پہلے کی بات ہے۔ اب تو میں ترک ہوں۔"

"وہ کیسے...... کسی کی نسل کیسے تبدیل ہو سکتی ہے؟" نصر حاجی نے پوچھا۔

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں یزدجرد قتل کیا گیا تو اس کے تابعین اور اس کی اولاد وہاں سے نکل کر ترکستان کی طرف فرار ہو گئی۔ میرا کوئی بزرگ بھی یقیناً ان میں ہوگا۔ یہاں آ کر ان لوگوں نے ترکوں سے بہت میل ملاپ کیا اور اس قوم سے شادی بیاہ کی رسم کی ابتدا کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین نسلوں کے گزرنے کے بعد یہ آدھے ترک بھی اصل ترک مشہور ہو گئے لہٰذا اب مجھے بھی ایرانی نہیں ترک سمجھو۔ ویسے میرا شجرہ نسب فیروز بن یزدجرد سے ملتا ہے۔"

اس کے اس انکشاف سے نصر حاجی کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ اپنے قیافے پر بھی ناز ہونے لگا کہ اس نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ یہ کوئی معمولی غلام نہیں۔ بردہ فروشی کا شاخسانہ نہیں، اس کے پیچھے کوئی معمولی گھرانا نہیں۔ اس کے تعارف میں ایک مضبوط حوالہ ہے جسے بنیاد بنا کر اس غلام کو نہایت مہنگے داموں فروخت کیا جا سکتا ہے۔

نصر حاجی کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ اس خوش گفتار غلام کو اپنی دل بستگی کے لیے اپنے پاس رکھے لیکن پھر اس کے اندر کا حاجی جاگ اٹھا۔ یہ بادشاہوں کا تحفہ ہے، بادشاہوں تک پہنچے تو مجھے مالا مال کر سکتا ہے۔

یہ جنگ بہت دنوں تک اس کے ذہن میں برپا رہی، یہاں تک کہ اس کا تجارتی قافلہ بخارا کی طرف جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے کچھ سوچ کر سبکتگین کو بھی ساتھ لے لیا۔

بخارا کے بازاروں کی بھیڑ بھاڑ، مدرسوں کی رونق، اہل علم کی فراوانی اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ اس سرائے سے بھی واقف تھا جہاں وہ ہمیشہ قیام کرتا تھا لیکن سبکتگین کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ ایک حسین خواب تھا جو وہ جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

نصر حاجی کے کارندے مال و اسباب سے لدے اونٹ لے کر بازار کی طرف چلے گئے اور وہ خود سبکتگین کے ساتھ سرائے میں آ گیا۔ سبکتگین کے لیے یہ دنیا بھی بالکل نئی تھی۔

"میں راستے بھر یہ دیکھتا آیا ہوں کہ تم نہایت اچھے شہ سوار ہو۔ میں نے جان بوجھ کر ایک ایسا گھوڑا تمہیں دیا تھا جو اپنی مرضی سے چلتا ہے، سوار کے قابو کم ہی آتا ہے لیکن تم نے تو چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے اولاد کی طرح سدھا لیا۔"

"یہی نہیں بلکہ میں ایک اچھا شمشیر زن بھی ہوں۔ جب تک میرا باپ زندہ رہا اس نے مجھے تلوار بازی کی اچھی خاصی مشق کرا دی تھی۔ جب ایک جنگ میں میرا خاندان قتل ہو گیا اور میں غلام بنا لیا گیا تو یہ شغل بھی چھوٹ گیا۔ اب معلوم نہیں کہ تلوار میرے ہاتھ میں آ کر پھسلتی ہے یا چلتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں گھوڑے اور تلوار سے دور رکھا جائے۔ کیا خبر کس وقت بھاگ نکلو۔" نصر حاجی نے ازراہ مذاق کہا۔

"میری تقدیر نے اگر مجھے غلام بنا ہی دیا ہے تو میں اپنے مالک سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"میں نے امتحان لینے کے لیے ہی تمہیں اکیلے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے تم اس میں کامیاب ہوئے۔"

"آپ آئندہ بھی مجھے وفادار ہی دیکھیں گے۔"

بخارا کے چند روزہ قیام کے دوران نصر حاجی نے خراسان کے حاکم الپتگین کا نام سنا۔ اسے معلوم ہوا کہ الپتگین غلاموں کا بڑا شائق ہے۔ اس کے پاس ہزاروں غلام ہیں اور وہ ان کی تربیت فرزندوں کی طرح کرتا ہے۔

معلوم تھا کہ پروفیسر کی تنخواہ کتنی تھی۔ البتہ وہ اس بارے میں اندازہ لگا سکتی تھی۔ اسے دوسرے پروفیسر سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا تھا اور جب اس نے انہیں دیکھا تو کسی نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے پاس سے یوں گزر گئے جیسے وہ انہیں نظر ہی نہ آئی ہو۔ اسے کئی کلاسیں پڑھانا ہوتی تھیں لیکن اسے طبی سہولتیں اور دیگر مراعات حاصل نہیں تھیں۔ وہ سر جھکائے کیمپس آتی اور اپنا کام ختم کر کے واپس چلی جاتی۔

اس کے باوجود وہ اس ادارے میں آکر بڑی سنسنی محسوس کر رہی تھی جہاں کبھی خود اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے برف باری میں بھی کیمپس آنا اچھا لگتا، یہاں کے ذہین طالب علم اسے پسند تھے جنہیں ہمیشہ پڑھانے میں مزہ آیا۔ اسے کلاس روم میں باہمی عمل پسند تھا۔ وہ نوجوان ذہنوں کے ساتھ خیالات کا تبادلہ کرتی اور طلبہ ادب سے اس کی محبت، خیالات کی پاکیزگی اور نوجوانوں میں اس کی دلچسپی کی تعریف کرتے تھے۔ ساندرہ کو امید تھی کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے دیں گے۔

سمسٹر میں ایک دفعہ میٹنگ ہوا کرتی تھی لیکن معاونین کو راہداری میں انتظار کرنا پڑتا تھا جب تک کہ مستقل پروفیسر اپنا ایجنڈا مکمل نہ کرلیں اور جب انہیں کمرے میں آنے کی اجازت ملتی تو انہیں شرمناک انداز میں دیوار کے ساتھ بٹھا دیا جاتا جبکہ مراعات یافتہ پروفیسرز میز پر بیٹھتے تھے۔ یہ دیکھ کر ساندرہ کو اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد آجاتا جب چھوٹی لڑکیوں کو رقص کے لیے مدعو نہیں کیا جاتا تھا اور وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرتیں کہ جب دوسرے لوگ رقص کریں گے تو انہیں بھی بلا لیا جائے گا۔

اسی طرح کی ایک میٹنگ میں ساندرہ نے اپنے پروفیسر کو بھی دیکھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی وجیہہ اور پرکشش تھا۔ اس نے اپنا ایک بازو برابر میں بیٹھی ہوئی مشہور شاعرہ کی کرسی کی پشت پر رکھا ہوا تھا جس کے لیے سنہرے بال اس کی کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے ساندرہ کی موجودگی پر کوئی توجہ نہیں دی جس پر اسے خاصی حیرت اور مایوسی ہوئی۔

ایک دن اسے شعبۂ تصنیف کی جانب سے کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس میں فیکلٹی کے تمام اراکین اور طلبہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع کے لیے اس نے اپنے بہترین سیاہ لباس اور اونچی ایڑی کی سینڈلوں کا انتخاب کیا۔ بالوں کو اچھی طرح برش کرنے کے بعد انہیں کندھوں پر کھلا چھوڑ دیا اور ہلکا سا میک اپ کر کے پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور سوچنے لگی کہ اسے اب بھی سب سے زیادہ پرکشش عورت سمجھا جائے گا۔ بڑھتی ہوئی عمر نے اس کے چہرے کے نقوش کو متاثر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے وزن میں کوئی اضافہ ہوا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں اب بھی پہلے جیسی چمک تھی۔ البتہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے باوجود پختہ عمر کے مردوں کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔

جب اس نے پروفیسر کو پارٹی میں دیکھا تو اپنے آپ کو اس کے پاس جانے سے نہ روک سکی۔ اس نے تعریفی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی تمہاری کلاس میں ہوا کرتی تھی۔ کیا میں تمہیں یاد ہوں۔ ساندرہ بیلنگھم!''

''بالکل، مجھے یاد آگیا۔'' اس نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کوئی چیز اہم نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اہمیت رکھتی ہے۔ میں کبھی تمہارے الفاظ نہیں بھولی۔ بہت اچھی نصیحت تھی۔ دراصل میری کچھ کتابیں شائع ہو گئی ہیں اور اب میں یہاں پڑھا رہی ہوں۔'' اس نے کہا، جانتی تھی کہ وہ بہت تیز بول رہی ہے اور اس نے بہت کچھ کہہ دیا ہے، تاہم وہ تھوڑی سی مایوس بھی تھی۔

''اچھا۔ اب تم یہاں ہو؟'' اس نے جواب دیا جس میں تھوڑی سی حیرت شامل تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''غالباً تمہیں ایک سمسٹر کے لیے معاون کے طور پر رکھا گیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی کہ مجھے واپس جانے کے لیے کہا جائے گا یا نہیں۔'' اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ بہت بری بات ہے۔'' اس نے کہا اور مسکرانے لگا۔ گو کہ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ اپنی زبان باہر نکال کر اوپر ہونٹ پر پھیرنے لگا جیسے بلی دودھ کو دیکھ کر کرتی ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ اتنا سنگ دل کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا دل مایوسی سے ڈوبنے لگا۔

پروفیسر نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میری نصیحت تمہارے لیے فائدہ مند رہی۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحے بھر کے لیے دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ بھی واپس اپنے چھوٹے سے دفتر میں چلی گئی جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ وہاں سے اس نے وہ کاغذات لیے جو اسے اس شام پڑھنا تھے۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ

پروفیسر پہلے کے مقابلے میں زیادہ بوڑھا، دبلا اور کچھ بیمار نظر آرہا تھا۔

اسے یاد آیا کہ وہ خود بھی خاصی عمر رسیدہ ہوچکی ہے اور اس شام کی طرح کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو بے حد تھکا ہوا محسوس کیا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کب تک اس طرح برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر اپنا بیگ کمر پر لادے چلتی رہے گی جس میں اس کا کمپیوٹر اور وہ کاغذات ہیں جو اسے پڑھنے ہیں۔ اس کا راستہ بھی انہی لوگوں کی طرح کٹھن اور دشوار گزار ہے جن کے چہرے تھکن سے مرجھا چکے ہیں اور وہ ہر وقت اسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں کہ آنے والے مہینوں میں ان کے پاس ملازمت یا کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی ہوگا یا نہیں۔ اس نے اپنی ان دو کتابوں کے بارے میں سوچا جنہیں حال ہی میں اس کے پبلشر نے واپس کردیا تھا اور وہ سوچ رہی... تھی کہ کیا اس کی مزید کوئی اور چیز شائع ہوسکے گی۔ بہرحال اس نے لکھنا تھا چاہے اسے رات گئے تک جاگنا پڑے۔ صبح سویرے اٹھ کر یونیورسٹی جانے کی فکر الگ تھی۔

حال ہی میں اس کے اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی بڑھ گیا تھا۔ ہر چیز کے دام بڑھ رہے تھے اور اس کی آمدنی ایک ہی جگہ رکی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی ایسا کام نہیں کررہا تھا جس سے کچھ آمدنی ہوتی۔ ان میں سے ایک فلم بزنس میں اور دوسرا مصور تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے ہی ان کی مدد کرنا پڑتی تھی۔

وہ پُرہجوم سب وے میں ایک بار کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس نے پروفیسر کی نصیحت اپنے بیٹوں کو کیوں نہیں بتائی، کوئی چیز اہم نہیں ہوتی لیکن اہمیت رکھتی ہے۔"

اس رات وہ گھر واپس آئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے لیے کھانا پکاسکے۔ اس نے فریج کھول کر دیکھا۔ دو انڈے، پنیر کا ایک ٹکڑا اور چند سلائس اس کی بھوک مٹانے کے لیے کافی تھے۔ وہ وہیں کچن کاؤنٹر پر کھڑے ہوکر جانوروں کی طرح کھانے لگی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے خدا خیر کرے۔ اس نے دھڑکتے دل سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف شعبۂ تصنیف کا سربراہ بول رہا تھا۔

"معاف کرنا، تمہیں اتنی رات گئے فون کررہا ہوں اور مجھے یہ بری خبر تمہیں سنانا پڑرہی ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پروفیسر کو ایک قریبی ریستوران میں فیکلٹی ڈنر کے دوران دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا ہے۔ وہاں اس کا آپریشن ہورہا ہے۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔ اب وہ کیسا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ اس کا پورا نام جم فالکنر تھا۔ "آپریشن کے بعد بھی اسے صحت یاب ہونے میں کئی ہفتے لگ سکتے ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس سیمسٹر کے آخر تک تم پروفیسر کی جگہ پڑھانا شروع کردو۔ اس کی چند کلاسیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ فیکلٹی کے تمام ممبران تمہارے شکر گزار ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیا تم اگلے سیمسٹر میں بھی اس کی کلاسیں لے سکو گی؟"

"مجھے خوشی ہوگی۔"

اس نے اپنی بساط کے مطابق یہ فرض انجام دیا اور سیمسٹر کے آخر تک یہ اضافی بوجھ برداشت کرتی رہی۔ اگلے سیمسٹر تک وہ بہت زیادہ خود اعتماد ہوچکی تھی۔ اسے پروفیسر کا کمرا بھی مل گیا تھا جہاں وہ اس کی بڑی سی میز پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر درختوں کو دیکھتی۔ طالب علموں کو کانفرنس کے لیے بلاتی اور انہیں قیمتی مشورے دیتی۔ پروفیسر کی جگہ کام کرنے سے اس کی عزت و توقیر میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور دوسرے شعبوں کے لوگ بھی اس سے نرمی سے پیش آنے لگے تھے۔ وہ راہداری سے گزرتی تو اسے دیکھ کر یوں مسکراتے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔ وہ اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے۔

ایک روز صبح کے وقت ایک نوجوان عورت نے جو خود بھی فکشن پڑھاتی تھی، اس کے دروازے پر دستک دی اور شرماتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ساندرہ کی نئی کتاب تھی جسے اس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میرے لیے اس کتاب پر اپنے دستخط کرنا پسند کروگی؟"

ساندرہ نے اس کی سبز آنکھوں اور چمک دار سنہری بالوں کو دیکھا اور اپنے دل میں سوچنے لگی کہ یہ نوجوان عورت بہت ترقی کرے گی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے خوشی ہوگی۔ تم کتنی پیاری ہو۔ کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟"

"ایملی ڈونن۔ میں تمہاری بہت بڑی پرستار ہوں۔" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ساندرہ کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔

ساندرہ نے کتاب پر دستخط کردیے اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر وہ اس سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ خود بھی معاون کے طور پر کام کررہی تھی اور اس کے دو چھوٹے بیٹے تھے۔ اس نے ساندرہ کو اپنے سیل فون پر ان دونوں کی

تصویر دکھائی۔ وہ سیاہ بالوں والے بچے پتھر کی دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا شوہر ایک آرکیٹکٹ تھا۔ ”ہم دونوں ہی جدوجہد کر رہے ہیں لیکن بہت مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ میں گزر اوقات کے لیے دوسری یونیورسٹیوں میں بھی کام کر چکی ہوں۔“

اس کی باتوں میں ساندرہ کو سچائی اور خلوص کی جھلک نظر آئی۔ وہ خود بھی ایسے ہی حالات سے گزر رہی تھی اس لیے اسے بھی اپنایت محسوس کرنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ کیا وہ اس کی حقیقی دوست بن سکتی ہے۔

اپریل میں ساندرہ کو معلوم ہوا کہ پروفیسر مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا ہے اور وہ خزاں میں واپس آرہا ہے۔ یہ بات اسے فالکنر نے بتائی۔ اس کے خیال میں یہ ایک معجزہ تھا ورنہ دورہ اتنا شدید تھا کہ کسی کو بھی اس کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ یہ خبر ساندرہ پر بجلی بن کر گری۔ وہ خود بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ پروفیسر زندہ نہیں رہے گا اور اگر صحت یاب ہو گیا تب بھی اس قابل نہیں ہوگا کہ اپنے فرائض دوبارہ سنبھال سکے۔ اس کے واپس آنے کا مطلب ساندرہ کی اپنی پوزیشن پر واپسی تھی جبکہ وہ پروفیسر کی جگہ مستقل تعیناتی کا خواب دیکھ رہی تھی۔

ساندرہ کو اس کی بیوی کا خیال آیا جو مر چکی تھی۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب پروفیسر نے بلی کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ”بہت بری بات ہے۔“ پھر اسے وہ چائے یاد آئی جو اس نے پروفیسر کے لیے بنائی تھی۔ وہ منظر بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھا جب پروفیسر کا بھاری ہاتھ اس کے گھٹنے پر رینگ رہا تھا۔ وہ سب باتیں اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے ابھر رہی تھیں۔ اس وقت وہ اپنی کتابیں اور دوسرا سامان سمیٹ کر اس شاندار دفتر سے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر کیمپس کا نظارہ کیا۔ درختوں پر بہار آئی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اب بھی وہ یہاں واپس آسکے گی؟ اس مشہور یونیورسٹی میں اسے دوبارہ پڑھانے کا موقع ملے گا؟ اب گزارہ کیسے ہوگا؟ مکان کا کرایہ اور دوسرے بل کس طرح ادا کیے جائیں گے؟ اگر اس نے شروع سے ہی ان لوگوں کے ساتھ کام کیا ہوتا، ان کے دل میں جگہ بنائی ہوتی تو آج وہ بھی اسی یونیورسٹی میں مستقل عہدوں پر فائز ہوتی۔ اس نے ہمیشہ سمجھوتا کرنے اور اپنے تعلقات استعمال کرنے سے گریز کیا۔ اس نے ایک اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کی اور وہی کیا جو اس کے سابق شوہر اور لڑکوں کے لیے مناسب تھا۔

اب خزاں کے موسم میں اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے حال ہی میں جو کتابیں لکھی تھیں ان میں ... کو بھی پبلشر نے چھاپنے پر رضامندی ظاہر نہیں کی۔ ... اپنے کاروباری مفاد کو دیکھتے ہوئے کام کرتے تھے ... ساندرہ کی ضرورتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک رات ... ہی اس کے چھوٹے بیٹے جم نے فون کر کے یہ خبر سنائی کہ اس کی کار کو حادثہ پیش آگیا تھا۔ اس کی کار نے دو قلابازیاں کھائیں اور وہ مرتے مرتے بچا۔ اس کے اسٹیئرنگ وہیل میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ وہ ویسے ہی پرانی کار تھی اور حادثے کے بعد استعمال کے قابل نہیں رہی تھی۔

”مجھے نئی کار چاہیے ممی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

وہ مئی کے آخر کی ایک گرم شام تھی۔ سیمسٹر ختم ہو چکا تھا۔ ساندرہ اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا بیٹھی کھانا کھا رہی تھی جو اسپاگیٹی اور آدھا کین ابلی ہوئی مچھلی پر مشتمل تھا۔ کھانے کے بعد اس نے دو گلاس سستے مشروب کے پیے اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر سوچوں میں گم ہو گئی۔ وہ کئی روز سے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس کی کسی سے بات ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹوں سے بھی نہیں۔ اس مہینے اس نے ابھی تک مکان کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے چین اور بے آرام محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں سن ہو رہی تھیں اور کمر میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ گزشتہ شب اس نے ایک بہت ہی برا خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی پھر وہ دوبارہ نہ سو سکی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے اس کا کمپیوٹر چوری کر لیا ہے جس میں اس کا نیا ناول اور باقی کام محفوظ تھا۔

اس نے کچھ سوچے بغیر اپنی پرانی چمڑے کے کور والی ایڈریس بک اٹھائی جو اس کے پاس برسوں سے تھی۔ پھر اس نے ناموں کی فہرست پر انگلی پھیرنا شروع کی۔ وہ کسی ایسے شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی مدد کر سکے۔ پھر وہ پروفیسر کے نام پر آ کر رک گئی۔ اس کے پاس ابھی تک اس کا نمبر محفوظ تھا جو اس نے کئی برس پہلے سرخ سیاہی سے اس کتاب میں لکھا تھا جب وہ اس کے گھر چائے پینے آیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا نمبر اسے دیا تھا کہ اگر کبھی ضرورت محسوس ہو تو وہ اس سے رابطہ کر سکتی ہے گو کہ اسے یقین نہیں تھا کہ آج بھی وہ اس بات پر قائم ہوگا۔ اس کی امید بہت کم

تھی۔ بہر حال وہ اس کا نمبر ملانے لگی۔

اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اگر اس نے اتفاقاً فون اٹھالیا تو وہ کیا کہے گی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوسری جانب سے فوراً ہی جواب آ گیا۔ وہ مزید گڑبڑا گئی اور اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

''کون بول رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ساندرہ ہوں۔ ساندرہ بینگھم۔ امید ہے کہ یہ تمہارے لیے زحمت کا باعث نہیں ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔'' اس نے نرم آواز میں کہا۔ اس کے باوجود ساندرہ کو یقین نہیں تھا کہ وہ اسے پہچان گیا ہوگا۔

''میں صرف یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔ ہم سب تمہارے بارے میں بہت پریشان تھے۔ میرا مطلب ہے کہ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ۔''

''فون کرنے کا بہت بہت شکریہ مائی ڈیئر، اب میں بہت بہتر ہوں بلکہ پہلے سے بھی اچھا ہوں۔ لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر نیا دل لگا دیا ہے گو کہ ابھی انہوں نے بہت زیادہ کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دی ہے جس کی وجہ سے بور ہو رہا ہوں۔''

''کیا تم پسند کرو گے کہ میں تم سے ملنے آ جاؤں؟ کسی بھی روز سہ پہر میں چائے کے وقت؟''

یہ کہتے ہوئے اسے بے اختیار وہ دن یاد آ گیا جب پروفیسر نے اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اس کی خاطر مدارات کے لیے کیک اور سینڈوچ بنائے۔ مہنگی پیالیاں خریدیں۔ وہ بھی کتنی بے وقوف تھی۔

''تم کتنی مہربان ہو۔'' پروفیسر نے گرم جوشی سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ لے کر آؤں، تم کیا پسند کرو گے؟ کیا تمہارے لیے کیک بنا کر لاؤں؟''

''اوہ نہیں۔ بس تم اپنی خوبصورت شکل لے کر آ جاؤ۔ ہم کچھ باتیں کریں گے۔ مجھے تمہارے ساتھ وقت گزار کر خوشی ہوگی۔''

ساندرہ کے پاس اپنے باپ کا پرانا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور ابھی تک محفوظ تھا۔ وہ تنہا رہتی تھی اسی لیے اس نے بھی اپنے باپ کی طرح بستر کے برابر والی دراز میں ریوالور رکھنا شروع کر دیا تھا حالانکہ وہ افریقا کے کسی دور دراز فارم میں نہیں بلکہ منہٹن کے وسط میں رہ رہی تھی۔ اس نے وہ ریوالور دراز سے نکالا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ حقیقی زندگی کے بجائے کوئی سنسنی خیز فلم ہوتی تو ہیروئن یہ ریوالور اپنے ساتھ لے کر پروفیسر سے ملنے جاتی تاکہ اس میں بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہو سکے۔ گو کہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے پروفیسر سے کیا بات کرنا ہے یا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے کن الفاظ کو سہارا بنانا ہوگا۔

اس نے کچھ سوچ کر ریوالور واپس دراز میں رکھ دیا۔ اسے کسی ہتھیار کا سہارا لیے بغیر اپنے طور پر ہی پروفیسر سے بات کرنا ہوگی۔

اسے پورا یقین تھا کہ اس سہ پہر پروفیسر نے صرف اسے ہی مدعو کیا ہے اور صرف وہ دونوں ہی اس کے پرانے گھر میں تنہا ہوں گے۔ اس طرح اسے پروفیسر سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل سکے گا۔ اگر وہ پروفیسر کو اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو وہ ضرور اس کی مدد پر آمادہ ہو جائے گا۔

اس نے بہت سوچ بچار کے بعد لباس کا انتخاب کیا۔ وہ ایسا لباس زیب تن کرنا چاہتی تھی جس میں اس کا جسم نمایاں ہو جائے۔ اس طرح وہ پروفیسر کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ اسکرٹ، اس پر سلیٹی رنگ کا سوئٹر، پیروں میں سیاہ لمبے چمڑے ... کے جوتے، کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں سیاہ چمڑے کے دستانے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ، اس روپ میں وہ فرانسیسی فلموں کی ہیروئن لگ رہی تھی۔

باہر کافی گرمی تھی اور ہوا نہ چلنے کی وجہ سے درختوں کے پتے ساکت تھے۔ باہر نکل کر اسے احساس ہوا کہ اس لباس میں اسے گرمی لگ رہی ہے۔ سڑک کے کونے پر واقع پھول فروش کی دکان پر وہ رک گئی تاکہ کچھ دیر ٹھنڈے ماحول میں رہے۔ پھر اس کی نظر شوکیس میں سجے ہوئے پھولوں پر گئی۔ اس نے کچھ سفید اور سرخ گلاب خرید لیے۔

سڑک پر چلتے ہوئے وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ دستانوں میں اس کے ہاتھ گیلے ہو گئے تھے، سر بری طرح گھوم رہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے دماغ میں کیا تھا؟ وہ کیا کر رہی تھی؟ یہ سب حماقت تھی۔ بڑی حماقت لیکن اب اس کے لیے واپس جانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی منزل کی جانب بڑھتی گئی۔

اس نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس گرمی میں کوئی بھی باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک بوڑھی عورت اپنے کتے کے ساتھ جاتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے مطمئن ہو کر دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور پروفیسر نے اسے اندر بلا لیا۔

جہاں تک اس کے علم میں تھا۔ پروفیسر نے کبھی کوئی نوکر نہیں رکھا۔ جب اس کی بیوی صحت مند تھی تو کھانا پکانے

سے لے کر گھر کی صفائی تک سارے کام وہی کیا کرتی۔ اس کی بیماری کے زمانے میں صفائی کرنے والی عورت آیا کرتی تھی۔ اس نے وہ چھوٹا سا گلدستہ پروفیسر کو پیش کیا اور جواب میں اس نے ساندرہ کے گال پر ایک بوسہ ثبت کر دیا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس نے بڑی بے حیائی سے کہا۔ "تم کتنی پیاری ہو مائی ڈیئر۔"

ساندرہ نے اپنا چشمہ اتار کر اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہ بولا۔ "تم اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہو بالکل کسی فرانسیسی اداکارہ کی طرح۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر لیونگ روم میں لے گیا۔ اسے وہ جگہ یاد تھی جہاں کئی برس پہلے وہ اپنے طالب علموں کو پارٹیوں میں بلایا کرتا تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سبز پتوں کی بیلیں اسی طرح کھڑکی کی طرف بڑھ رہی تھیں اور کتابیں دیوار پر لگی ہوئی الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے چکردار زینے کی طرف دیکھا تو اسے پروفیسر کی بیوی یاد آ گئی جب وہ باتھ روم جانے کے لیے اس کے کمرے کے آگے سے گزری تو وہ تنہا اندھیرے کمرے میں گلابی کمبل اوڑھے ہوئے لیٹی تھی اور اس نے اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا۔

اس نے پروفیسر کی طرف دیکھا جس نے اس کے لائے ہوئے پھول میز پر رکھ دیے تھے اور مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزتے بازوؤں سے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ دور ہو گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔ "میں چائے پینا پسند کروں گی، کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

"کیوں نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے کچھ بسکٹ کہیں رکھے ہوئے ہیں لیکن کیا تم چائے سے زیادہ کوئی تیز مشروب لینا پسند کرو گی؟"

"چائے ہی ٹھیک رہے گی۔" ساندرہ نے کہا تو وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ ساندرہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

اب تھوڑا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پیالی میں چائے اور طشتری میں... بسکٹ لے کر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پیالے میں گری دار میوہ بھی تھا۔ وہ اس کے برابر میں بالکل قریب ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تمہاری زبان سے یہ بات سن کر میں بہت حیران ہوا۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اس کی جالی دار ٹوپی اتار دی۔ ساندرہ کے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ "میں بھی تمہیں نہیں بھولی۔" اس نے بناوٹ سے کہا اور جب پروفیسر کا ہاتھ اس کے اسکرٹ پر سے پھسلتا ہوا ٹانگوں تک پہنچا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ بغیر دودھ چینی کی گرم چائے پیتی رہی۔ جب اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی تو پروفیسر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے مزید قریب کر لیا اور وارفتگی کے عالم میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "مائی ڈیئر، مائی ڈیئر۔"

ساندرہ نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید پیش قدمی کرتا، ساندرہ نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اس سے الگ کیا اور اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ ڈگمگاتا ہوا فرش پر جا گرا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے ہلکا سا سانس لیا۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور کراہنے لگا۔

وہ وہاں رکی رہی جب تک کہ اس کے مرنے کا یقین نہ ہو گیا۔ اس کا جسم بل کھایا ہوا زمین پر پڑا ہوا تھا اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ اب وہ شخص ایک بے جان شے ہے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور خاموشی سے چلی آئی۔

موسم گرما میں وہ جم فالکنر کے فون کا انتظار کرتی رہی کہ وہ اسے پروفیسر کی خالی جگہ کے بارے میں بتائے۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی اور پروفیسر کی جگہ اسے ہی مستقل تقرری کا پروانہ مل جائے گا لیکن فالکنر کے بجائے ایمل نے فون کر کے بتایا کہ پروفیسر کی جگہ اس کا تقرر ہو گیا ہے۔ "میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھ رہی ہوں حالانکہ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ میں اسے بہت پسند کرتی تھی۔ وہ ایک ذہین پروفیسر اور مصنف تھا۔ یقیناً میں نے کبھی نہیں چاہا کہ اسے کوئی نقصان پہنچے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کی وجہ سے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب آ گیا ہے۔"

ساندرہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اس عظیم سانحہ اور اچانک موت سے کم از کم کسی ایک کو تو خوشی ملی۔" یہ کہتے ہوئے اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے آپ کو پروفیسر کی موت کا ذمے دار سمجھ رہی تھی۔ اسے کرنی کا پھل مل گیا تھا اور اس کو ملنے والی خوشی کسی اور کے حصے میں چلی گئی۔

محفلِ شعر و سخن

❁ محمد رشید سیال.....روہڑی، ضلع سکھر
لاکھ سہی یہ چاندی صورتیں زلفوں کے خم اچھے ہیں
دل کا موسم اچھا ہو تو سارے موسم اچھے ہیں

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

❁ یمنیٰ جاوید.....کراچی
اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی



❁ سید ظفر عباس زیدی.....بھوآنہ
ہم نے ٹھوکر کھا کر چلنا سیکھا ہے
اور ہیں وہ جو ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں

❁ رمضان پاشا.....گلشنِ اقبال، کراچی
ہم کنارے پر کھڑے تکتے رہیں گے سوچ سوچ
اور سفینے کو کہیں آبِ رواں لے جائے گا

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ
مرے میاد سے کہہ دو نہیں اب لوٹنا ممکن
سمندر میں گرے قطرے کو پھر پایا نہیں جاتا

❁ جاوید اختر رانا.....پاک پتن شریف
ہاں! مجھے رسمِ محبت کا سلیقہ ہی نہیں
جا! کسی اور کا ہونے کی اجازت ہے تجھے

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ.....خانیوال
عشق ہر چیز کی تاثیر بدل دیتا ہے
برف چھوتی ہے تو اک آگ سی لگ جاتی ہے

❁ بینش صدیقی.....حیدرآباد
ذرا نہیں ہے دل سے وہ کوشش کے باوجود
ایک شخص میری ذات پر بھاری ہے اس قدر

❁ ساگر تلوکر.....چشمہ بیراج، میانوالی
میں کھل جاؤں گا بہتے پانیوں میں
رہِ طوفان میں اک مٹی کا گھر ہوں

❁ منصب چودھری، ماریہ چودھری.....پاک پتن شریف
تُو تو عالم ہے جانتا ہے کتابوں کے راز
میرا چہرہ پڑھ میرے حالات بتا
حاصل ہو جائے مجھ کو دلنشیں میری
کوئی ایسی دعا کوئی ایسی مناجات بتا

❁ جنید احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی
نیا جذبہ نئی ترنگ لے کے آیا ہوں
میں خوشبودار سپنے لے کے آیا ہوں
اک دو خواب خریدے ہیں بیچ کر آنکھیں
تب اپنی ذات کا آہنگ لے کے آیا ہوں

❁ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی

انسان کے پہلو میں دل ہے کہ پتھر
ہر ظلم کو دیکھ کر جو خاموش رہا ہے

❁ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی

بڑا غرور تھا جن کے خلوص پر مجھ کو
کرم انہی کا ہے شامل مرے ستانے میں

❁ ریاض بٹ...... حسن ابدال

اداس اتنا نہ ہوا کر کسی کی یاد میں
لوگ نصیب سے ملتے ہیں اداسیوں سے نہیں

❁ عظیم احمد...... جھنگ سٹی

مر کر بھی اُن کو دیکھتے رہنے کی چاہ میں
آنکھیں کسی کو دینے کی تاکید کر گیا

❁ شاہد علی...... فیصل آباد

اس لیے بھی میں رات کو گھر سے نکل آتا ہوں
سردیوں کے چاند کو احساسِ تنہائی نہ ہو

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... سکھیکی منڈی

ہے کیا عذاب کہ آنکھوں میں نیند بھر نہ سکے
نہ یاد آ مجھے اتنا کہ شب گزر نہ سکے

❁ صبا سحر...... کراچی

پھولوں کو جب بھی اس طرح مسلا کریں گے لوگ
خوشبو کی بوند بوند کو ترسا کریں گے لوگ
آنسو نکل آئیں تو انہیں خود ہی پونچھیے
آئیں گے پونچھنے بھی تو سودا کریں گے لوگ

❁ منیر شگفتہ...... وہاڑی

محبت میں اذیت شناس کتنی تھیں
بچھڑتے وقت یہ آنکھیں اداس کتنی تھیں
بچھڑ کے تجھ سے کسی طور دل بہل نہ سکا
نشانیاں بھی میرے پاس تیری کتنی تھیں

❁ وزیر محمد خان...... بفہ ہزارہ

تنہائیوں میں بیٹھ کے کیا سوچتے ہو تم
کچھ تو ہمیں بتاؤ پریشاں ہم بھی ہیں

❁ زوہیب احمد ملک...... گلستانِ جوہر، کراچی

میری خطاؤں کی فہرست لے کر آیا تھا
عجیب شخص تھا اپنا حساب چھوڑ گیا

❁ انعم کمال...... حیدر آباد

غمِ فراق میں کچھ دیر رو ہی لینے دو
بخار کچھ تو دلِ بے قرار کا نکلے

❁ سید شاہ عالم زمرد...... راولپنڈی

ہمیں تو آپ کی اک اس ادا نے لوٹ لیا
نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں
ہم ہی سے سیکھیں ادائیں ہم ہی پہ وار کیا
ہمارے تیر ہم ہی پر چلائے جاتے ہیں

❁ طاہر مجاہد...... چھالیہ

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

❁ طیب اسد...... ڈیرہ اسماعیل خان

ہوا لپکتی رہے، میرا کارواں۔ تو چلے
بُرا نہیں اگر اک بار پھر چراغ جلے
غمِ حیات سے لوں گا امِ حیات کا درس
تمام عمر شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

❁ اعتزاز ظفر...... اسلام آباد

کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فرق ہے رنگ تمہارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماؤ

❁ سلیم قادر...... میانوال رانجھا

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

❁ نوشتہ گلزار...... بھکر

ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اکسانے آئے ہیں
ضمیرِ ارتقاء میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں
اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سناٹے
سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں

❁ نادیہ ریاض...... نواب شاہ

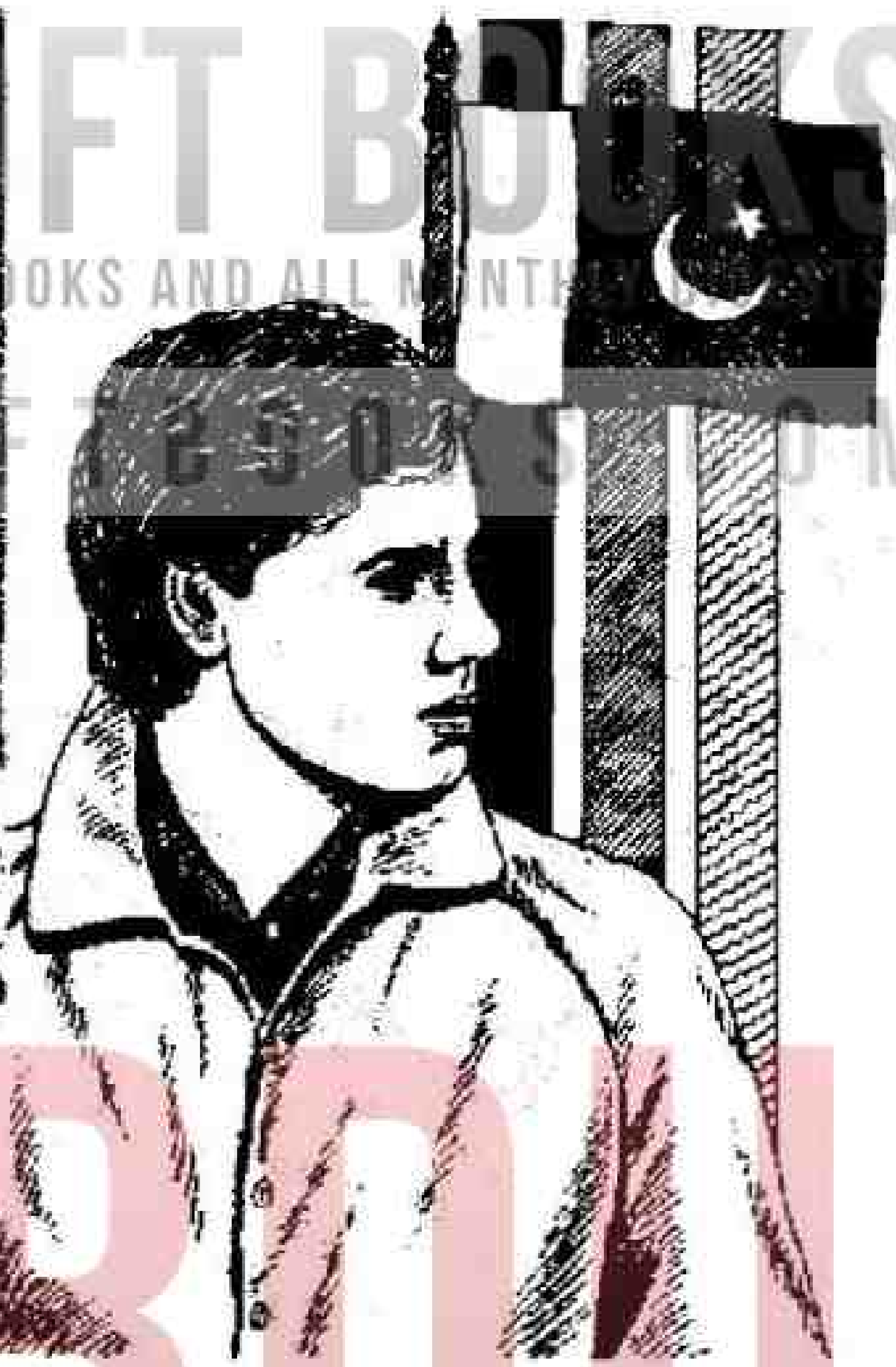
اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ
خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات چلی ہے، بری حسین خطاؤ!

❊ اختر پرویز......بہار کالونی، کراچی
یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں
جو تو رفیقِ سفر ہو تو رات، رات نہیں
❊ ریاض احمد انصاری......لاہور
شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں
❊ طیب شاہین......کھیالہ شیخاں
مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہوگی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رخی کا جواز
❊ امتیاز احمد......پھالیہ
یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تعلق کا حوصلہ بھی نہیں
❊ سائرہ نواب......پشاور
مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں
❊ نعیم احمد......بہاولپور
یہ پوچھنا ہے، کب آدم زمیں پہ اترے گا
جو لے چلے کوئی کامل خدا کے پاس ہمیں
❊ کامران شاہد......میرپور خاص
زور آور کے دستِ ستم میں دونوں گروی ہیں
مزدوروں کا خون پسینا، دہقانوں کا ہل
❊ صبا حمید......ٹنڈو الہیار
تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے
اس کے سوا ہمارا کوئی مدعا نہ تھا
❊ سحر خان......کوئٹہ
وہاں پہ اب بھی ستارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں، جس بھی گلی میں رہتا تھا
❊ عاصم خان......کراچی
سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زلف کے جائیں گے کسی دن!

❊ عمران شیروانی......لاہور
چاہے تو یونہی رکھے، چاہے تو سحر کردے
اس رات کا مستقبل اس ماہ جبیں پر ہے
❊ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
زہر بیچنے والے آبسے ہیں شہروں میں
سانپ کی طرح اب تو دوستی بھی ڈستی ہے
❊ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
یہ رت جگوں کا کسی طور سلسلہ نہ رہے
ملو تو یوں کہ بچھڑنے کا شائبہ نہ رہے
❊ ملائکہ حریم......اوکاڑہ
قدم قدم پہ ملے بھی ہیں اور بچھڑے بھی
کہاں چراغ جلائیں، کہاں بجھائیں ہم
❊ محمد امجد ریاض......اقبال نگر چیچہ وطنی
گریہ کروں تو خندہ زنی مجھ پہ کرتا ہے
ساجن کے دل کو پتھر نہ کہوں تو کیا کہوں
❊ اشفاق شاہین......لاہور
نہ ہو امید تو دوزخ سے کم نہیں دنیا
فریب کتنا ضروری ہے آدمی کے لیے
❊ وسیم اکرم......مہر شاہ، خانیوال
احساسِ محبت کے لیے ہم اتنا ہی کہتے ہیں
تیرے بغیر بھی ہم تیرے ہی رہتے ہیں
❊ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ
لیتی ہے جلتی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور
❊ حنظلہ شاہد......سکھر
موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی!
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل!

کوپن
محفلِ شعروسخن
برائے شمارہ
جون 2017
نام: ____________________
پتا: ____________________





دھیان

عظمیٰ اختر

قانونِ قدرت ہے جیسا بیج بویا جائے گا ویسا ہی پودا نکلے گا مگر... یہ بے وقوفی کی اعلیٰ مثال ہوگی کہ کیکر کا بیج بو کر گلاب کی توقع کی جائے... سب کچھ جانتے ہوئے اس نے بھی یہی غلطی کی... تمام عمر جس زمین پر اسے کیڑے نظر آتے رہے، جب اگلی نسل کی بات آئی تو اسی زمین پر گلاب ہی کھلے نظر آئے... مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ معصوم بچوں کا ذہن بھی ایسی ہی نرم مٹی ہے جس میں ہم جو بٹھاتے ہیں وہ آسانی سے اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

مغربی اور مشرقی ماحول اور افادیت و اذیت کا عبرت اثر موازنہ

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کسی سے ٹیلی فون پر باتیں کر رہے ہوں اور آپ کے قریب سے ایک ہاتھ اٹھے اور کریڈل کو دبا کر باتوں کا سلسلہ ہی توڑ ڈالے۔ وہ چاہے کوئی بھی ہو، غصہ تو آتا ہی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں اچھی خاصی فون پر اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ انہوں نے آتے ہی فون کے کریڈل پر ہاتھ رکھا اور لائن کٹ گئی۔ یوں میرا اس کے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا۔ میں نے غصے کے عالم میں ان کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں بھی غصے اور نفرت کے ملے جلے تاثرات کی گھٹائیں موجود تھیں۔

”بہت ہو چکا ثنا..... اب اسے بند کرو۔ میں یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتا کہ تم یوں لڑکوں سے آزادانہ باتیں کرو..... اور ان کے ساتھ گھومو پھرو.....“

”مگر پاپا.....“ میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

Watch Us On

YouTube

خالص شہد کی پہچان





چہرے کی جھریوں کا بہت ہی آسان علاج





"میں نے کہا ہے نا...... کہ مجھے یہ سب کچھ قطعاً اچھا نہیں لگتا...... اور سنو جس ماحول میں تم اب جانے والی ہو وہاں بھی یہ قطعاً اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" انہوں نے اسی لہجے میں کہا۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا...... یہ تم کہہ رہی ہو...... تم ثنا...... جانتی ہو تم کس سے مخاطب ہو؟" پاپا غصے میں سرخ ہوتے ہوئے بولے۔

"ہاں...... ہاں سب جانتی ہوں۔ جس ماحول اور جس ملک میں ہم رہ رہے ہیں وہاں کسی کی آزادی سلب کرنے کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ چند نمبر ڈائل کر کے آپ کو......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاید مجھے کہیں احساس ہو چلا تھا کہ میں نے غصے میں بہت غلط بات کہہ دی ہے اور اس کا اثر یقیناً پاپا کی طبیعت پر بھی ہوگا مگر میں بھی کیا کرتی، میں بھی تو غصے میں تقریباً اندھی ہو چکی تھی۔

یہ بھی تو تقریباً ہر روز کی بات ہو چلی تھی کہ مجھے اٹھتے بیٹھتے اس بات کا دانستہ طور پر احساس دلایا جا رہا تھا کہ میں اب اس ماحول سے دور جانے والی ہوں۔ جب سے میں نے شعور سنبھالا تھا، مجھے یہ یاد کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اس ماحول میں رہنے والا ہر مرد...... ایک سانپ ہے اور اب مجھے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ نادیدہ پابندیوں کے حصار میں رہنا ہوگا...... اور یہ باتیں میرے سراپا میں انڈیلی جا رہی تھیں جن سے مجھے نفرت ہوتی چلی گئی۔ یہی وہ نفرت تھی جو قطرہ قطرہ میرے اندر کہیں جمع ہوتی رہی اور آج موقع ملتے ہی نفرت کا یہ آتش فشاں پھٹ پڑا ممکن تھا کہ میں اور بھی بہت کچھ کہہ ڈالتی کہ مجھے جیسے احساس ہو گیا تھا۔

"ہوں......!" پاپا کے چہرے پر نفرت اور پریشانی کے اثرات ہویدا ہو گئے تھے۔

"ثنا! میں یہ سب تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کسی ڈرے ہوئے انسان کی طرح ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ یوں جیسے وہ میری گفتگو سن کر اندر ہی اندر سے کہیں ٹوٹ کر رہ گئے ہوں۔

"پاپا...... میں اس قدر بھی نا سمجھ نہیں ہوں کہ آپ بات بات پر مجھے سمجھاتے پھریں۔ انگلی پکڑ کر چلنے کا زمانہ کب کا میرا ساتھ چھوڑ گیا ہے اور اب میں اپنا برا بھلا خوب سمجھ سکتی ہوں۔" میں نے دھیرے سے بات بناتے ہوئے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ تم ناسمجھ ہو...... مگر پھر بھی میرے لیے تو تم وہی ثنا ہو...... جسے میں انگلی پکڑ کر قدم قدم چلنا سکھا رہا ہوں۔ جس ماحول میں ہم سانس لے رہے ہیں اور جس فضا میں تم نے جانا ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں جو تہذیب اور ثقافت سمجھ کر کیا جا رہا ہے، وہاں یہ انتہائی بے ہودہ سمجھا جاتا ہے...... تم اس ماحول کی چھاپ لے کر وہاں جاؤ گی تو تمہاری زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں کی آزادی...... وہاں رسوائی کا سبب بن جائے گی۔ اس لیے...... اس لیے میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" پاپا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"دیکھیں پاپا...... اول تو میں نے وہاں جانا ہی نہیں جہاں کی آپ مجھے باتیں سناتے رہتے ہیں اور دوسرے جب پانی سر سے گزر جائے تو پھر ڈوبنے سے بچنے کی ساری دعائیں اکارت ہو جاتی ہیں اس لیے......!"

میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"تم سن رہی ہو...... رومیسہ...... کس دیدہ دلیری سے یہ میری باتوں کا جواب دے رہی ہے۔ کچھ شرم حیا باقی نہیں رہی۔ کتنا روکھا پن آ گیا ہے تمہاری لاڈلی کی باتوں میں۔" پاپا نے امی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ تب امی جان بھی کچن سے نکل کر ہمارے پاس آ گئیں......

"تمہارے پاپا ٹھیک کہتے ہیں ثنا...... یقین کرو ہم تمہاری بھلائی میں ہیں۔ تم جہاں جا رہی ہو وہاں آنکھوں میں یہاں کی آزادی اور بے حیائی لے کر جاؤ گی تو زندگی کانٹوں کی سیج بن کر رہ جائے گی۔ تم نے وہاں کے رسم و رواج...... وہاں کی قدروں کی صرف باتیں سنی ہیں، وہاں کا ماحول نہیں دیکھا۔" امی جان نے دھیرے دھیرے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں نہیں جانا چاہتی امی...... میں یہاں کی آزادی کو چھوڑ کر گھٹن اور تعفن زدہ ماحول میں گھٹ گھٹ کر مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" میں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"مگر بیٹا...... یہ سب تو تمہیں کرنا ہوگا...... اس لیے کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم ایک مسلمان گھرانے میں جنم لے کر یوں آزادی کے...... ساتھ دوسری تہذیب کے لڑکوں کو یوں ٹیلی فون کرو، ان کے ساتھ آزادی کے ساتھ گھومو پھرو...... یا ان سے میل جول رکھو۔ لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ہر حال میں واپس پاکستان جانا ہے اور جلدی جانا ہے...... وہی ہماری تہذیب اور ثقافتی ورثہ ہے۔ وہاں کی مٹی میں ہمارے بزرگوں کی حیا آلود سانسوں کی خوشبو رچی بسی ہے اور یہاں کیا ہے۔" امی جان نے ایک بار پھر

یہی غلام اس کی فوج بھی ہیں جن سے کام لے کر وہ دشمنوں پر قابو پاتا ہے۔ انہی غلاموں کے ذریعے اس نے حاکم خراسان بنتے ہی اپنی حکومت کو قوی بنالیا ہے اور مکمل غلبہ حاصل کرلیا ہے۔

نصر حاجی نے جب الپتگین کے کارناموں کی ترازو میں سبکتگین کو تولا تو وہ خراسان کے شایانِ شان نظر آیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس نایاب نگینے کو خراسان پہنچائے گا۔

ان دنوں بخارا پر وہ خاندان حکومت کرتا تھا جو تاریخ میں ''سامانی'' کہلاتا تھا۔ خراسان اسی خاندان کے زیر حکومت تھا اور بخارا کا ایک صوبہ تھا۔

نصر حاجی نے بخارا میں رہ کر تمام تجارتی سامان فروخت کردیا۔ چند نایاب تحفے بچا کر رکھ لیے جو وہ خراسان پہنچ کر الپتگین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ ان کاموں سے نمٹ چکا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو سرائے میں چھوڑا اور خود سبکتگین کو ہمراہ لے کر عازم خراسان ہوا۔

خراسان کی رونق و ترقی دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ الپتگین ایک بہترین حکمران ہے۔ رعایا اس سے خوش ہے۔ جب وہ سرائے میں جاکر ٹھہرا تو اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ الپتگین خود بھی امیر منصور بن نوح کا غلام رہ چکا ہے اور اس کی قابلیت کے صلے میں اسے خراسان کا حاکم (گورنر) بنایا گیا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے طبقے یعنی غلاموں کو بہت عزیز رکھتا ہے۔

اب نصر حاجی اس فکر میں غلطاں تھا کہ کسی طرح الپتگین تک رسائی حاصل ہو۔ ایک رات سرائے میں داستان گوئی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس محفل میں جاکر بیٹھ گیا۔ داستان گو داستان سنا رہا تھا اور لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص اس محفل میں داخل ہوا۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کے چہرے سے شانِ امارت ظاہر ہورہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اس کے لیے جگہ خالی کی تو نصر حاجی کو یقین ہوگیا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔ کون ہے؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی یہ مشکل اس وقت دور ہوگئی جب سرائے کے مالک نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور پھر ایسا انتظام کیا کہ اسے اس نووارد کے برابر نشست مل گئی۔ آنے والا شخص داستان سننے میں اتنا محو تھا کہ نصر حاجی کی موجودگی کا اسے علم تک نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد جب داستان گو پانی پینے کے لیے کچھ دیر کو رکا تو اس شخص نے نصر حاجی کی طرف دیکھا۔

''معاف کیجیے گا، آپ مجھے خراسان کے معلوم نہیں ہوتے۔''

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں ترکستان سے بخارا آیا تھا اور اب خراسان میں ہوں۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں خراسان کس سلسلے میں آنا ہوا؟''

''شاید آپ جیسے مہربان سے ملاقات مقدر تھی۔''

''یہ تو آپ نے دنیا داری کی بات کردی۔ آپ تشریف لائے ہیں تو کوئی مقصد ہوگا۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایک تاجر ہوں اور امیر الپتگین کے حضور کچھ تحائف پیش کرنے کا خواہش مند ہوں۔ پریشان ہوں کہ رسائی کیسے ہو۔''

''اگر آپ تاجر ہیں تو آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

''پھر بھی کوئی حوالہ تو ہو۔''

''میرا نام علی بن تگین ہے۔ امیر کے درباریوں میں سے ایک ہوں۔ جس دن آپ کو آنا ہو فرما دیجیے گا۔ میں امیر کے سامنے آپ کا ذکر چھیڑ کر دیکھوں گا۔''

''کسی دن کیا، میں کل ہی حاضر ہوجاتا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک بات اور بتا دینا چاہتا ہوں۔'' نصر حاجی نے کہا اور سبکتگین کا ذکر بھی چھیڑ دیا یعنی یہ کہ وہ ایک غلام لے کر حاضر ہوا ہے۔

علی بن تگین یہ سن کر خوش ہوگیا۔ ''یہ تو اور اچھی بات ہوئی۔ امیر کو غلاموں سے بہت رغبت ہے۔ آپ بے کھٹک آجائیں۔''

اس تعارف کے بعد نصر حاجی کے لیے امیر الپتگین تک رسائی مشکل نہیں تھی۔ اس نے علی بن تگین سے ملاقات کا وقت طے کرلیا۔

الپتگین اپنے امراء کے درمیان گھرا بیٹھا تھا کہ اسے ایک سوداگر کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ غالباً علی تگین اس کی اطلاع پہلے ہی دے چکا تھا۔ اطلاع ملتے ہی امیر الپتگین نے سوداگر کو اجازت دے دی۔ اس اجازت کا مقصد ہی یہ تھا کہ اب امراء وہاں سے ہٹ جائیں۔ انہوں نے جگہ خالی کردی۔

نصر حاجی حاضر خدمت ہوا تو اس کے ساتھ سبکتگین بھی تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہی وہ غلام ہے جس کی فروخت کے لیے تاجر حاضر ہوا ہے۔

نصر حاجی نے امیر کی خدمت میں تحائف پیش کیے اور اجازت کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ سبکتگین اپنی جگہ پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ الپتگین کی تجربہ کار آنکھیں غلام کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کیا تم اپنے مالک کی پیروی میں اپنی جگہ پر

مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی امی جان...... مجھے پاپا کے وہ الفاظ بھی اچھی طرح یاد ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہیں مگر چاہے آپ اسے میری گستاخی کہہ لیں یا ایک ایسا سچ سمجھ لیں جو بہت ہی کڑوا ہوتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ میں دوسروں کی طرح منافقت نہیں کرسکتی۔'' میں نے ایک بار پھر ان کی ساری دلیلوں کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''روک لو اسے روبی...... ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔'' پاپا کا غصہ انتہائی بلندیوں پر تھا۔ وہ غصے سے میری طرف بڑھے بھی تھے کہ امی نے انہیں روک لیا۔

''جانے دو شہزاد...... جوان بیٹی ہے، اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے اچھے لگو گے۔''

''مگر اس کو دیکھو...... اسے اتنی تمیز بھی نہیں رہی کہ کس کے ساتھ بات کررہی ہے اور بڑوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے کیا آداب ہوتے ہیں۔'' پاپا غصے میں تقریباً چیختے ہوئے بولے۔

''یہی باتیں...... جو میرے لیے ممنوع بنائی جارہی ہیں، یہ راستے جن پر مجھے چلنے سے روکا جارہا ہے کیا یہ سب میرے لیے ہی ہے؟ بھائی جان کے لیے نہیں۔ اس لیے نا...... کہ وہ لڑکے ہیں وہ جو چاہیں کریں۔ ان کے لیے سب جائز ہے۔ کیا وہ اس تہذیب میں سانس نہیں لے رہے؟ وہ سوزان سے ڈیٹ مارتے رہیں۔ وہ ڈوریا سے جب چاہیں، فون پر گفتگو کرتے رہیں۔ وہ دوسری تہذیب کی گوریوں سے جہاں چاہیں ملیں اور ان کو لے کر جہاں چاہیں گھومیں، ان کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں مگر میں...... میں کسی کے ساتھ ٹیلی فون پر بات بھی کرلوں تو آپ کو سبکی محسوس ہوتی ہے اور آپ کی نظریں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ یہ دوغلا پن نہیں تو اور کیا ہے۔''

میں بھی تو شاید آج سارے بدلے اتارنے پر تلی ہوئی تھی۔

یہ ساری وہ باتیں تھیں جنہیں میں نہ جانے کب سے اپنے من کے دوزخ میں چھپائے ان کی آنچ سے لحہ بہ لحہ جلتی چلی آرہی تھی۔

تب ہی امی جان پاپا کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میں وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ جوں جوں سوچتی جارہی تھی میرے اندر ہی اندر سلگنے والی ساری باتیں جیسے الاؤ بنتی چلی جارہی تھیں۔

مجھے اچھی طرح وہ دن یاد ہے کہ میں اس وقت اتنی بڑی نہ تھی۔ یا شاید پاپا مجھے ان دنوں اتنا باشعور نہ سمجھتے ہوں مگر ان کی ساری باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں اور پاپا باتیں کرتے کرتے نہ جانے کہاں سے کہاں آپہنچے تھے۔ تب میرے پوچھنے پر انہوں نے اپنے من میں چھپی ساری باتیں مجھے بتانا شروع کردیں۔

''تم نہیں جانتیں ثنا...... میں نے اپنی زندگی کے وہ دن کس قدر اذیت میں گزارے۔ اگر تم ایسی اذیت سے گزرو...... اللہ نہ کرے تو مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد زندگی کو ہار جاؤ۔ پتا ہے، تم کس قدر آسائشوں میں سانس لے رہی ہو مگر میں...... میری ہر سانس پر مجبوریوں اور بے بسی کے سخت پہرے تھے۔ میں نے ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اپنی تعلیم مکمل کی، اس تمنا اور آرزو پر...... کہ مجھے ایک اچھا مستقبل مل جائے مگر میں نے تعلیم مکمل کی اور مجھے روزگار کی تلاش ہوئی تب مجھے پہلی بار شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ میرا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ میرے پاس وسائل کی کمی تھی اور کچھ وہاں کے لوگ بھی سنگدل تھے۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں سے نوالہ چھین کر خوش ہوتے تھے۔ وہ آپ کے سینے پر پاؤں رکھ کر اپنے مقاصد کی اگلی سیڑھی پھلانگنے کو اپنی کامیابی اور دوسروں کی ناکامی کو اس کا مقدر گردانتے تھے۔ ہاں ثنا بیٹا...... وہاں رہنے والوں کی سانسیں تو زندگی کی مٹھی میں بند ریت کی طرح ہوتی ہیں جو دھیرے دھیرے گرتے گرتے ختم ہوکر رہ جاتی ہے اور موت وہاں بہت جلد اپنا کھیل جیت جاتی ہے۔ وہاں بھوک کے ہاتھوں مجبور جوانیاں بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہیں مگر ان کی آرزوؤں کی دلہن کبھی نہیں سجتی......

''میں نے اپنے اردگرد ہر روز خوابوں کی سنہری جھالروں والے شامیانے لگائے اور ان کے نیچے بیٹھ کر اپنی تعبیروں کا بے تحاشا انتظار کرتا رہا مگر بے سود...... میں نے بڑی تگ ودو کی...... اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور اپنی طرف آس بھری نظروں سے دیکھنے والے چہروں کو ناآسودگی کی دھوپ سے بچانے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا...... تو ناچار میں ایک سیاسی جماعت کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔

''میرا ایک دوست بہت پہلے کسی نہ کسی طرح ادھر آگیا تھا...... ارسلان کو تم بھی جانتی ہو...... وہی تمہارے انکل...... تب ایک روز میں نے اسے لکھا کہ میرے جسم پر مسائل کی پڑنے والی دھوپ سے میرا بدن تڑخنے لگا ہے، وہ

میری مدد کرے۔ اس نے مجھے ایک مشورہ دیا کہ میں بھی اِدھر ہی آجاؤں تو وہ میرے لیے کچھ کر سکے گا......"

"تو پھر آپ اُدھر گئے؟" میں نے اپنی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

"مگر اِدھر جانے کے لیے بھی تو رقم کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہ تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار کر رقم حاصل کر ہی لی۔ پاسپورٹ بھی بنالیا۔ کچھ زیور تھا وہ رہن رکھا...... اب مجھے آس سی ہونے لگی تھی کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر میرے اردگرد سانس لینے والے لوگوں کی مجبوریاں میری راہ کی رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ اماں اور ابا کے مفلوک الحال چہرے اور ان کی زندگی پر جلد اترنے والی شام کے گھرے سائے مجھے مایوسی کے پاتال میں کھینچے چلے جا رہے تھے۔ ایک تمہاری جوان پھپو...... جس کو دیکھ کر میری سوچیں چھلنی ہو جاتی تھیں۔

"میں وہاں جا کر بہت جلد کوشش کر کے اس بوجھ کو آسانی سے اتارنے کے قابل ہو جاؤں گا......!" میں نے ایک روز ڈرے ڈرے انداز میں اپنے والد سے بات کی۔

"میں جانتا ہوں شہزاد...... مگر یہ بھی تو دیکھو آس کی گدرائی آنکھیں بند ہونے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں کہ اب انہیں امید کی ایک اور سولی پر لٹکا جاؤ۔" ابا نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن ابا...... یہاں رہ کر بھی تو آس پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہم چھو کی جھولی خالی سوچوں سے بھر کر اسے اپنی دہلیز سے تو اٹھانے سے رہے۔ اس کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔" میں نے اپنی طرف سے ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تب ابا نے مجھے اجازت دے دی اور پھر میں اِدھر آگیا......

"اکیلے ہی......؟" میں نے پاپا کی باتوں کے تواتر کو توڑتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"سنو تو سہی......" پاپا نے جواب دیا۔ "ارسلان نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ کچھ عرصہ میں نے یہاں بھی ہاتھ پاؤں مارے پھر میرے ویزے کا وقت ختم ہو گیا۔ تب میں چھپ گیا...... تاکہ یہاں سے نکالا نہ جا سکوں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے آزادی کے سارے دن میرے لیے ختم ہو چکے ہیں اور میں پابندیوں کے پنجرے میں یونہی ختم ہو جاؤں گا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے جب ایک روز ارسلان نے میری ہمت بندھاتے ہوئے پوچھا۔

"شہزاد...... تمہیں پتا ہے۔ وہاں حکومت بدل گئی ہے اور حکومت بدلتے ہی پرانی حکومت کے وفاداروں پر دن رات ابتلا کر دیے جاتے ہیں۔"

"جہاں وفائیں نبھانے کی ریت نہ ہو وہاں تو ایسا ہوگا ہی۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

"میں نے ہمیشہ ناکامی اور مایوسی سے امید کے ذرے چنے ہیں۔ کیا تم...... اس طرح نہیں کر سکتے کہ وہاں کسی دوست کو لکھ کر چند کاغذات منگوالو......" ارسلان نے میری امید بندھائی۔

"کیسے کاغذات......؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"پگلے...... اس طرح تمہیں یہاں سیاسی پناہ مل جائے گی۔ یہاں تمہارا جینا آسان ہو جائے گا اور پھر تم آسانی کے ساتھ اپنے لیے دوڑ دھوپ کر سکو گے۔ ملازمت کر سکو گے اور پیچھے کی فکر بھی نہیں رہے گی۔ تم اگر یہ کر لو...... تو باقی کام میں تمہارے لیے کر دوں گا۔ یہاں ہم وکیل کریں گے اور اس کے ذریعے کیس کر کے تمہیں سیاسی پناہ دلوائیں گے۔ آج کل اسی طرح ہو رہا ہے۔ بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے میں حرج ہی کیا ہے۔" ارسلان نے مجھے سمجھایا۔

"کوشش کر دیکھتا ہوں......" میں نے جواب دیا۔

"تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا......؟" ارسلان نے ایک بار پھر پوچھا۔

"دیکھو نا...... اس طرح چھپ چھپ کر اور کہاں تک گزارہ کرو گے۔ ویزے کا وقت ختم ہو گیا ہے، کسی وقت بھی یہاں کی پولیس تمہیں ملک بدر کر دے گی۔ اگر اس طرح تمہیں سیاسی پناہ مل جائے گی تو میرا بوجھ بھی کم ہو جائے گا۔"

"ہوں......" میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تب میں نے اِدھر اپنے دوست کو لکھا جس نے میرے لیے یہ کام کرنے کی نہ صرف ہامی بھر لی بلکہ بہت جلد اس نے مقامی اخبارات میں میرے خلاف لگے ہوئے بیانات کے تراشے، میری سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں پولیس کو مطلوب میرے خلاف انکوائری اور پولیس رپورٹ کی جھوٹی کاپی بنوا کر مجھے ارسال کر دی۔

"ارسلان اس روز بہت خوش ہوا تھا جس روز اسے یہ ساری چیزیں مل گئی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر میرے لیے تگ و دو کی...... اور ایک مقامی وکیل کو بھاری فیس دے کر عدالت میں کیس کر کے میرے لیے سیاسی پناہ کی درخواست دے دی۔ دو ایک پیشیوں کے بعد مجھے سیاسی پناہ دے دی گئی۔

سیاسی پناہ حاصل کرنے کے بعد بھی میری مشکلات کا

سفر ختم نہ ہو سکا، شاہ بیٹی...... میں نے دکھوں کا ایک نیا سفر یہاں شروع کیا لیکن اس قدر ضرور ہوا کہ اب میں ارسلان کے لیے بوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ اب بھی میری مشکلات کو حل کرنے میں میری مدد کر رہا تھا۔ مگر اب میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے یہاں بھی دکھوں کے کتنے سمندر پار کیے اور مسائل کی سرخ آندھیوں سے کہاں کہاں لڑا، یہ ایک طویل داستان ہے۔''

''تو امی آپ سے کہاں ملیں اور پھپھو کا کیا ہوا؟'' میرے اندر تجسس نے سر ابھارا۔

''رومیسہ کے والدین کا تعلق بھی پاکستان سے تھا۔ ہم لوگ بھی اس قدر بے بس ہوتے ہیں۔ ہم اپنی بے بسیوں اور محرومیوں سے لڑنے میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خبر ہی نہیں ہو پاتی کہ ہمارے گھروں کے آنگنوں میں لگے ہوئے پودے تناور درخت کب بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کب کے یہاں آ کر بسے ہوئے تھے۔ پھر انہیں احساس اس وقت ہوا جب رومیسہ جوانی کی حدود کو چھونے لگی، تب انہیں اس کی فکر ہوئی۔ انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ میرا ان کے گھر آنا جانا تھا تب رومیسہ کے والدین نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا...... اور رومیسہ میری بیوی بن گئی۔ اگرچہ روی اس ماحول میں پلی بڑھی ہے مگر اس پر گہری مشرقی چھاپ اس قدر گہری ہے کہ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ یہاں پلی بڑھی ہے۔''

''تو پاپا...... اب آپ کو اپنے ملک کی یاد نہیں ستاتی......؟'' میں نے پاپا کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''چھوڑ دو بیٹی...... دھوکوں اور دکھوں کے ماحول سے بڑی مشکل سے چھٹکارا ملا ہے۔ اب تو اس بات کو یاد بھی کرتا ہوں تو میرے اندر کے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں۔ کیا تھا وہاں...... بھوک، مایوسی، ہیرا پھیری، منافقت کی گھٹا ٹوپ میں سسکتی زندگی...... زندگی تو یہاں ہے...... یہاں زندگی کا احساس پھر سے جوان ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک تمہاری پھپھو تھی...... جو کی شادی بڑی دھوم دھام سے کر دی۔ اس کو پیا دیس سدھار کر میں پلٹا تھا کہ بابا فوت ہو گئے، ان کا دکھ اماں کی جان لے کر ختم ہوا اور پھر میرے لیے وہاں رہ ہی کیا گیا تھا۔ میں اب وہاں جاؤں بھی تو کس کے لیے...... تم سب...... جو میرے ہو...... وہ تو یہاں ہو...... میرے ساتھ۔''

''تو کیا ہم کبھی بھی وہاں نہ جا سکیں گے......؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''اگر میرا بس چلے تو شاید کبھی بھی نہیں...... تم نہیں جانتیں وہاں انسانیت کی کس قدر تذلیل ہوتی ہے۔ وہاں کس قدر بے حسی، بے رحمی اور ظلم ہے...... قدم قدم پر منافقت کے سانپ کنڈلیاں مارے ڈسنے کے لیے ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ وہاں جبر ہے...... جس کے پاس دولت ہے جس کے پاس اقتدار ہے، وہ وہاں سب کچھ ہے۔ وہاں لوٹ مار اور پاپا کاری مچی ہوئی ہے۔ عجب افراتفری ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں ہر طرح سے امن ہے۔ سکون ہے۔ زندگی ہر جگہ مسکراتے ہوئے زندہ رہنے والوں کا استقبال کرتی ہے اور وہاں جینا ایک لعنت بن کر رہ گیا ہے۔''

پاپا نے بات ختم کی...... ایسی باتیں تو پاپا آج سے کچھ عرصے پہلے تک کرتے رہے ہیں مگر جب سے انہیں احساس ہوا ہے کہ ان کے گھر پیدا ہونے والی ایک ننھی سی

بچی اب شعور کی منزل تک آپہنچی ہے تب سے انہوں نے ایسی باتیں کرنا چھوڑ دی ہیں اب بھی کبھار جب وہ وطن کی بات کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے اس بات کی بھنک مل جاتی ہے کہ اب وہ اگر یہاں سے جانا بھی چاہیں گے تو صرف اس لیے کہ ان کی بیٹی جوان ہوچکی ہے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں او لیول میں تھی۔ میں اس روز اسکول سے ابھی گھر واپس نہ پلٹی تھی کہ مائیکل کا ٹیلی فون آگیا۔ اس نے امی سے میرے بارے میں پوچھا۔ نہ جانے امی جان نے اسے کیا کہا ہوگا مگر جب میں اسکول سے واپس آئی تو سب سے پہلا سوال مجھ سے ہی ہوا۔

''یہ مائیکل کون ہے......؟''

''مائیکل کریسون...... میرا کلاس فیلو ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''وہ گھر ٹیلی فون کیوں کرتا ہے؟'' امی نے غصے سے پوچھا۔

''اسے کوئی کام ہوگا...... دراصل وہ کچھ روز سے اسکول نہیں آرہا۔ شاید اس نے کچھ اس بارے میں پوچھنا ہو۔'' میں نے اسی شانت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو اچھا ہوا ٹیلی فون میں نے سنا اور اس وقت تمہارے پاپا گھر میں نہیں تھے۔ وگرنہ......'' امی جان نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں یہ ایسی بری بات بھی نہیں۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ ہم وہاں گفتگو کرتے ہیں تو وہ یہاں بھی ٹیلی فون کرسکتا ہے۔'' میں نے نادانستگی میں جواب دیا۔

پھر اسی شام امی نے پاپا کو جو بتایا، وہ بھی میرے کانوں نے سنا۔ امی پاپا سے کہہ رہی تھیں۔

''شہزاد! تمہیں پتا ہے۔ شاب جوان ہوگئی ہے۔''

''ہوں...... تو کیا ہوا؟ ابھی پڑھ بھی تو رہی ہے۔'' پاپا نے جواب دیا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو...... یہ نہ ہو وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ آج مائیکل کا ٹیلی فون آیا تھا۔''

''یہ مائیکل کون ہے؟'' پاپا نے حیرت سے پوچھا۔

''کہہ رہی ہے اس کا کوئی دوست ہے۔'' امی نے جواب دیا۔

''بلاؤ اسے......'' پاپا نے غصے میں کہا۔

تب مجھے بھی بلالیا گیا۔

''کون ہے یہ مائیکل...... اور وہ کیوں یہاں ٹیلی فون کرتا ہے؟'' پاپا نے بھی امی والا سوال دہرایا۔

''امی جان کو بتا تو دیا تھا۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے اور دوست بھی...... وہ کتنے دنوں سے چھٹی پر تھا شاید اس نے اسکول کے بارے میں کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا ہو۔'' میں نے وضاحت کی۔

''مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے اور پھر شاید تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ہم نے تمہاری منگنی ادھر اپنے ملک میں تمہارے رشتے کے تایا زاد سے طے کررکھی ہے اور وہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ سمجھیں......؟'' پاپا نے مجھ پر انکشاف کیا تب میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔ مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے کوئی بات کی...... تو پاپا کی ناراضی بڑھ جائے گی۔ میں اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ نہ جانے مائیکل نے کیا کہا ہوگا جس کے ردعمل میں یہ سب کچھ ہورہا تھا۔ میں سوچنے لگی۔

سوچیں بھی تو تالاب کے بھنور کی طرح ہوتی ہیں جو پھیلتی ہیں تو پھر دائرہ در دائرہ پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ مائیکل کریسون...... میری کلاس کا سب سے نفیس اور ذہین لڑکا تھا۔ اس کی گفتگو میں رکھ رکھاؤ...... اور اس کا انداز دوسرے سب لڑکوں سے جدا تھا جو میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس کی ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ اس میں یہاں اور اس معاشرے کے رہنے والے دوسرے لڑکوں کی طرح چلبلاپن نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح ایشیائی لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے بھی نہ دیکھتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک بار میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''مائیکل! ایک بات تو بتاؤ...... کیا تمہارے کسی شہری نے بھی دوسرے ملک میں جاکر کبھی سیاسی پناہ لی ہے؟''

اس نے میری طرف بڑی عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کیا......؟''

''ہاں...... کیا تمہارے ہاں کے کسی باشندے نے کسی دوسرے ملک میں بھی سیاسی پناہ لی ہے؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''میری دانست میں کبھی نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' اس نے سپاٹ سا جواب دیا۔

''کیوں نہیں ہوا...... میرا مطلب ہے جب دوسرے ملکوں کے باشندے یہاں آکر سیاسی پناہ مانگ لیتے ہیں تو یہاں کے لوگ کیوں نہیں ایسا کرتے......؟'' میں نے وضاحت سے اپنا دوسرا سوال کیا۔

"اس لیے کہ ہم انسانیت کی تذلیل نہیں کرتے۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اس کا احساس کرتے ہیں اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے ہاں وہ کچھ نہیں ہوتا جو تمہارے جیسے لوگوں کے ملکوں میں ہوتا ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

"تو کیا واقعی یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا......؟" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"یقیناً نہیں...... یا پھر اس انداز میں نہیں جس طرح دوسرے ممالک میں ہوتا ہے۔" اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔ "اور پھر شاید تم اسے بے ایمانی جانو کہ میں یہاں سچ بولنے پر مجبور ہوں کہ ہم دراصل ساری منافقت اپنے دشمنوں کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اپنے ملک اور اپنی نسل کے لیے ہم لوگ منافقت نہیں کرتے اور تو اور...... ہم چاہے جس قدر بھی کمینے ہوں، ہمیں اپنے ملک کا مفاد عزیز ہوتا ہے اور ہم ہر حال میں اس کا تحفظ کرتے ہیں۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں، ہمیں اپنے ملک اور اس کا مفاد ہر وقت دھیان میں رہتا ہے اور اس پر آنچ آنے سے پہلے ہم اپنی جان دے دیتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اپنی ساری صلاحیتیں بچا کر رکھتے ہیں لیکن یہ سب کچھ تمہارے ملکوں میں نہیں ہوتا۔

"وہ تو اپنے مفاد کو بچانے کے لیے اپنے ملکی مفاد کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ تو اپنے فائدے کی سوچتے ہیں انہیں اپنی عزت، غیرت اور حمیت کوئی چیز بھی عزیز نہیں ہوتی۔ وہ دولت کی چکا چوند کو حاصل کرنے کے لیے اپنا آپ بیچ دیتے ہیں۔ ملک ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔"

ممکن تھا کہ مائیکل اس سے آگے بھی کچھ اور کہتا...... مگر میں وہاں سے غصے میں اٹھ آگئی، اس نے میری انا کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے کئی بار مجھے بلانے کی کوشش بھی کی مگر میں اس سے ناراض ہی رہی۔

اس روز بھی اس نے اپنے اور میرے مشترکہ دوست پال راجر سے کہا کہ وہ مجھے فون کرے۔ میں اس روز گھر پر ہی تھی جب راجر نے مجھے فون کر کے کہا۔

"وہ بہت پریشان ہے صرف تمہارے لیے......!"

"تو میں کیا کروں؟" میں نے اسے کورا جواب دیا۔

"کیا تم اسے معاف نہیں کر سکتیں؟ وہ اپنی باتوں کی تلخ حقیقتوں کے باوجود شرمندہ ہے اور تمہارے لیے پریشان ہے۔ تم اسے معاف کر دو۔" راجر نے اپنے لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

سچی باتیں

☆انسان سب سے لڑ سکتا ہے، سوائے موت کے۔ موت کے آگے انسان بے بس ہے۔ اس دنیا سے چلا جاتا ہے، پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔ کچھ تصویریں، کچھ یادیں اور کچھ باتیں پھر ہمارے ساتھ وہ بھی ختم۔"

☆خواہشات تاریک جنگل ہیں جن میں بھٹکتے بھٹکتے عمر بیت جاتی ہے مگر منزل کا رستہ پھر بھی نہیں ملتا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

"راجر...... میں نے کہا ہے نا...... کہ میرے پاپا اس کے ساتھ میرے تعلقات کو برا سمجھتے ہیں۔ اس لیے بھی میں اس سے دور ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔" میں نے رک رک کر اسے جواب دیا۔

"مگر کیا تمہارے لڑکے ہماری لڑکیوں سے تعلقات نہیں رکھتے؟ ہم نے تو کبھی اس بات کا برا نہیں منایا۔ تم پر کوئی دباؤ تو نہیں؟" راجر نے بے باکی سے پوچھا۔

"کچھ بھی ہو...... ہم اسے اچھا نہیں سمجھتے۔" میں نے دوبارہ کہا۔

"خود تمہارا بھائی احد بھی ڈوریا...... سوزان کے ساتھ آزادی سے گھومتا پھرتا ہے۔ جینی کے ساتھ کلبوں میں پھرتا ہے۔ اس وقت تمہارے پاپا کچھ نہیں کہتے؟" اس نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے طنز کیا۔

"راجر...... میں نے کہا نا......!" میں ابھی اس سے آگے اپنی بات مکمل نہ کر پائی تھی کہ اچانک ایک ہاتھ میرے قریب ہی سے اٹھا...... اور فون کے کریڈل کو دبا کر لائن کاٹ گیا۔ یہ پاپا کا ہاتھ تھا اور میں جو پہلے ہی پریشان تھی اور بھی پریشان ہو گئی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے غصے سے پاپا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں پہلے ہی غصے سے سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ تقریباً غصے سے دہاڑے۔

"بہت ہو چکا تماشا...... اب اسے بند کر دو۔"

اور پھر میں بھی غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہتی چلی گئی۔

اس رات میں بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ کیا مجھے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے بھی تھا یا نہیں...... اور کیا جو کچھ میں نے کہا، پاپا اور امی جان اس کے مستحق بھی تھے؟ میری سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں...... جو کچھ ہوا، وہ اس قدر ناداننگی میں ہوا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح جب میں اٹھی تو پاپا کام پر جاچکے تھے اور امی جان کچن میں تھیں۔ پچھلی رات کے سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے اور پھر میں کچھ سوچتے ہوئے اٹھی اور امی جان کے پاس آگئی۔ یقیناً امی بھی میرے اس رویے کی وجہ سے ناراض تھیں۔ تبھی تو میں نے پیچھے سے جاکر اپنی باہیں ان کے گلے میں حمائل کردیں۔

''مجھے افسوس ہے امی جان...... آپ کو میری باتیں بری لگیں۔'' میں نے رکتے رکتے آہستگی سے کہا۔

''تمہارے پاپا بے حد ناراض ہیں تم سے...... جانتی ہو تم نے کیا کیا کہا ہے۔'' امی جان نے ناراض لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے ایک بات بتائیں۔ جن بچوں کے ذہنوں میں شروع دن سے اپنے ملک کے بارے میں اس قدر برے خیالات رکھے جائیں گے، جہاں کی معاشرتی قدروں کو شرمندگی سمجھ کر ان کی تذلیل کی جائے گی، جہاں کے بارے میں اتنی نفرت پھیلادی جائے کہ اس کا نام لیتے ہی کراہت سی محسوس ہونے لگے پھر اس سے یک لخت اتنا پیار کیوں جاگنے لگتا ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ ہم دہرے معیار کو اپنائے رہتے ہیں؟ ہمارے معیار کے پیمانے اپنی ذات کے لیے کچھ اور ہوتے ہیں اور اپنی جوان بیٹیوں کے لیے کچھ اور...... مجھے صرف اسی وجہ سے پاپا سے اختلاف تھا اور رہے گا۔ ویسے آپ بے فکر رہیں، میں انہیں منالوں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور پھر جب پاپا واپس آئے تو وہ ناراض ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں آہستگی سے چلتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئی کچھ دیر کے انتظار کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

''تو کیا سوچا ہے تم نے......؟''

''وہ کس بارے میں؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تمہاری شادی وہاں پاکستان میں کرنے والے ہیں۔'' پاپا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''اس ملک میں پاپا...... جس سے آپ کو یا آپ کی طرح یہاں رہنے والوں کو کبھی ہمدردی نہیں ہوئی۔ جس میں بقول آپ کے بے حسی ہے، ظلم ہے، استحصال ہے، جبر ہے اور جہاں منافقت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ جہاں افراتفری ہے اور چھینا جھپٹی ہے۔ اس ملک میں جہاں سے بھاگ کر آپ اور آپ جیسے لوگ دوسرے ملکوں میں جاکر جبری بے دخلی کا لبادہ اوڑھ کر سیاسی پناہ حاصل کرتے ہیں۔ اس دیس میں جہاں کے رہنے والے بھی اس کی قدر نہیں کرتے، آپ مجھے وہاں...... ان درندوں کے آگے چارا بنا کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

''مگر بیٹی...... وہ ہمارا اپنا ملک ہے، ہماری بنیاد ہے......؟'' پاپا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ہماری بنیاد اور ہمارا ملک کیسے ہوسکتا ہے جس کے بارے میں کبھی ہم نے سوچا ہی نہیں، جس کی طرف کبھی ہمارا دھیان ہی نہیں گیا...... وہ ہمارا ملک نہیں ہوسکتا جس کی ہم نے قدر ہی نہیں کی۔ ہمارا دیس تو یہ ہے جہاں میں نے آنکھ کھولی۔ جہاں آپ کو پناہ ملی...... کیا آپ اس بات سے انکاری ہیں؟'' میں نے روانی میں وہ سب کہہ دیا جو میرے من میں کہیں برسوں سے چھپا ہوا تھا۔

''یہ الگ بات ہے کہ اب آپ کو اپنی بیٹی کی عزت اور اپنی غیرت یہاں محفوظ نظر نہیں آتی تو آپ کو اس کی یاد ستانے لگی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ آپ نہیں چاہتے کہ آپ کی بیٹی آپ کی عزت کو یوں سرعام نیلام کرے۔ یہی بات ہے نا...... آپ بھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ آپ کی بیٹی یوں آزادانہ کلبوں میں ڈانس کرتی پھرے۔ ایسا ہی ہے نا...... آپ تو کیا...... اس طرف سے آنے والا ہر شخص اپنی حد تک تو اس آزادی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے مگر جب بات اس کی نسل سے آگے بڑھتی ہے تو اس کی غیرت اور حمیت یہ سب برداشت نہیں کرپاتی اور وہ اپنے پیچھے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ آپ نے میری نسل کے کانوں میں اس ملک کے خلاف بڑا زہر بھرا ہے۔ بہت ورغلایا ہے ہمیں...... مگر ایک بات بتادوں پاپا...... آپ ہی بدقسمت تھے جن کو کبھی اپنے ملک کا دھیان نہیں آیا مگر ہم تو اس کے باوجود اپنے اس ان دیکھے ملک سے پیار کرتے ہیں اور ہمارا دھیان ہر پل اور ہر لحہ اسی کی طرف رہتا ہے۔ اس لیے پاپا...... کہ وہاں ہمارے بڑوں کی حیا آلود سانسوں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ یہاں کیا ہے...... خوش ہوجائیں پاپا کہ میں اس ملک میں ضرور جاؤں گی، ضرور جاؤں گی وہاں...... کہ اس کے بغیر اس کی اپنی شناخت ادھوری ہے اور شناخت کہیں ادھوری رہ جائے تو زندگی کا سارا سفر کھوٹا رہ جاتا ہے۔''

کھوٹا سکہ

فوزیہ طیب



کوئی بھی شے اس دنیا میں بے کار نہیں بنائی گئی پھر انسان کیسے بغیر مقصد کے دنیا میں آسکتا ہے لیکن . . . اس کے والدین نے اسے دنیا کا سب سے ناکارہ انسان سمجھنے کی غلطی کر ڈالی تھی مگر ایک دن انہیں احساس ہو گیا کہ جہاں کچھ نہیں چلتا وہاں کھوٹا سکہ چل جاتا ہے۔

باپ کے لیے ایک بیٹے کی بے مثال قربانی کا دلچسپ انداز

اسٹیشن سے نکلتے ہی مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں فوراً بس میں بیٹھ کر گھر پہنچ جاتا اور ڈیڈی کو یہ خبر سناتا کہ مجھے کالج سے نکال دیا گیا ہے اور چار مہینے کی جو فیس جمع کرائی تھی وہ بھی ضائع ہو گئی ہے۔ کالج سے نکالا جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گزشتہ دو برسوں میں تین مرتبہ مجھے کالج سے نکالا جا چکا تھا اور اس کی وجہ میری ضرورت سے زیادہ شراب نوشی اور نشے میں الٹی سیدھی حرکات تھیں لیکن اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی انوکھی حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ نشے کے عالم میں ایک خچر پر بیٹھ کر میں کلاس روم میں گھس آیا تھا۔ میرا کالج سے نکالے جانا ڈیڈی کے لیے

Watch Us On YouTube

خالص شہد کی پہچان





Health Care Club

چہرے کی جھریوں کا بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

بھی کوئی نئی خبر نہ ہوتی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ میری اصلاح کے سلسلے میں وہ اس حد تک مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے شاید اب اس موضوع پر سوچنا بھی ترک کر دیا تھا۔ میں انہیں صرف پیسوں کی ضرورت پڑنے پر خط لکھتا اور وہ خاموشی سے میری مطلوبہ رقم کا چیک مجھے بھیج دیتے۔ میں اپنے گھر صرف چھٹیوں پر آتا تھا اور وہ بھی صرف ڈیڈی کی ہی کی خاطر۔ اپنی جوان سوتیلی ماں سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور یہ جذبہ یکطرفہ نہیں تھا۔ اسے بھی مجھ سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ڈیڈی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی یا ناخوشگوار، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

بس اسٹاپ پر موجود ٹیلیفون بوتھ سے میں نے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ٹیلیفون انگیج تھا۔ میں ٹیلیفون فارغ ہونے کے انتظار میں باہر ٹہلنے لگا۔ عموماً اس قسم کی ناخوشگوار خبریں میں گھر جانے سے پہلے ہی ڈیڈی کو سنا دیا کرتا تھا تاکہ روبرو ہونے کی تھوڑی بہت ندامت سے محفوظ رہا جا سکے۔ ایک مرتبہ غلطی سے میں نے اس طریقہ کار پر عمل نہیں کیا تھا اور سیدھا ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ جب ڈیڈی کو میں نے بتایا کہ مجھے کالج سے نکال دیا گیا ہے تو چند لمحے خاموشی سے وہ مجھے دیکھتے رہے، پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولے تھے، اسی کا مجھے افسوس تھا۔ میرے کالج سے نکالے جانے کی خبر سن کر یکلخت ان کے چہرے پر تھکن سی چھا گئی تھی اور جس قسم کے تاثرات ان کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے انہیں محسوس کر کے مجھے اپنے آپ پر بہت شرم آئی۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس غلطی کو نہیں دہرایا۔

کچھ دیر انتظار کر کے میں نے پھر ٹیلیفون کیا۔ گھر کا ٹیلیفون اب بھی انگیج تھا۔ یقیناً میری سوتیلی ماں کسی سے گفتگو کر رہی تھی کیونکہ ڈیڈی کبھی اتنی طویل گفتگو نہیں کرتے تھے اور پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ آج بدھ ہے اور بدھ کو ڈیڈی دفتر سے گھر نہیں آتے۔

ڈیڈی بالٹی مور میں کام کرتے تھے۔ بدھ کے دن انہیں رات دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ بالٹی مور سے گھر تک ٹرین کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا، اس لیے کئی برسوں سے ڈیڈی کا معمول تھا کہ بدھ کی شام وہ گھر آنے کے بجائے رات بالٹی مور کے کسی ہوٹل میں گزارتے تھے چنانچہ یہ سوچ کر کہ جب ڈیڈی گھر میں موجود ہی نہیں ہوں گے تو ٹیلیفون کرنے کا کیا فائدہ، میں بس میں سوار ہو گیا۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا سفر دس منٹ کا تھا۔ ہمارا مکان قصبے کے آخر میں تھا اور یہ وہ جگہ تھی جہاں سے میں سمندر کی لہریں تک گن سکتا تھا۔

دس منٹ بعد میں بس سے اترا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ سورج ڈوب چکا تھا اس لیے مجھے دور ہی سے ڈرائنگ روم میں روشنی نظر آ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری سوتیلی ماں گھر پر موجود ہے۔ میں نے بیگ دروازے کے پاس رکھ کر پتلون کی جیب سے دروازے کی چابی نکالی۔ گھر کی ایک چابی ہمیشہ میرے پاس ہوتی تھی۔ میں نے چابی تالے کے سوراخ میں داخل کی لیکن اسے گھمانے کی ضرورت نہیں پڑی، دروازہ ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا۔ دروازہ اس طرح کھلنے پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مارشا، میری سوتیلی ماں ازلی سست اور بے پروا تھی۔ میں نے چابی واپس جیب میں رکھی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور ہال میں داخل ہو کر اپنا بیگ ڈرائنگ روم میں صوفے پر پھینک دیا۔ ڈرائنگ روم میں بلب روشن تھا۔ میری نظر میز پر رکھے ٹیلیفون پر پڑی۔ اس کا ریسیور کریڈل پر موجود نہیں تھا بلکہ میز سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس طرح لٹکے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جب میں بس اسٹاپ سے گھر فون کر رہا تھا تو مسلسل انگیج ہونے کی آواز کیوں آ رہی تھی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ تھا کہ چمکدار، سرخ بالوں والی عورتیں بڑی بھلکڑ ہوتی ہیں اور میری سوتیلی ماں کے بال انتہائی سرخ اور چمکدار تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فون پر بات کرتے کرتے کسی کام سے اندر گئی ہو گی اور یہ بھول گئی ہو گی کہ وہ فون پر بات کر رہی تھی۔ دوسری طرف جو بھی فون پر ہو گا، وہ اس کے انتظار میں سوکھ رہا ہو گا۔ میں نے جھولتے ہوئے ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب سے مجھے کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ میرا وہم ہو اور وہ آواز کھڑکی سے آنے والی ہوا کی سرسراہٹ ہو اس لیے میں نے فون پر کسی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے ''ہیلو'' کہا۔ اس مرتبہ میری آواز سن کر کسی نے گہرا سانس لیا جس میں حیرت کا خفیف سا عنصر بھی شامل تھا۔ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا، غالباً اسے میری آواز سننے کی توقع نہیں تھی۔ پھر فوراً ہی اس طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ میں نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اپنی سوتیلی ماں کو آواز دی۔ میری آواز کا کوئی جواب نہ ملا چونکہ ڈرائنگ روم کی بتی جل رہی تھی اور وہ فون پر گفتگو

ادھوری چھوڑ کر گئی تھی، اس لیے مجھے یہ تو یقین تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے۔

میرا خیال درست تھا۔ مارشا خواب گاہ میں موجود تھی لیکن مُردہ حالت میں۔ کسی نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔ اس کے جسم پر شوخ لباس تھا اور اس کا بڑا سا پرس مسہری پر رکھا تھا۔ مرنے سے پہلے وہ باہر کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ وہ مسہری پر اوندھی پڑی تھی اور اس کی گردن دائیں طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے رخسار پر تھا، جس کی ایک انگلی میں ہیرے والی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ کمرا پوری طرح خوشبو سے معطر تھا اور یہ وہی خوشبو تھی جو مارشا لگاتی تھی۔ اس وقت اس نے باہر جانے کے لیے خاصی فراخدلی سے خوشبو استعمال کی ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں اس پر جھکا رہا پھر سیدھا کھڑا ہوا۔ اس طرح وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے پہلے پولیس کو اس واردات کی اطلاع دینی تھی اور پھر بالٹی مور ڈیڈی کو فون کر کے یہ افسوسناک خبر سنانی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ڈیڈی کو اس خبر سے بے حد دکھ ہوگا لیکن اب کیا جاسکتا تھا۔ میری سوتیلی ماں کی حد سے زیادہ بے پروائی نے اسے اس انجام سے دوچار کیا تھا۔ نہ وہ دروازہ کھلا چھوڑتی، نہ کوئی چور اندر گھستا اور نہ ہی وہ اس کے ہاتھوں یوں ماری جاتی۔

میری بھٹکتی نظریں ہیرے والی انگوٹھی پر پڑیں۔ انگوٹھی شاید انگلی میں سختی سے پھنسی ہوئی ہے ورنہ چور کئی ہزار ڈالر کی انگوٹھی اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے جھک کر اپنی سوتیلی ماں کا گداز ہاتھ تھام کر انگوٹھی کو ہلایا جلایا تو وہ آسانی سے انگلی سے نکلتی چلی آئی۔ تب مجھے یاد آیا کہ ڈیڈی نے شادی کی پچھلی سالگرہ پر جب یہ انگوٹھی مارشا کو تحفے کے طور پر دی تھی تو میری سوتیلی ماں نے اس کے کھلا ہونے کی شکایت کی تھی لیکن اپنی فطری کاہلی کی وجہ سے وہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسے چھوٹا نہیں کرا سکی تھی۔ اس کے باوجود چور اتنی بیش قیمت انگوٹھی کیسے چھوڑ گیا؟ شاید اس کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میری سوتیلی ماں جس زاویے سے بستر پر پڑی تھی اسے دیکھتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ چور کی نظر انگوٹھی پر نہ پڑی ہو۔ خود میں خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہیرے کی چمک دمک کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اپنے طور پر مزید تحقیق کے لیے میں نے پرس کی چیزیں نکال کر دیکھیں۔ ان میں میک اپ کے سامان اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ نوٹوں کی ایک گڈی بھی موجود تھی۔ وہ کُل ساٹھ ہزار ڈالرز تھے۔ ڈیڈی شادی کے پہلے دن سے ہی میری سوتیلی ماں پر خوب مہربان تھے اور اسے خاصا زیادہ جیب خرچ دیتے تھے لیکن یہ چور کیسا تھا جو ساٹھ ہزار ڈالرز کے نوٹ بھی چھوڑ گیا تھا اور کئی ہزار ڈالر کی انگوٹھی بھی۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھول کر زیورات کا صندوقچہ نکالا۔ وہ مقفل نہیں تھا اور اس میں بیش قیمت زیورات جوں کے توں موجود تھے۔ میری تحقیقات کے مطابق چور نے کوئی بھی قیمتی چیز نہیں چرائی تھی۔ تو کیا یہ قتل چوری کے سلسلے میں نہیں ہوا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ جیسے ہی چور کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا ہو ویسے ہی میری سوتیلی ماں واپس آگئی ہو۔ چور کو کوئی چیز چرانے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ وہ مارشا کو ہلاک کرنا نہ چاہتا ہو لیکن غیر ارادی طور پر جب اس سے قتل جیسا جرم سرزد ہوگیا ہو تو اس کے اوسان خطا ہوگئے ہوں اور اس نے فوراً بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی ہو۔

اس حد تک غور وخوض کے بعد مجھے خیال آیا کہ قتل کے اسباب اور طریقۂ واردات پر غور کرنا میرا نہیں پولیس کا کام ہے۔ مجھے صرف پولیس کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔ مجھے گھر میں داخل ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں آکر میں نے فون پر پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

”میں مارٹن کریگ بول رہا ہوں۔“ سلسلہ ملنے پر میں نے پُرسکون آواز میں کہا اور پھر اپنے گھر کا پتا بتانے کے بعد کہا۔ ”میں ابھی گھر پہنچا ہوں۔ مجھے میری سوتیلی ماں مُردہ حالت میں ملی ہے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تفتیش کے لیے کوئی یہاں پہنچ جائے۔“

میں نے خود محسوس کیا کہ میرے لہجے میں کوئی اضطراب نہیں تھا جیسے میں فون پر ایک قتل کی اطلاع نہیں دے رہا بلکہ قریبی جنرل اسٹور کو کسی چیز کا آرڈر نوٹ کرا رہا ہوں۔ میری اس طمانیت میں میرا کوئی ارادہ شامل نہیں تھا، یہ بالکل فطری عمل تھا کیونکہ مجھے مارشا کی موت کا ذرا بھی دکھ نہیں تھا اور میں یہ ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا تھا کہ مصنوعی طور پر رنج یا افسوس ظاہر کروں۔

”پریشان نہ ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اور پولیس کی آمد تک کسی چیز کو نہ چھوئیں۔“

فون بند کر کے میں نے اپنا بیگ کھولا اور کتابوں کے نیچے رکھی ہوئی شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ پولیس کے آنے تک میرے پاس وقت گزارنے کے لیے کوئی

بیٹھو گے نہیں؟'' الپتگین نے کہا۔

''میری جگہ تو آپ کے دل میں ہے اور مجھے لگتا ہے میں وہاں بیٹھ چکا۔''

الپتگین اس جواب سے محظوظ ہوا۔ پھر وہ نصر حاجی سے مخاطب ہوا۔

''تم یقیناً اس نایاب غلام کی قیمت دل میں سوچ کر آئے ہو گے۔ ہمیں بتاؤ تاکہ ہم اسے خرید لیں۔''

''سوچا تو میں نے بھی بہت تھا لیکن اس کے عوض ملنے والی رقم رکھنے کے لیے میرے پاس جگہ نہیں تھی۔ پھر سوچا بطور تحفہ اسے آپ کی نذر کردوں کیونکہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ تحفے کی قیمت نہیں پوچھی جاتی۔''

''سوداگر! باتیں تو تم بھی بہت اچھی کر لیتے ہو۔''

''حضور! یہ باتیں مجھے پہلے نہیں آتی تھیں، دو چار دن جو اس غلام کی صحبت میں رہا ہوں تو یہ باتیں مجھے بھی آ گئیں۔''

''ہم نے تمہارا دیا ہوا تحفہ قبول کیا۔ ہم تمہیں اس لڑکے کی قیمت ادا نہ کریں گے لیکن تمہارے انتخاب کی قیمت تمہیں ضرور ادا کریں گے۔''

امیر الپتگین نے ایک بیش بہا رقم ادا کی اور سبکتگین کو خرید لیا جس کا پورا نام ناصر الدین سبکتگین تھا۔

''اگر آدابِ شاہی کے خلاف نہ ہو تو میں اپنے سابق مالک کا شکریہ ادا کروں۔'' سبکتگین نے الپتگین سے اجازت چاہی۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

سبکتگین نصر حاجی سے مخاطب ہوا۔

''اپنے سے کم تر سے چھٹکارا دلایا اور اپنے سے برتر کے حوالے کیا۔ دونوں باتوں کے لیے آپ کا شکریہ۔''

''تو نے مجھے دونوں جگہ سرخرو کیا۔ اس کے لیے تیرا شکریہ۔''

نصر حاجی کے رخصت ہونے کے بعد الپتگین بھی اٹھ گیا۔ اسی وقت چند امراء حاضر ہوئے۔ انہیں معلوم تھا کہ نئے آنے والے غلام کو کہاں ٹھہرایا جائے، اسے کیا لباس پہنایا جائے اور امیر کی خدمت میں کب حاضر کیا جائے۔

سبکتگین کو ذرا تنہائی ملی تو وہ اب تک کے سفر پر غور کرنے بیٹھ گیا۔ غلام منڈی سے الپتگین کے عظیم الشان محل تک کا سفر اس کے سامنے تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا اور یہ تہیہ بھی کر رہا تھا کہ وہ اس نعمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔

اس نے نہایت مستعدی اور محبت کے ساتھ الپتگین کی خدمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں اس نے امیر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ حالت یہ ہوگئی کہ امیر اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا۔ دربار میں بھی اسے ساتھ رکھتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی دانش کا بھی قائل ہوتا چلا گیا۔ امورِ مملکت کے بارے میں اس نے کئی مرتبہ اس سے مشورے کیے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے مشورے نہایت صائب تھے۔ غلام ہوتے ہوئے اس کی رائے بڑے بڑے امیروں کے ہم پلہ ہوا کرتی تھی۔

اس نے بہت جلد دوسرے غلاموں پر فوقیت حاصل کر لی۔ امیر کو بہت جلد یقین ہوگیا کہ وہ بہت جلد ترقی کی اعلیٰ منازل طے کرلے گا۔ اس کی پیشانی اس کی عظمت کا صاف پتا دے رہی تھی۔ سبکتگین کی طرف دیکھ کر امیر کو اپنا ماضی یاد آجاتا تھا۔ وہ بھی ایک ادنیٰ غلام تھا لیکن ترقی کر کے خراسان کا حاکم بن گیا تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ سبکتگین بھی ترقی کر کے اعلیٰ مناصب تک پہنچے۔ اس کی اہلیت جانچنے کے لیے وہ اسے پورے مواقع دے رہا تھا۔ اردگرد ہونے والی چھوٹی موٹی جنگوں میں وہ اسے لشکر کے ساتھ خاص طور پر بھیجتا تھا تاکہ اسے جنگی تربیت حاصل ہو۔

جب امیر کو پورا اعتماد حاصل ہوگیا تو اس نے اسے سیر و شکار کی اجازت دے دی۔

اس نے معمول بنا لیا۔ اپنے واحد گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں گھومتا پھرتا اور چھوٹا موٹا شکار کیا کرتا۔ ایک دن وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اس طرف نکل گیا جہاں دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک ہرنی کہیں سے دوڑتی ہوئی آئی اور سبزہ چرنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ سبکتگین نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے ایک جگہ روک لیا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ ہرنی گھاس چرنے میں محو ہوجائے تو وہ گھوڑا دوڑائے اور بے خبری میں اس پر جا پڑے۔ ہرنی نے گھاس پر دو چار منہ مارے اور پھر گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ گھوڑے اور اس کے سوار کو نہ دیکھ سکی اور مطمئن ہو کر گھاس چرنے لگی۔ سبکتگین ایک پیڑ کی اوٹ سے نکلا اور گھوڑا دوڑا دیا۔ ہرنی نے خطرے کی بو سونگھ کر سوار کی طرف دیکھا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ماں کو دیکھ کر بچے نے بھی زقند بھری۔ سبکتگین نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ ہرنی تو چھلانگیں مارتی ہوئی کسی طرف غائب ہوگئی لیکن بچہ کمزور تھا اور ہوشیار بھی نہیں تھا کہ اونچے اونچے درختوں کی طرف نکل جاتا۔ وہ کھلے میدان میں دوڑتا رہا۔ بچہ تھا، کب تک دوڑتا۔ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ایک جگہ گر گیا۔ سوار کو قریب آتے دیکھ کر اٹھا، چند قدم بھاگا اور پھر گر گیا۔ سبکتگین اس کے بالکل

مصروفیت نہیں تھی اس لیے میں نے شراب نوشی کے لیے موقع غنیمت جانا۔

چوتھا گھونٹ بھرتے وقت میری نظر اس اخبار پر پڑی تھی۔ وہ اخبار مڑا ہوا صوفے کے نیچے رکھا تھا۔ میں گھونٹ بھرتے بھرتے رک گیا کیونکہ ہمارے قصبے میں صرف ایک مقامی اخبار نکلتا تھا جو صرف ایک ورق کا ہوتا تھا اور ڈیڈی اسے کبھی نہیں خریدتے تھے۔ اخبار کی ضخامت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مقامی اخبار نہیں ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی میرا سر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ میں نے بوتل میز پر رکھ کر دھڑکتے دل سے، جھک کر قالین پر سے اخبار اٹھایا۔ میں واقعی خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن اس وقت میں نے اپنے خوف کے محرک پر غور کیا تھا۔

میں نے اخبار کی تہ الٹ کر دیکھا۔ اس کا نام ”بالٹی مور اسٹار“ تھا۔ ڈیڈی روزانہ جب دفتر سے گھر آنے لگتے تھے تو ریل کا ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کاٹنے کے لیے ہمیشہ بالٹی مور کے اسی اخبار کا تازہ ترین ایڈیشن خریدتے تھے۔ اس میں تین بجے سہ پہر تک کی خبریں ہوتی تھیں اور یہ اخبار پانچ بجے پریس سے نکل کر شہر میں فروخت ہوتا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اخبار کی تاریخ دیکھی۔ وہ اسی روز کا اخبار تھا اور اس کے دائیں طرف بالائی کونے پر ”سہ پہر تین بجے کا ایڈیشن“ درج تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس وقت سات بھی نہیں بجے تھے اور یہ اخبار بالٹی مور میں پانچ بجے فروخت کے لیے آیا ہوگا۔ بالٹی مور سے ہمارے قصبے کا ٹرین سے ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ تھا اس لیے اس اخبار کے ڈاک میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ بالٹی مور سے آنے والا کوئی شخص یہ اخبار اپنے ساتھ ہی وہاں سے لایا تھا لیکن کون شخص؟

مجھے معلوم تھا کہ ڈیڈی یہی اخبار پڑھتے ہیں اور یہی ایڈیشن خریدتے ہیں کیونکہ ان کا دفتر سے اٹھنے کا وقت بھی پانچ بجے شام کا ہی تھا۔ وہ اسٹیشن پر ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے ہی اخبار خریدتے ہیں اور تمام راستے اسے پڑھتے آتے ہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بدھ کی شام وہ گھر نہیں آتے۔ پھر یہ اخبار کہاں سے آیا؟ اگر ڈیڈی خلافِ معمول بدھ کی شام گھر آئے تھے تو میں ایک دوسری چیز سے اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا مکان کے داخلی دروازے تک گیا۔ دروازے کے بالکل پاس لوہے کے اسٹینڈ پر ایک بڑی سی ایش ٹرے رکھی رہتی ہے۔ یہاں مجھے کچھ وضاحت کرنی پڑے گی۔ اسٹیشن سے گھر تک کا بس کا سفر دس منٹ کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بسوں میں سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ سگریٹ کے عادی لوگوں سے لازمی طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بس سے اترتے ہی سگریٹ سلگا لیں۔ بس اسٹاپ سے ہمارے گھر کا فاصلہ اتنا ہے کہ اسے طے کرنے کے دوران ایک سگریٹ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا سیکڑوں مرتبہ کا تجربہ تھا۔ میری مرحومہ ماں نے اس مخصوص جگہ پر ایش ٹرے اسی لیے رکھوائی تھی کہ میں اور ڈیڈی سگریٹ نوشی کے عادی ہیں اور ہمیں گھر میں گھستے ہی سگریٹ بجھانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ہم دونوں ہی سگریٹ کا تین چوتھائی حصہ پینے کے عادی تھے۔ اگر بعض لوگوں کی طرح ہمیں بھی آدھا سگریٹ پھینک دینے کی عادت ہوتی تو میری ماں کو دروازے کے قریب ایش ٹرے رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

میری مرحومہ سوتیلی ماں بھی سگریٹ پیتی تھی لیکن اس کا برانڈ ”بگ فور“ تھا اور اس کی بجھائی ہوئی سگریٹ صاف پہچانی جاتی ہے کیونکہ اس کے آخری سرے پر لپ اسٹک کے نشان ہوتے ہیں۔ میں متلون مزاج آدمی ہوں اور آج کل میرا تازہ ترین برانڈ چیسٹر فیلڈ تھا لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، ڈیڈی کو ایک ہی برانڈ کی سگریٹ پیتے دیکھا ہے جو بیس پچیس سال پہلے بڑی مقبول تھی۔ غیر مقبول ہونے کے باوجود یہ نئے دور کی سب سگریٹوں سے مہنگی تھی۔ میری سوتیلی ماں تو اس کا ایک کش بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے ایش ٹرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس میں سگریٹ کا صرف ایک ہی ٹکڑا پڑا تھا اور یہ ڈیڈی ہی کے برانڈ کا تھا یعنی لیوانٹ کارک پنٹڈ۔ یہ ٹکڑا پچھلی شام کا بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ گھر کی صفائی کے لیے روزانہ صبح ایک ملازمہ آتی ہے جو ایش ٹرے کو بھی ضرور صاف کرتی ہے۔

اب یہ واضح تھا کہ ڈیڈی کچھ دیر پہلے غیر متوقع طور پر گھر آئے تھے۔ انہوں نے نہ جانے کیا منظر دیکھا جس سے مشتعل ہو کر انہوں نے مارشا کو قتل کر ڈالا لیکن کیا ایک عدد اخبار اور سگریٹ کا ایک ٹکڑا ڈیڈی کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے؟ اس کے برعکس اس بات کے بھی زیادہ امکانات ہیں کہ وہ گھر آئے ہی نہ ہوں جیسا کہ برسوں سے ان کا معمول تھا۔ کیا آج انہوں نے برسوں پرانی عادت توڑ دی؟ میں پولیس کو فون کر چکا تھا۔ پولیس راستے میں ہوگی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم میں گیا اور فون پھر آپریٹر کو اس کمپنی کا نام بتایا

جہاں ڈیڈی کام کرتے تھے اور اسے فوراً اٹارنی موور رابطہ قائم کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے جلد ہی نمبر ملا دیا۔

"مجھے مسٹر جارج کریگ سے بات کرنی ہے۔ میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"وہ تو شام پانچ بجے دفتر سے چلے گئے ہیں۔" آفس گرل نے بتایا۔

"لیکن آج بدھ ہے۔ بدھ کو وہ رات گئے تک دفتر میں کام کرتے ہیں۔"

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔" آفس گرل نے جواب دیا۔ "لیکن آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ پانچ بجے ہی گھر چلے گئے تھے۔"

"اچھا۔" میں نے ڈوبتے دل سے کہا۔ "کیا انہوں نے کہا تھا کہ وہ گھر جا رہے ہیں؟"

"نہیں صاف طور پر تو نہیں کہا تھا البتہ ایسی کوئی بات ضرور کہی تھی کہ آج رات وہ گھر پر گزارنا پسند کریں گے۔ اس سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ گھر جا رہے ہیں۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ امید کی آخری کرن بھی اندھیرے میں جا ڈوبی۔ مجھے فوری طور پر ایک اہم فیصلہ کرنا تھا اور اس فیصلے پر مجھے زیادہ غور وخوض کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بالکل ناکارہ انسان ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے اکیس سال ضائع کر دیے تھے۔ اگر میں سو سال مزید زندہ رہتا تب بھی میری زندگی کا کوئی مصرف نہیں ہوگا، سوائے دوسروں پر بوجھ بنے رہنے کے۔ مجھے صرف دو ہی شوق ہیں... جن سے میں کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ ایک شراب اور دوسرے جاسوسی ناول۔ میں آج تک ڈیڈی کو چیک پر دستخط کرنے کی مشین سمجھتا آیا تھا۔ میں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ پیسا کہاں سے آتا ہے اور کتنی محنت سے آتا ہے اور جس بُری طرح میں نے ڈیڈی کی توقعات کو پامال کیا ہے، اس سے ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے ان کے دکھ کا صرف اندازہ تھا، اس کی تلافی کرنے ... کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ میں جب بھی ان سے پیسے طلب کرتا تو وہ خاموشی سے چیک لکھ دیتے۔ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا کہ میں نے اس رقم کا کیا کرنا ہے یا میں آج کل کیا کر رہا ہوں اور مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ مستقبل کے سلسلے میں میرا کوئی بھی پروگرام یا کوئی بھی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے صرف حال سے دلچسپی تھی۔ اس لیے مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ ان کے اور میرے درمیان کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اگر وہ دنیا میں نہیں رہیں گے تو میرا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کے دم سے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی بے پناہ شفقتوں اور مہربانیوں کی یادیں قطاریں باندھے میرے تحت الشعور کے دھندلکوں میں چلی آئیں اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی کہ انہیں اس دنیا میں رہنے کا مجھ سے زیادہ حق ہے۔ میری موت سے دنیا کا کوئی کام نہیں رکے گا۔ میں محض ایک عضوِ معطل ہوں۔ یہ میرے لیے آخری موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر میں ڈیڈی کی شفقت اور مہربانی پر تشکر کا اظہار کر سکتا تھا۔ میں انہیں بتا سکتا تھا کہ میں ناکارہ ضرور ہوں مگر بے حس اور احسان فراموش نہیں۔

بہت دور کہیں سے میں نے پولیس کار کے ہارن کی آواز سنی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا اور مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، فوراً کرنا تھا۔ میں شہادتوں کو بگاڑ کر قتل کا شبہ کسی اور پر ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس طرح گھوم پھر کر تفتیش کا رخ ڈیڈی کی طرف مڑ سکتا تھا اس لیے میں نے نئی شہادتیں تیار کر کے اپنے قاتل ہونے کا ثبوت دینا تھا۔ میں دوڑتا ہوا خواب گاہ میں پہنچا۔ میری سوتیلی ماں اسی طرح پڑی تھی۔ اسے ناخن لمبے رکھنے کا شوق تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں مضبوطی سے تھام کر پہلے اپنے چہرے پر ایک طرف ناخنوں سے گہری خراشیں لگائیں پھر دوسری طرف۔ میرے رخساروں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی اس حرکت کے نتائج کا جائزہ لے کر میں نے اپنی ٹائی ڈھیلی کر کے اس کی ناٹ دائیں طرف سرکا دی اور اسے ہاتھ میں لے کر کسی قدر مسلا پھر میں نے اپنے بالوں کو پکڑ کر خوب جھنجوڑا۔ کچھ بال اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ گئے۔ انہیں میں نے مارشا کے نکیلے ناخنوں میں پھنسا دیا۔ میں نے وہ منحوس اخبار اور سگریٹ کا ٹکڑا باورچی خانے میں لے کر جا اچھی طرح جلا دیا۔

سائرن کی آواز گھر کے باہر آ کر رک گئی اور چند لمحے بعد پولیس دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ میں تیزی سے واپس ڈرائنگ روم میں آیا اور پھرتی سے صوفے پر دراز ہو کر بڑے مطمئن انداز میں سگریٹ پینے لگا۔ پولیس نے مایوس ہو کر دروازہ توڑنا شروع کر دیا تھا۔ دروازہ توڑنے کے لیے انہیں کم از کم ایک منٹ تو درکار تھا۔ میں اس معاملے کے دوسرے اہم پہلو پر غور کرنے لگا۔

آخر ڈیڈی میری سوتیلی ماں کو قتل کرنے کے بعد

کہاں گئے؟ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈیڈی کے لیے بہترین راستہ یہی تھا کہ وہ واپس بالٹی مور چلے گئے ہوں۔ مجھے یہ بھی توقع تھی کہ انہوں نے وہاں جا کر جائے واردات سے اپنی غیر حاضری ثابت کرنے کے لیے کسی شہادت کا بھی انتظام کرلیا ہوگا۔ وہ شام پانچ بجے دفتر سے نکلے تھے، ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ یہاں سے اگر وہ واپس بالٹی مور گئے ہوں گے تو آٹھ یا سوا آٹھ بجے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس طرح انہیں صرف سوا تین گھنٹے کا حساب دینا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی عقلمندی سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ فلم دیکھنے چلے گئے تھے یا کسی پارک میں سیر کررہے تھے یا ایسا ہی کوئی جواز۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ وہ پولیس کے سامنے یہ اقرار نہ کریں کہ وہ بالٹی مور سے باہر گئے تھے اور اپنے قصبے میں قدم رکھا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پولیس سے پہلے مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ملے۔ بالفرض میرا ان سے سامنا ہی نہ ہوسکا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو ان کا جرم اپنے ذمے لیتے دیکھ کر خود قتل کا اعتراف کربھی لیا تب بھی میری تیار کردہ شہادتیں اتنی مضبوط تھیں کہ ان کی موجودگی میں پولیس ڈیڈی کو قاتل ثابت نہیں کرسکتی تھی۔ ظاہر ہے مارشا کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا اور مارشا کے ناخنوں میں میری جلد کے باریک ٹکڑے اور میرے سر کے بال پائے جائیں گے اور یہ ثبوت مجھے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی ہوگا۔

بالآخر دروازہ ٹوٹ گیا اور پولیس والوں کا ایک ریوڑ سا اندر گھس آیا۔ جب انہوں نے مجھے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے دیکھا تو ان کی حالت قابلِ دید ہوگئی۔ میں نے ان کے غصے کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے انگلی سے خواب گاہ کی طرف اشارہ کیا اور وہ سب دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ تعداد میں وہ چار تھے، ایک قدرے عمر رسیدہ اور تین جوان۔ ان میں سے صرف ایک نوجوان جس کی عمر میرے اندازے کے مطابق تیس کے لگ بھگ تھی، ذہین اور باریک بین نظر آتا تھا۔ باقی تینوں احمق ہی معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک پولیس والا جس کا نام ہیری تھا میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے پولیس والا ہی نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ''مارٹن کریگ! تمہیں اس پولیس والے سے ہوشیار رہنا پڑے گا......''

کچھ دیر بعد جب وہ مارشا کی لاش کے معائنے سے فارغ ہوکر باہر آئے تو ایک سپاہی نے ہیڈ کوارٹر فون کرکے اس واردات کی تصدیق کی اور ماہرین بھیجنے کی درخواست کی پھر وہ چاروں میرے اردگرد بیٹھ کر مجھے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگے۔ ہیری بالکل خاموش تھا۔ وہ گہری نظروں سے میری حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''مقتولہ تمہاری سوتیلی ماں تھی؟'' پختہ عمر کے پولیس والے نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تم نے اسے قتل کیا ہے؟''

''ہاں۔ میرے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''قتل جیسے جرم کا ارتکاب کرکے تم بڑے مطمئن نظر آرہے ہو؟''

''اگر وہ ایک بار پھر زندہ ہوجائے تو اسے دوبارہ قتل کرنے پر بھی میں اتنی ہی خوشی محسوس کروں گا جتنی پہلی دفعہ کی تھی۔'' میرے اس اظہارِ خیال پر چاروں نے مجھے مزید غور سے دیکھا۔ ہیری اب بھی خاموش تھا۔

''کیا نام تھا مقتولہ کا؟''

''مارشا کریگ۔ میں جب......''

''ابھی نہیں۔ لیفٹیننٹ کے آنے پر تمہارا بیان لیا جائے گا۔''

کچھ دیر بعد لیفٹیننٹ صاحب بھی آگئے۔ ان کے ساتھ ماہرین کی فوج تھی۔ ایک پولیس والے نے مجھے وہیں پر کھڑا کرکے میری تلاشی لی اور پھر میرے پاس بیٹھ گیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ شاید میں کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کروں جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس دوران ہیری نے اٹھ کر میرے بیگ کی تلاشی لی۔ اس میں چند کپڑوں اور کتابوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ کالج میں میرا مضمون نفسیات تھا۔ ہیری ایک کتاب نکال کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سوچ میں ڈوبی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ خواب گاہ کے اندر ماہرین اور فوٹو گرافر اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیفٹیننٹ بھی وہیں تھا۔ آخر کار مارشا کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی اور مجھے خواب گاہ میں لیفٹیننٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مسہری پر جہاں کچھ دیر پہلے مارشا کی لاش پڑی تھی، اب صرف ایک نشان تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہاں کچھ دیر پہلے کوئی موجود تھا۔ لیفٹیننٹ کے قریب پولیس اسٹینوگرافر موجود تھا۔ اب میرا بیان شروع ہوا۔ نام، ولدیت اور عمر وغیرہ پوچھنے کے بعد لیفٹیننٹ نے کہا۔

''مارٹن! میں چاہتا ہوں کہ اب تم تفصیل کے ساتھ اس جرم کے بارے میں بتاؤ۔ تم نے کہا ہے کہ تم پرنس ماؤتھ یونیورسٹی کے طالب علم ہو۔ اب جبکہ کالجوں میں تعلیم جاری ہے، تم اچانک گھر کیوں آئے؟''

''مجھے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ میں ایک ٹرین پر سوار ہو کر کلاس روم میں چلا گیا تھا۔'' میں نے بڑی سادگی سے کہا۔

''خوب... پھر کیا ہوا؟''

''میں سہ پہر کو ٹرین میں بیٹھا جس نے مجھے چھ بجے یہاں اتارا۔ میں نے اسٹیشن سے دو مرتبہ گھر فون کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں مرتبہ مجھے گھر کا نمبر انگیج ملا۔ پھر میں بس پکڑ کر گھر چلا آیا۔ میرے پاس دروازے کی ایک چابی ہمیشہ رہتی ہے جس سے دروازہ کھول کر میں خاموشی سے اندر چلا آیا۔ مارشا، میری سوتیلی ماں ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں خاموشی سے دروازے میں کھڑا اس کی گفتگو سنتا رہا۔ اسے میری آمد کا علم نہیں تھا۔ پھر اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے جلدی سے فون بند کر دیا مگر میں اس کی کافی باتیں سن چکا تھا اور مجھے اس سے زیادہ سننے کی ضرورت بھی نہیں تھی.....''

''کیسی باتیں؟''

''اس سوال کا جواب میں نہیں دے سکتا۔'' اگر میں اس بات کی وضاحت کرتا تو اس سے میری سوتیلی ماں کا کردار داغدار ہوتا اور اس طرح میرے ڈیڈی کی عزت پر حرف آتا جو مجھے پسند نہیں تھا۔ میں نے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے یہی سمجھا اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''مارشا فون بند کر کے خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے باہر جانے کے لیے لباس بدلا ہوا تھا۔'' میں رک گیا۔ میرا ذہن آئندہ پیش آنے والے فرضی واقعات کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح پیش آئے ہوں گے۔ مجھے ان کی تفصیل بتانی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ مجھے پولیس کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ بھی کرنا پڑے گا۔

''اس کے بعد؟''

''میں نے مارشا کو کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی کشمکش میں ہم بستر پر گر گئے۔ اس نے خوب لاتیں چلائیں اور اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرا چہرا نوچا لیکن میں نے اس کی گردن نہیں چھوڑی۔ پھر پتا نہیں کب اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ مجھے گردن ٹوٹنے کا احساس نہیں ہو سکا۔ وہ فوراً ہی مر گئی۔''

''گویا تم نے غیر ارادی طور پر اسے قتل کیا۔ تمہارا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا؟''

''ہاں۔ غیر ارادی طور پر میری گرفت ضرورت سے زیادہ سخت ہو گئی۔''

''تب تم نے کیا کیا؟''

''میں چند لمحے کے لیے اسے کھڑا دیکھتا رہا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک منٹ لگا کہ وہ واقعی مر چکی ہے۔'' میں نے کہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں نے پولیس کو فون پر بتایا تھا کہ میں ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں اور میری سوتیلی ماں مجھے مُردہ حالت میں ملی ہے۔ مجھے اس غلطی کو بھی نبھانا تھا اس لیے جلدی سے کہا۔ ''پہلے میں نے سوچا کہ خاموشی سے فرار ہو جاؤں لیکن جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ میں زیادہ عرصہ قانون کی گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ پھر میں نے ارادہ کیا کہ جرم کو اس طرح پیش کروں کہ پولیس مجھے قاتل نہ سمجھے۔ یہ خیال مجھے بڑا مناسب محسوس ہوا اور اسی لیے جب میں نے فون پر آپ لوگوں کو قتل کی اطلاع دی تھی تو یہ کہا تھا کہ میرے گھر پہنچنے پر میری سوتیلی ماں مجھے مردہ حالت میں ملی ہے لیکن جب میں آپ لوگوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے اس صورت حال پر غور کیا اور تب مجھے احساس ہوا کہ اپنے چہرے پر مارشا کے ناخنوں کے نشانات میں کسی طرح بھی نہیں چھپا سکتا اور مزید تحقیقات کے بعد آخر کار یہ ثابت ہو ہی جائے گا کہ مارشا کو میں نے قتل کیا ہے چنانچہ مجھے اپنا پہلا بیان بڑا احمقانہ محسوس ہوا اور بڑے غور و خوض کے بعد مجھے یہی مناسب نظر آیا کہ پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔''

ایک بار پھر ہیری نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ خدا جانے وہ سادہ لباس والا جاسوس کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اس کی خاموشی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میرا بیان مکمل ہونے پر اسٹینوگرافر نے پورٹیبل ٹائپ رائٹر نکالا اور میرا اعترافِ جرم ٹائپ کرنے لگا۔ میں نے پڑھنے کی زحمت کیے بغیر اعتراف نامے پر دستخط کر دیے۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ نے مجھے عملی طور پر اپنے جرم کا مظاہرہ کرنے کی ہدایت کی۔ ایک ٹرک میں سے مووی کیمرا اتارا گیا، تیز روشنیاں جلائی گئیں۔ ایک نوجوان پولیس والا میری سوتیلی

ماں کا کردار ادا کرنے لگا اور واردات کی فلم بنائی جانے لگی۔

میں نے مکان سے باہر جا کر دروازہ کھولا، ہیٹ کو اچھال کر اسٹینڈ پر پھینکا۔ پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ میری ہدایت پر پولیس والا ٹیلیفون کا ریسیور کان سے لگا کر میری طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیگ صوفے پر ڈالا اور خاموشی سے سننے لگا۔ پھر میں نے پولیس والے سے کہا کہ وہ چونک کر پیچھے مڑے اور مجھے دیکھ کر فون بند کر دے اور خواب گاہ میں چلا جائے۔ پولیس والے نے میری ہدایات پر بخوبی عمل کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے خواب گاہ میں داخل ہوا اور پولیس والے کی گردن دبوچ لی۔ میری ہدایت کے مطابق وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ عین اس وقت میری نظر مسہری پر پڑی اور مجھے اپنے بیان کی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے بیان میں کہا تھا کہ میں اور مارشا ہاتھا پائی کرتے ہوئے مسہری پر گرے تھے اور اب جبکہ مسہری خالی تھی تو میں نے دیکھا کہ اس پر صرف ایک جسم کا نشان تھا۔ اگر ہم دونوں بستر پر گرے تھے تو وہاں کافی سلوٹیں یا دو جسموں کے نشان ہونے ضروری تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی پولیس والے نے اس کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے پولیس والے کو مسہری پر گرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی مسہری پر گر گیا۔ اس طرح بخیر و خوبی میرے بیان کا یہ کمزور پہلو بھی ختم ہو گیا۔ پولیس والے نے چہرہ نوچنے اور لاتیں مارنے کی اداکاری کی، چند منٹ بعد میں نے اسے چھوڑ دیا اور کیمرے نے بھی فلم لینا بند کر دی۔

اس تمام وقت میں ہیری میرے چہرے کا مشاہدہ کرتا رہا جبکہ دوسرے پولیس والے میری حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ اس دوران داخلی دروازے پر باتیں کرنے کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد دروازے پر پہرا دینے والا کانسٹیبل اندر آیا اور لیفٹیننٹ کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ لیفٹیننٹ نے میری طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ پولیس والا واپس باہر چلا گیا۔ ہم اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ ایک منٹ بعد جب پولیس والا دوبارہ اندر آیا تو اس کے ساتھ میرے ڈیڈی بھی تھے۔ غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پولیس والے نے غالباً انہیں اندر آنے سے روکا تھا اور وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں گھر کے اندر ہونے والی واردات کے متعلق کچھ پتا نہیں۔ میں ان کی عمدہ اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ غصیلی نظروں سے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' ڈیڈی نے کہا۔

اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ حیران رہ گئے۔

''مارٹن ...... ! تم ...... کیسے آ گئے ...... تمہاری ماں کہاں ہے؟''

میں ان کی اداکاری پر اش اش کر اٹھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جب انہیں علم ہوگا کہ میں نے ان کا جرم اپنے سر لے لیا ہے تو کیا وہ یہ اداکاری جاری رکھ سکیں گے یا بے گناہی کا خول اتار کر اپنے جرم کا اقرار کر لیں گے۔ صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میں گھبرا گیا اور میرا سارا اطمینان یکلخت رخصت ہو گیا۔ اتنے پولیس والوں کی موجودگی میں، میں ڈیڈی کو کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا لفظ کہہ سکتا تھا جس سے وہ خبردار ہو جائیں ......

میں چپ چاپ ان کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ میری نظروں کا پیغام پڑھ لیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں، بنے بنائے کھیل کو نہ بگاڑیں جس کے لیے میں نے اتنی محنت کی۔

''ڈیڈی! میں آپ کو ایک بری خبر سنانے والا ہوں۔ مارشا مر چکی ہے۔'' میں نے کہا۔ ڈیڈی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ...... ''انہیں میں نے قتل کیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ڈیڈی کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ سہارا لے کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''نہیں مارٹن ...... نہیں ...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''میں نے مارشا کو قتل کیا ہے ...... میں اس کا قاتل ہوں ...... میں'' ...... میں نے انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے لفظ ''میں'' پر بڑا زور دیا تھا۔ میں انہیں سمجھانا چاہتا تھا کہ مارشا کا قاتل میں ہوں، وہ نہیں ہیں۔

''مارٹن ...... تم ...... ایسا نہیں کر سکتے۔''

''آپ کو کیا معلوم ڈیڈی ......'' میں چلایا۔ ''آپ تو بالٹی مور میں تھے۔ آپ یہاں تھے ہی نہیں، آپ تو ابھی ابھی آئے ہیں، آپ کو کیا معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے ...... آپ تو بالٹی مور میں تھے۔''

''اسے حوالات میں لے جاؤ۔'' لیفٹیننٹ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔''

میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی اور مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جا کر بند کر دیا گیا۔

چند دنوں میں ساری قانونی کارروائیاں مکمل ہو گئیں۔ ایک ہفتے بعد جیوری کے انتخاب کے بعد مقدمہ شروع ہونا تھا۔ ڈیڈی حوالات میں مجھ سے ملاقات کے

لیے آئے۔ ہم دونوں کو ایک کمرے میں چھوڑ دیا گیا۔ بند دروازے کے باہر مسلح پہریدار موجود تھا۔

''مارٹن!'' ڈیڈی نے اداس لہجے میں کہا۔ ان کے چہرے پر اضمحلال تھا، شیو بڑھا ہوا تھا۔ چند دنوں میں ہی وہ بوڑھے ہو گئے تھے۔ ''میں نے تمہارے لیے وکیل کر لیا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ جب تک تم اسے اعتماد میں لے کر سب کچھ صحیح صحیح نہیں بتاؤ گے تب تک وہ یہ مقدمہ ہاتھ میں نہیں لے گا۔''

''ڈیڈی! میں نے مارشا کو قتل کیا ہے۔'' میں نے بلند آواز سے کہا اور ساتھ ہی ڈیڈی کو انگلی کے اشارے سے محتاط رہنے کی تاکید کی۔ ''وہ وکیل کیا مجھ سے کوئی جھوٹی کہانی سننا چاہتا ہے۔'' پھر میں نے ان کے کان سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ ''ڈیڈی! میرے خیال میں یہاں کوئی ڈکٹافون چھپا ہوا ہے ورنہ ہم لوگوں کو اس طرح تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع نہ دیا جاتا۔ آپ بلند آواز میں مجھ سے باتیں کرتے رہیں مگر کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں...... میں ذرا اپنا اطمینان کر لوں۔''

ڈیڈی میرا مطلب تو سمجھ گئے ہوں گے لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بولے۔ ''مارٹن! مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ میرا بیٹا......''

میں چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کمرے میں گھوم کر ڈکٹافون کے تار تلاش کرنے لگا۔ آخرکار میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پولیس والے خفیہ فون کے ذریعے دوسرے کمرے میں ہماری بات چیت سن رہے تھے۔ میں نے وہ تار توڑ دیا اور بھاگ کر ڈیڈی کے پاس آیا۔

''ڈیڈی! آپ نے کیس کی کارروائیوں کے دوران کوئی غلط بات تو نہیں کہی نا؟'' میں نے پوچھا۔

''کس چیز کے بارے میں؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''اپنے بارے میں۔''

''لیکن میرے پاس کہنے کے لیے ہے ہی کیا؟''

میں نے گرمجوشی سے ان کا کندھا دبایا۔ ''بہت خوب ڈیڈی! بس آپ یہی طرزِ عمل اپنائے رکھیں۔'' میں نے کہا لیکن دل ہی دل میں مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ ڈیڈی کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ میں نے ان کے لیے جو قربانی دی ہے انہیں اس کی توقع تھی بلکہ وہ اسے اپنا حق سمجھ رہے تھے۔ پولیس کے سامنے ان کا یہ طرزِ عمل اختیار کرنا بے حد مناسب تھا لیکن تنہائی میں اس اداکاری کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ ہمیں مزید گفتگو کا موقع نہیں مل سکا۔ خفیہ فون کا تار ٹوٹتے ہی کسی دوسرے کمرے سے ہیری دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے میرے ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی جن پر تار توڑنے کی وجہ سے نشان پڑ گئے تھے۔

''مجھے تم سے یہی توقع تھی مارٹن!'' ہیری نے کہا۔ پھر ڈیڈی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اب آپ جا سکتے ہیں مسٹر......!''

تین دن بعد پھر ہیری میرے پاس آیا۔ وہ اطمینان سے کوٹھری میں میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف سگریٹ بڑھائی جسے میں نے شکریے کے تکلف کے بغیر قبول کر لیا۔

''کیا مسٹر کیف آج کل بھی تمہارے کالج میں نفسیات کے پروفیسر ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا وہ تمہارے بھی استاد رہ چکے ہیں؟''

''ہاں۔'' ہیری نے کہا۔ ''لیکن تم نفسیات میں ضرور فیل ہوئے ہو گے کیونکہ تم نے پولیس کے سامنے جو مظاہرہ کیا تھا وہ انتہائی ناقص تھا۔''

''کوئی حرج نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مرنے کے بعد میرے پاس بہت وقت ہو گا۔ پھر میں پورے دھیان سے اس مضمون کا مطالعہ کروں گا۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو مارٹن کہ میں تمہارے اس بیان پر یقین کر لوں کہ مارشا کریگ کو تم نے قتل کیا ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''جب تک تمہارے ڈیڈی نہیں آئے تھے تم نے بڑے سکون کا مظاہرہ کیا جیسے تم فولادی اعصاب کے مالک ہو لیکن جیسے ہی تم نے ڈیڈی کو دیکھا، تمہاری پیشانی پر پسینا آ گیا اور تم سوئی کے نیچے اٹک جانے والے ریکارڈ کی طرح ایک ہی بات دہرانے لگے...۔'' آپ بالٹی مور میں تھے ڈیڈی...... آپ بالٹی مور میں تھے۔'' ممکن ہے میرے دوسرے ساتھیوں نے اس جملے کو اہمیت نہ دی ہو لیکن میں نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمہارے ڈیڈی اس شام بالٹی مور میں نہیں تھے۔''

میرے دل کی دھڑکن گویا رک گئی۔ مجھے اسی پولیس والے سے کھٹکا تھا اور میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ میں ہیری کو بیوقوف نہیں بنا سکا۔ کیا میری تمام محنت ضائع ہونے والی تھی؟

''...... اس لیے......'' ہیری مزید کہہ رہا تھا۔ ''میں نے فوراً تمہارے ڈیڈی کی مصروفیت کے بارے میں

چھان بین شروع کر دی کہ وہ قتل کے وقوعے والی شام چھ اور سات بجے کے درمیان کہاں تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کیس پر اتنی محنت نہیں کی...... تمہارے ڈیڈی نے جو بیان دیا تھا میں نے ہر پہلو سے اسے پرکھا...... ایک بار نہیں پانچ بار...... میں نے درجنوں افراد سے ملاقات کی۔ ہر ایک کا بیان لیا اور اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی...... جس کے نتیجے میں میرے سامنے تمہارے ڈیڈی کی ایک گھنٹے کی چھوٹی سے چھوٹی مصروفیت کا ایک ایک سیکنڈ کا حساب موجود ہے۔''

غالباً اس کی اس گفتگو کے دوران میں سانس لینا بھی بھول گیا۔ بس منہ کھولے اسے دیکھتا رہا...... ہیری بڑے ٹھوس لہجے میں آہستہ آہستہ الفاظ ادا کر رہا تھا اور ان کا ردعمل میرے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔

''تم یہ نہیں پوچھو گے مارٹن کہ میری اس شدید محنت اور تحقیق کا کیا نتیجہ برآمد ہوا......؟''

''نہیں...... نہیں۔'' میں چلا اٹھا۔

''تم بے شک نہ پوچھو لیکن میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔'' ہیری نے بڑے مطمئن انداز میں سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ تمہارے ڈیڈی کا بیان تھا کہ بدھ کے دن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے انہوں نے معمول کے خلاف رات گئے تک کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پانچ بجے شام دفتر سے اٹھ گئے...... ان کی طبیعت نڈھال تھی اس لیے انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ بالٹی مور کے ایک مشہور حمام میں ترکی غسل کریں جو گرم بھاپ کے ذریعے کیا جاتا ہے اور غسل کے دوران دو آدمی نہانے والے کے جسم کی مالش کرتے ہیں تاکہ اس کے پٹھے کھل جائیں اور سستی اور اعصابی تناؤ دور ہو جائے اور نہانے والے کی طبیعت پرسکون اور تروتازہ ہو جائے...... گرم بھاپ کے غسل کے دوران وہ بے ہوش ہو گئے اور مالش کرنے والے آدمی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر انہیں ایک انجکشن دیا اور پھر دوائیں کھلائیں۔ اس طرح انہیں بالٹی مور میں تقریباً پونے آٹھ بج گئے۔ پھر وہ آٹھ بجے والی ٹرین سے گھر آنے کے لیے سوار ہو گئے اور ساڑھے نو بجے یہاں پہنچے...... میں نے اس سارے سلسلے کی تصدیق کے لیے پہلے ان کے دفتر کے چار آدمیوں کے بیانات لیے جن سے تصدیق ہوئی کہ وہ واقعی دفتر سے پانچ بجے اٹھ گئے تھے...... میں نے اس ٹیکسی والے کو تلاش کیا جو انہیں دفتر سے اس مشہور حمام تک لے گیا تھا۔ اس نے بھی ان کے بیان کی تصدیق کی۔ میں نے حمام کے منیجر کا بیان لیا اور مالش کرنے والے ان دونوں آدمیوں سے بھی ملا جنہوں نے تمہارے ڈیڈی کے جسم کی مالش کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ واقعی وہ غسل کے دوران بے ہوش ہو گئے تھے اور وہ ٹیکسی میں انہیں ڈاکٹر کے کلینک تک لے گئے تھے۔ میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو بھی تلاش کیا جو انہیں کلینک تک لے گیا تھا۔ پھر میں نے ڈاکٹر سے بھی ملاقات کی جس نے تمہارے ڈیڈی کو انجکشن لگایا تھا اور وہ دوائیں دی تھیں...... تمہارے ڈیڈی کا بیان حرف بہ حرف درست ثابت ہوا اس لیے مارٹن! تمہارے ڈیڈی تمہاری سوتیلی ماں کے قاتل نہیں ہو سکتے کیونکہ جس وقت یہ واردات ہوئی ہے، اس وقت وہ حمام میں موجود تھے اور دو آدمی ان کے جسم کی مالش کر رہے تھے...... کچھ سمجھے تم؟ اب بتاؤ کہ آخر تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور در و دیوار میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔

''لیکن...... یہ کون کہتا ہے کہ اسے میرے ڈیڈی نے قتل کیا ہے؟'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''کوئی نہیں۔'' ہیری نے کہا۔ ''اسی لیے آج تم یہاں نظر آ رہے ہو کہ کوئی تمہارے ڈیڈی کو قاتل نہ کہہ سکے...... مجھے بیوقوف بنانے میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے باپ کو بچانے کے لیے قتل کا الزام اپنے سر لے لینے اور کسی نامعلوم اور اجنبی کی خاطر قربانی کا بکرا بننے میں بڑا فرق ہے دوست! کیا تم اب بھی اپنا موجودہ رویہ برقرار رکھنا بہتر سمجھتے ہو؟''

''میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم سچ بول رہے ہو اور میرے لیے جال نہیں بچھا رہے ہو...... اور یہ کہ ڈیڈی پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔''

''میں یہاں جیل کی کوٹھری میں تو تمہارے سامنے کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔'' ہیری بولا۔ ''میں تمہارے لیے ہمدردی کا ایک ہی جواز پیش کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ میں بھی اسی استاد کا شاگرد ہوں جس نے تمہیں پڑھایا ہے اور اس ناتے سے تم مجھے بھائی سمجھ سکتے ہو، ایک مخلص بھائی۔''

''یہ بچوں والی باتیں ہیں ہیری اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی بچہ نہیں ہے۔'' میرا لہجہ کمزور پڑ گیا تھا۔

''میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں میرے الفاظ پر اعتبار کرو...... میں جھوٹ نہیں بول رہا اور نہ ہی مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے......'' میں چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا، اس کے لہجے سے خلوص ٹپک رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے

احساس ہوا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

''ٹھیک ہے......''بالآخر میں نے طویل سانس لے کر کہا۔''میں تم پر اعتماد کیے لیتا ہوں...... یہ درست ہے کہ میں نے مارشا کو قتل نہیں کیا لیکن میں یہی سمجھا تھا کہ ڈیڈی اس کے قاتل ہیں۔''ہیری اگر سچ بھی بول رہا تھا تب بھی میں اسے اخبار اور سگریٹ کے متعلق بتانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا اور ایسے کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں وہ ڈیڈی پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکتے تھے۔

''مجھے یقین تھا مارٹن کہ قتل تم نے نہیں کیا...... اس حقیقت کے کئی ثبوت موجود ہیں۔''ہیری نے کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔''مارٹن! میں تمہیں خوفزدہ تو نہیں کرنا چاہتا لیکن حقائق کو تمہاری نظروں سے اوجھل بھی نہیں رکھنا چاہتا...... حالات اب کسی کے بھی اختیار میں نہیں رہے۔ تم اگر اب چیخ چیخ کر بھی اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہو، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی بھی ایک انسان ہے۔ اسے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں جس کی وجہ سے وہ تمہیں موت کی سزا سنائے لیکن بہرحال ایک بھیانک جرم ہوا ہے اور حالات و شواہد کی روشنی میں کسی نہ کسی کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔ مجرموں کو ان کے جرم کی سزا دینا ہی اس کا فرض ہے۔ وہ مجرم کے دستیاب نہ ہونے پر کسی کی بھی موجودگی کو ترجیح دے گا...... میرے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے مارشا کو قتل نہیں کیا لیکن تمہارے اقبالِ جرم کی موجودگی میں ان شہادتوں کا کوئی تاثر نہیں بنتا...... تمہارے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اصل مجرم پکڑا جائے۔ صرف اسی صورت میں ڈسٹرکٹ اٹارنی تمہیں بری کر سکتا ہے......''ہیری خاموش ہو کر متفکر چہرہ لیے مختصری کوٹھری میں ٹہلتا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''سنو دوست! درحقیقت میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا البتہ تم اپنی مدد خود کر سکتے ہو اور وہ اس طرح کہ تم مجھے کوئی ایسی بات، ایسا نکتہ بتاؤ جس کی مدد سے اصل مجرم کا کھوج لگا سکوں۔ اسی صورت میں تمہارا بچاؤ ہو سکے گا ورنہ تم اپنے آپ کو مکمل طور پر پھنسا چکے ہو۔''

میرے پاس اس نوعیت کے دو ہی سراغ تھے...... اخبار اور سگریٹ کا ٹکڑا...... لیکن یہ دونوں سراغ پولیس کو براہِ راست ڈیڈی تک پہنچاتے تھے۔ میں ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا مارٹن! میں اب چلتا ہوں...... اگر زیادہ دیر ٹھہرا تو کوئی مجھ پر رشوت خوری کا شبہ نہ کر بیٹھے۔''ہیری نے کہا اور گارڈ کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ ہیری جب باہر نکل گیا اور گارڈ دوبارہ تالا لگانے لگا تب مجھے وہ اہم بات یاد آئی۔ میں نے زور سے آواز دے کر ہیری کو بلایا۔ وہ واپس آ گیا مگر گارڈ نے تالا کھولنے سے انکار کر دیا۔ ہیری سلاخوں سے ہی منہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں اسے بتایا......''مجھے ابھی ابھی ایک بات یاد آئی ہے ہیری! شاید اس سے تمہیں کوئی مدد مل سکے۔ تمہیں یاد ہو گا، میں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ جب میں گھر میں داخل ہوا تو میری سوتیلی ماں کسی سے ٹیلیفون پر باتیں کر رہی تھی اور مجھے دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا تھا...... یہاں میں نے غلط بیانی کی تھی...... درحقیقت جب میں گھر میں داخل ہوا تو ریسیور میز سے نیچے لٹک رہا تھا اور خواب گاہ میں مارشا مردہ حالت میں پڑی تھی...... دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس نے ٹیلیفون بند نہیں کیا تھا۔ شاید اس نے قاتل کی یا قتل کے وقت ہونے والی ممکنہ جدوجہد کی آوازیں سنی ہوں...... میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف موجود شخصیت نے گھبرا کر گہرا سانس لیا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت تک مجھے مارشا کے قتل کا علم نہیں ہوا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا اور اس کے بعد میں خواب گاہ میں گیا۔''

ہیری چند لمحے کے لیے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

''یقیناً یہ بات بڑی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔''ہیری نے کہا۔''فون پر دوسری طرف جو کوئی بھی تھا وہ چشم دید گواہ تو نہیں لیکن صوتی گواہ ضرور ثابت ہو سکتا ہے۔ اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ شاید اس سے کوئی ایسی بات معلوم ہو سکے جس کے سہارے اصل مجرم تک پہنچا جا سکے...... اس دن تاریخ کیا تھی......؟ تین نومبر...... اور وقت شام کے چھ بجے کا تھا...... ٹھیک ہے نا......؟ تم نے اسٹیشن سے گھر فون کیا تھا اور اس وقت سے فون انگیج تھا۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ جس وقت تم نے فون کیا تھا اس سے پانچ منٹ پہلے گھر کا ٹیلیفون انگیج ہوا تھا۔ تقریباً دس منٹ انتظار کر کے تم نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ اس کے بعد تم نے دس منٹ بس کا سفر کیا۔ اس کے بعد بس اسٹاپ سے گھر پہنچنے میں تمہیں پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ اس کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے، ہیٹ اسٹینڈ پر پھینکنے اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہنے کا وقفہ پانچ منٹ کا سمجھ لو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ٹیلیفون کال کم ازکم آدھے گھنٹے تک جاری رہی۔ اس سے زیادہ وقت ہو سکتا ہے، کم نہیں...... آدھ گھنٹے سے پون گھنٹے تک کی کال کے پیسے بھی عام کالز سے بہت زیادہ ہوں گے۔ میں ٹیلیفون

ایکسچینج جا کر ان کا ریکارڈ چیک کروں گا۔ تین نومبر کی شام کو چھ بجے کے قریب اتنی طویل کالز کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ میں ایسی تمام کالیں چیک کروں گا۔ مجھے اپنے مطلوبہ شخص کا نام و پتا مل جائے گا...... یہ ایک ہمت افزا بات ہے...... اب تم فکر نہ کرو، کوئی نہ کوئی مثبت تبدیلی ضرور آنے والی ہے۔'' ہیری نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر میرا کندھا تھپکا۔ ''اپنے وکیل سے تعاون کرو، اپنے جرم سے انکار کر دو۔ مجھے امید ہے کہ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے پہلے میں کچھ کر لوں گا۔''

مقدمہ شروع ہوئے چار روز گزر گئے، ہیری کی صورت تک نظر نہیں آئی۔ میرا وکیل بڑی دشواریاں محسوس کر رہا تھا۔ پولیس کا موقف بہت مضبوط تھا۔ ہیری کے کہنے کے مطابق میں اقبال جرم سے منکر ہو گیا تھا لیکن چوتھے دن جب استغاثہ نے جیوری کے سامنے ایک بڑا سا پردہ لگایا اور کمرائے عدالت کی تمام کھڑکیوں پر پردے گرا کر اندھیرا کر کے میرے ارتکاب جرم کی اداکاری والی فلم دکھانے کا اہتمام کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میرے تابوت میں آخری کیل ہے۔ اس فلم کے دیکھنے اور میرا اعتراف جرم پڑھنے کے بعد دنیا کا کوئی آدمی یہ ماننے کو تیار نہ ہوتا کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ مقدمے کو مضبوط بنانے کے لیے استغاثہ نے میرا پورا ماضی عدالت کے سامنے پیش کر دیا تھا جو کہ ظاہر ہے کہ تابناک نہیں تھا اور پولیس نے میرے کردار کی تصویر کشی کچھ اس مہارت سے کی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی...... جس روز میں ٹرین میں گھر آ رہا تھا، راستے بھر شراب نوشی کرتا آیا تھا۔ پولیس نے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس آدمی کو بھی عدالت میں پیش کر دیا تھا جو مجھ سے اس لیے جلا بیٹھا تھا کہ سفر کے دوران میں نے اس کی درخواست پر بھی اسے دو گھونٹ شراب پلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے گواہی دی کہ جب میں اسٹیشن پر اترا ہوں تو میرے معدے سے ناک تک شراب بھری ہوئی تھی۔

میرے وکیل کے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا کہ اگر میں نے قتل نہیں کیا تھا تو اس کا اعتراف کیوں کیا تھا۔ اس کے علاوہ وکیل استغاثہ نے مجھ پر جرح کرتے ہوئے میرے کمزور پہلو پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اپنی سوتیلی ماں کو قتل نہیں کیا؟''

''جی ہاں...... میں نے مارشا کو قتل نہیں کیا۔''

''تو کیا اعتراف نامے پر کسی نے تم سے جبری طور پر دستخط کرائے تھے؟''

''جی نہیں...... میں نے اپنی مرضی سے دستخط کیے تھے۔'' میں نے جواب دیا کیونکہ میں نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہوا تھا۔

''اگر قتل تم نے نہیں کیا تھا تو اعتراف نامے پر دستخط کیوں کیے تھے؟''

''میں اس سوال کا جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

اس کے بعد کمرائے عدالت کی بتیاں بجھا کر جیوری کو وہ فلم دکھائی گئی جس میں، میں نے طریقۂ واردات کا مظاہرہ کر کے دکھایا تھا۔

فلم ختم ہوگئی، اسکرین کو ہٹا لیا گیا اور بتیاں روشن کر دی گئیں۔ وکیل استغاثہ کو مزید دلائل وغیرہ دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس نے بڑے اختصار سے کہا۔ ''میں نے مقدمہ مکمل طور پر عدالت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میں مزید کوئی شہادت پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

میرے وکیل نے غالباً کسی آخری امید کے تحت میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''مارٹن! خدا کے لیے مجھے یہ بتا دو کہ تم نے اعتراف نامے پر دستخط کیوں کیے تھے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا......'' میں نے جواب دیا۔

میرے وکیل نے مایوسی سے سر ہلایا اور عدالت کو مخاطب کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ ''محترم جج اور ارکانِ جیوری! آخر میں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ......''

اچانک عدالت کے کسی کارندے نے میرے وکیل کے کان میں سرگوشی کی۔ میرے وکیل نے تقریر ملتوی کر کے عدالت سے دو منٹ کی مہلت مانگی اور کارندے کے ساتھ عدالت سے باہر چلا گیا۔ میں نے حیرانی کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو میری نظر ہیری پر پڑی۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ پچھلی نشستوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غالباً چند لمحے پہلے ہی آیا تھا۔ میرا وکیل باہر کارندے سے کوئی بات کر کے فوراً ہی واپس آیا اور ہیری کے قریب جھک کر اس سے گفتگو کرنے لگا۔ پھر وہ واپس اپنی جگہ آیا اور عدالت سے ایک گواہ پیش کرنے کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔

''میں کمرائے عدالت میں موجود مسٹر ولیم ہمن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ گواہوں کے کٹہرے میں تشریف لے آئیں۔'' میرے وکیل نے کہا۔ ہیری کے برابر بیٹھا ہوا اجنبی اٹھا اور گواہوں والے کٹہرے میں آگیا۔ وہ بڑا تروس

نظر آ رہا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔

''کیا تم مقتولہ مارشا کریگ کو جانتے تھے مسٹر ولیم؟''

میرے وکیل نے پہلا سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' گواہ نے نیچی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا تم مقتولہ سے محبت کرتے تھے؟''

گواہ کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''مسٹر ولیم ...... میرے سوال کا جواب دیجیے!''

میرے وکیل نے نرمی سے کہا۔ گواہ نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ عدالت کو بتائیں کہ تین نومبر کی شام کو جب آپ نے مقتولہ سے ٹیلیفون پر بات کی تھی تو فون پر کیا سنا تھا؟''

''میں نے مارشا کریگ کو تقریباً پونے چھ بجے ٹیلیفون کیا تھا۔'' گواہ نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا..... ''میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھ سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔ ہم دونوں ہر بدھ کو رات کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ بدھ کی رات مسٹر کریگ بالٹی مور میں ہی گزارتے تھے۔ مارشا نے بتایا کہ اس نے لباس بھی تبدیل کر لیا ہے اور وہ صرف میرے فون کا انتظار کر رہی تھی تا کہ ملاقات کی جگہ کا تعین ہو سکے۔ کچھ دیر تک ہم مختلف جگہوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے ...... ابھی ہم کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ مارشا نے مجھ سے کہا کہ ذرا ٹھہرو دروازے پر کوئی ہے، میں دیکھ لوں، کون ہے...... میں نے ہولڈ کیے رکھا۔ چند لمحے بعد میں نے فون پر مارشا کی آواز سنی ...تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

''اس کے بعد میں نے ایک مردانہ آواز سنی .... کیا میں اب اتنا بدصورت ہو گیا ہوں کہ تم میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتیں ......؟ پھر چند لمحے خاموشی رہی۔ دفعتاً میں نے مارشا کے چیخنے کی آواز سنی۔ آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ برابر والے کمرے سے آ رہی ہو۔ مارشا نے چیختے ہوئے کہا تھا... رک جاؤ اسٹیو! یہ کیا کر رہے ہو، میں مر جاؤں گی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ تا تھا کہ میں کیا کروں۔ اگر میں فون بند کر کے پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دیتا تو میری پوزیشن مشکوک ہو جاتی اور میرے مارشا کے ساتھ تعلقات کا راز بھی فاش ہو جاتا۔ اس کے علاوہ مجھے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں تھا کہ مارشا کے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور صورت حال کس قدر نازک ہے۔ میں ٹیلیفون پر مارشا کو پکارتا رہا لیکن دوسری طرف مکمل خاموشی طاری تھی۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے مارشا، اس اجنبی جس کا نام اسٹیو تھا، سے ڈر کر گھر سے بھاگ نکلی ہو۔ میں اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا کہ شاید وہ واپس آ کر بتائے کہ یہ سب کیا معاملہ تھا اور پھر ہم دونوں ملاقات کے لیے جگہ کا تعین کریں گے۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بہر حال یہ احساس ضرور ہے کہ وہ ایک طویل وقفہ تھا...... پھر میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور چند لمحوں بعد ایک نئی مردانہ آواز نے مارشا کو پکارا۔ پھر اس نے ریسیور میں ہیلو کہا۔ میں بری طرح چونک پڑا اور میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔''

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ جس مردانہ آواز نے ریسیور میں ہیلو کہا تھا وہ پہلے والے مرد کی نہیں تھی جسے مقتولہ نے اسٹیو کہہ کر پکارا تھا؟'' میرے وکیل نے پوچھا۔

''جی ...... مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ پہلی آواز بھاری بھرکم اور کسی بڑے مرد کی لگتی تھی۔ اس میں اتنا لوچ بھی نہیں تھا جبکہ دوسری آواز نرم اور کسی نوجوان کی محسوس ہوتی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''شکریہ مسٹر ولیم!'' میرے وکیل نے کہا پھر اراکینِ جیوری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں محترم جج اور معزز اراکین جیوری کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہی مکان میں جہاں کسی بھی وقت داخل ہونے کا اسے پورا پورا حق حاصل ہو مثلاً مقتولہ کا شوہر یا سوتیلا بیٹا، داخل ہو تو کیا مقتولہ ایسے شخص سے کہہ سکتی تھی کہ تم یہاں کیا لینے آئے ہو، میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی اور تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ......؟ اس کے علاوہ جیسا کہ سب جانتے ہیں میرے موکل کا نام مارٹن ہے۔ کیا مقتولہ مارٹن کو اسٹیو کہہ کر پکار سکتی تھی ...... اب میں عدالت سے استغاثہ کے گواہ ہیری کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانے کی درخواست کروں گا۔''

جج نے ہیری کو گواہوں کے کٹہرے میں آنے کا حکم دیا۔ ہیری نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔

''مسٹر ہیری! اس سے پہلے آپ استغاثہ کی طرف سے گواہ کے طور پر پیش ہوئے تھے اور آپ نے تصدیق کی تھی کہ میرے موکل مارٹن نے اعتراف نامے پر اپنی مرضی سے دستخط کیے تھے۔ اب میں آپ سے ایک ایسا سوال پوچھنا چاہتا ہوں جو اس سے پہلے نہیں پوچھا گیا۔ آپ نے

قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھوڑا روکا اور زمین پر کود گیا۔ ہرنی کے بچے نے پورا زور لگا کر ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن سبکتگین نے اسے پکڑ لیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا اور شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ گھوڑے کو ہلکی چال چلاتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ دور چل کر اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کچھ فاصلہ دے کر ہرنی اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے اور اس کی صورت اور حرکات سے پریشانی اور رنج کا اظہار ہو رہا ہے۔ پہلے تو وہ خوش ہو گیا کہ شکار خود بخود اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ ہرنی کو بھی اپنے ساتھ دوڑاتا ہوا شہر کی طرف لے جائے لیکن پھر اس کی فطری رحم دلی غالب آگئی۔ اسے یاد آگیا کہ ہرنی کا بچہ اس کے پاس ہے۔ ہرنی محض ہرنی نہیں ہے بلکہ ایک ماں بھی ہے۔ میں نے ایک ماں سے اس کا بچہ چھین لیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دل لرز اٹھا۔ اس نے کسی توقف کے بغیر بچے کی بندش کھولیں اور زمین پر چھوڑ دیا۔ بچہ رہائی ملتے ہی بھاگا اور ماں کے پاس پہنچ گیا۔ ہرنی کے دل سے اس سوار کا خوف نکل گیا تھا۔ وہ بچے کو بے تحاشا چوم رہی تھی اور بار بار نظریں اٹھا کر سوار کی طرف دیکھ لیتی تھی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ پھر اس نے بچے کو ساتھ لیا اور چوکڑیاں بھرتی ہوئی جنگل کی طرف پلٹ گئی۔

سبکتگین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

وہ گھر پہنچا تو مضمحل اور تھکا تھکا نظر آرہا تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، اس نے ایک ماں کا دل دکھایا ہے۔ یہ سوچ کر طمانیت کا احساس بھی ہوتا تھا کہ اس نے بہت جلد اپنے گناہ کو نیکی میں بدل بھی دیا۔

وہ رات کو جب اپنے بستر پر گیا تو اس وقت بھی یہی خیال دامن گیر تھا۔ وہ ہرنی کے بارے میں غور کرتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اس نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے۔

''اے ناصرالدین! تو نے جو ایک بے زبان جانور پر رحم کیا ہے، وہ خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں بہت مقبول ہوا ہے۔ پروردگار نے اپنے رحم و کرم کا دروازہ تجھ پر کھول دیا ہے۔''

اس کی آنکھ کھلی تو وہ حیران و پریشان تھا۔ کچھ دیر تو بستر سے اٹھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے چھت کو گھورتا رہا۔ جب ذرا کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھے ہوئے خواب پر غور کیا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایسا بابرکت خواب اور ایسی امید افزا نوید۔ کہاں میں، کہاں یہ خواب۔ اس کی تعبیر بھی یقیناً نیک ہی ہوگی۔

ابھی وہ پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کا بلاوا آگیا۔ امیر نے اسے طلب کیا تھا۔ اس نے وقت کا اندازہ لگایا تو اسے احساس ہوا کہ امیر کا اسے طلب کرنا کچھ ایسا بے جا نہیں۔ وہ آج کچھ زیادہ دیر تک سوتا رہا ہے۔ ایسی گہری اور اطمینان بخش نیند اسے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے تو اسے پرسکون نیند آتی ہے۔ ہرنی کے بچے کو اس کی ماں کے حوالے کرنے کے بعد اسے جو روحانی سکون ملا تھا اس کے بعد ایسی ہی نیند آسکتی تھی۔ فجر کی نماز کے وقت وہ بہ مشکل اٹھا تھا۔ نماز کے بعد یہ سوچ کر سویا تھا کہ کچھ دیر میں اٹھ جائے گا۔ اسی دوران خواب نے اس کی نیند گہری کردی اور وہ اب اٹھ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا اور الپتگین کے حضور پہنچ گیا۔

''سبکتگین! کیا اب تمہاری محبت کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں دوپہر ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''غلام اپنی کوتاہی پر معذرت کا طلب گار ہے۔''

''خلیفہ عبدالملک کے انتقال کے بعد ہم کچھ اور بھی تنہا ہو گئے ہیں۔ بخارا سے کوئی خبر بھی نہیں آئی۔''

''جب تک نئے خلیفہ کا انتخاب نہیں ہو جاتا، آپ کی پریشانی جائز ہے۔ غیر یقینی حالات مشکلات تو سامنے لاتے ہی ہیں اور کیا خبر یہ انتخاب ہو بھی چکا ہو۔ آپ کے پاس اطلاع پہنچنے والی ہی ہو۔''

''میری اطلاع کے مطابق آلِ سامان میں خلافت کے معاملے پر اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے یہ اختلافات کسی بڑی جنگ کا پیش خیمہ نہ بن جائیں۔''

''اگر ایسا ہوا تو آپ کا غیر جانب دار رہنا ہی مناسب ہوگا۔''

''فرزندِ من! یہ ممکن نہ ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی فریق کا تو ساتھ دینا ہی ہوگا۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چوب دار نے بخارا سے آئے ہوئے قاصد کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ عام طور پر قاصدوں سے تنہائی میں ملاقات کرتا تھا تا کہ اس کا لایا ہوا پیغام دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچے لیکن قاصد بخارا سے آیا تھا اور نئے خلیفہ کی تقرری کا انتظار تھا۔ اس نے سبکتگین کو

اس کیس میں ایک سراغ رساں کی حیثیت سے عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ آپ کی ذاتی رائے اس سلسلے میں کیا ہے کہ میرا مؤکل مارشا کریگ کا قاتل ہوسکتا ہے یا نہیں؟''

''مجھے پورا یقین ہے کہ مارٹن نے مارشا کریگ کو قتل نہیں کیا اور میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔

''کیا آپ عدالت کے سامنے اس ثبوت کی نوعیت بیان کریں گے؟''

''سب سے پہلی بات یہ کہ......'' ہیری نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''مبینہ ملزم کے دونوں رخساروں پر ناخنوں کے جو لمبے لمبے نشانات موجود ہیں اور جن کے بارے میں مارٹن نے بتایا تھا کہ یہ مقتولہ کی خود کو چھڑانے کی جدوجہد کے دوران اس کا منہ نوچنے سے پیدا ہوئے تھے، وہ غیر حقیقی ہیں...... میرا مطلب ہے کہ وہ نشانات اس جدوجہد میں پیدا نہیں ہوسکتے تھے جس کا ذکر اور عملی مظاہرہ مارٹن نے کیا تھا۔ عدالت کے سامنے ملزم کے چہرے کے چند بڑے سائز کے فوٹوگراف پیش کیے گئے تھے۔ اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ مارٹن کے چہرے پر دونوں جانب وہ نشانات صرف ایک ہاتھ سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ ایک رخسار پر انگوٹھے کے ناخن کا نشان نیچے کی طرف سے اوپر کی طرف گیا ہے اور دوسری طرف اوپر کی جانب سے نیچے کو آیا ہے۔ اگر مقتولہ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ نوچتی تو دونوں طرف انگوٹھے سے پیدا ہونے والی خراش نیچے کی طرف ہوتی۔ ہم یہ فرض نہیں کرسکتے کہ مقتولہ نے جدوجہد کے دوران صرف ایک ہاتھ استعمال کیا ہوگا کیونکہ وہ جدوجہد زندگی بچانے کی آخری کوشش تھی۔ کوئی مذاق یا کھیل نہیں تھا...... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مارٹن نے وہ نشان خود ہی اپنے چہرے پر مقتولہ کے ہاتھ سے بنائے اور ظاہر ہے کہ یہ حرکت اس نے اس کی موت کے بعد کی...... پوسٹ مارٹم سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے اور مقتولہ کے درمیان کوئی جدوجہد سرے سے ہوئی ہی نہیں کیونکہ مقتولہ کے صرف دائیں ہاتھ کے ناخنوں کے نیچے سے مارٹن کے چہرے کی کھال کے باریک ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کا دوسرا ہاتھ بالکل صاف تھا۔''

''اور کچھ؟'' میرے وکیل نے اپنی آواز کا جوش دباتے ہوئے پوچھا۔

''بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔'' ہیری نے کہا۔ ''کہ میں نے بالٹی مور سے اسٹیو کلارک نامی ایک آدمی کو گرفتار کیا ہے جس نے مارشا کریگ کو قتل کرنے کا اعتراف کرلیا ہے...... یہ گرفتاری میں نے آج صبح کسی حکم کے بغیر اپنی مرضی سے کی ہے اور میں......''

ہیری کی آواز عدالت میں موجود لوگوں کے شوروغل میں دب کر رہ گئی...... اسٹیو کلارک کا پورا نام سنتے ہی میرے ذہن پر پڑے ہوئے فراموشی کے پردے اچانک اٹھتے چلے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ تین سال پہلے جب میں کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا تھا تو ڈیڈی نے اس شخص سے مجھے متعارف کرایا تھا...... اسٹیو کلارک ڈیڈی کا دوست تھا اور ان ہی کے دفتر میں ملازم تھا۔ میں نے اس وقت یہ بات نوٹ کی تھی کہ وہ ڈیڈی ہی کے برانڈ کا سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ وہ ڈیڈی کا ہم عمر تھا اس لیے میں نے اس وقت یہی سوچا تھا کہ جس زمانے میں وہ سگریٹ بڑی مقبول تھی، میرے ڈیڈی اور اس شخص نے ایک ساتھ ہی وہ سگریٹ پینا شروع کی ہوگی اور دونوں وفاشعاری کی عادت کے تحت آج تک وہی سگریٹ پی رہے ہیں...... رہا اخبار کا مسئلہ تو ''بالٹی مور اسٹار'' نامی اخبار بالٹی مور میں اتنا مقبول ہے کہ وہاں کی نوّے فیصد آبادی وہی اخبار خریدتی ہے۔''

جب شور کچھ کم ہوا تو جج نے سراغ رساں ہیری سے کہا۔ ''تم نے آج صبح جس شخص کو گرفتار کیا ہے اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔''

''یہ میرے لیے ممکن نہیں جناب والا!'' ہیری نے سادگی سے کہا۔ ''کیونکہ مجرم بالٹی مور کے ایک پولیس اسٹیشن میں بند ہے۔ البتہ میں اس کا تحریری اعتراف جرم لے آیا ہوں جو میں عدالت کے سامنے پیش کرتا ہوں۔''

ہیری نے تہ کیا ہوا ایک کاغذ نکال کر جج کو پیش کیا۔ اس نے بغور اسے پڑھا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

''میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں۔'' میرے وکیل نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''کہ اب جبکہ ثابت ہوگیا کہ میرا مؤکل بے گناہ ہے تو عدالت اسے اس مقدمے سے باعزت طور پر بری کرنے کا حکم جاری کرے۔''

جج نے میز پر ہتھوڑا بجایا۔

''مبینہ ملزم مارٹن کریگ کی بے گناہی ثابت ہوچکی ہے اس لیے یہ عدالت اسے مقتولہ مارشا کریگ کے قتل کے الزام سے باعزت طور پر بری کرتی ہے اور پولیس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ فوری طور پر مارٹن کریگ کو رہا کردے۔''

قسط نمبر: 2

وقت

محب مہر

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جو بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔



جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑے پایا۔ اس کے ساتھ ہی سر کے ... عقبی حصے سے درد کی ایک ٹیس اٹھی اور میرا ہاتھ بے اختیار سر کے متاثرہ حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

انکل سلطان کے فون پر میں ایمرجنسی میں بے سٹی پہنچا تھا کیونکہ شارو لاپتا ہو چکی تھی لیکن قبل اس کے کہ میں انکل سے مل کر حالات سے آگاہی حاصل کرتا' اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھتے ہی مجھے یہ حادثہ پیش آگیا تھا۔ کسی سفاک شخص نے میرے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا اور میں زمیں بوس ہو کر ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گیا تھا۔

میں نے سر کے متاثرہ حصے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں ایک گومڑ نمودار ہو چکا تھا اور اس ابھار میں بڑی ظالم قسم کی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ جان لیوا ٹیسوں نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں نے ہمت کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اندازہ ہو گیا کہ میں انکل سلطان کے اپارٹمنٹ کی انٹرنس کے پاس ہوں، یعنی اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے میں۔ جب ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو مجھے انکل کا خیال آیا۔ انہیں اپارٹمنٹ کے اندر ہونا چاہیے تھا مگر وہاں طاری سناٹا کوئی اور ہی وحشت ناک کہانی سنا رہا تھا۔

''انکل .....!'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے انکل کو آواز دی۔

اس کے ساتھ ہی بے ساختہ میری نگاہ اپنی رسٹ واچ پر چلی گئی۔ گھڑی رات سوا گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں ساڑھے دس بجے نیکولز اسکوائر پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں لگ بھگ پون گھنٹا بے ہوش رہا تھا۔

بے ہوشی کے تصور کے ساتھ ہی وہ ستم گر بھی ذہن میں گھوم گیا جس نے کسی آہنی شے کی ضرب سے مجھے بے ہوشی کی کیفیت میں پہنچایا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے سر کے متاثرہ حصے سے درد کی لہریں بھی اٹھنے لگیں لیکن میں اپنی تکلیف کو بھول کر انکل کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں وہ کہاں چلے گئے تھے.......!

لیونگ روم خالی پڑا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اگر وہ اپارٹمنٹ میں موجود تھے تو انہیں بیڈ روم میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے بیڈ روم کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر بہ آواز بلند انہیں پکارا۔

''انکل سلطان! آپ کہاں ہیں؟''

اس بار بھی ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر میری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس وقت میرا ذہن بہ یک وقت دو محاذوں پر مصروف تھا۔ ایک طرف مجھے انکل سلطان کی فکر تھی تو دوسری جانب شارو کے بارے میں میں بہت زیادہ پریشان تھا۔

انکل کے مطابق، شارو گروسری کی خریداری کے لیے اسٹیلے اسٹورز تک گئی تھی اور پھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی گمشدگی کی وجہ ہی سے انکل نے مجھے فون کیا تھا اور میں آن واحد میں بے سٹی پہنچ گیا تھا مگر یہاں میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آگیا تھا۔

لیونگ روم سے انکل کے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے کے دوران میں یہ تمام تر خیالات میرے ذہن سے گزرے اور میں نے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک افسوس ناک منظر نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔

انکل سلطان اپنی وہیل چیئر پر موجود تھے اور وہیل چیئر بیڈ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ انکل کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور ان کے جسم میں مجھے کسی قسم کی کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بادی النظر میں وہ گزر گئے' ایسا لگ رہا تھا۔ اس خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

میں دوڑ کر آگے بڑھا تو ایک اور انکشاف ہوا۔ انکل کے دونوں ہاتھوں اور پاؤں کو وہیل چیئر کے ساتھ اس طرح کس کر باندھا گیا تھا کہ وہ کسی بھی طور وہیل چیئر کو حرکت نہ دے سکیں۔ اگر ایسا کرنے والے کم بخت کو پتا ہوتا کہ انکل کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہے تو شاید وہ پاؤں کو جکڑنے کی زحمت نہ کرتا۔

میں نے سب سے پہلے انکل کے وائٹل سائنز کا جائزہ لیا۔ ان کی سانس چل رہی تھی مگر انتہائی مدھم۔ انہیں خاموش رکھنے کے لیے ان کے منہ میں کپڑے کا گولا بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں وہ گولا ان کے منہ سے نکالا پھر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے کسی ایسی شے کی تلاش تھی جس کی مدد سے میں انکل کو آزاد کرا پاتا۔

میں ایک تیز دھار چھری لے کر واپس بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ میں فریج سے ایک گلاس میں پانی بھی بھر لایا تھا۔ سب سے پہلے میں نے انکل کے ہاتھ پاؤں کی بندشوں کو کاٹ کر انہیں آزاد کیا پھر ان کے چہرے پر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد

انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔

''انکل......!'' میں نے اضطراری انداز میں انہیں پکارا۔ ''یہ سب کیا ہے۔ آپ کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟''

وہ پلکیں جھپک کر رہ گئے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میں نے محسوس کیا' انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ دمے کے مریض تھے اور وہ جس حالت میں مجھے ملے تھے، ایسی حالت میں تو کسی تندرست شخص کو بھی رکھا جائے تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں' انکل تو پھر ایک ضعیف اور مفلوج انسان تھے۔

اچانک میرے ذہن میں آیا کہ انہیں انہیلر دوں۔ میں میڈیسن والی کیبنٹ سے ان کا انہیلر اٹھا لایا۔ ان کی سانس اکھڑ اکھڑ کر چل رہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ان کی گردن کو اپنے بائیں بازو کی گرفت میں تھاما پھر ان کا منہ کھول کر انہیلر کے دو پف دیے۔ یہ ٹریٹ منٹ بہت ضروری تھا۔

چند لمحات میں ان کی اکھڑی اور الجھی ہوئی سانس میں بہتری نمودار ہوئی۔ میری بروقت محنت رنگ لے آئی تھی۔ میں نے انہیں دو گھونٹ پانی پلایا پھر ان کی ہتھیلیوں کو دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی سانس معمول پر آگئی۔

میں نے انہیں سہارا دے کر وہیل چیئر سے باہر نکالا! پھر بہ آہستگی بستر پر لٹا دیا۔ جب وہ آرام دہ پوزیشن میں دراز ہو گئے تو میں نے استفسار کیا۔

''انکل! یہ سب کیسے ہوا؟''

''وہ دو بدمعاش تھے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''مجھ معذور کو اپارٹمنٹ میں تنہا دیکھ کر ان کی نیت خراب ہو گئی اور مجھے بے بس کر کے وہ کافی کچھ لوٹ کر لے گئے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں انکل!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''وہ دونوں بدمعاش کون تھے اور آپ کی اجازت کے بغیر اپارٹمنٹ میں داخل کیسے ہو گئے؟ آپ نے تو مجھے شاروی کی گم شدگی کے سلسلے میں بلایا تھا؟''

''میں سمجھاتا ہوں میرے بچے!'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولے۔

اس کے بعد انکل سلطان نے مجھے جو تفصیل بتائی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ شاروی گروسری کی خریداری کے لیے لگ بھگ چھ بجے شام اپارٹمنٹ سے نکلی تھی۔ اسٹیلے

اسٹورز کے اسٹاف کے بیان کے مطابق، وہ خریداری کے بعد سات بجے اسٹورز سے رخصت ہو گئی تھی لیکن وہ جب گھر نہیں پہنچی تو انکل کو اس کی فکر ہوئی۔ پہلے انہوں نے شاروی کو کال کی لیکن اس کا فون آف جا رہا تھا۔ کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی جب وہ ٹریس نہ ہوئی تو انکل نے کم و بیش نو بجے رات مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی لہٰذا میں فی الفور ایٹلانٹس سے بے سٹی کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

انکل نے بتایا کہ آج دن میں ان کے بیڈ روم کے اے سی میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ اے سی میں سے ایک عجیب سی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے اے سی ریپئر نگ کمپنی سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے بندے کسی وقت آکر انکل کا اے سی ٹھیک کر جائیں گے۔ جب انکل نے شاروی کی گم شدگی کے حوالے سے مجھے مطلع کیا' اس کے چند منٹ بعد ہی کمپنی کے دو افراد اے سی ٹھیک کرنے ان کے اپارٹمنٹ پہنچ گئے تھے اور پھر انکل کو فلیٹ میں اکیلے دیکھ کر ان کی نیت میں کھوٹ آگیا اور انہوں نے انکل کو بے بس کر کے کام دکھا دیا۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ میرے سر کے عقبی حصے میں آہنی شے سے ضرب کس نے لگائی ہوگی اور...... جب میں وہاں پہنچا تھا تو اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے لاک کیوں نہیں تھا۔ شاید یہی وہ لمحات تھے جب وہ لٹیرے مکینک اپارٹمنٹ سے فرار ہو رہے تھے۔

انکل کے بیان میں بہت سی باتیں جواب طلب تھیں۔ اس وقت میں اپنے سر کی تکلیف کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا تاہم شاروی کے غیاب کا خیال اور اس کے حوالے سے سنگین تشویش میرے ذہن میں موجود تھی۔ شاروی کا سراغ لگانے کے لیے ان لٹیروں کے مسئلے کو حل کرنا ضروری تھا لہٰذا میں نے انکل سے پوچھا۔

''آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ پہلے میں آپ کے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

انہوں نے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں کچن میں گھس گیا پھر اپنے اور انکل کے لیے لائٹ ڈنر کا انتظام کر دیا۔ فریج میں کھانے پینے کا کافی سامان بھرا ہوا تھا لہٰذا مجھے اس بندوبست میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

خالی پیٹ میں کھانا پہنچا تو انکل کی طبیعت بحال ہو گئی۔ میں نے انہیں اپنے سوالات کی باڑ پر رکھ لیا۔

''انکل! آپ نے بتایا ہے کہ مجھے فون کرنے کے

بعد جب آپ فارغ ہوئے تو اے سی ریپئرنگ کمپنی کے دو افراد یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کا تعلق کس کمپنی سے تھا؟''

''اے ایس اے سی ایچ کمپنی۔'' انہوں نے بتایا۔

''یعنی اے ٹو سپلائی ائر کنڈیشننگ اینڈ ہیٹنگ کمپنی۔ میں ہمیشہ انہی لوگوں سے کام کرواتا ہوں۔''

میں نے ''اے ٹو سپلائی ائر کنڈیشننگ اینڈ ہیٹنگ'' نامی یہ کمپنی دیکھی ہوئی تھی۔ ان کا آفس نیکولز ایونیو پر تھا۔ اس کمپنی کا مالک مسٹر ڈیوس تھا جو اپنی ایمان داری اور بلند کردار کے لیے پورے بے سٹی میں مشہور تھا۔ یہ کمپنی بلاشبہ نہایت ہی عمدہ سروس فراہم کرتی تھی لیکن انکل کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ مجھے ہضم ہورہا تھا اور نہ ہی اس کمپنی کی ساکھ سے لگا کھاتا تھا۔

''انکل! جہاں تک میری معلومات ہیں' یہ کمپنی نائن ٹو فائیو کام کرتی ہے اور انہی اوقات میں سروس بھی دیتی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''پھر رات کو نو بجے کے بعد اس کمپنی سے دو افراد کا یہاں آنا سمجھ نہیں آرہا؟''

''مجھے خود بھی ان کی آمد پر حیرت ہوئی تھی۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولے۔ ''لیکن اس وقت میرا ذہن شارو کے لیے انتہائی فکر مند تھا۔ وہ دونوں کمپنی کی مخصوص یونیفارم میں تھے اور ان کے گلے میں آئی ڈی کارڈ بھی موجود تھے۔ لہٰذا میں ان افراد کے بارے میں زیادہ نہ سوچ سکا اور انہیں گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔''

''وہ میری آمد سے کتنی دیر پہلے اپارٹمنٹ سے نکلے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے صحیح اندازہ نہیں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ ''انہوں نے مجھے وہیل چیئر پر بے بس کردیا تھا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں بری طرح جکڑ دیے گئے تھے' صرف منہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ میں انہیں گھر میں موجود قیمتی سامان اور رقم کے بارے میں بتا سکوں۔ جب ان کا مقصد پورا ہوگیا تو انہوں نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میری بولتی بھی بند کردی اور اپارٹمنٹ سے نو دو گیارہ ہوگئے۔ منہ بند ہوجانے کی وجہ سے میری سانس رکنے لگی تھی۔ پھر دم گھٹ کی کیفیت میں مجھے اپنا کچھ ہوش نہ رہا۔ شاید میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ میں نہیں جانتا' وہ کمینے فوراً اپارٹمنٹ سے نکل گئے تھے یا یہاں کچھ دیر کے لیے رکے تھے!''

''میرے اندازے کے مطابق وہ میری آمد کے وقت ہی یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔'' میں نے اپنے سر کے عقبی حصے کو سہلاتے ہوئے تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور جاتے ہوئے وہ مجھے بھی ایک تحفہ دے گئے ہیں۔''

''کیا ہوا میرے بچے!'' انکل نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والے اذیت ناک تاثرات کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''بس ٹھیک ہی ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر انہیں اپنی آمد کے وقت پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کردیا۔

میرے سر کے عقبی حصے میں ایک گومڑ سا بن گیا تھا تاہم وہاں سے خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ ان دونوں میں سے کسی نے گن کے دستے سے میرے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر میں نے انکل سے پوچھ لیا۔

''وہ شیطان خالی ہاتھ تھے یا ان کے پاس کوئی گن وغیرہ بھی تھی؟''

''وہ دونوں گن بردار تھے۔'' انکل نے بتایا۔ ''اور ان کے ہاتھوں میں گن کی موجودگی نے مجھے بے حد ہراساں کردیا تھا۔ میں سمجھا تھا' وہ میرا اے سی ٹھیک کرنے آئے ہیں مگر وہ گن کے زور پر مجھے لوٹ کر چلے گئے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں انکل۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اے ایس اے سی ایچ ایک قابلِ اعتماد کمپنی ہے۔ میں کل پتا چلالوں گا کہ انہوں نے کن بندوں کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ جب ان کی نشان دہی ہوجائے گی تو پھر انہیں پکڑنا بھی آسان ہوجائے گا......''

لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک بوجھل سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''وہ کیا کیا لے گئے ہیں؟''

''پانچ ہزار ڈالرز کیش اور تین ہزار ڈالرز کی جیولری۔'' انکل نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''یہ جیولری میں نے ٹفنی کے لیے بنوائی تھی۔''

''سب بازیاب ہوجائے گا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ابھی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اس مسئلے کو کل صبح حل کریں گے۔''

ٹفنی' انکل کی بیٹی تھی اور امریکی نیوز چینل ''فوکس نیوز'' میں کسی اہم عہدے پر فائز تھی۔ میری آج تک ٹفنی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور مجھے اس بارے میں بھی ٹھیک ٹھیک پتا نہیں تھا کہ انکل ٹفنی سے رابطے میں تھے یا نہیں۔

''میرے بچے! اس واقعے کی رپورٹ درج کرانا بھی بہت ضروری ہے۔'' انکل نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ

ہمارا فرض بنتا ہے۔''

''فرض نہیں بنتا بلکہ فرائض بنتے ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگے۔

''آپ کے اپارٹمنٹ پر صرف ڈکیتی کی واردات ہی نہیں ہوئی انکل......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اس واردات سے کچھ دیر پہلے آپ کی گھریلو ملازمہ اور میری دوست شارو بھی اچانک غائب ہوئی ہے۔ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج ہونا لازمی ہے اور...... یہ کام اگر ابھی ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو علی!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''میں ابھی پولیس اسٹیشن فون کر کے انہیں دونوں واقعات کی اطلاع دے دیتا ہوں پھر ان کی مرضی وہ جب بھی اور جس بھی انداز میں تفتیش کریں۔''

''او کے......'' میں نے ٹیلی فون سیٹ انکل کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔ ''بے سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آپ کا ایک دوست آفیسر بھی تو ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے نہیں بلکہ ہوتا تھا۔'' وہ تصحیح کرتے ہوئے بولے۔ ''مسٹر راجر بارکر بی سی پی ڈی (بے سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ) کا چیف آفیسر تھا۔ کچھ عرصہ پہلے یعنی دو ہزار سات میں وہ ریٹائرڈ ہو گیا تھا۔ اس نے انیس سو پچھتر سے دو ہزار سات تک پورے بتیس سال پولیس ڈیپارٹمنٹ کی خدمت کی ہے۔ وہ ایک نڈر اور دبنگ پولیس آفیسر تھا۔ کچھ عرصہ اس نے ''ایف بی آئی'' کے لیے بھی کام کیا ہے۔ وہ اپنی بیوی بچی کے ساتھ کئی بار ہمارے گھر آ چکا ہے۔ اس وقت ان کے دو بیٹے بھی ہوا کرتے تھے۔ اب تو کافی عرصے سے ان لوگوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید وہ کسی دوسری اسٹیٹ میں شفٹ ہو گیا ہے۔ اینی ہاؤ......'' جملہ نامکمل چھوڑ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''بے سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا چیف آفیسر اس وقت کوئی بھی ہو ہمیں اس محکمے سے بھرپور تعاون کا یقین ہے۔''

''آپ بی سی پی ڈی فون کریں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔''

میں دراصل شارو کے لیے سخت بے چین تھا۔ اس کی پراسرار گمشدگی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اگر اس کو پیش آنے والے واقعے میں لیونارڈو کا کوئی ہاتھ تھا تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گا تاکہ پُرغرور انداز میں یہ بتا سکے کہ اس نے اپنی سابق تمام ذلت اور ہزیمت کا بدلہ چکا دیا ہے لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کے فون کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ شارو کو تلاش کرنے کے لیے مجھے اپنی عقل کو سوچ کے گھوڑے پر سوار کر کے سرپٹ دوڑانا تھا۔

میں دوسرے بیڈروم میں آیا اور اپنے سیل فون سے پاؤلا کا نمبر ملایا۔ پاؤلا کا نمبر مجھے شارو ہی نے دیا تھا۔ پاؤلا لیک جیکسن کے کسی شاپنگ مال میں سیلز گرل تھی اور سپر۔ایٹ نامی موٹل میں شارو کی روم میٹ ہوا کرتی تھی۔ لیک جیکسن شاپنگ مالز کی جنت ہے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ یہ کسی کو فون کرنے کا کوئی شریفانہ وقت نہیں تھا لیکن میں اندرونی بے قراری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ شارو کی گمشدگی نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

پاؤلا کا سیل فون سوئچ آف تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ سو چکی تھی۔ پاؤلا سے اب صبح ہی بات ہو سکتی تھی اور صبح سے میری مارننگ شفٹ بھی تھی یعنی مجھے چھ بجے اینگلٹن پہنچنا تھا۔ یہ اکسٹھ کلومیٹر کی ڈرائیو تھی جو اڑتالیس منٹ کا تقاضا کرتی تھی گویا مجھے پانچ بجے گھر سے نکلنا تھا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اٹھا اور انکل سلطان کے بیڈروم میں آ گیا۔

جب وہ پولیس کو اطلاعات فراہم کرنے کے بعد فارغ ہو چکے تو میں نے انہیں اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد انہوں نے کہا۔

''میرے بچے! میں تمہاری جاب کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ شوق پورا کرنے کے لیے اینگلٹن جانا ضروری تو نہیں۔''

''میں سمجھا نہیں انکل!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''تم لیک جیکسن میں رہتے ہو۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''تمہاری رہائش کے نزدیک ہی ''ایکسپریس مارٹ'' ہے۔ وہاں کی مینجمنٹ میں میری رسائی ہے۔ اگر تم کہو تو میں بات کروں؟''

''ایکسپریس مارٹ'' میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس اسٹور کے ساتھ گیس اسٹیشن بھی تھا یعنی پیٹرول پمپ۔ مذکورہ اسٹور ہائی وے ڈبل تھری ٹو پر واقع تھا۔ اسی ہائی وے سے لوگن بیری اسٹریٹ نکل کر ''دی گیٹ وے'' اپارٹمنٹس کی طرف آتی تھی جہاں میں رہتا تھا۔

''بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے انکل۔'' میں

نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ بعد کے مسائل ہیں۔ میں یک لخت سرکل اے والی جاب کو ختم نہیں کرسکتا لہٰذا صبح تو مجھے ہر قیمت پر جانا ہوگا۔ ویسے بھی جیک خواجہ کو میری جگہ کوئی بندہ ارینج کرنے میں دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔“

”اوکے...... جیسے تمہیں آسانی ہو۔“ وہ بات ختم کرنے والے انداز میں بولے۔

میں نے کہا۔ ”میرے پاس ایک اور آئیڈیا بھی ہے۔“

”ہاں بتاؤ......؟“ وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئے۔

”آج کل کالج میں چھٹیاں چل رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لہٰذا کالج کے قریب رہائش ناگزیر نہیں ہے۔ کیوں نہ میں کچھ عرصے کے لیے آپ کے پاس شفٹ ہوجاؤں۔ یہاں آپ کا خیال رکھنے والا فی الحال کوئی نہیں رہا۔ اس بہانے مجھے آپ کی خدمت کا موقع بھی مل جائے گا۔ بعدازاں جب آپ کی دیکھ بھال کے لیے کوئی معقول بندوبست ہوجائے گا تو پھر میں دوبارہ لیک جیکسن شفٹ ہوجاؤں گا۔“

”آئیڈیا اچھا ہے۔“ وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ ”تم جیک خواجہ سے جان چھڑاؤ۔ میں یہاں بے شی میں تمہاری جاب کا بندوبست کرتا ہوں۔ تیرھویں اسٹریٹ پرواقع ”کیون کارنز“ اسٹور پر میری بہت چلتی ہے۔“

کیون کارنز بے شی کا ایک معروف اسٹور تھا۔ اسٹور کے مالک نے کارنز کو ”سی“ کے بجائے ”کے“ سے لکھوا رکھا تھا۔ امریکا ایسی ”اختراعات“ کے لیے کافی مشہور ہے اور اسے فیشن سمجھا جاتا ہے۔ میں نے انکل کی تجویز سے اتفاق کرلیا۔ انہوں نے کہا۔

”اب تم آرام کرو۔ تمہیں نیند کی اشد ضرورت ہے۔“

میں دوسرے بیڈروم میں آگیا۔ چند روز پہلے بھی میں اس بیڈروم میں ایک رات گزار کر گیا تھا لیکن اس رات میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا اور یہ ”کوئی اور“ اس وقت لاپتا ہوچکا تھا۔ شارو کے تصور نے چند روز پہلے والی ایک نشاط انگیز رات کی یاد تازہ کردی جب ہمارے بیچ من و تو کا فرق مٹ گیا تھا۔ ہم یک جان دو قالب ہوگئے تھے۔ ایک دوسرے کے اندر کہیں کھو گئے تھے، گم ہوگئے تھے۔ ہم دونوں گم شدہ کافی دیر تک ایک دوسرے کے اندر خود کو تلاش کرتے رہے تھے۔ رات اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہی تھی اور ہم اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر ہر حد سے گزر گئے تھے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی پہنچ سے دور ہوتی ہے وہ اسے نسبتاً زیادہ شدت سے یاد کرتا ہے اور اگر مذکورہ چیز دستیاب رہنے کے بعد اچانک کہیں گم ہوجائے تو اس کی یاد کی شدت کو ناپا نہیں جاسکتا۔ یہ تصور جان لیوا اور سوہانِ روح ہوتا ہے۔ میں بھی ان لمحات میں اسی نوعیت کی جاں گسل کیفیت سے گزر رہا تھا۔ شارو کی پراسرار گمشدگی ایک اذیت ناک معما بن کررہ گئی تھی اور مجھے اس معمے کو حل کرنا تھا ...... کسی بھی قیمت پر!

اگرچہ اس وقت مجھے ایک بھرپور نیند کی اشد ضرورت تھی لیکن میرا ذہن آپوں آپ شارو کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی بازیابی کے امکانات پر غور کررہا تھا۔ جب انسانی ذہن ایسی سچویشن میں ہو تو پھر آنکھ کا لگ جانا سہل نہیں رہتا۔

مگر میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ تھا اور انسانی نفسیات کے بارے میں میری معلومات ایک عام انسان سے کافی زیادہ تھیں۔ میں انسانی دماغ کی مختلف تہوں اور ان تہوں کی لامحدود گہرائیوں کا علم رکھتا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کن حالات میں دماغ کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے۔ قدرت نے دماغ کو کھوپڑی میں اسی لیے رکھا ہے کہ یہ انسان کے جسم کا سب سے اہم حصہ ہے اور کھوپڑی سے زیادہ محفوظ مقام اس کے لیے اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہ اس مضبوط قلعے میں رہتے ہوئے پورے جسم کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچاتا ہے۔ اب یہ تکلف سوچے گا کہ کیا دماغ کی انگلیاں بھی ہوتی ہیں؟ ہاں ...... ہوتی ہیں۔ جب ہوش کے ناخن ہوسکتے ہیں تو دماغ کی انگلیاں کیوں نہیں......!

یہ ٹھیک ہے کہ دماغ کی پورے جسم پر حکمرانی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دماغ ایک مربوط سسٹم کے تحت کام کرتا ہے۔ قدرت نے اس کی حرکات وسکنات کے لیے باقاعدہ قانون اور قاعدے مرتب کر رکھے ہیں اور یہ اپنے سلیبس سے روگردانی نہیں کرتا۔ دماغ کے میموری سسٹم یعنی یادداشت کے نظام میں بعض ایسے خانے ہوتے ہیں کہ اگر ہم اپنی سوچ کے ذریعے وہاں کوئی پیغام نوٹ کروادیں تو دماغ کا آٹو سسٹم اس کے مطابق پیغام کی ترسیل کو یقینی بنادیتا ہے۔

میں نے دماغ کی اس خوبی غیر مترقبہ سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور چار پانچ مرتبہ پوری گہرائی کے ساتھ ان ہیل اینڈ ایگزہیل کرنے کے بعد دماغ کے وسط میں واقع اپنی تھیلامس ایریا

کا تصور کیا۔ اپنی ہتھیلی اس میں پائنیل گلینڈ موجود ہوتا ہے۔ اس گلینڈ یعنی غدود کو انسان کی تیسری آنکھ یا باطنی آنکھ بھی کہا جاتا ہے۔ اگر یہ آنکھ بیدار ہو جائے تو اس سے اَن گنت فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جب انسان کی ظاہرہ دونوں آنکھیں بند ہوتی ہیں تو پھر یہ تیسری باطنی آنکھ کام کرنے لگتی ہے۔ میں نے پائنیل گلینڈ یعنی باطنی آنکھ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے یہ پیغام نوٹ کروادیا۔

''میں نہایت ہی پُرسکون بیٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور صبح ٹھیک ساڑھے چار بجے میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی۔ اس مختصر سی نیند میں میری ساری ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کافور ہو جائے گی۔''

☆☆☆

ذوالفقار خواجہ عرف جیک خواجہ ایک تجربہ کار، معاملہ فہم اور دانش مند انسان تھا۔ اس نے میری کتھا کو پوری توجہ سے سنا اور میرے حالات کی نزاکت کو فوراً سمجھ لیا۔ میری بات مکمل ہونے پر اس نے کہا۔

''علی! تم اپنی جگہ درست ہو۔ بس مجھے دو دن کی مہلت دے دو، میں کسی بندے کا بندوبست کرلوں گا۔ اس کے بعد تم آزاد ہوگے۔''

''او کے باس! جیسے آپ کو سہولت ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''علی! میری ایک بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہماری تقدیر کا مالک ہے۔ اس نے جس کا جیسا نصیب لکھ دیا ہے، اسے ویسے ہی زندگی گزارنا ہے لہٰذا کسی سے گلہ شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک مالک کو ہمارا ساتھ منظور تھا، ہم نے ایک ساتھ کام کیا۔ اب اگر ہمارے راستے جدا ہونا لکھا ہوا ہے تو ہمیں اس حقیقت کو خندہ پیشانی سے تسلیم کرنا چاہیے۔ ہمیں اس بات پر فخر محسوس کرنا چاہیے کہ مالک نے ہمیں ایک ساتھ رہنے کا جتنا موقع فراہم کیا، ہم نے اس وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ ایک ساتھ بتایا ہوا ایک ایک پل ہماری زندگی کا سرمایہ ہے جو ہمارے لیے کسی یادگار سے کم نہیں ہوگا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں باس!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میں آپ کو بہت مس کروں گا اور جب بھی آپ کی یاد آئی، میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔''

''بڑی خوشی سے...... موسٹ ویلکم!'' وہ زیرِلب مسکرایا۔ ''میرے اسٹور اور گھر کے دروازے تمہیں ہمیشہ کھلے ملیں گے۔''

''تھینک یو باس۔'' میں نے کہا۔

''انسان اپنے حالات اور ضرورت یا مجبوری کے پیش نظر منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کا منصوبہ حسب توقع نتائج لائے گا یا نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں کسی زمانے میں امریکا آیا تھا۔ ان دنوں امریکا میں داخل ہونا اور یہاں بودوباش اختیار کرنا آج کی طرح کارِ دارد نہیں ہوا کرتا تھا۔ مجھے ایک ایجنٹ غیر قانونی طریقے سے امریکا لایا تھا اور وہ بھی ملکوں ملکوں گھما کر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''وہ ریکروٹنگ ایجنٹ مجھے کراچی سے ترکی کے شہر استنبول لے گیا پھر استنبول سے ہم نیدرلینڈز کے شہر ایمسٹرڈیم پہنچے تھے اور ایمسٹرڈیم سے لندن۔ ان سب مقامات پر ہم نے دو دو، چار چار دن قیام کیا تھا۔ پھر وہ اللہ کا بندہ مجھے لندن سے سیدھا کیوبا کے شہر ہوانا لے آیا۔ کیوبا سے امریکی ریاست فلوریڈا بہت نزدیک ہے۔ ہوانا اور فلوریڈا کے ساحلی شہر میامی کے بیچ بہت کم فاصلہ ہے۔ کسی موٹر بوٹ کے ذریعے یہ سمندری فاصلہ کم و بیش ایک گھنٹے میں طے کیا جاسکتا ہے۔''

''تو آپ موٹر بوٹ پر سوار ہو کر ہوانا سے میامی پہنچے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... حالانکہ میرے ایجنٹ کا پروگرام یہی تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل ایجنٹ نے جس شخص کے ذریعے مجھے میامی پہنچانا تھا، ان دنوں وہ کسی لفڑے میں جیل چلا گیا تھا۔ ایجنٹ کسی نئے بندے پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا لہٰذا وہ مجھے کیوبا سے میکسیکو لے گیا۔''

''اوہ...... آپ نے تو واقعی خوب دنیا کی سیر کر ڈالی۔'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیوبا میں آپ نے کتنے دن قیام کیا تھا؟''

''کوئی ایک ہفتہ!'' جیک خواجہ نے جواب دیا۔

''ہوانا کے سگار بہت مشہور ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس ایک ہفتے میں آپ نے خوب سگار پیے ہوں گے!''

''ہاں پیے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہوانا میں سگار کے علاوہ دو اور چیزیں بھی بین الاقوامی ''شہرت'' کی حامل ہیں۔''

خواجہ صاحب نے لفظ ''شہرت'' پر خاصا زور دیا تو

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”کون سی دو چیزیں؟“

”اسلحہ اور منشیات۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ کیوبا کی دو بڑی انڈسٹریز ہیں لیکن......“

”لیکن کیا؟“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھا تو میں نے سوال کر ڈالا۔ جواب میں وہ بتانے لگا۔

”کیوبا ایک کمیونسٹ ملک ہے اور ایجنٹ جس بندے کے ذریعے کام کرواتا تھا، وہ عیسائی تھا۔ ان دنوں کیوبا میں مذہبی لوگوں پر عتاب آیا ہوا تھا لہٰذا جولین کو ایک کیس میں ملوث کر کے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ ہم لوگ پاکستان سے آئے تھے اور یقیناً مذہبی تھے لہٰذا جولین کے جیل چلے جانے کے بعد ایجنٹ نے وہاں سے کھسک لینے میں ہی عافیت جانی اور ہم میکسیکو کے کیپٹل میکسیکو سٹی آ گئے۔ میکسیکو میں ہم نے لگ بھگ پندرہ دن قیام کیا اور وہ بھی مختلف شہروں میں۔ میکسیکو سٹی سے ہم لیون پہنچے پھر ڈیورنگو، لاس موشس، سونورا سے ہوتے ہوئے تاجوانا آ گئے۔

”تاجوانا“ میکسیکو اور امریکا کا بارڈر ہے۔ بارڈر کی دوسری جانب امریکی ریاست کیلی فورنیا کا سرحدی شہر سان ڈیاگو واقع ہے۔ ایجنٹ نے مجھے چالیس پہیوں والے مال بردار ٹرالر میں چھپا کر تاجوانا بارڈر کراس کرایا اور ہم سان ڈیاگو پہنچ گئے۔ فورٹی وہیلر ٹرالر میں چھپ کر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن خیریت گزری اور میں امریکا پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ میں نے کیلی فورنیا میں گزارا اور پھر ٹیکساس آ گیا۔ ٹیکساس کا موسم اور آب و ہوا کافی حد تک کراچی سے مماثل ہے لہٰذا یہاں میرا دل لگ گیا اور میں یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، ٹیکساس ہی میں جما بیٹھا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے تمام ضروری کاغذات بھی بن گئے اور ...... طویل عرصے تک ایک پُرامن اور قانون پسند شہری کی حیثیت سے وقت گزارنے پر میرا گرین کارڈ بھی جاری کر دیا گیا۔ اب میں یہاں کا ایک کامیاب بزنس مین ہوں اور زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر رہی ہے۔ یہ ساری باتیں تمہیں بتانے کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح امریکا میں سیٹل ہو جاؤں گا لیکن چونکہ مالک نے میرے نصیب میں یہ سب لکھ رکھا تھا لہٰذا ایسا تو ہونا ہی تھا۔ میری دعا ہے کہ تم جہاں بھی رہو مالک تمہیں خوش باش اور خوش حال رکھے!“

”آمین!“ میں نے تہِ دل سے کہا۔ ”خواجہ صاحب! میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں مگر آپ کی کہانی کا ایک پہلو میرے ذہن کو الجھا رہا ہے۔“

”کون سا پہلو؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”جیسا کہ آپ نے بتایا اس زمانے میں امریکا آنا اور یہاں سیٹل ہونا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر آپ کے ایجنٹ نے اس قدر پاپڑ کیوں بیلے؟“

”اس بدمعاش کی اپنی چند مجبوریاں تھیں۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس کی جن سرگرمیوں یا کوششوں کو تم پاپڑ بیلنے سے تعبیر کر رہے ہو، وہ سب اس کے پروگرام کا حصہ تھا اور یہ بات بہت بعد میں میرے علم میں آئی تھی۔“

”پروگرام کا حصہ!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”خواجہ صاحب! میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”میں اکیلا اس ایجنٹ کے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہ نصف درجن افراد کو لے کر چلا تھا جن میں سے بعض کا تعلق کراچی سے بعض کا پاکستان کے دوسرے شہروں سے تھا اور اتنا طویل اور کٹھن روٹ اختیار کرنے میں اس کا بھلا تھا۔ وہ ریکروٹنگ کے علاوہ ڈرگ ٹریفکنگ میں بھی ملوث تھا۔ ان دنوں کینابیز یعنی ماری جوانا کا استعمال عروج پر تھا۔ وہ ایجنٹ اسی ڈرگ کا کام کرتا تھا۔ لہٰذا نگری نگری گھومنا اور قریہ قریہ پڑاؤ ڈالنا اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی......“

”اوہ......“ میں نے ایک تشویش بھری سانس خارج کی۔ ”پھر تو آپ بڑے لکی ہیں جو عزت و آبرو کے ساتھ صحیح سلامت امریکا پہنچ گئے۔“

”مالک کا احسان ہے علی۔“ وہ تشکرانہ انداز میں بولے۔ ”بے شک! وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے اور صاف نیت کے ساتھ اس کی ذات سے ہمیشہ خیر کی امید رکھنا چاہیے۔“

”ایگریڈ......!“ میں نے پورے یقین سے کہا۔

ہمارے بیچ مزید چند منٹ تک انسان کی نیت، ارادے، عمل اور سوچ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی پھر وہ اپنے گھر چلے گئے اور میں کام میں مصروف ہو گیا۔

آئندہ دو تین روز میں جیک خواجہ نے میری جگہ دوسرے بندے کا بندوبست کر لیا لہٰذا سرکل اے گروسری پر میری آمد و شد کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اب میں اپنا سارا وقت انکل سلطان کے ساتھ گزار رہا تھا۔ شاروی کی گمشدگی اور انکل کے اپارٹمنٹ پر پیش آنے والا واقعہ گویا چوں چوں کا مربا بن کر رہ گیا تھا۔ اس واقعے سے اگلے روز ”اے ایس اے سی ایچ“ کمپنی نے ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی۔

”وقوعہ کے روز ہماری کمپنی سے کوئی بندہ مسٹر علی سلطان کا اے سی ٹھیک کرنے نہیں گیا تھا۔ یہ سروس ہم نے

وہاں سے نہیں اٹھنے دیا اور اس کی موجودگی ہی میں قاصد کو اندر بلالیا۔ قاصد کی نظر اندر آتے ہی سبکتگین پر پڑی۔ ایک غلام کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ ہچکچایا ضرور تھا لیکن اسی وقت الپتگین کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ ”کہو کیا خبر لائے ہو؟“

قاصد نے ایک مرتبہ پھر غلام کی طرف دیکھا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ غلام کو یہاں سے ہٹادیا جائے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔

”امیر معظم! بخارا میں خلافت کا تخت ابھی تک خالی ہے۔ سلطنت کے کاموں میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ دشمن طاقتیں سر اٹھانے کی تیاری کررہی ہیں۔ کسی نام پر اتفاق نہیں ہو پارہا ہے۔ یہ فیصلہ اب تک نہیں ہوسکا ہے کہ حکومت کسے سونپی جائے۔ امرائے بخارا کو آپ کی دانش وذہانت پر مکمل بھروسا ہے لہٰذا آپ سے دریافت فرمایا ہے کہ آلِ سامان میں اب کون ایسا شخص ہے جو حکومت کرنے کا اہل ہو۔“

الپتگین کچھ دنوں سے اپنے غلام سبکتگین سے مشورے کرنے کا عادی ہوگیا تھا لیکن قاصد کی موجودگی میں اسے شرم آئی کہ وہ غلام سے مشورہ کرتا یا اس کے جواب کو اپنا جواب بناتا۔ یہ تو کرسکتا تھا کہ قاصد سے کچھ دیر کی مہلت طلب کرتا اور الگ لے جاکر سبکتگین سے مشورہ کرلیتا کہ کیا جواب دیا جائے۔ ہونے والی بات تھی کہ اس نے دونوں میں سے کوئی بات بھی اختیار نہیں کی۔ قاصد پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ امرائے بخارا اس کی دانش وذہانت پر مکمل بھروسا کرتے ہیں۔ اس کے ذہن میں غرور آیا، اپنی دانش پر بھروسا کیا اور خود ہی جواب دینا مناسب سمجھا۔

”امرائے بخارا تک میرا یہ پیغام پہنچادو کہ منصور بن عبدالملک ابھی نوجوان ہے لہٰذا اس کام کے لیے اس سے زیادہ اس کا چچا موزوں ہے۔ اس کے برخلاف کیا گیا تو ممکن ہے سلطنت کے کاموں میں ابتری پھیل جائے۔“

سبکتگین کے خیال کے مطابق یہ جواب قطعی ناموزوں اور خلافِ مصلحت تھا لیکن وہ امیر کو ٹوکنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ جب قاصد رخصت ہوگیا تو اس نے جسارت کی اور وہ بھی اس لیے کہ اپنے آقا کی بھلائی پیشِ نظر تھی۔

”یہ آپ نے کیا پیغام پہنچادیا۔“

”کیا تمہاری رائے اس کے برعکس ہوتی؟“

”آپ نے غلام کو موقع ہی نہیں دیا ورنہ غلام کی رائے اس سے مختلف ہوتی۔“

”تم کیا مشورہ دیتے؟“

دو دانے...

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک چیونٹی سے پوچھا۔ ”تم سال بھر کتنی خوراک کھاتی ہو۔“

اس نے عرض کی۔ ”اے پیغمبر خدا! میں سال میں صرف دو دانے کھاتی ہوں۔“

”صرف دو دانے۔“ حضرت عیسیٰؑ نے حیرت کہا۔ پھر انہوں نے چیونٹی کو پکڑ کر ایک بوتل میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی دو دانے بھی ڈال دیے اور بوتل کو اچھی طرح بند کرکے کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔

ایک سال بعد جب انہوں نے بوتل کو کھولا تو حیران ہوئے کہ چیونٹی نے صرف دو کے بجائے ایک دانہ کھایا تھا۔ آپ کے استفسار پر چیونٹی نے عرض کی۔

”پہلے میں خدا پر یقین رکھتے ہوئے دو دانے کھایا کرتی تھی، اب چونکہ میں ایک انسان کے اختیار میں ہوں، کیا پتا سال کے بجائے دو سال بعد یہاں سے نکالے اس لیے میں نے اگلے سال کے لیے ایک دانہ رکھ لیا۔“

آپ چیونٹی کی بات سن کر بہت آزردہ ہوئے اور خدا کی بارگاہ میں دعا کی۔ ”اے میرے رب! انسان کو رزق قیامت تک تو ہی دے سکتا ہے اگر یہ ذمے داری تو نے کسی انسان کو دے دی تو لوگ بھوکے مرجائیں گے۔“

قلمی تعاون: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

انمول موتی

ایک نوجوان نے اپنے دادا سے پوچھا۔ ”دادا جان! آپ لوگ پہلے کیسے رہتے تھے؟ نہ لائٹ، نہ جہاز، نہ ٹرین، نہ انٹرنیٹ، نہ کمپیوٹر، نہ فلم، نہ ڈراما، نہ ٹی وی، نہ اے سی، نہ گاڑی، نہ موبائل، نہ فون۔“

دادا نے جواب دیا۔

”جیسے تم لوگ ابھی رہ رہے ہو۔ نہ نماز، نہ قرآن، نہ دین، نہ اسلام، نہ روزہ، نہ شفقت، نہ ادب، نہ احترام، نہ اخلاق۔ نہ شرم، نہ حیا۔“

مرسلہ: راحیلہ شفیق، نیو کراچی سندھی ہوٹل

آئندہ روز کے لیے رکھی تھی۔ پھر ہماری کمپنی نائن ٹو فائیو کام کرتی ہے۔ رات کو نو بجے کے بعد ہمارے کسی ورکر کا کسی کے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جن دو افراد نے اس رات علی سلطان کے اپارٹمنٹ میں واردات کی، ان کا ہماری کمپنی سے کوئی تعلق نہیں۔ پولیس کو اس سلسلے میں کڑی تفتیش کرنا چاہیے اور ان دو افراد کا جلد از جلد سراغ لگانا چاہیے جنہوں نے ہماری کمپنی کی یونیفارم پہن کر اور آئی ڈی کارڈ لگا کر یہ مذموم کام کیا ہے۔ کمپنی اس سلسلے میں پولیس سے بھرپور تعاون کے لیے تیار ہے۔''

اے ایس اے سی ایچ کمپنی کا موقف بہت جان دار تھا اور انہوں نے بال کو پولیس کی کورٹ میں پھینک دیا تھا۔ پولیس پوری تن دہی سے ان دو نامعلوم لٹیروں کو تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں پولیس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ ان لٹیروں کو کیسے یہ بات معلوم تھی کہ وقوعہ کے روز علی سلطان نے اپنے اے سی کے حوالے سے مذکورہ کمپنی میں کوئی شکایت درج کرا رکھی ہے؟ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ کمپنی کے اسٹاف میں سے کوئی شخص ان مجرموں کے ساتھ ملا ہوا تھا یا کم از کم ان سے کمپنی کے معاملات پر گفتگو کرتا تھا۔ پولیس اس حوالے سے کمپنی کے اسٹاف کو بھی چیک کر رہی تھی۔ یہ ساری تفتیشی کارروائیاں تو جاری تھیں لیکن ابھی تک کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

دوسری جانب شارو ابھی تک مفقود الخبر تھی۔ اس کی گمشدگی کے حوالے سے پولیس کو تفصیلاً آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن پولیس کسی ایک پوائنٹ پر فوکس نہیں کر پا رہی تھی لہٰذا یہ معاملہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ ہم نے پولیس اسٹیشن میں صرف شارو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی اور پولیس سے اپیل کی تھی کہ شارو کو جلد از جلد بازیاب کیا جائے۔ پولیس نے شارو کو تلاش کرنے کا وعدہ کرنے کے ساتھ ہی اس حوالے سے عجیب و غریب موقف اختیار کیا تھا۔ جب میری پولیس چیف سے دن ٹو دن ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''مسٹر علی! شارو کتنے عرصے سے تمہارے انکل کے اپارٹمنٹ میں کام کر رہی تھی؟''

''چند روز سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''چند روز...... '' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''مثلاً کتنے روز؟''

''لگ بھگ دس دن سے۔'' میں نے بتایا۔

''کیا تمہارے انکل نے یہ گھریلو ملازمہ کسی میڈ سروسز کمپنی کے توسط سے منگوائی تھی؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''کوئی اور ریفرنس!'' اس کی سوالیہ نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

''شارو میری بہت اچھی دوست تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں نے ہی اسے انکل کے پاس رکھوایا تھا۔''

''تو گویا تم اس کے ریفرنس ہو؟'' اس نے کہا۔ ''یعنی شارو کے ضامن؟''

''جی بالکل۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''اسی لیے میں شارو کے لیے بے حد پریشان ہوں آفیسر۔''

''مجھے تمہاری پریشانی کا بہ خوبی احساس ہے مسٹر علی!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''اور ہماری یہی کوشش ہے جلد از جلد شارو کو ڈھونڈ نکالیں لیکن اس سلسلے میں چند الجھنیں ہیں جن سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔''

''کیسی الجھنیں آفیسر؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ ہاؤس کیپرز اور میڈز وغیرہ کو یوں منہ اٹھا کر نہیں رکھ لیا جاتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کام کے لیے ہر شہر میں باقاعدہ فرمز اور کمپنیز موجود ہیں جو ہاؤس کیپرز اینڈ میڈز (گھریلو ملازمہ) فراہم کرتی ہیں۔ ان کمپنیز کے پاس ایسے افراد کا مکمل ریکارڈ ہوتا ہے تاکہ بعد از اں اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو آسانی سے میڈ کو ٹریس آؤٹ کیا جا سکے۔ اگر لٹنے پٹنے سے بچنا ہو تو محفوظ طریقہ یہی ہے۔''

''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں آفیسر!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے شارو کو کسی میڈ پرووائڈر کمپنی کے توسط سے نہیں رکھا تھا لیکن وہ میرے لیے قابلِ بھروسا تھی۔''

''ہوں......!'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم شارو کو کتنے عرصہ سے جانتے تھے؟''

''تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کسی شخص کو جاننے کے لیے یہ بہت کم عرصہ ہے۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے انکل کی ہاؤس کیپر بننے سے پہلے وہ کہاں کام کرتی تھی؟''

''وہ لیک جیکسن کے ایک نائٹ کلب میں سنگنگ کرتی تھی۔''

''اور رہتی کہاں تھی؟'' آفیسر نے پوچھا۔

''سپر۔ایٹ موٹل میں۔'' میں نے بتایا۔

"تمہاری دوستی شارو سے پیر۔ ایٹ موٹل میں ہوئی تھی یا نائٹ کلب میں؟"

"نائٹ کلب میں۔"

"نائٹ کلب کا نام؟" اس نے سوال کیا۔

"وتی لاؤنج۔" میں نے جواب دیا۔ "پلاسٹیشن ڈرائیو، لیک جیکسن۔"

"بہت خوب۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "ایک، ڈیڑھ ماہ پہلے تمہاری اس سے ملاقات ہوئی اور تم نے اس کی گلوکاری چھڑا کر اسے اپنے انکل کی ہاؤس کیپر بنا دیا اور تم اس لڑکی کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے...... ہوں؟"

"آفیسر!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ کسی شخص کو جاننے کے لیے ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بہت کم ہوتا ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اگر انسان کے پاس بصیرت ہو تو کسی شخص کو سمجھنے کے لیے ایک ڈیڑھ منٹ بھی کافی ہوتا ہے۔ یہ میرا بیان کردہ فلسفہ نہیں بلکہ جدید قسم کے تمام ماہرین نفسیات اس پر متفق ہیں۔"

"تم کرتے کیا ہو؟" اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اسٹوڈنٹ ہوں سر۔"

"کہاں......اور کیا پڑھ رہے ہو؟"

"برازو سپورٹ کالج، لیک جیکسن۔" میں نے جواب دیا۔ "میں وہاں سائیکالوجی پڑھ رہا ہوں۔"

"گڈ!" اس نے ستائشی انداز میں کہا۔ "برازو سپورٹ کالج کا اپنا ایک مقام ہے۔"

"آفیسر! مجھے شارو کے کردار پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ ہمیں کسی قسم کا دھوکا نہیں دے کر گئی اور نہ ہی اس نے ہمارا نقصان کیا ہے۔ ہم اس کی پراسرار گمشدگی کے لیے سخت پریشان ہیں۔ امید ہے آپ شارو کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔" میں نے درخواست بھرے انداز میں کہا۔

"ضرور، ہماری کوشش یہی ہے کہ شارو کو فوراً ٹریس آؤٹ کرلیں۔ یہ معاملہ اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ذہن کئی زاویوں پر کام کر رہا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں آفیسر!" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

"مسٹر علی! تمہیں شارو پر مکمل بھروسا ہے۔ ہم تمہارے بھروسے کو چیلنج نہیں کرتے لیکن پولیس اپنے انداز میں سوچتی ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر شارو کی گمشدگی کے ساتھ دو لٹیروں والا واقعہ نتھی نہ ہوتا تو میں ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور نہ ہوتا۔"

"کون سا خاص انداز آفیسر؟" اس کی باتیں میری تشویش کو بڑھا رہی تھیں۔

"میں نے کہا نا، پولیس اپنے انداز میں سوچتی ہے اور ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے مسٹر علی!" وہ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس بات میں شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ اگر گھر کا اے سی خراب تھا یا اس میں سے کسی قسم کی آواز پیدا ہو رہی تھی تو یہ خرابی شارو سے چھپی نہیں رہی ہو۔ وہ کل وقتی گھریلو ملازمہ تھی۔ گھر کے تمام اندرونی معاملات کی اسے بہ خوبی خبر رہتی ہوگی۔ وہ یہ بات بھی جانتی ہوگی کہ علی سلطان نے "اے ایس اے سی ایچ" کمپنی سے کسی مکینک کو اے سی ٹھیک کرنے کے لیے بلایا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟"

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "آپ بالکل درست فرما رہے ہیں آفیسر لیکن میں سمجھا نہیں کہ ان باتوں کا موجودہ معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق نکالا جاسکتا ہے مسٹر علی!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "اور ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ تم توجہ سے سنو گے اور منطقی انداز میں سوچو گے تو مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوجاؤ گے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"آپ بولتے جائیں۔"

"ایک لمحے کے لیے فرض کرلو کہ شارو مجرمانہ ذہن کی مالک ہے اور وہ چند افراد کے ساتھ مل کر اسی نوعیت کی گھریلو وارداتیں کرتی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس نے کسی خاص مقصد کے تحت تم سے دوستی کی اور ایک ڈیڑھ ماہ ہی میں اس نے تمہارا اتنا اعتماد حاصل کرلیا کہ وہ علی سلطان کے گھر میں پہنچ گئی۔ یہ اس کے الفاظ کا جادو ہے یا اس کے انداز کی مہارت کہ تم چچا بھتیجا اس لڑکی پر اندھا بھروسا کرنے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ شکار پوری طرح گرفت میں آچکا ہے تو اس نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ اس کے ساتھی اے سی مکینکس کے روپ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور سب کچھ لوٹ لاٹ کر چلتے بنے۔ وہ خود اس آپریشن سے پہلے گروسری لانے کے بہانے اپارٹمنٹ سے نکل گئی تھی۔"

"آپ کی کہانی کافی انٹرسٹنگ ہے آفیسر۔" میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"صرف انٹرسٹنگ یا لوجیکل بھی؟"

"یس...... لوجیکل بھی۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "جو آپ نے بیان کیا وہ ناممکن نہیں لیکن اس کیس میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شارو کی گم شدگی اور اپارٹمنٹ پر ہونے والی ڈکیتی کی واردات دو الگ واقعات ہیں اور...... میں کسی بھی قیمت پر، کسی بھی حال میں شارو کی نیت پر شک نہیں کر سکتا۔"

"او کے مسٹر علی!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "ہم شارو کو تلاش کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی، ہمیں ان دو لٹیروں کی بھی تلاش ہے جنہوں نے مکینکس کے بھیس میں تمہارے انکل کے گھر کا صفایا کیا ہے۔ ان تین افراد میں سے جیسے ہی کوئی ہمارے ہتھے چڑھے گا تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

میں نے آفیسر کا شکریہ ادا کیا اور پولیس اسٹیشن سے نکل آیا۔ آفیسر کی تھیوری منطقی لحاظ سے اپنی جگہ درست تھی مگر میرا دل و دماغ شارو کو فریبی اور بدنیت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھی...... کبھی نہیں!

بے سٹی، میٹا گورڈا کاؤنٹی میں واقع تھی۔ میٹا گورڈا کا میئر مارک برکر ذاتی طور پر اس معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ امید کی جا سکتی تھی کہ بہت جلد شارو کو بازیاب کر لیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے...... امید پر دنیا قائم ہے۔ میں بھی امید کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

پُرامید ہونا بہت اچھی اور مثبت بات ہے لیکن صرف پُرامید ہو کر بیٹھ جانا مناسب نہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو مسلسل حرکت میں رکھنا بہت ضروری ہے اور...... میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا کیونکہ میں ایک عملی انسان ہوں۔

شارو کی گم شدگی کے اگلے روز میں پاؤلا سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پاؤلا جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ کسی شاپنگ مال میں سیلز گرل تھی۔ میں نے جب پاؤلا کو شارو کے لاپتا ہونے کے بارے میں بتایا تو اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ چند روز پہلے تک شارو، پاؤلا کی روم میٹ ہوا کرتی تھی لیکن پاؤلا کے مطابق، شارو جب سے سپر ایٹ موٹل سے گئی تھی، اس نے دوبارہ شارو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ گویا وہ شارو کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ شارو کی تلاش کے سلسلے میں مختلف انداز میں کوششیں جاری تھیں لیکن میرا ذہن گھوم پھر کر لیونارڈو کی طرف چلا جاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شارو کی گم شدگی میں اسی کمینے کا ہاتھ ہو لیکن اس کی مکمل اور مسلسل خاموشی میرے اضطراب کو ہوا دے رہی تھی اور جی چاہتا تھا کہ میں پہلی فرصت میں جا کر اس کی گردن دبوچ لوں اور...... اس کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دوں۔

لیونارڈو تک رسائی کے لیے میرا گھر سے نکلنا ضروری تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ انکل کو اعتماد میں لے کر میں لیک جیکسن روانہ ہو جاتا ہوں۔ ایک روز میں نے ان سے پوچھا۔

"انکل! پولیس بے سٹی میں اپنا کام کر رہی ہے لیکن میں خاموش نہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر؟" انہوں نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے میرے بچے!"

"میں چند دن کے لیے لیک جیکسن جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "وہاں رہ کر میں اپنے طور پر بھی شارو کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا تمہیں "بی سی پی ڈی" کی کارکردگی پر بھروسا نہیں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ایسی بات نہیں ہے انکل!" میں نے جلدی سے کہا۔ "بے سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ اپنے طور پر تفتیشی کارروائی کو آگے بڑھا رہا ہے لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا۔ شارو میری بہت اچھی دوست ہے اور یہ دوستی مجھ سے تقاضا کرتی ہے کہ میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں۔"

"او کے...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" انہوں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "تم ضرور اپنی دوست کو تلاش کرو لیکن اس سلسلے میں میری ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا میرے بچے۔"

میں نے فرماں برداری سے کہا۔ "جی ضرور...... آپ حکم کریں، میں سن رہا ہوں۔"

"کسی بھی مرحلے پر کبھی قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ "لڑائی جھگڑے اور دنگا فساد سے دور رہنے کی کوشش کرنا اور اگر کبھی ایسی کسی سچویشن سے سامنا ہو جائے تو فوراً قانون کی مدد لینا اور قانون کے رکھوالوں سے بھرپور تعاون کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں انکل۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"تم کب لیک جیکسن جانا چاہتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"کل صبح۔" میں نے جواب دیا۔ "کیونکہ آج مجھے

آپ کے لیے ایک میڈ کا انتظام کرنا ہے۔ میں آپ کو بے یارومددگار چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔"

"میڈ کا بندوبست کہاں سے کروگے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ایک قابلِ بھروسا ذریعے سے۔" میں نے ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تاکہ میری غیر موجودگی میں آپ کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے میں خود بھی گاہے بگاہے بے سٹی کا چکر لگاتا رہوں گا۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولے۔ "تمہارے سارے دوست بھی ادھر لیک جیکسن ہی میں ہیں۔ چند دن وہاں رہو گے تو تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور ہاں......" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جاب کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔ یہاں بے سٹی میں یا وہاں لیک جیکسن میں؟"

"فی الحال کہیں بھی نہیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "جب تک شارد کا سراغ نہیں مل جاتا' میں خود کو کسی نئی مصروفیت میں نہیں ڈالوں گا۔ میرا ایک ایک لمحہ اسے ڈھونڈنے میں صرف ہوگا۔"

میرے پُرعزم انداز کو دیکھتے ہوئے انہوں نے صرف اتنا کہا۔ "بیسٹ آف لک میرے بچے!"

میں نے "موبی۔ میڈ سروسز" کے نمبر ڈائل کیے اور دوسری جانب کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

"موبی۔ میڈ سروسز" امریکا کا ایک قابلِ اعتماد ادارہ تھا جو لوگوں کو ہاؤس کیپرز اور میڈز وغیرہ فراہم کرتا تھا۔ یہ لوگ پوری چھان پھٹک کے بعد ہی کسی میڈ کو اپنے پاس رجسٹر کرتے تھے اور بعد ازاں اس کے حوالے سے ہر قسم کی ذمے داری بھی قبول کرتے تھے۔

"ہیلو......!" دوسری جانب فون اٹینڈ کرلیا گیا۔

"میرا نام اسد علی ہے۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "میں نیکولز اسکوائر اپارٹمنٹس سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے انکل کے لیے ایک میڈ کی ضرورت ہے۔"

دوسری طرف بولنے والی خاتون نے پوچھا۔ "مسٹر علی! آپ کے انکل کو پارٹ ٹائم میڈ چاہیے یا فل ٹائم؟"

"فل ٹائم۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بیمار ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے علاوہ اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی اور کوکنگ وغیرہ بھی کرنا ہوگی۔"

"مطلب...... پورے گھر کو سنبھالنا ہوگا؟"

"جی بالکل۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"گھر میں آپ کے انکل کے علاوہ اور کتنے افراد ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"صرف انکل ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے بدن کا زیریں حصہ مفلوج ہے اور وہ وہیل چیئر پر ہیں۔ روزانہ کوکنگ ضروری نہیں ہے۔ بیچ میں کبھی باہر سے ریڈی میڈ کھانا بھی لایا جاسکتا ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "ہمارے پاس اس وقت ایک ایسی سمجھ دار اور تجربہ کار ہاؤس کیپر ہے جو آپ کے انکل کے تمام معاملات کو بہ خوبی ہینڈل کرلے گی لیکن......"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"یہ میڈ تھوڑی کاسٹلی ہے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "اگر آپ افورڈ کرسکتے ہیں تو میں ابھی اسے آپ کے اپارٹمنٹ بھیج دیتی ہوں۔"

"مثلاً...... کتنی کاسٹلی ہے وہ؟" میں نے استفسار کیا۔

"ایملی ماہانہ دو ہزار ڈالرز لے گی۔" اس نے بتایا۔ "یہ اس کی تنخواہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ لوگ اس کے ساتھ جو بھی حسنِ سلوک کرو، وہ آپ کا ظرف ہے۔"

"ایک منٹ......" میں نے دوسری جانب بولنے والی موبی۔ میڈ سروسز کی نمائندہ خاتون سے کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کے بعد انکل سے پوچھا۔

"ایک فل ٹائم بہت سلیقہ شعار اور تجربہ کار ہاؤس کیپر دو ہزار ڈالرز ماہانہ میں مل رہی ہے۔ کیا بولوں؟"

"ڈن کردو میرے بچے!" وہ فراخ دلی سے بولے۔

"او کے...... ہم افورڈ کرلیں گے۔" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "بس ایک بات کا خیال رہے کہ میڈ قابلِ بھروسا ہونا چاہیے۔"

"آپ فکر نہ کریں مسٹر علی!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "اپنے اپارٹمنٹ کا ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کروادیں۔ ایملی دو گھنٹے کے اندر آپ کے پاس پہنچ جائے گی اور جہاں تک اس کے قابلِ بھروسا ہونے کا تعلق ہے تو...... موبی۔ میڈ سروسز نام ہے اعتماد کا۔"

"فون نمبر تو یہی ہے جس سے میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور ایڈریس آپ نوٹ کرلیں۔"

پھر میں نے اسے انکل سلطان کے بیمن روڈ پر واقع

نیکولز اسکوائر والے اپارٹمنٹ کا مکمل ایڈریس نوٹ کروادیا۔ میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔

☆☆☆

لیک جیکسن میں کافی دنوں کے بعد آیا تھا مگر یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ یہاں کی زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں دواں تھی مگر مجھے آج یہاں ایک خاص قسم کی کمی محسوس ہورہی تھی اور وہ کمی تھی شارو کی۔ لیک جیکسن میں شاپنگ مالز اور ریسٹورنٹس کی بھرمار ہے اور یہاں کی زندگی بے ستی اور ایگلٹن کی بہ نسبت کافی تیز اور چکا چوند والی ہے۔ ہر طرف بہار ہی بہار دکھائی دیتی ہے اور فطرت کے یہ رنگین اور دل فریب نظارے انسانی ذہن کو مسحور کرکے رکھ دیتے ہیں لیکن یہ سب شاد و آباد دلوں کے چونچلے ہیں۔ اگر انسان کے اندر کا موسم ٹھیک نہ ہو تو اسے باہر کی ہر شے پھیکی اور بے مزہ محسوس ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ داخلی معاملات سے متاثر ہوتا ہے اور خارجی معاملات کو متاثر کرتا ہے۔ اندر اور باہر کے معاملات میں توازن ہی نارمل زندگی ہے۔

میرے اندر کا موسم بھی بگڑ چکا تھا۔ شارو میری زندگی میں بہار کے ایک خوش گوار جھونکے کے مانند تھی اور اس کے جانے سے میرے احساسات پر خزاں نے قبضہ جمالیا تھا لہٰذا میں خود کو بجھا بجھا سا، ٹوٹا ٹوٹا سا اور بکھرا بکھرا سا محسوس کررہا تھا۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ ان مقامات کی یاترا میں گزارا جہاں اکثر میں شارو کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ یہ میری لاشعوری حرکت تھی۔ میری متلاشی نگاہ ہر جگہ شارو کو تلاش کرنے میں مصروف تھی اور وہ تھی کہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے آسمان نگل گیا یا زمین کھاگئی......!

پورے دن کی لیک جیکسن نوردی کے بعد میں رات میں ونی لاؤنج چلا آیا۔ اس نائٹ کلب میں شارو سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی جو بڑی تیزی سے ایک مضبوط دوستی میں بدل گئی تھی۔ ریاضی کا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی سوال کہیں بیچ میں کسی مقام پر اٹک جائے تو وہاں رک کر دماغ کھپانے کے بجائے سوال کی ابتدا پر پہنچ جانا چاہیے اور مرحلہ وار ایک ایک اسٹیپ آگے بڑھنا چاہیے۔ اس طرح اٹکن کے مقام پر سوال خود بہ خود رواں ہوجاتا ہے یعنی رکاوٹ دور ہوجاتی ہے اور سامنے منزل بہت واضح دکھائی دینے لگتی ہے۔

میرے بوجھل اور متلاشی قدم شاید مجھے ونی لاؤنج اسی لیے لے آئے تھے کہ مجھے امید تھی کہ شارو کا کوئی سراغ اسی نائٹ کلب سے ملے گا۔

کلب کی رونق عروج پر تھی۔ ہال کی تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ شارو کی جگہ متبادل سنگر کا بندوبست کرلیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک جاذب نظر خوش گلو سنگر تھی مگر اس کی آواز میں شارو والی گہرائی اور گیرائی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے، یہ میری جانب دارانہ رائے ہو...... میں نے جیسا محسوس کیا... بعینہٖ ویسا بیان کردیا۔ انسان کی یہ مجبوری ہے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو ایک طرف رکھ کر نہیں سوچ سکتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرنے پر قادر ہے تو بے حد معذرت کے ساتھ، میری نظر میں وہ گوشت پوست کا کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ پروگرام کی ہوئی کوئی مشین ہے...... کوئی روبوٹ ہے......!

میں ایک میز پر جا کر بیٹھا اور ڈنر کا آرڈر دے چکا... تو کلب کا منیجر میرے پاس چلا آیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ گردن جھکا کر کہا۔

''گڈ ایوننگ سر!''

میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''گڈ ایوننگ مسٹر بنجامن۔''

''سر! آپ کافی دنوں سے ہمارے لاؤنج میں نہیں آئے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''ادھر شارو نے جاب چھوڑی ادھر آپ بھی غائب ہوگئے۔ ہم سے سروس میں اگر کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں مسٹر بنجامن۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں۔ میں کچھ دنوں کے لیے لیک جیکسن سے باہر چلا گیا تھا اس لیے ادھر آنا نہیں ہوا۔''

اس نے میری غیر حاضری کو شارو کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے جواب میں ایسا کوئی تاثر نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا کہ میں شارو کے بہت زیادہ قریب ہوں اور اس نے میرے کہنے پر ونی لاؤنج کی جاب کو خیرباد کہا تھا اور...... یہ کہ شارو کئی دنوں سے مفقود الخبر ہوچکی ہے۔

''تھینک یو سر!'' وہ احسان مندانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ جیسے لوگ تو ہمارے کلب کی زینت ہیں۔ یہاں تشریف لاتے رہا کریں۔''

''شیور۔'' میں نے یقینی لہجے میں کہا۔ ''مسٹر بنجامن......'' میں بولتے بولتے رک گیا۔

''یس سر...... حکم کریں۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''کیا وہ بدمعاش اب بھی ادھر آتا ہے؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

بنجامن خاصا سمجھ دار اور معاملہ فہم انسان تھا۔ وہ فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ اس کمینے لیونارڈو کا پوچھ رہے ہیں نا؟''

''لیونارڈو'' کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر بدمزگی ابھر آئی تھی۔ یہ بنجامن کی لیونارڈو کے لیے ناپسندیدگی کا اثر تھا۔ جس روز شارو کے معاملے پر میرا لیونارڈو کے ساتھ اس لاؤنج میں پہلا جھگڑا ہوا تھا اس رات مجھ سے الجھنے سے پہلے لیونارڈو نے بنجامن کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا تھا لہٰذا! بنجامن کسی بھی قیمت پر لیونارڈو سے محبت تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''بالکل! میں اسی کا پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ کافی دنوں سے ادھر دکھائی نہیں دیا۔'' بنجامن نے بتایا۔ ''خدا اسے غارت کرے۔ اس قسم کے گندے انڈے معاشرے کا سکون غارت کرتے ہیں۔''

میں بنجامن کے الفاظ پر چونک اٹھا تھا تاہم اپنی اندرونی کیفیت کو میں نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں استفسار کیا۔ ''مسٹر بنجامن! کیا آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں، لیونارڈو کو آپ نے کب سے نہیں دیکھا؟''

''وھائے ناٹ!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ پھر ایک تاریخ بتانے کے بعد کہا۔ ''اس دن کے بعد سے وہ مجھے نظر نہیں آیا۔''

میری تشویش میں قدرے اضافہ ہوگیا۔ بنجامن نے جو تاریخ بتائی تھی اس کے اگلے روز ہی شارو منظر سے غائب ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں، گھوم پھر کر میرا دماغ اسی پوائنٹ پر آجاتا تھا کہ شارو کی گم شدگی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ لیونارڈو کا ہاتھ ہے۔

''سر! کوئی خاص بات ہے؟'' بنجامن کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ ''کیا اس تاریخ اور لیونارڈو میں کوئی کنکشن ہے؟''

اس نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والی فکر کی لکیروں سے اندازہ لگالیا تھا کہ میں کسی الجھن میں ہوں۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونہی پوچھ لیا۔'' ''او کے سر! وہ جانے کے لیے مڑا۔'' انجوائے یور ڈنر۔''

''تھینکس مسٹر بنجامن۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت میں نے ایک شخص کو ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کی صورت مجھے شناسا سی لگی تھی لیکن فوری طور پر مجھے یہ یاد نہ آسکا کہ وہ کون تھا اور میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

بنجامن کی تیز نگاہ بھی اس شخص پر پڑ چکی تھی اور وہ... کم بخت بھی مجھے ہال میں بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی اسے جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ایسے بدکا جیسے کسی خوف ناک بھوت سے اس کا سامنا ہوگیا ہو۔ اس نے سیکنڈ کے دس ویں حصے میں کلب سے فرار کا فیصلہ کیا اور یوٹرن لے کر تیز قدموں سے واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

اس شخص کی یہ نامعقول حرکت مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ واضح طور پر وہ مجھ سے خوف زدہ ہوکر بھاگا تھا مگر کیوں...... اسے میری ذات سے کس قسم کا ڈر تھا؟

اس دوران میں بنجامن میری جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''مسٹر بنجامن! آپ نے اس بندے کو دیکھا؟''

''یس سر...... وہ آپ کو دیکھ کر بھاگا ہے۔'' اس نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے اصراری لہجے میں پوچھا۔ ''میرا اس سے کیا تعلق؟''

''تعلق کا تو مجھے پتا نہیں سر!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نے یہی محسوس کیا ہے' وہ آپ سے خوف زدہ ہوکر رفوچکر ہوا ہے۔''

''کیا آپ اس بندے کو جانتے ہیں؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''کون ہے یہ؟''

''اس کا نام پیلو ہے۔'' بنجامن نے بتایا۔ ''یہ لیونارڈو کے ٹولے میں شامل ہے۔ جس رات آپ نے لیونارڈو کی یہاں دھلائی کی تھی، یہ پیلو اس کے ساتھیوں میں شامل تھا۔''

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یاد آگیا کہ پیلو کا چہرہ مجھے دیکھا بھالا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ پیلو مجھے وہی لاؤنج میں دیکھ کر اگر خوف زدہ ہوا تھا تو اس کا ایک ہی

مطلب تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسا راز تھا جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتا تھا اور عین ممکن تھا اس راز کا تعلق شارو سے ہو۔ میں شارو کا دوست اور شارو کی حمایت میں ان سے بھڑ چکا تھا۔ پیلو میرے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے پہلی فرصت میں وہاں سے ریس لگا دی تھی۔

میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کرلیا کہ مجھے ہر قیمت پر پیلو کا تعاقب کرنا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے قدم باہر کی جانب اٹھ گئے۔

مجھے اپنے عقب میں بنجامن کی آواز سنائی۔ ''سر! آپ کا ڈنر......؟''

''ڈنر بھی ہوگا۔'' میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر تیز آواز میں کہا۔ ''بشرطیکہ میں واپس آنے کی پوزیشن میں ہوا......''

میں وی لاؤنج سے باہر نکلا اور چاروں جانب عقابی نگاہ دوڑائی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اس کے آثار مل گئے۔ وہ اسٹریٹ میں ایک جانب کھسک رہا تھا اور بار بار مڑ کر عقب میں بھی دیکھ رہا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ میں اس کا تعاقب کروں گا۔

اس کا یہ خدشہ صد فی صد درست تھا کیونکہ میں پوری شدومد کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکل چکا تھا۔ پیلو کو اپنے تعاقب کا احساس ہو چکا تھا۔ شاید اس نے مجھے اپنے عقب میں لپکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اچانک ایک جانب دوڑ لگا دی۔ لامحالہ مجھے بھی اپنی رفتار میں اضافہ کرنا پڑا۔

پیلو نے بلیو ڈینم پر گہری نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے چہرے پر ڈاڑھی بھی تھی لہٰذا اس پر نگاہ رکھنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ''وی لاؤنج'' ٹریل ون پلانٹیشن ڈرائیو پر تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے روڈ کے اوپر آگئے تھے تاہم ہم دونوں اس روڈ کے دو کناروں پر دوڑ رہے تھے۔

اسی لمحے پلانٹیشن ڈرائیو کی ایک جانب سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ مذکورہ کار کا رخ پیلو کی جانب تھا یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔

''رک جاؤ پیلو، ورنہ مارے جاؤ گے۔''

وہ نہیں رکا جیسے اسے زندگی کی پروا نہ ہو۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یونہی محسوس ہوا کہ وہ کار پیلو کو کچل ڈالے گی۔ مجھے پیلو کی یقینی موت دکھائی دے رہی تھی۔ میں پیلو سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اسے دھکا دے کر کار کی زد میں آنے سے بچا نہیں سکتا تھا۔

بے بسی کے احساس نے بے اختیار مجھے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے ایک فلک شگاف آواز سنی۔

یہ آواز اس کار کے ٹائروں کی تھی، جو اب تب میں پیلو پر چڑھائی کرنے والی تھی۔ میں نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں۔ کار کے ڈرائیور نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فی الفور بریک لگا دیے تھے۔ ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ نے رات کا سکون برباد کر دیا تھا۔ پیلو اگرچہ کار کے نیچے کچلے جانے سے محفوظ رہا تھا تاہم اس کا جسم کار کے بونٹ سے ٹکرایا تھا۔

یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ پیلو اپنا توازن قائم نہیں رکھ پایا تھا اور بونٹ سے زبردست ٹکر کھانے کے بعد زمین بوس ہو گیا تھا۔ کار کے اندر سے دو افراد باہر نکلے اور روڈ پر پڑے ہوئے پیلو کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ میں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور پیلو کی گردن ناپنے کے لیے آگے بڑھ آیا لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

پیلو خاصا سخت جان اور پھرتیلا واقع ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ میں اس کے سر پر پہنچتا یا کار سے برآمد ہونے والے دو افراد اس کی مزاج پرسی کرتے' وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں بھی دوڑتے ہوئے اس کا تعاقب جاری رکھوں۔

کار والے ہکا بکا ہمیں دیکھتے چلے گئے۔ وہ توقع کر رہے ہوں گے کہ ان کی کار سے ٹکرانے والا شدید زخمی ہو گیا ہو گا اور ممکن ہے اسے ضروری طبی امداد کے لیے کسی اسپتال لے جانا پڑے لیکن پیلو نے جس مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ کار والوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی باعثِ حیرت تھا۔ پیلو جتنی شدومد سے خود کو مجھ سے دور لے جانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں میری ذات کے حوالے سے کوئی ایسا راز چھپا ہوا ہے جو وہ میرے سامنے اگلنے سے گریزاں ہے اور...... یہی سوچ مجھے اس کا تعاقب کرنے کے لیے مہمیز کر رہی تھی۔

ہم روڈ کی ایک ہی سائڈ پر آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارے بیچ فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ ایک ذیلی گلی میں مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا تو وہ مجھے ایک بائیک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ پتا نہیں یہ کس کی بائیک تھی جو گلی میں ایک طرف کھڑی

تھی۔ پیلو اس بائیک پر سوار ہو کر میری پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔

وہ جیسے ہی بائیک کو سنبھال کر آگے بڑھا، میں نے خود کو ہوا میں بلند کیا اور دونوں پاؤں کی ایک ڈبل کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔ میں چونکہ تیز رفتاری سے بھاگتا آ رہا تھا لہٰذا اس عمل میں مجھے زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی۔

میری ڈبل کک نے اسے بائیک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہم دونوں فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بائیک پیلو کے نیچے سے نکل کر ایک جانب پھسلتی چلی گئی۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم دونوں بھی پختہ گلی میں گرے تھے۔

میں بجلی کی سرعت سے اٹھ کر کھڑا ہوا پھر وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''پیلو! تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ میں جہنم تک تمہارا پیچھا کروں گا۔''

''تم میرے تعاقب میں کیوں لگے ہو؟'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم کیا...... تمہارا پرائیویٹ باپ لیونارڈو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں کہا۔ ''البتہ تم لوگوں نے مجھ سے ایک بہت قیمتی شے چھین لی ہے۔''

''کون سی شے؟'' وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

''میری دوست...... شارو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شارو کے نام پر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''شارو کو تم لوگوں نے کہاں چھپایا ہے؟''

''میں تمہاری دوست کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تمہارا وہ غیر قانونی باپ لیونارڈو تو ضرور جانتا ہوگا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''چلو یہی بتا دو کہ لیونارڈو آج کل کہاں غائب ہے؟ وہ کافی دنوں سے لیک جیکسن میں دکھائی نہیں دے رہا......!''

وہ مجھ سے بات کرنے کے دوران میں بڑی چالاکی سے ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے اپنے کسی ساتھی کا انتظار ہو لیکن اگلے ہی لمحے میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ پیلو اپنے کسی ساتھی کا انتظار نہیں کر رہا تھا بلکہ بڑی چالاکی سے راہِ فرار تلاش کر رہا تھا۔

مجھے باتوں میں لگا دیکھ کر اچانک اس نے پچھلے پاؤں دوڑ لگا دی اور ہم جدھر سے آئے تھے وہ ادھر ہی دوڑ پڑا۔ بادلِ ناخواستہ میں بھی اس کے تعاقب میں لپکا۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے اپنی نگاہ سے اوجھل ہونے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ پیلو ڈور کا ایک سرا تھا اور اس ڈور کے دوسرے سرے پر شارو بندھی ہوئی تھی۔ اگر پیلو میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر میں آسانی سے شارو تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے واپس پلانٹیشن ڈرائیو پر نکل آئے۔ یہ ونی لاؤنج کی مخالف سمت تھی یعنی ہم پلانٹیشن ڈرائیو کے بڑھتے ہوئے نمبرز کی طرف تھے۔ اگر ہم اسی سمت بھاگتے چلے جاتے تو ونی لاؤنج پہنچ جاتے۔

پیلو نے یہاں بھی عیاری سے کام لیا اور ونی لاؤنج سے تھوڑا پہلے ڈبل ون فائیو پلانٹیشن ڈرائیو پر واقع ''چرچ چکن'' نامی ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ میں بھلا کب پیچھے رہنے والا تھا۔

جب میں ہوٹل کے اندر پہنچا تو میں نے پیلو کو کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچن کے اندر غائب ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ کچن کے دروازے پر رک کر کچھ سوچا پھر بہ آہستگی دروازہ کھول کر میں بھی کچن میں داخل ہو گیا۔

اندر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کچن میں تین باوردی باورچی اپنے کام میں مصروف تھے۔ کشادہ کچن کی ایک دیوار کے ساتھ چولہے اور اوون ایک سیدھ میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد نصف درجن سے زیادہ تھی۔ دوسری دیوار پر مختلف مسالاجات کے ڈبوں والے ریک بنے ہوئے تھے۔ تیسری دیوار میں ایک طرف ڈش واشنگ کے لیے ایک کنگ سائز سنک لگا ہوا تھا اس کے اوپر پلیٹوں والے ریک تھے اور دوسری جانب بڑے بڑے دو فریج اور ڈیپ فریزر رکھے ہوئے تھے۔ چوتھی دیوار وہی تھی جس میں دروازہ تھا۔ میں اسی دروازے سے کچن کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس دیوار کی اندرونی جانب ایک لائن سے کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں جن پر مختلف نوعیت کے ایپرن اور صافی ٹائپ کپڑے لٹکے نظر آ رہے تھے۔ یہ ساری چیزیں کوکنگ سے متعلق تھیں۔

کچن کے عین وسط میں ڈائننگ ٹیبل کی طرح کی ایک طویل میز لگی ہوئی تھی جس کے اوپر مختلف ٹرے میں سبزی اور گوشت کا وہ سامان بھرا ہوا تھا جو ابھی پکنے جا رہا تھا۔ گوشت والے پورشن میں صرف چکن دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اس ریسٹورنٹ کی خاص ڈش چکن ہی کی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا نام ''چرچ چکن'' رکھا گیا تھا۔ چکن کے پارچہ جات کے نزدیک ہی چھوٹے بڑے ہر سائز کے چوپر

اور چھریاں بھی رکھی نظر آرہی تھیں۔
جب میری متلاشی نظر کسی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو پائی تو میں نے وہاں موجود شیف حضرات سے استفسار کیا۔
''کیا تم لوگوں نے یہاں کسی شخص کو دیکھا ہے جس نے بلیو ڈینم جینز پر گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ڈاڑھی ہے اور اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں......؟''
وہ مجھے کچن میں موجود پاکر گہرے تذبذب کا شکار ہو گئے تھے۔ کسی بھی ریسٹورنٹ کے کچن میں کسی غیر متعلقہ شخص کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس پالیسی کی کئی ایک وجوہات ہیں جن پر تفصیلی بات کا ابھی موقع نہیں ہے۔ میرے بلا اجازت اندر گھس آنے پر ان کے چہروں پر ناگواری ابھر آئی تھی لہٰذا ایک نے ترش لہجے میں جواب دیا۔
''یہاں کوئی نہیں آیا......سوائے تمہارے۔''
''میں نے خود اسے کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''وہ بہت خطرناک انسان ہے۔ تم لوگ اسے کو روکنے کی کوشش نہ کرو ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''
''مصیبت میں تو تم پھنسنے والے ہو!'' دوسرے شیف نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''اگر فوراً سے پیشتر یہاں سے چلتے نہ بنے تو......!''
ان کے چہروں اور آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی کے جذبات تھے۔ میں نے ان کے احساسات کی پروا کیے بغیر سخت لہجے میں کہا۔
''میں چلا تو جاؤں گا مگر اس شخص سے نمٹنے کے بعد اور مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں کہیں موجود ہے۔''
بات کے اختتام پر میں نے کچن کے وسط میں رکھی کنگ سائز ڈائننگ ٹیبل کے نیچے جھانکا اور میری مراد بر آئی۔ وہ شیطان کا بچہ مذکورہ ٹیبل کے نیچے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اسے پچکارا۔
''بیٹا جی! باہر آجاؤ ورنہ مجھے بھی مجبوراً ٹیبل کے نیچے آنا پڑے گا۔''
اس نے خود کو ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی صورت حال میں دیکھا تو بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیبل کے نیچے سے نکل آیا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی دکھائی اور ٹیبل کے اوپر سے ایک تیز دھار چوپر اٹھا کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔
میں اس کے ہاتھ میں چوپر کو دیکھ کر ریڈ الرٹ ہو چکا تھا۔ اس نے چوپر کی مدد سے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں اس حملے کو روکنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔
میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے چوپر والے ہاتھ کی کلائی کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا پھر زمین کے رخ پر ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کی کلائی کو آزاد کر دیا۔
وہ نیوٹن کے قوانین حرکت کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے منہ کے بل کچن کے فرش سے جا ٹکرایا۔ اس خوفناک زمینی ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے حلق سے ایک... دردناک آواز خارج ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ والا چوپر ایک اوون کی جانب پرواز کر گیا۔ کچن میں بھگدڑ مچ گئی۔ تینوں شیف حضرات یکے بعد دیگرے وہاں سے کھسک لیے۔ میں نے کچن کے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا تاکہ کوئی اندرونی کارروائی کو دیکھ نہ سکے۔
میں اور پیلو کچن میں رہ گئے تو ہمارے بیچ باقاعدہ معرکہ شروع ہو گیا۔ اب کی بار اس نے ایک چھری اٹھالی تھی۔ وہ چھری کو ہوا میں لہرا کر مجھے ڈرانے لگا کہ اگر میں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تو وہ مجھے چیر کر رکھ دے گا مگر میں اس کے ڈرانے میں کب آنے والا تھا۔
میں اسے کنفیوز کرنے کے لیے مختلف برتن اٹھا کر اس کے اوپر پھینکنے لگا۔ میرے اس عمل کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس کی مت ماری گئی تھی۔ وہ مجھ پر حملہ کرنا بھول کر اپنے چہرے کو برتنوں کی چوٹوں سے بچانے کی کوشش میں لگ گیا تھا تاہم تیز دھار والی خطرناک چھری اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔
میں اس پر مختلف برتن پھینکنے کے دوران میں غیر محسوس انداز میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اس کی مدافعتی پالیسی کے باعث مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں نے اس کی غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔
جیسے ہی وہ میری رینج میں آیا، میں نے ایک وزنی فرائنگ پین کو ہینڈل سے پکڑ کر ''دے مار ساڑھے چار'' کے انداز میں پیلو کی دھنائی شروع کر دی۔ فرائنگ پین کی شکل میں میرے ہاتھ میں ایک نہایت ہی موزوں اور موثر ہتھیار آگیا تھا جس کی کاری ضربات پیلو کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہی تھیں۔
میں نے پیلو کو بے دریغ پیٹتے ہوئے ایک دیوار سے لگا دیا۔ اس دیوار میں کچن کا عقبی دروازہ بھی تھا۔ میں نے ...گھٹنوں کی ٹھوکروں سے اس کے پیٹ کا حشر نشر کر ڈالا۔ وہ

''میں کہتا سکوت اختیار کیا جائے۔''
''وہ کیوں؟''
''اگر دو فریقوں میں سے ایک کی حمایت کی جائے تو دوسرے کی مخالفت لازم آجاتی ہے۔ آپ نے بھی رائے دے کر ایک طرح سے منصور بن عبدالملک کی مخالفت کر دی ہے اور منصور کو حکومت کے لیے نااہل قرار دے دیا ہے۔ اب اگر امرائے بخارا نے آپ کی رائے کو اہمیت نہیں دی اور منصور ہی کو تخت پر بٹھا دیا تو آپ کی رائے اس کے دل میں کھٹکتی رہے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے آپ کا مخالف ہو جائے گا۔ اگر تخت پر نہیں بیٹھا تو بھی اس حق تلفی کو آپ کی مخالفت کا نتیجہ سمجھے گا۔ اس وقت آپ کا سکوت ہی بہتر تھا۔''
''تم نے بالکل ٹھیک کہا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے تیر تو کمان سے نکل گیا۔ اب جو خدا دکھائے۔''
سبکتگین کی دوراندیشی نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔
اس نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہی ہوا۔ امرائے بخارا نے الپتگین کی رائے کو اہمیت نہیں دی اور منصور کو تخت پر بٹھا دیا بعض امرا نے منصور کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی کہ الپتگین نے اس کی مخالفت کی تھی۔ منصور اس وقت تو خاموش رہا لیکن قدم مضبوط ہوتے ہی اس نے الپتگین کو اپنے حضور طلب کیا۔ خدا جانے اس نے کس مصلحت کے تحت بلایا تھا لیکن الپتگین کے دل میں چھپے ہوئے چور نے اس کے پاؤں روک دیے۔
اس نے منصور کے خلاف رائے دی تھی اس لیے ڈر گیا کہ منصور خدا جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس نے منصور کے دائرۂ اطاعت سے نکلنے کی ٹھان لی۔ علم سرکشی بلند کیا اور دو تین ہزار دوں کو ساتھ لے کر جو اس کے غلام تھے، غزنی کی طرف روانہ ہوا۔
سبکتگین کا خواب اپنی تعبیر کی طرف بڑھنے کے لیے تیار تھا۔
الپتگین نے اپنے لشکر کا سپہ سالار سبکتگین کو بنایا اور غزنی پر حملہ آور ہو گیا۔ منصور کو پہلے ہی علم ہو گیا تھا کہ الپتگین باغی ہو گیا ہے اور غزنی کی طرف ہاتھ بڑھانے والا ہے۔ اس نے بھی غزنی کو بچانے کے لیے ایک لشکر روانہ کر دیا لیکن وہ الپتگین کی قوت کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ وہ یہ بھول گیا کہ الپتگین کی فوج اس کے غلاموں پر مشتمل ہے کرائے کی فوج نہیں ہے۔ یہ غلام اپنے آقا پر جان دینے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ ان کا سپہ سالار یعنی ایک غلام ہی ہے جس کی دلیری اور مہارت اس وقت تک ضرب المثل بن چکی تھی۔
سبکتگین نے دلیری دکھائی اور ایک ہی حملے میں غزنی کو مٹھی میں دبا لیا۔ منصور کی فوج شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ الپتگین غزنی جیسے شہر کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔
جب منصور نے دیکھا کہ خراسان خالی ہے تو اس نے وہاں کی حکومت ابوالحسن محمد بن ابراہیم، سجوری کو دے دی۔
الپتگین نے خراسان کے بدلے غزنی حاصل کر لیا۔
سبکتگین کا خواب ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔
الپتگین نے پندرہ سال تک نہایت کروفر سے غزنی پر حکومت کی۔ اس عرصے میں الپتگین سے زیادہ سبکتگین کو شہرت ملی۔ اس نے اپنے آقا کے حکم سے کئی بار ہندوؤں سے جہاد کیا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کی ہمدردیوں اور فیاضیوں نے اہل غزنی کے دلوں میں خوب جگہ بنا لی۔ دربار میں بھی اس کی شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ الپتگین نے اسے امیر الامرا بنا دیا تھا۔ سلطنت کے مفاد میں جو مشورہ ہوتا وہ اسی سے کرتا تھا۔
الپتگین اب تیزی سے بڑھاپے کی طرف گامزن تھا۔ اس نے سلطنت کے تمام امور اپنے بیٹے ابو اسحٰق کے بجائے سبکتگین کو سونپ دیے تھے۔ غزنی کے سیاہ و سفید کا مالک سبکتگین ہی تھا۔ بعض اوقات تو وہ الپتگین کے علم میں لائے بغیر ہی کوئی حکم جاری کر دیتا۔ الپتگین کو معلوم ہوتا تو وہ اس سے کوئی باز پرس نہ کرتا۔ تمام امیزدوں کے ساتھ بھی ایسا بالانصاف رویہ اختیار کیے ہوئے تھا کہ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ سب اس سے خوش بھی تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے حتیٰ کہ ابو اسحٰق کو بھی کبھی اس سے یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ امورِ مملکت کے کام کیوں انجام دے رہا ہے۔ ابو اسحٰق کو... کبھی باپ سے بھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اس نے بیٹے کے ہوتے ہوئے ایک غلام کو اختیارات کیوں دے رکھے ہیں۔
خوش اسلوبی اور خوشحالی کے دور سے گزرتے ہوئے بالآخر... وہ وقت بھی آیا جو سب پر آتا ہے۔ الپتگین کی بیماری نے طول کھینچا اور اس کے انتقال کا وقت قریب آ گیا۔
اس بیماری کے دوران اس نے الپتگین کے سرہانے بیٹھ کر راتیں گزار دیں۔ اس رات بھی وہ شمع دان ہاتھ میں لیے الپتگین کے سرہانے کھڑا تھا کہ الپتگین نے نحیف آواز میں اسے اپنے قریب بلا لیا۔
''میرے بیٹے! تو نے اطبا کے درمیان ہونے والی

میری ہر ٹھوکر پر تکلیف سے بلبلا اٹھتا لیکن میں بس کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی ناک اور چہرے کے مختلف حصے بری طرح زخمی ہو چکے تھے اور وہاں سے خون بھی جاری ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک میرے لات گھونسوں کی تاب نہ لا سکا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھتے ہوئے۔۔۔ خونخوار لہجے میں استفسار کیا۔ ''اب بتاؤ' کہاں ہے تمہارا خفیہ باپ۔۔۔ لیونارڈو؟''

وہ جزبز ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔

''لگتا ہے ابھی تم شکم سیر نہیں ہوئے۔'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''تمہیں چند اور لذیذ کھانے کھلاتا ہوں گے۔''

وہ منمنایا ''مم۔۔۔ میں۔۔۔ لیونارڈو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔''

''تمہارے تو اچھے بھی جانیں گے اور مجھے بتانے کے لیے بے تاب بھی ہوں گے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''اب دیکھنا کس طرح میں۔۔۔ تمہاری زبان کے سارے بند قفل کھولتا ہوں۔۔۔''

وہ رحم طلب انداز میں مجھے تکنے لگا لیکن ان لمحات میں مجھے چیلو پر رتی بھر ترس نہیں آ رہا تھا۔ میں نے قریب ہی دیوار پر لگے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا پھر ریسیور والے تار کا پھندا بنا کر اس کی گردن کے گرد کستے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں زندگی عزیز ہے تو مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ اگر میں نے اس پھندے کو ٹائٹ کر دیا تو پل بھر میں پھڑک کر جان دے دو گے۔''

''مم۔۔۔ مجھے لیونارڈو کی کوئی خبر نہیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' میں نے تار کو اس کی گردن کے گرد کستے ہوئے الوداعی لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے جہنم کی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بنوا دیا ہے۔ تم اپنی روح کو قفسِ عنصری سے پرواز کے لیے تیار کر لو۔''

بات کے اختتام پر میں نے اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھایا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔

میں نے تار کی گرفت قدرے ڈھیلی کر دی تو اس کی سانس کی آمد و شد بحال ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اسے ٹھسکا لگا پھر وہ کھانسنے لگا۔

''لمبی اور گہری سانسیں لو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تاکہ تم بولنے کے قابل ہو سکو اور۔۔۔ مجھے لیونارڈو کے بارے میں بتا پاؤ۔۔۔''

''بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''ذرا سانس تو لینے دو۔''

''بہت لے چکے تم سانس۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''اب شروع ہو جاؤ۔۔۔ اور مجھے بتاؤ' لیونارڈو کہاں ہے؟''

''۔۔۔ وہ کیوبا گیا ہوا ہے۔''

''کیوبا۔۔۔!'' میں نے شک آمیز انداز میں کہا۔

''وہاں وہ کیا لینے گیا ہے؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔'' وہ بے بسی سے پلکیں جھپکا کر بولا۔

''مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟'' میں نے تیکھی نظر سے اسے گھورا۔

''نہیں۔۔۔ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔''

''اگر تمہاری کوئی بات بعد میں غلط ثابت ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے دھمکانے کی کوشش کی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں کہ لیونارڈو کیوبا گیا ہے اور میں نہیں جانتا' وہ وہاں کیوں گیا ہے۔۔۔''

''یہ جانتے ہو نا کہ وہ کب کیوبا گیا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے انٹرکام کے تار کو اس کی گردن کے گرد بس اتنا ہی ڈھیلا رکھا ہوا تھا کہ وہ آسانی سے گفتگو کر سکے۔ مجھے اس بات پر پورا اختیار تھا کہ جب چاہوں، اس کی بولتی بند کر دوں۔

میرے سوال کے جواب میں چیلو نے چند روز پہلے کی ایک تاریخ بتا دی۔ میں چونک اٹھا۔ یہ وہی تاریخ تھی جب شارو منظر سے غائب ہوئی تھی۔

''تم تو وہ تاریخ بتا رہے ہو جس روز سے شارو گم شدہ ہے۔'' میں نے کڑے انداز میں اسے گھورا۔ ''کیا لیونارڈو شارو کو بھی اپنے ساتھ کیوبا لے گیا ہے؟''

''میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''مجھے اس بارے میں پتا نہیں ہے۔''

''پھر کس کو پتا ہے؟'' میں نے برہمی سے پوچھا۔

''لیونارڈو کی سرگرمیوں کی صحیح خبر صرف باس ہی کو ہو سکتی ہے۔'' وہ مریاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کون باس۔۔۔ کس کا باس؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''کارلوس۔۔۔ ہم سب کا باس۔''

"یہ کارلوس کہاں ملے گا؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ "میں کبھی ڈائریکٹ باس سے نہیں ملا۔ جو بھی بات ہوتی ہے، لیونارڈو کے ذریعے مجھ تک پہنچتی ہے۔"

"آخری سوال!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "شاروا اس وقت کہاں ہے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے تار کا کھنچاؤ بڑھا دیا۔

"م...... میں ...... نہیں ...... جانتا۔" وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

اسی وقت کچن کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

میں نے مارا ماری شروع کرنے سے پہلے کچن کے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا تھا اور یہ میرا بروقت فیصلہ تھا۔ اگر وہ دروازہ کھلا رہتا تو میں پیبلو کی خاطر داری کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کی زبان سے کچھ اگلوا سکتا تھا۔

دستک کی آواز میں لحہ بہ لحہ تیزی آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے دروازہ نہیں کھولا تو دستک دینے والے اسے توڑ کر اندر گھس آئیں گے اور ممکن ہے وہ لوگ مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں کیونکہ میں نے پیبلو کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا چنانچہ مجھے پہلی فرصت میں وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔

کچن کے مین دروازے سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا لہٰذا میں نے فرار کے لیے عقبی دروازہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پیبلو کو وہیں کچن کے فرش پر کسمپرسی کی حالت میں پھینک کر کچن کے عقبی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اب وہ لوگ پیبلو کے ساتھ جو بھی سلوک کرتے، مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے دل کھول کر اس کی ٹھکائی کر ڈالی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں تشنہ نہیں رہے تھے۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ عقبی دروازہ کھولا اور دبے پاؤں کچن سے نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے میں "چرچ چکن" ریسٹورنٹ کی حدود سے بھی باہر ہو چکا تھا۔ یہ کچن ریسٹورنٹ کے عقبی حصے میں واقع تھا اور اس کا عقبی دروازہ ریسٹورنٹ سے باہر گلی میں کھلتا تھا۔

میں نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی عبور کی اور مین پلانٹیشن ڈرائیو پر آ گیا۔ میری سرخ اسپورٹ کار ونی لاؤنج کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ مجھے جلد از جلد اپنی کار میں بیٹھ کر جائے وقوعہ یعنی "چرچ چکن" ریسٹورنٹ سے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

واپسی کے سفر میں جب میں نے اپنے حالیہ رویے پر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں شاروا والے معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی پر کھلی تھی۔

میں اس وقت اپنے لیک جیکسن والے اپارٹمنٹ میں تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے فون اٹینڈ کر لیا۔ دوسری جانب انکل سلطان تھے۔ میرے "ہیلو" کے جواب میں انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میرے بچے! تم اس وقت کہاں ہو؟"

"جہاں آپ نے فون کیا ہے میں وہیں پر ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "دی گیٹ وے اپارٹمنٹ میں۔"

"تم خیریت سے تو ہو نا؟" ان کی آواز سے گہری فکر جھلک رہی تھی۔

"ہاں ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔ "ابھی آپ کے فون کی گھنٹی پر اٹھا ہوں۔ آپ میرے لیے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا......؟"

"میں اپنی پریشانی بعد میں بیان کروں گا۔" وہ سرسری انداز میں بولے۔ "پہلے تم میرے سوالات کے جواب دو...... بالکل سچے اور کھرے جواب!"

"میں نے پہلے کبھی آپ سے غلط بیانی کی ہے جو آپ اس قسم کی بات کر رہے ہیں۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے میرے بچے!" وہ جلدی سے بولے۔ "لیکن اس وقت میں اپنی سوچ کے سامنے مجبور ہوں اور تمہارے حوالے سے بہت پریشان ہو رہا ہوں۔"

"آپ پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیں۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "اللہ کے حکم سے میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"اللہ تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔" وہ دعائیہ انداز میں بولے پھر پوچھا۔ "گزشتہ رات تم نے ڈنر کہاں کیا تھا؟"

"ونی لاؤنج میں۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

وہ ٹٹولنے والے انداز میں مستفسر ہوئے۔ "ونی لاؤنج یا چرچ چکن......؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ "چرچ چکن" وہ ریسٹورنٹ تھا جہاں گزشتہ رات میں نے پیبلو سے دو دو ہاتھ کیے تھے اور اسے خون میں لت پت ادھ موا چھوڑ کر ریسٹورنٹ سے نکل

آیا تھا۔ انکل نے چرچ چکن کا کیوں پوچھا تھا؟ اس سوال نے میرے ذہن میں اتھل پتھل مچادی۔ میں نے ان کے دل کا حال جاننے کے لیے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

''وِنی لاؤنج انکل...... وِنی لاؤنج!''

''او کے ٹھیک ہے۔'' وہ بے یقینی لہجے میں بولے پھر پوچھا۔ ''کیا ڈنر کے بعد تم ونی لاؤنج سے نکل کر چرچ چکن ریسٹورنٹ کی طرف گئے تھے؟''

مجھے شک ہوا کہ انہیں رات والے واقعے کی بھنک مل چکی ہے۔ میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

''انکل! آپ میرے چرچ چکن ریسٹورنٹ جانے پر اس قدر زور کیوں دے رہے ہیں۔ کیا اس حوالے سے کوئی خاص بات ہے؟''

''خاص بات ہے جبھی تو اتنی صبح تمہیں فون کیا ہے۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''مگر تمہیں کیسے معلوم ہوگا...... تم تو ابھی سو کر اٹھے ہو۔''

''آخر معاملہ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اخبار میں سب کچھ شائع ہو چکا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولے۔

بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا سب کچھ......؟''

''یہ سب کچھ کہ......'' انکل کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''گزشتہ رات ڈبل ون فائیو پلانٹیشن ڈرائیو، لیک جیکسن کے ایک ریسٹورنٹ ''چرچ چکن'' میں دو افراد کے درمیان ایک خون ریز معرکہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور دوسرا فرار ہو گیا۔ ہلاک ہونے والے شخص کا نام پیبلو ہے جس کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے۔ اس ذیل میں لیونارڈو نامی کسی غنڈے کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ لیونارڈو کے ذکر پر میں چونک اٹھا اور فوراً تمہیں فون کر ڈالا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم پچھلی رات چرچ چکن نہیں گئے اور تمہارا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے تن بدن سے جان نکل گئی ہو۔ میں پیبلو کو گزشتہ رات شدید زخمی حالت میں چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں چھوڑ کر آیا تھا۔ میرے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ پیبلو اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انکل کے سامنے کس طرح سچائی کا اقرار کروں۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ پیبلو سے ہونے والی مار اماری اور اس کی موت کے معاملے سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ اگر انہیں پتا چلتا کہ میرے ہاتھوں ایک بندے کا قتل ہو چکا ہے تو نہ جانے ان کے دل و دماغ پر کیا گزرتی۔ وہ پہلے ہی بہت زیادہ بیمار تھے۔ یہ صدمہ ان کی برداشت سے باہر بھی ہو سکتا تھا۔

سردست میں نے مفاہمانہ حکمت عملی اختیار کی اور قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں انکل۔ میں خیریت سے ہوں۔ آپ نے ناشتا کر لیا؟''

''ہاں کر لیا۔'' انہوں نے بتایا۔

''ایملی کیسی جا رہی ہے؟''

''بہت اچھی۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''گھر کو اور گھر کے سارے معاملات کو اس نے سنبھال لیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے بہ ظاہر مضبوط لہجے میں کہا تاہم اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن مجھے اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا میرے بچے۔'' وہ فکر مندی سے بولے۔

''جی ضرور۔'' میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ آرام کریں۔ میں ناشتے کے بعد آپ کو کال کرتا ہوں۔''

میں نے ریسیور کریڈل کیا تو پریشانی نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے رات دل کھول کر پیبلو کی ٹھکائی کی تھی لیکن یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جان سے چلا جائے گا۔ شارو کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گیا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بے دریغ چل پڑے تھے۔

میں نے اپنا کمپیوٹر آن کر لیا تاکہ تازہ ترین حالات سے آگاہی حاصل کر سکوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اخبار کو ہاتھ میں پکڑ کر پڑھنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے لیکن ان لمحات میں، میں جس نوعیت کے نازک حالات سے گزر رہا تھا اس میں اپارٹمنٹ سے باہر جا کر اخبار کو خرید کر لانا اور پھر حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینا خطرے سے خالی نہیں تھا لہٰذا میں نے آن لائن نیوز پیپرز سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے تین معروف اخبارات دی فیکٹس، دی سورس اور براڈوریا کا ڈیلی نیوز کے سٹی پیج کو بڑی باریک بینی سے کھنگال ڈالا۔ مجھے اپنے مطلب کی خبر تلاش کرنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا نہ پڑا۔

اخبارات نے گزشتہ رات والے واقعے کی مناسب کوریج کی تھی۔ رپورٹ کے مطابق پیبلو نامی ایک غنڈے کا

کسی سے ٹکراؤ ہوگیا تھا۔ دونوں مارا ماری کرتے ہوئے ''چرچ چکن'' نامی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور پھر ریسٹورنٹ کے کچن میں ان کے بیچ خون ریز معرکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں پیلو شدید زخمی ہوکر کچن کے فرش پر گر گیا تھا۔ دوسرا شخص اسے وہیں چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ پوری خبر میں اس ''دوسرے شخص'' کا کہیں نام نہیں دیا گیا تھا۔

تجزیہ نگاروں کے مطابق' یہ دو مختلف جرائم پیشہ گروہوں کے افراد کا ٹکراؤ تھا۔ جس میں ایک شخص پیلو کا تعاقب کرتے ہوئے چرچ چکن ریسٹورنٹ تک پہنچا تھا۔ وہ پیلو سے کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا' جگادری صحافیوں کے خیال میں وہ نامعلوم شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس واردات کو معمول کا ایک واقعہ قرار دیا گیا تھا اور خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ جرائم پیشہ افراد میں اس قسم کے ٹکراؤ ہوتے ہی رہتے ہیں تاہم پولیس کو اس نامعلوم شخص کی تلاش تھی۔

میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس لی۔ خبر میں میرا نام یا حلیہ نہیں بیان کیا گیا تھا۔ یہ بات میرے حق میں جاتی تھی لیکن یہ ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھے کلین چٹ جاری کردی گئی ہو۔ پولیس بڑی شدومد کے ساتھ اس نامعلوم شخص کی تلاش میں تھی پیلو جس کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا اور ...... یہ اطمینان بخش صورتِ حال نہیں تھی۔ مجھے فوری طور پر اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا۔

میں نے بڑی سرعت سے لباس تبدیل کیا اور ایک ہینڈی بیگ کے ساتھ اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ میں نے گزشتہ رات جو لباس زیب تن کر رکھا تھا اسے ایک الگ تھیلی میں پیک کرلیا تھا۔ اپارٹمنٹ کو میں نے اسی حالت میں چھوڑا جیسا میری آمد سے پہلے وہ تھا۔ میں نے گزشتہ دوپہر سے آج کی صبح تک اس اپارٹمنٹ میں جو وقت گزارا تھا' اس کے ایک ایک آثار کو میں نے حرفِ غلط کی طرح مٹادیا تھا حتیٰ کہ اپنے کمپیوٹر کی ہسٹری کو بھی ڈیلیٹ کردیا تھا۔

یہ اچھی بات تھی کہ اس دوران میں ''دی گیٹ وے'' اپارٹمنٹس کے کسی رہائشی سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی میں نے لیک جیکسن والے دوسرے دوست احباب سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ یعنی کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ میں گزشتہ روز دوپہر سے لیک جیکسن میں تھا' سوائے ایک شخص کے اور اس شخص کا نام تھا بنجامن ...... دی لاؤنج نائٹ کلب کا منیجر!

میں نے اپنی اسپورٹ ہنڈائے کو لوگن بیری اسٹریٹ پر دوڑاتے ہوئے سوچا۔ ''مجھے یہی ظاہر کرنا چاہیے کہ میں لیک جیکسن آیا ہی نہیں ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال ابھرا۔ ''اور وہ جو بنجامن سب کچھ جانتا ہے' اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کا بھی کچھ ہو ہی جائے گا۔'' میں نے خود کو سمجھایا۔ ''ایک شخص کی زبان پر تالا ڈالنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔''

ذہن کے دوسرے حصے نے پوچھا۔ ''کیا تم بنجامن کی زبان پر بھی ویسا ہی تالا ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہو.... جیسا پیلو کی زبان پر ڈالا تھا؟''

ذہن میں بے اختیار پیدا ہونے والے اس سوال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں اپنے ذہن کو جواب دیا۔ ''ارے نہیں یار ......وہ ایک حادثہ تھا۔ میں ہرگز ہرگز پیلو کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو اس کی زبان سے محض شارو کا اتا پتا اگلوانا چاہتا تھا اور وہ ڈھیٹ کچھ بتا کر نہیں دے رہا تھا۔ ردعمل کے طور پر میرے ہاتھ پاؤں کچھ زیادہ ہی چل گئے اور وہ......''

میں نے ہنڈائے کو ہائی وے ٹو ڈبل ایٹ پر ڈالنے سے پہلے ایک پبلک فون بوتھ کے پاس روک لیا پھر گاڑی سے نکل کر بوتھ میں گھس گیا۔ اگلے ہی لمحے میری انگلیاں دی لاؤنج کے نمبر ڈائل کررہی تھیں...... ٹو نائن سیون تھری سکس ٹو ٹن ایٹ۔

''دی لاؤنج۔'' دوسری جانب فون اٹینڈ کرنے والے نے کہا۔

میں نے آواز بدل کر پوچھا۔ ''مسٹر بنجامن سے بات ہوسکتی ہے۔ ایک ضروری میٹر ہے؟''

اس وقت تک دوپہر ہوچکی تھی اور مجھے امید تھی کہ بنجامن لاؤنج پہنچ چکا ہوگا۔ اسی نائٹ کلب کے ساتھ چونکہ ایک ریسٹورنٹ کا سیٹ اپ بھی تھا لہٰذا لنچ کے اہتمام کے لیے یہ قدرے جلدی کام شروع کردیتا تھا۔

''پلیز ویٹ......'' دوسری طرف بولنے والے نے کہا۔

اس ''پلیز ویٹ'' کا مطلب یہ تھا کہ بنجامن لاؤنج میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو......!''

''مسٹر بنجامن!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں؟''

''نہیں...... میرے قریب اس وقت کوئی نہیں ہے۔''

اس نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کون؟''

''علی!'' میں نے بتایا۔ ''اسد علی!''

''اوہ سر آپ۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس وقت کہاں ہیں؟ آپ کو پتا ہے...''

''ہاں' مجھے معلوم ہو چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہہ دیا۔ ''پیلو کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

''یس سر!'' وہ بدمزہ ہو کر بولا۔ ''پیلو اور لیونارڈو جیسے لوگ ہمارے معاشرے کے ناسور ہیں۔ ان کا صفایا ہوتا رہے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ ان کمینوں کی وجہ سے اکثر لوگوں کا دھندا خراب ہو رہا ہے......''

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

''سر! آپ نے بتایا نہیں' اس وقت آپ لیک جیکسن میں ہیں یا کہیں اور؟''

''میں آج صبح ہی لیک جیکسن سے رخصت ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''اپنا خیال رکھیے گا۔ آپ جہاں بھی ہوں خدا آپ کی حفاظت کرے۔''

''آمین!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔ ''مسٹر بنجامن! میں تو یقیناً اپنا خیال رکھوں گا ہی لیکن آپ سے بھی ایک درخواست ہے۔''

''جی حکم کریں سر!'' وہ جلدی سے بولا۔

''آپ کو بھی میرا خیال رکھنا ہو گا...... بہت زیادہ خیال!''

اس کی الجھن زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں سمجھا نہیں۔ آپ جب مجھ سے دور ہیں تو پھر میں آپ کا خیال کیسے رکھ سکوں گا؟''

''اپنی زبان بند رکھ کر۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے کہا۔ ''میں گزشتہ رات آپ کے لاؤنج میں نہیں آیا تھا بلکہ میں کئی دنوں سے ادھر نکلا بھی نہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جب سے شارو نے ہمارے لاؤنج کی جاب چھوڑی ہے' میں نے آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔ آپ شارو کا گانا سننے آتے تھے' اس کے چلے جانے کے بعد آپ یہاں کا راستہ بھول گئے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ سے اسی قسم کے تعاون کی امید تھی۔''

''اچھائی کو چار سو پھیلانے اور برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے میں ہر وقت آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

''شکریہ مسٹر بنجامن!'' میں نے کہا۔ ''میں پیلو کی جان لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو اس سے شارو کا اتا پتا پوچھ رہا تھا اور وہ زبان کھولنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے جھنجلا کر کچھ زیادہ ہی جوش دکھا دیا جس کے نتیجے میں وہ ختم ہو گیا۔''

''وہ ایک حادثہ تھا مسٹر علی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جسٹ این ایکسیڈنٹ۔ آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں اور مجھے بتائیں کہ شارو کو کیا ہوا ہے؟ آپ پیلو سے اس کا اتا پتا کیوں پوچھ رہے تھے؟''

''شارو چند روز سے غائب ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اس کی گم شدگی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''وہ کب سے غائب ہے؟'' اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''جس دن سے آپ نے لیونارڈو کو نہیں دیکھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور مجھے شک ہے کہ شارو کی گم شدگی میں لیونارڈو کا ہاتھ ہو سکتا ہے اس لیے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے جب میں نے لیونارڈو کے آدمی پیلو کو مشکوک انداز میں بدک کر بھاگتے دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ وہ شارو کے بارے میں کوئی اہم بات جانتا ہے لہٰذا میں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔''

بنجامن ایک مخلص اور ہمدرد انسان کا کردار ادا کر رہا تھا اس لیے میں نے اس سے شارو کا معاملہ شیئر کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی تھی۔ جو لوگ آپ کے سچے خیرخواہ ہوں ان کو حقیقتِ حال سے واقف رکھنا چاہیے۔ اس سے باہمی اعتماد مضبوط ہوتا ہے اور زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

''شارو کی گم شدگی کا سن کر مجھے افسوس ہوا ہے مسٹر علی!'' وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''کیا پیلو نے شارو کے حوالے سے آپ کو کچھ بتایا؟''

''کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ زبان کھول دیتا تو میرے ہاتھ پاؤں بھی رک جاتے اور وہ اس وقت سانس لے رہا ہوتا۔ اینی ہاؤ...... خس کم جہاں پاک!''

''پیلو نے لیونارڈو کے بارے میں کوئی معلومات دی؟'' بنجامن نے پوچھا۔

''ہاں......اس نے بتایا کہ لیونارڈو کیوبا گیا ہوا ہے۔''

''کیوبا؟'' بنجامن نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''وہاں وہ کیا کرنے گیا ہے؟''

''لیونارڈو جیسے بدمعاشوں کے لیے کیوبا کی سرزمین کسی جنت سے کم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ وہاں کچھ نئی بدمعاشیوں کی تعلیم لینے گیا ہو۔ اب یہ تو پولیس بتا سکتی ہے کہ وہ وہاں ہوانا بیچ پر بلونز اور لولی پاپس بیچنے کا ارادہ رکھتا ہو؟''

''مسٹر علی! میں بھی آپ کے انداز میں سوچنے پر مجبور ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ شارو کی گم شدگی میں لیونارڈو کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ اگر لیونارڈو واقعی کیوبا گیا ہے تو پھر ممکن ہے' شارو کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہو۔''

''حقیقت کیا ہے' یہ تو اسی وقت پتا چلے گا جب کوئی ٹھوس چیز سامنے آئے گی۔'' میں نے عملی سوچ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پیملو نے مجھے مس گائیڈ کرنے کے لیے ایسی بات کی ہو۔ ممکن ہے' لیونارڈو ادھر لیک جیکسن میں ہی ہو!''

''اگر وہ لیک جیکسن میں ہوا تو اپنے ساتھی کی موت پر یقیناً حرکت میں آئے گا۔'' اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''ہوسکتا ہے' وہ آج کسی وقت لاؤنج بھی آ نکلے۔''

''مسٹر بنجامن! میں تو لیک جیکسن سے بہت دور جاچکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ کے لاؤنج میں اور اس کے گردوپیش میں جو بھی صورتِ حال پیدا ہو' اسے آپ ہی نے ٹیکل کرنا ہے۔''

''ڈونٹ وری...... میں ٹیکل کرلوں گا۔'' وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہوجائیں۔ یہاں کی کوئی ٹینشن آپ تک نہیں پہنچے گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس والوں کو بھی تو منہ دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا پولیس پوچھ تاچھ کے لیے ونی لاؤنج آئی تھی!''

''آپ کے فون سے کچھ دیر پہلے وہ میرا انٹرویو کرکے گئے ہیں۔'' بنجامن نے بتایا۔ ''بلکہ انہی کی وجہ سے مجھے آج جلدی ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ چرچ چکن ریسٹورنٹ ڈبل ون فائیو پلانٹیشن ڈرائیو پر واقع ہے اور ہمارا ونی لاؤنج ٹرپل ون پلانٹیشن ڈرائیو پر۔ ایک طرح سے یہ دونوں ایک دوسرے کے 'پڑوسی' بھی ہیں لہٰذا ونی لاؤنج پر تفتیش کا تو جواز بنتا ہے نا۔''

''آپ نے پولیس کے سوالات کے جواب میں کیا کہا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اس واقعے سے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے کہا۔ ''آئندہ بھی یہی پالیسی اختیار کرنا ہے۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں مسٹر علی!'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میری زبان سے یا ونی لاؤنج کی حدود سے کوئی ایسی بات نہیں نکلے گی جو آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر دے۔ آپ کو مجھ پر مکمل بھروسا کرنا چاہیے۔''

''تھینک یو مسٹر بنجامن!'' میری آواز میں تشکرانہ جذبات کی بھرمار تھی۔

وہ فراخ دلی سے بولا۔ ''یو آر آلویز موسٹ ویل کم مسٹر علی۔ ٹیک کیئر......''

''یو ٹو۔'' میں نے تہ دل سے کہا۔ ''آپ مجھے اپنا سیل نمبر دے دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔''

اس نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ مسٹر بنجامن نے جو کہا تھا، وہ کر بھی دکھائے گا۔ اس کے رویے اور الفاظ سے وفا کی مہک اٹھتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے مخلص نہ ہوتا تو پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا چکا ہوتا۔ میرے دل نے کہا کہ مجھے بنجامن پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ کسی بھی مرحلے پر مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ میں نے دل کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میری سرخ ساسانی اسپورٹ کار ایک مرتبہ پھر ہائی وے نوڈبل ایٹ پر آگئی۔ میرا رخ شمال کی جانب تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ میں لیک جیکسن سے صحیح سلامت نکل آیا تھا، میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی۔ آگے جو بھی ہوتا' دیکھا جاتا۔

ہائی وے نوڈبل ایٹ ٹیکساس کے جنوبی ساحلی شہر فری پورٹ کو ہوسٹن سے ملاتی ہے۔ اگر ہم فری پورٹ سے نکل کر اس ہائی وے پر شمال کی جانب سفر کریں تو ہمیں لیک جیکسن، برج ووڈ، اینگلٹن، روشیرون اور مینویل سے گزرنا پڑتا ہے پھر ہم ہوسٹن پہنچ جاتے ہیں۔ اگر میں بھی اس ہائی وے پر آگے بڑھتا چلا جاتا تو سیدھا ہوسٹن پہنچ جاتا۔ لیک جیکسن سے ہوسٹن نوے کلومیٹر ہے اور یہ فاصلہ کم وبیش پینتالیس منٹ میں طے کیا جاسکتا ہے۔ اگر میں راستے میں کہیں نہیں رکتا تو دوپہر میں ہوسٹن پہنچ جاتا لیکن راستے میں رکنا ناگزیر تھا۔

بے نشان منزل کی جانب اندھا دھند قدم اٹھانا انتہائی نامناسب اور غیر محفوظ تھا۔ میں اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا، ان میں قدم قدم پھونک کر بڑی احتیاط سے اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میری ذرا سی غلطی مجھے کسی بہت بڑی مصیبت سے ہم کنار کرسکتی تھی۔ اس وقت میں لیک جیکسن اور رچ ووڈ کے درمیان محوسفر تھا اور مسلسل اپنے پیش آمدہ حالات پر غور کررہا تھا۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ سب سے پہلے مجھے اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے جسے میں اپنے اپارٹمنٹ سے ایک تھیلی میں ڈال کر لایا تھا۔ یہ وہی لباس تھا جو میں نے چیلو سے مارا ماری کے دوران میں پہن رکھا تھا۔ اس لباس کو فوری طور پر ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ ابھی تک تو اللہ کا شکر تھا کہ خیریت گزری تھی اور اس واقعے کے حوالے سے میرا نام کہیں نہیں آیا تھا اور نہ ہی چیلو سے مار پیٹ کرنے والے شخص کی شناخت یعنی اس کے لباس اور حلیے پر کوئی بات ہوئی تھی لیکن پھر بھی موجودہ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ حتی الامکان احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ آئندہ اس حوالے سے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔

میں نے ایک جگہ کار روک کر مذکورہ لباس کو ایک کوڑے دان کی نذر کیا اور آگے بڑھ گیا۔ ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا اور اسی سوچ میں انکل سلطان بھی شامل تھے۔ میں نے صبح ان سے وعدہ کیا تھا کہ ناشتے کے بعد انہیں کال کروں گا اور اب اس بات کو بھی کافی وقت گزر چکا تھا لیکن یہ بھی درست تھا کہ میں نے انکل سے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی تھی کیونکہ..... میں نے ابھی تک ناشتا ہی نہیں کیا تھا۔

ناشتے کے تصور کے ساتھ ہی مجھے بھوک کا شدید احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنتیں چاروں قل پڑھنے لگیں۔ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر ابھی تک میں جس ابتری اور افراتفری کا شکار تھا، اس میں ناشتے کی جانب میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے یہ بھی یاد نہیں آیا تھا کہ میں نے گزشتہ رات ڈنر بھی نہیں کیا تھا۔

ونی لاؤنج میں ڈنر کا آرڈر دینے کے بعد جس نوعیت کے حالات سے میرا پالا پڑا تھا، انہوں نے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں دی تھی، میں پیٹ پوجا کب اور کیسے کرتا گزشتہ رات کو میں نے فریج میں سے جوس نکال کر پیا تھا اور سو گیا تھا۔

میں نے اپنے معدے اور آنتوں کے دیرینہ جائز مطالبات کے سامنے ہتھیار پھینکنے کا فیصلہ کرتے ہوئے رچ ووڈ کے ایک گیس اسٹیشن (پیٹرول پمپ) پر کار روک دی۔

امریکا میں پیٹرول کو گیسولین کہا جاتا ہے لہٰذا پیٹرول پمپ بھی گیس اسٹیشن کہلاتا ہے۔ گیسولین کا مطلب کسی بھی انجن کو فراہم کیا جانے والا ایندھن ہے جسے ہمارے ملک میں عموماً پیٹرول کا نام دیا جاتا ہے۔

امریکا میں اکثر گیس اسٹیشنز کے ساتھ اسٹورز اور اکثر اسٹورز کے ساتھ گیس اسٹیشنز آپ کو مل جائیں گے۔

میں نے پہلے اپنی اسپورٹ کار کا فیول ٹینک فل کروایا پھر ناشتے کے بندوبست کے لیے گیس اسٹیشن سے ملحقہ اسٹور میں گھس گیا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد میں بھرپور ناشتے کے لوازمات کے ساتھ اپنی گاڑی کے اندر بیٹھا تھا۔

پیٹ میں خوراک اتری تو دماغ بہتر انداز میں کام کرنے لگا۔ ان لمحات میں مجھے ذاتی تجربہ ہوا کہ یہ کیوں کہا جاتا ہے...... اگر معدہ خالی ہو تو دماغ کام نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں عقل دماغ سے نکل کر خالی معدے میں اتر جاتی ہے......!

میں نے خوب سیر ہو کر ناشتا کیا اور انکل سلطان کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ میرے سچے محسن اور مربی تھے۔ وہ عرصہ دراز سے میرے ہر نوعیت کے اخراجات اٹھا رہے تھے۔ میں ان کا بیٹا نہیں تھا لیکن انہوں نے سگی اولاد سے زیادہ میرا خیال رکھا تھا۔ ہمارے بیچ دوستی کا رشتہ قائم تھا اسی لیے ہم بلاجھجک ایک دوسرے سے ہر بات کرلیتے تھے۔ میں نے آج تک ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا' معمولی سے معمولی بات بھی میں ان سے شیئر کرتا تھا کیونکہ میں انہیں اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔

''یہ اچھی خیر خواہی نبھائی جارہی ہے مسٹر علی!'' میرے ذہن میں ایک طنزیہ سوچ ابھری۔

''کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟'' دوسری سوچ نے پہلی سوچ سے سوال کیا۔

''بہت خوب......'' پہلی سوچ کا انداز تیکھا ہوگیا۔

''کتنے معصوم بن رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں...... ہوں؟''

''مجھے کیا جاننا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

یہ سوال و جواب میرے اپنے ذہن کی پیداوار تھے۔ انسان کے ہر عمل اور ردعمل کے پیچھے سوچ کی ایک مربوط فلاسفی کام کررہی ہوتی ہے اور تمام حرکات و سکنات کی وجوہات ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن جب خود ہی سوال اور خود ہی جواب کی سچویشن سے گزرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا

ہے کہ وہ غلط اور صحیح کی ناپ تول کے بعد کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا ہے اور اس سلسلے میں بالآخر وہ کامیابی حاصل کرلیتا ہے کیونکہ اس کوشش میں انسان کا ضمیر پوری طرح ذہن کا ممدومعاون بنا ہوتا ہے۔

”تم ایک طرف اپنے انکل کو خیرخواہ اور مخلص سرپرست بھی مان رہے ہو اور دوسری جانب ان سے ایک حساس معاملے کو ابھی تک چھپا رکھا ہے۔ یہ تمہاری سوچ اور عمل میں کھلا تضاد نہیں مسٹر علی؟“

”تم کون سے حساس معاملے کی بات کررہے ہو؟“ میرے اس استفسار سے ضعف جھلکتا تھا۔

”وہی معاملہ جس نے تمہیں سر پر پاؤں رکھ کر لیک جیکسن سے بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔“ میرے ضمیر نے ملامتی انداز میں کہا۔ ”کیا تم نے انکل سلطان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا ہے؟ کیا تم نے انہیں بتایا کہ گزشتہ رات ”چرچ چکن“ ریسٹورنٹ کے کچن میں پیلو سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہوئی تھی اور...... اس کی موت کے ذمے دار تم ہی ہو؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو میں نے انکل سے یہ بات چھپا رکھی ہے۔“ میں نے ندامت آمیز انداز میں سوچا۔ ”لیکن میں بہت جلد کسی مناسب وقت پر انہیں سب کچھ بتادوں گا۔“

”مناسب وقت اور موقع کا انتظار وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس عقل کی کمی ہوتی ہے یا جن کے پاس کوئی شفاف منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔“ میرے ذہن کا وہ حصہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”زیرک اور باتدبیر لوگ تو اپنی حکمت عملی سے ہر وقت اور ہر موقع کو مناسب بنالیتے ہیں۔ کیا تم اس وقت کا انتظار کررہے ہو جب یہ خبر انکل سلطان کو کسی اور ذرائع سے ملے اور...... تم پر سے ان کا اعتماد اٹھ جائے؟“

”نن...... نہیں...... ہرگز نہیں۔“ میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوگا...... میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

”پھر تاخیر کس بات کی...... اپنے محسن و مربی کو اپنے دکھ درد میں شریک کرلو...... ابھی اور اسی وقت......“

”اوکے...... آئی ایم گوئنگ ٹو ڈو!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس ایک بے اختیاری جملے کے ساتھ ہی میرے اندر سکون کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تپتے صحرا سے نکل کر کسی نخلستان میں آگیا ہوں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی انسان کو جہنم سے جنت میں شفٹ کردیا گیا ہو۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے سیل فون سے انکل سلطان کے نمبر پنچ کررہا تھا۔

رابطہ قائم ہونے پر انکل نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔ ”کیسے ہو میرے بچے؟“

”میں ٹھیک ہوں انکل۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”لیک جیکسن میں سب امن وامان ہے نا؟“

”مجھے نہیں معلوم انکل!“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک اٹھے۔ ”کیا تم لیک جیکسن میں نہیں ہو؟“

”نہیں......“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت لیک جیکسن اور ایبنگڈن کے درمیان رچ ووڈ کے نزدیک ہوں۔“

”تم وہاں کیا کررہے ہو؟“ ان کے لہجے میں تشویش در آئی۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”انکل...... میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت آپ کے قریب کوئی ہے تو نہیں۔ میرا مطلب ہے...... ابھی؟“

”نہیں۔ ایملی کچن میں ہے اور میں اس وقت اپنے بیڈروم میں ہوں۔“ انہوں نے بتایا پھر پوچھا۔ ”تم مجھ سے جو بھی کہنا چاہتے ہو، بے دریغ کہہ ڈالو۔“

انکل کے حوصلہ دلانے پر میری زبان کھل گئی۔

”انکل! میں گزشتہ رات ”چرچ چکن“ ریسٹورنٹ گیا تھا اور...... پیلو میرے ہی ہاتھوں شدید زخمی ہوا تھا......“

”اوہ خدایا...... میرے بچے! یہ تم نے کیا کرڈالا۔“ انکل کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ کسی بھی صورت میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا......“

”میں ہرگز پیلو کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔“ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک حادثہ ہے۔ میں تو اس سے شارو کے بارے میں پوچھ گچھ کررہا تھا۔ اسی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ لیونارڈو کئی روز سے کیوبا گیا ہوا ہے۔ میں پیلو کی زبان سے اگلوانا چاہتا تھا کہ لیونارڈو، شارو کو بھی اپنے ساتھ کیوبا لے گیا ہے یا اسے یہیں کہیں بند کرکے رکھا ہوا ہے لیکن اس نے زبان نہیں کھولی اور میں اسے مارتا چلا گیا......“

”اور تم نے اسے اتنا زدوکوب کیا کہ وہ جان ہی سے گزر گیا......!“ انکل کے لہجے سے شکایت جھلکتی تھی۔

"میں جب چرچ چکن کے کچن سے نکلا تو وہ زندہ تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے نہیں پتا' وہ کب اس دنیا سے رخصت ہوا۔"

"اب یہ پتا چلانے کی ضرورت ہے نہ فائدہ۔" انکل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ چیلو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا اور اس صورتِ حال میں ایک بات سراسر تمہارے حق میں جاتی ہے اور وہ یہ کہ پولیس کی تفتیش میں اور ٹی وی و اخبار کی خبروں میں کہیں تمہارا نام نہیں آیا۔"

"اور آئے گا بھی نہیں...... ان شاء اللہ!" میں نے پورے وثوق سے کہا۔ "لیک جیکسن میں کوئی نہیں جانتا کہ میں نے کل کا دن وہاں گزارا تھا اور گزشتہ رات میرا چیلو سے کوئی پھڈا ہوا تھا۔"

"گڈ......" وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولے۔ "اب تم چند روز تک لیک جیکسن کا رخ نہیں کرنا۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔" میں نے کہا۔ "جب اس معاملے کی گرد بیٹھ جائے گی تو پھر میں ادھر جاؤں گا۔"

"تم یہاں میرے پاس بے سٹی آجاؤ۔" انکل نے تجویز پیش کی۔ میں نے ان کی تجویز پر صاد کرنے سے پہلے پوچھا۔

"کیا ایملی کو یہ بات پتا ہے کہ میں گزشتہ صبح آپ کے پاس سے لیک جیکسن آیا تھا؟"

"نہیں۔ وہ یہ بات نہیں جانتی۔" انکل نے بتایا۔ "اسے بس یہ معلوم ہے کہ تم کل صبح یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ کہاں گئے ہو اور کب واپس آؤ گے یہ بات ایملی کے علم میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا لیکن چند روز کے بعد۔"

"اور یہ چند روز تم کہاں گزارنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"بوسٹن!" میں نے جواب دیا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ میرے پروگرام کی تائید میں بولے۔ "وہاں تمہارا ذہن بھی بٹے گا اور خوب دل بھی لگے گا کیونکہ بوسٹن میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ خصوصاً ناسا کا کینیڈی اسپیس سینٹر۔"

"جی بالکل۔ میں اسپیس سینٹر کا وزٹ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں پیسوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میرے والٹ میں متعدد کریڈٹ کارڈز موجود ہیں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "ان کارڈز کے ہوتے ہوئے مجھے کسی قسم کی کوئی مالی پریشانی کیوں ہوگی۔ آپ ہیں نا ان کارڈز کے بل بھرنے کے لیے۔"

"شیور میرے بچے!" وہ بڑے دلار سے بولے۔ "لیکن وہاں بوسٹن میں تم کوئی نئی حماقت نہیں کرو گے...... سمجھ گئے نا؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا انکل۔" میں نے شرمندگی بھرے انداز میں کہا۔ "انسان اپنی غلطیوں ہی سے سیکھتا ہے اور میں نے گزشتہ رات والی اپنی غلطی سے سیکھا ہے کہ جذبات سے مغلوب نہیں ہونا اور اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھنا ہے کیونکہ جوش میں انسان ہوش کھو بیٹھتا ہے جس کا نتیجہ افسوس اور پچھتاوے کی شکل ہی میں برآمد ہوتا ہے۔"

"شاباش میرے بچے!" وہ مطمئن انداز میں بولے۔ "تم انسانی نفسیات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ گاہے بہ گاہے مجھ سے فون پر رابطہ ضرور رکھنا۔ جب تک چیلو کی موت والا معاملہ دب دبا نہیں جاتا' میں لاشعوری اور شعوری طور پر تمہاری طرف سے فکرمند رہوں گا۔"

"اللہ خیر کرے گا انکل!" میں نے کہا۔ "آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ ان شاء اللہ! ہم جلد ملیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔ ٹیک کیئر اینڈ گڈ بائے۔"

"سیم ٹو یو مائی ڈیئر انکل۔" یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ موقوف کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ دو روز امن و سکون سے گزر گئے۔

بوسٹن میں کسی بھی جاننے والے سے میں نے رابطہ نہیں کیا تھا البتہ دن میں ایک آدھ بار بے سٹی فون کر کے میں انکل سلطان کو اپنی خیریت سے آگاہ کر دیا کرتا تھا تاکہ انہیں تسلی رہے کہ میں کسی مشکل میں نہیں ہوں۔

میں نے ائرپورٹ کے نزدیک ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ یہ ایک ٹو اسٹار ہوٹل تھا جہاں ہر قسم کی رہائشی سہولت میسر تھی۔ میں اگر چاہتا تو اپنے کسی بھی تعلق دار کے پاس رک کر بہت سارے خرچے بچا سکتا تھا لیکن مجھے یہ مناسب نہیں لگا۔ ویسے بھی میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، ان کا اولین تقاضا یہی تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ میں بوسٹن میں ہوں۔ میرے اس اقدام کا مقصد پیسے بچانا ہرگز نہیں تھا۔

دو دن میں' میں نے بوسٹن کے تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر مقامات دیکھ ڈالے۔ ان میں سے بعض میرے پہلے

سے دیکھے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ مزہ مجھے کینیڈی اسپیس سینٹر میں آیا۔ خلائی سائنس کا یہ قومی تحقیقاتی ادارہ یعنی ''ناسا'' پینتیس ویں امریکی صدر جان فٹز جیرالڈ کینیڈی کے نام کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ آج تک جے ایف کینیڈی کی موت ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔

میں روزانہ رات کو سونے سے پہلے اپنے دماغ کو ہدایت دینے کا عادی ہوں۔ آج کل میں جس قسم کے حالات کا شکار تھا اس میں تو اس نوعیت کی احتیاطی ہدایت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس رات بھی میں نے اپنے دماغ کو یہ ہدایت دی تھی۔

''میں نہایت پرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور صبح سات بجے میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر اس کمرے میں میری زندگی سے متعلق کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے کے آثار پیدا ہوئے تو میری آنکھ مقررہ وقت سے پہلے ہی فوراً کھل جائے گی۔''

میں لگ بھگ گیارہ بجے رات سونے کے لیے لیٹا تھا اور دماغی ہدایت کے مطابق، مجھے پورے آٹھ گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح سات بجے بیدار ہونا چاہیے تھا لیکن رات کے دو بجے میری آنکھ یکایک کھل گئی۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ میرے دماغ نے اگر مجھے مقررہ وقت سے پہلے جگا دیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرے کمرے میں کوئی گڑبڑ تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کمرے کی لائٹ آن کر دی پھر میری نگاہ کمرے کی ایک ایک چیز کا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔ سب کچھ نارمل اور اپنی جگہ پر تھا لیکن میرے دل میں اطمینان نہیں تھا۔ میرے دماغ نے کبھی مجھ سے دغا نہیں کی تھی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تو تھی......!

میں نے بستر چھوڑ دیا اور کمرے کے داخلی دروازے کو اچھی طرح چیک کیا۔ دروازہ مکمل لاک تھا۔ میں نے واش روم کے اندر اور بیڈ کے نیچے بھی جھانک کر دیکھ لیا مگر کوئی ایسی شے دکھائی نہ دی جسے میں مقررہ وقت سے پہلے بیدار ہونے کا سبب گردانتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دماغ نے کس ہنگامی بنیادوں پر مجھے مقررہ وقت سے پہلے جگا دیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ آنکھ تو کھل ہی گئی ہے اور نیند بھی اچاٹ ہو چکی ہے لہٰذا وقت گزاری کے لیے مجھے ٹی وی دیکھنا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ٹی وی آن کر دیا۔

میں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی وی پر مختلف چینلز بدل رہا تھا کہ ایک نیوز چینل پر پہنچ کر میں رک گیا۔ وہاں کسی نیوز کا فالو اَپ چل رہا تھا اور اسی فالو اَپ نے مجھے رکنے پر مجبور کیا تھا کیونکہ اس خبر کا تعلق میری ذات سے تھا۔

اس نیوز فالو اپ میں بتایا جا رہا تھا کہ گزشتہ دنوں ٹیکساس کے شہر لیک جیکسن میں پیلو نامی شخص کی جس بندے سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی، اس کے بارے میں پولیس کو اہم اطلاعات ملی ہیں۔ پیلو جس شخص کے ہاتھوں پٹ کر موت کے منہ میں چلا گیا وہ ایک نوجوان اور دراز قامت انسان ہے۔ وقوعہ کی رات مذکورہ نوجوان ''چرچ چکن'' ریسٹورنٹ سے نکل کر دی لاؤنج کی پارکنگ کی طرف گیا تھا اور وہاں سے ایک سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار پر سوار ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ پولیس کو سرخ اسپورٹ کار والے اس نوجوان کی تلاش ہے جس نے پیلو کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس چرچ چکن ریسٹورنٹ اور دی لاؤنج کی پارکنگ کے بیچ کنکشن کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی ہے......!

اس نیوز فالو اپ کو دیکھ کر میں بے چین ہو گیا۔ پولیس کی تفتیش بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھ رہی تھی، بہ الفاظ دیگر میری سمت بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ ابھی تک کہیں بھی میرا نام نہیں آیا تھا اور نہ ہی میرا اتا پتا ڈسکس کیا گیا تھا لیکن میری سرخ اسپورٹ کار پولیس کی دلچسپی کا مرکز بن چکی تھی۔

میں اس بات پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ ٹیکساس اسٹیٹ میں ہزاروں کی تعداد میں اسپورٹس کاریں جن میں سیکڑوں سرخ رنگ کی سانتا فی ہنڈائے بھی ہوں گی۔ میں پولیس کی تحقیق اور تفتیش کے طریقہ کار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر وہ انہی خطوط پر پیش قدمی کرتے چلے گئے تو وہ مطلوبہ سرخ اسپورٹ کار کا نمبر اور رجسٹریشن معلوم کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے پھر مجھ تک رسائی حاصل کرنا ان کے لیے چنداں مشکل ثابت نہیں ہوگا۔

میں نے ٹی وی کو آف کر دیا اور گہری سنجیدگی سے موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔ میرے ذہن نے ہرگز مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ میری زندگی کے حوالے سے ایک انتہائی اہم معاملے میں پیش رفت ہوئی تھی جس سے میں بے خبر تھا۔ اگر میں میٹھی نیند کے مزے لوٹتا رہتا تو یقیناً اگلے روز تک مجھے اپنی زندگی کے اس نازک پہلو سے بے خبر ہی رہنا تھا۔ میرے دماغ نے ہدایات کی پیروی کرتے ہوئے ذمے داری کا ثبوت دیا تھا اور مجھے گہری نیند سے جگا کر بتایا تھا...... یہ سونے کا نہیں جاگنے کا وقت ہے۔ اگر میں یونہی گھوڑے بیچ کر سوتا رہا تو حالات کا پانی میرے سر پر

گفتگو سن لی؟ ان کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اب مجھے دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔ میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر میری کسی بات سے تجھے دکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ دوسری بات یہ کہ تیری صلاحیتوں کے اعتراف کے باوجود غزنی کی حکومت تجھے نہیں ابو اسحٰق کو سونپنے کی وصیت کر رہا ہوں۔"

"حضور! میں تو ایک ادنیٰ سا غلام ہوں۔ یہ حق ابو اسحٰق کا ہی ہے جو انہیں ملنا چاہیے۔ میں جس طرح آپ کا غلام ویسا ہی ان کا غلام۔"

"میری بات غور سے سنتے رہو۔ مجھے معلوم ہے ابو اسحٰق میں حکومت کرنے کی اہلیت نہیں لیکن میری شفقت کا تقاضا ہے کہ میرے بعد میرا بیٹا تخت نشیں ہو۔ یہ بات بھی میرے پیش نظر ہے کہ تمہارا تخت نشیں ہونا ممکن ہے امراء کو پسند نہ آئے یا وہ اسے تمہاری کسی سازش کا حصہ سمجھیں اور نا اتفاقیاں میری محنت برباد کر دیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض امراء تمہیں اپنا حاکم دیکھنا چاہیں۔ تم لالچ میں آ کر کسی سازش کا حصہ مت بننا ورنہ کسی کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ ابو اسحٰق کے پردے میں تم حکومت کرنا۔ اگر وہ تمہیں ایسا کرنے دے۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد الپتگین کی سانس اکھڑنے لگی۔ سبکتگین کو یہ موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ ان باتوں پر عمل کرنے کی تائید کر سکے۔ وہ اتنی زور سے چیخا کہ دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ اجازت لیے بغیر کمرے میں آ گئے۔

"کیا ہوا مالک! آقا کی طبیعت......"

"حکیم ابو علی کو فوری خبر کرو۔ امیر ابو اسحٰق اگر اپنے محل میں ہیں تو انہیں یہاں ہونا چاہیے۔ ہم سب کے آقا کی حالت غیر ہو رہی ہے۔"

محافظ الٹے قدموں کمرے سے نکل گئے۔

حکیم ابو علی اور دوسرے اطبا الپتگین کی بیماری کے سبب محل ہی میں قیام پذیر تھے۔ فوراً حاضر ہو گئے البتہ ابو اسحٰق کو آنے میں قدرے دیر لگی۔ اس وقت تک الپتگین کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ محل کی دیواریں سوگواری کی چادر اوڑھ کر کھڑی ہو گئیں۔ آہ و بکا کی صدائیں گونجنے لگیں۔

اس افراتفری میں کوئی دشمن اپنی چال چل سکتا تھا۔ سبکتگین نے اسی رات اپنے لشکر کو غزنی کی سرحدوں کی طرف بھیج دیا تا کہ کوئی غنیم تخت خالی دیکھ کر غزنی پر حملہ آور نہ ہو جائے۔

دن نکلا تو اس سوگ میں پورا غزنی شریک ہو گیا۔ بازار بند ہو گئے۔ ہر شہری نے ماتمی لباس زیب تن کر لیا۔ الپتگین کی مقبولیت ایسی تھی کہ ہر آنکھ اشک بار تھی۔

الپتگین کی تدفین کے بعد محل اور شہر تین دن تک سوگ میں ڈوبا رہا۔ تین دن بعد سبکتگین نے تمام امراء کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے الپتگین کی وصیت بیان کی۔ کسی کو کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔ اختلاف تو جب ہوتا جب وہ اپنا نام پیش کرتا۔ ابو اسحٰق تو الپتگین کا بیٹا تھا۔ اس کے نام پر سب نے اتفاق کیا اور ایک چھوٹی سی تقریب میں ابو اسحٰق کو

سے گزر جائے گا۔ پھر سنبھلنا اور بچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔

موجودہ صورت حال کو ٹیکل کرنے کا سیدھا سادہ اور امن پسند ذمے دارانہ طریقہ تو یہ تھا کہ میں خود کو لیک جیکسن پولیس کے سامنے پیش کر دیتا۔ انہیں پوری تفصیل سے بتاتا کہ میری پبلو سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی میں اس کی جان لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں تو صرف اپنی دوست شارو کو تلاش کر رہا تھا اور اسی سلسلے میں پبلو سے میری پوچھ تاچھ جاری تھی لیکن ہمارے بیچ تلخ کلامی، مارا ماری میں بدل گئی اور پھر وہ واقعہ پیش آ گیا جو میری نظر میں ایک حادثہ ہے۔

شارو کی گم شدگی کی رپورٹ ''بی سی پی ڈی'' میں درج تھی اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ بے ٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ اور وہاں کا میئر مارک بر کر شارو کی تلاش میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ وا ہو سکتا تھا۔ ''ایل جے پی ڈی'' والے مجھے بالکل بری الذمہ تو قرار نہیں دے سکتے تھے کیونکہ میرے ہاتھ سے ایک شخص کی جان گئی تھی۔ مجھے بھاری جرمانہ اور کوئی چھوٹی موٹی سزا ہو سکتی تھی اور...... یہی میں نہیں چاہتا تھا۔

میں جرمانہ ادا کرنے یا کوئی ہلکی سزا سے نہیں ڈرتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سزا کی صورت میں مجھے کچھ عرصہ جیل کسٹڈی ہو سکتی تھی لہٰذا اس صورت میں، میں شارو کو تلاش نہیں کر سکتا تھا یعنی کچھ عرصے کے لیے مجھے اس مشن سے خود کو الگ کرنا پڑتا اور...... یہ مجھے کسی بھی طور پر منظور نہیں تھا۔ مجھے ہر قیمت پر شارو کو ڈھونڈ نکالنا تھا لہٰذا خود کو قانون کے حوالے کرنا فی الحال میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔

میں نے فوری طور پر بنجامن سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ رات سوا دو بجے تھے۔ اس وقت تک ونی لاؤنج بند ہو چکا ہوگا لیکن آخری ٹیلی فونک گفتگو میں، میں نے بنجامن کا سیل نمبر لیا تھا لہٰذا میں نے وہی نمبر ٹرائی کیا۔

''ہیلو بنجامن!'' رابطہ ہونے پر میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''ویری سوری، اس وقت آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں فون کرنے پر مجبور ہو گیا۔''

''ان تکلفات کی ضرورت نہیں مسٹر علی۔'' وہ نرمی سے بولا۔ ''آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گھر پہنچا ہوں۔ میں چونکہ جاگ رہا ہوں اس لیے ڈسٹرب کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے اسے اپنے حوالے سے نیوز فالو اپ کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، میرے نزدیک پولیس کا دائرہ تنگ نہیں ہوتا جا رہا؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے علی۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''میں کل ہی آپ کو اس بارے میں بتا دیتا لیکن میرے پاس آپ کا کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ کل پولیس ہمارے لاؤنج میں بھی پوچھ گچھ کرنے دوبارہ آئی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''انہوں نے آپ سے کس قسم کے سوالات کیے؟''

''آپ جانتے ہیں، ونی لاؤنج اور چرچ چکن ایک دوسرے کے بہت قریب واقع ہیں لہٰذا تفتیش بالکل قدرتی بات ہے۔''

بنجامن نے بتایا۔ ''پھر پولیس کے ذرائع کے مطابق پبلو پر تشدد کرنے والا دراز قد نوجوان چرچ چکن کے کچن سے نکل کر ونی لاؤنج کی پارکنگ میں آیا تھا پھر سرخ اسپورٹ ہنڈائے کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوا تھا چنانچہ پولیس یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نامعلوم دراز قامت نوجوان کا ونی لاؤنج یا اس کی پارکنگ سے کیا تعلق ہے۔''

''پھر آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اپنی مکمل لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔'' بنجامن نے بتایا۔ ''میں نے ان سے کہا کہ اگر کوئی شخص ونی لاؤنج کی پارکنگ میں اپنی کار کھڑی کر کے چرچ چکن جاتا ہے اور وہاں مار پیٹ کی کوئی واردات کرتا ہے تو اس معاملے کا کنکشن ونی لاؤنج سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہاں یہ بات میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ وقوعہ کی رات پولیس کو مطلوب نوجوان ونی لاؤنج نہیں آیا تھا اور نہ ہی میں نے اسے کہیں اور دیکھا ہے بلکہ میں ایسے کسی شخص کو جانتا تک نہیں۔''

''ویری گڈ مسٹر بنجامن!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ نے بہت عمدہ اور محفوظ ڈپلومیٹک جواب دیا ہے۔''

''آپ کچھ عرصے کے لیے لیک جیکسن سے دور ہی رہیں تو اچھا ہوگا۔'' بنجامن نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کیونکہ پبلو والے معاملے کی پیروی کارلوس نامی ایک شخص کر رہا ہے۔ کارلوس نے پولیس پر دباؤ ڈال رکھا ہے کہ وہ جلد از جلد پبلو کے قاتل کو گرفتار کرے اس لیے

آپ کو بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''
کارلوس کے نام پر میں چونک اٹھا تھا۔ جب میں پیلو کو زیر کرنے کے بعد اس سے شارو کے بارے میں تفتیش کر رہا تھا تو یہ نام پیلو کی زبان پر آیا تھا۔
''میری معلومات کے مطابق' یہ کارلوس تو لیونارڈو اور پیلو کا باس ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟'' بنجامن نے سوال کیا۔
''خود پیلو نے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جب میں پیلو سے شارو کے حوالے سے سوال جواب کر رہا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ لیونارڈو کو با گیا ہوا ہے اور شارو اس وقت کہاں ہے اس بارے میں صرف باس جانتا ہے۔ میں نے پوچھا، کون باس؟ تو اس نے بتایا' کارلوس۔ میں نے استفسار کیا یہ کارلوس کہاں ملے گا' تو اس نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا جس پر میں نے اس کی بے دریغ پٹائی کر ڈالی تھی......''
''میں یہ تو نہیں جانتا کہ کارلوس ان لوگوں کا باس ہے البتہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ کارلوس کوئی اچھا آدمی نہیں۔'' بنجامن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کارلوس کا تعلق بھی جرائم کی دنیا سے ہے لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر اور خود کو پردے میں رکھ کر کام کرتا ہے۔ معاشرے میں اس کی حیثیت بہ ظاہر ایک شریف شہری کی ہے لہٰذا پولیس اس سے مکمل تعاون کر رہی ہے۔''
''ٹھیک ہے مسٹر بنجامن! اب آپ آرام کریں۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ جب اوکھلی میں سر دے دیا ہے تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔''
''گاڈ بلیس یو مسٹر علی!'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔
''کوئی نئی ڈیولپ منٹ ہو تو آپ مجھے انفارم کیجیے گا۔'' میں نے کہا۔
اس نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''آف کورس مسٹر علی!''
''تھینکس اینڈ گڈ نائٹ۔'' میں نے الوداعی کلمات ادا کر دیے۔
دوسری جانب بنجامن نے بھی مجھے ''گڈ نائٹ'' کہا پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک بلکہ سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔
ونی لاؤنج کا منیجر بنجامن مثبت سوچ رکھنے والا ایک معقول انسان تھا۔ میں اس پر مکمل بھروسا کر سکتا تھا۔ اس مصیبت سے بچانے کے لیے وہ مجھ سے بھرپور تعاون کر رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ آئندہ بھی میرے ساتھ اس کا رویہ ایسا ہی دوستانہ رہے گا اور وہ مجھے ہر خطرے سے باخبر کرتا رہے گا۔
اس تمام تر ہنگامی صورتِ حال میں انکل سلطان بھی میرے ذہن میں موجود تھے۔ اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ابھی تک پولیس کی تازہ ترین تحقیق و تفتیش سے واقف نہیں تھے ورنہ پیلو مرڈر کیس میں سرخ اسپورٹ کار اور دراز قامت نوجوان کا نام سامنے آجانے پر وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرتے۔ اگر ان کی جانب خاموشی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ انکل پولیس کی تازہ ترین ڈیولپ منٹ سے ابھی تک آگاہ نہیں تھے۔
مشکل یہ تھی کہ انکل کو ہمیشہ اس خبر سے بے خبر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ آئندہ روز کسی نہ کسی خبر رساں ذرائع کے توسط سے یہ بریکنگ نیوز لیک جیکسن سے بے سٹی بھی پہنچنا تھی اور انکل سلطان کو بھی اس سے آگاہ ہونا تھا۔ یقیناً یہ خبر انکل کے لیے کسی عظیم صدمے سے کم نہ ہوتی۔ میں ان کی اذیت کا تصور کر کے بے حد مضطرب ہو گیا۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں بے چینی کے عالم میں ایک دیوار سے دوسری دیوار کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ اس ٹہل کو مارننگ یا ایوننگ واک کی چہل قدمی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بلکہ ان لمحات میں میرا انگ انگ سپرِ عذاب تھا۔ میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح خود کو اس سچویشن سے نکالوں......؟
پھر کسی معجزے کی طرح ایک نام میرے ذہن میں چمکا اور اگلے ہی لمحے مجھے ایک ڈھارس کا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ اگر میں موجودہ صورتِ حال میں اس سے مدد مانگوں تو میری مصیبت ٹل سکتی ہے' میری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ یہ ایسا وقت نہیں تھا کہ کسی کو سوتے سے جگا کر اپنی پتا سنائی جائے لیکن مشکل گھڑی کسی خاص وقت یا موقع کی محتاج نہیں ہوتی، نہ ہی وہ آپ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد قدم رنجہ فرماتی ہے۔ مصیبت کی تو پہلی پہچان اور پہلا تعارف یہی ہے کہ یہ کسی بھی وقت کسی پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔
'جب مصیبت کے نزول کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں تو پھر ایک مصیبت زدہ انسان کو بھی بہت سارے الاؤنس حاصل ہو جاتے ہیں۔ وہ افتاد پڑنے پر کسی بھی وقت اپنے ہمدرد، اپنے سہولت کار کو پکار سکتا ہے۔' اپنے والد کو کھونے کے دوران میں میرے ذہن میں ان کے یہ الفاظ بھی گونج رہے تھے۔

''مجھے بہادر اور جی دار لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور میں ایسے افراد کی بہت قدر کرتی ہوں۔ تمہیں اگر زندگی میں کبھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو یاد کر لینا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔''

میں اس ہسپانوی طرح دار لیڈی کا وزیٹنگ کارڈ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے ایک رات ہائی وے ڈبل تھری ٹو پر میری اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ میں لیونارڈو کے غنڈوں سے نبرد آزما تھا اور وہ سلور اوڈی میں وہاں اچانک وارد ہوئی تھی پھر اس کے گن بردار باڈی گارڈ نما ڈرائیور کے دھمکانے پر وہ غنڈے وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ اسی موقع پر چار چھلوں والی سلور اوڈی کی عقبی نشست پر براجمان ڈیلفینا نے میری بہادری کی تعریف کرتے ہوئے مجھے یہ پیش کش کی تھی۔

ڈائلنگ مکمل ہونے پر دوسری جانب بیل بجی پھر فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ یہ جان کر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ رات کے اس پہر وہ جاگ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے گمان گزرا کہ کہیں رانگ نمبر تو نہیں لگ گیا لہٰذا میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہیلو...... ایٹ ڈبل زیرو ڈبل فور فائیو ڈبل زیرو نائن زیرو؟''

''آف کورس۔'' دوسری طرف سے مردانہ آواز میں تصدیق کی گئی۔ ''اینڈ دس از سان لوئی ریزوٹ۔''

''سان لوئی ریزوٹ؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''یس! سان لوئی ریزوٹ۔ سی وال بلیوارڈ گیلویسٹن۔'' اس شخص نے وضاحت کی پھر پوچھا۔ ''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

میں تو توقع کر رہا تھا کہ اس کال کے نتیجے میں ڈیلفینا سے بات ہوگی لیکن یہاں کوئی اور ہی قصہ نکل آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ذہن میں یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ شاید ڈیلفینا نے مجھے الّو بنایا ہے لیکن دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ چار چھلوں والی اوڈی پر سوار خوب رو ہسپانوی دوشیزہ میرے ساتھ ایسا گھٹیا مذاق بھی کر سکتی ہے۔ میں نے بڑے اعتماد سے جواب میں کہا۔

''مے آئی اسپیک ٹو میڈم ڈیلفینا؟''

''اوہ......'' دوسری جانب بولنے والے نے گہری سانس خارج کی اور بتایا۔ ''میڈم تو اس وقت ریزوٹ میں موجود نہیں ہیں۔''

''لیکن انہوں نے تو مجھے یہی نمبر دیا تھا۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔

''یقیناً دیا ہوگا۔'' وہ شخص نرمی سے بولا۔ ''میڈم بعض اوقات سان لوئی ریزوٹ پر بھی ہوتی ہیں لیکن اس وقت وہ آؤٹ آف اسٹیشن ہیں۔''

''وہ جہاں بھی ہیں پلیز ان سے میرا کانٹیکٹ کرا دیں۔'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''بہت ہی سیریس میٹر ہے۔''

''آپ کا تعارف؟'' اس نے احترام بھرے انداز میں پوچھا۔

''اسد علی!'' میں نے بتایا۔ ''میڈم ڈیلفینا مجھے جانتی ہیں۔''

''ظاہر ہے...... ان کا نمبر کسی ایسے شخص کے پاس ہو ہی نہیں سکتا جو ان کے لیے قابل بھروسا نہ ہو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مسٹر علی! آپ فون بند کریں۔ میڈم تک آپ کی بات پہنچائی جا رہی ہے۔ وہ مناسب سمجھیں گی تو آپ سے رابطہ کر لیں گی۔''

''وہ ہیں کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا تو ہے' آؤٹ آف اسٹیشن ہیں۔''

''اس آؤٹ آف اسٹیشن کا کوئی نام تو ہوگا؟'' میں نے ضدی لہجے میں استفسار کیا۔

ادھر میرا جملہ مکمل ہوا' ادھر ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہو گیا۔ فون کسی تکنیکی خرابی کے باعث بند نہیں ہوا تھا بلکہ دوسری جانب سان لوئی ریزوٹ گیلویسٹن سے بولنے والے نے دانستہ ریسیور کریڈل کر کے بتایا تھا کہ مجھے انتظار کی سولی پر چڑھ جانا چاہیے۔

میں اس وقت ہوسٹن کے ایک ہوٹل کے کمرے میں تھا اور وہ شخص کم و بیش پچاسی کلومیٹر دور گیلویسٹن میں تھا۔ میں یہاں سے ہاتھ دراز کر کے اس کا گریبان پکڑ کر یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ تم نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر فون بند کیوں کر دیا؟ اگر میں اپنی کار میں سوار ہو کر اس کی سرزنش کرنے بھی جاتا تو ایک گھنٹا لگ ہی جاتا لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں انتظار کروں۔

ڈیلفینا نے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ میرے سیل فون کے ڈسپلے پر ایک انجان نمبر چمکنے لگا۔ ایریا کوڈ سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ فون کرنے والا اس وقت ڈیلس میں تھا۔

''ہیلو۔'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ''علی

اسپیکنگ!‘‘

’’علی! کیسے ہو؟‘‘ ایک مترنم نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ’’اتنی رات گئے رابطہ..... تم خیریت سے تو ہو؟‘‘

’’کیا میں یقین کرلوں کہ اس وقت میں میڈم ڈیلفینا سے ہم کلام ہوں؟‘‘

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ میں ڈیلفینا کی آواز کا اچھی طرح شناسا نہیں تھا۔ ہماری صرف ایک ہی مختصر سی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی چند لمحات کی اور پھر فون پر ویسے بھی انسان کی آواز میں کافی تبدیلی آجاتی ہے۔ میں تصدیق کیے بغیر کسی غیر متعلق شخص سے اپنا معاملہ شیئر نہیں کرسکتا تھا۔

’’یس، آف کورس۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’دس از ڈیلفینا...... مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟‘‘

’’میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور آپ کی مدد چاہیے۔‘‘

’’ظاہر ہے کوئی مصیبت زدہ ہی اتنی رات گئے مدد کے لیے پکارتا ہے۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ’’علی! بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟‘‘

’’یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ آپ میرے لیے کیا کرسکتی ہیں۔‘‘

’’تو پھر اس جان کاری میں وقت برباد نہ کرو۔‘‘ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ’’فوراً اپنا مسئلہ بیان کرو۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔‘‘

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا۔

’’علی! تم اس وقت کہاں ہو؟‘‘

’’ہوسٹن میں۔‘‘ میں نے بتایا۔

’’ہوسٹن میں کدھر؟‘‘

’’ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

اس نے استفسار کیا۔ ’’ہوٹل کا نام؟‘‘

’’ہابی ائرپورٹ ان۔‘‘

’’اوہ..... تم تو ائرپورٹ کے بہت قریب ہو۔ صرف ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اب میں جو کہوں غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرتے جاؤ۔ آر یو ریڈی؟‘‘

’’یس..... آئی ایم۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

’’اپنا ضروری سامان سمیٹو اور ہوٹل سے نکل آؤ۔‘‘ وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

’’مجھے کہاں جانا ہوگا؟‘‘ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’تمہیں ڈیلس آنا ہے..... میرے پاس۔‘‘ وہ حتمی انداز میں بولی۔

’’اپنی گاڑی میں آؤں نا؟‘‘

’’نن..... نہیں۔‘‘ وہ قطعیت سے بولی۔ ’’ہوسٹن سے ڈیلس تین سو بیاسی کلومیٹر کی دوری پر ہے اور یہ کار میں تقریباً سوا تین گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ جن حالات سے تم اس وقت گزر رہے ہو ان میں لانگ ڈرائیو خطرے سے خالی نہیں اور وہ بھی تمہاری سرخ اسپورٹ کار پر جو ’’ایل جے پی ڈی‘‘ کو مطلوب ہے!‘‘

’’پھر مجھے کیسے ڈیلس پہنچنا ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بائی ائر۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’کیا تم ابھی تک ہوٹل کے کمرے ہی میں ہو؟‘‘

’’بس نکل رہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن اس وقت مجھے ڈیلس کے لیے کون سے فلائٹ ملے گی اور وہ بھی بغیر ریزرویشن کے......؟‘‘

’’تم اپنے دڑبے سے تو نکلو..... سب ہوجائے گا۔‘‘ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ’’اور جب تک میں ’’گڈ مارننگ‘‘ نہ کہوں، تم فون بند نہیں کروگے..... اوکے!‘‘

’’اوکے میڈم!‘‘ میں نے بیگ کو کندھے پر ڈالا اور ہوٹل سے نکل آیا پھر پوچھا۔ ’’میں تو ائرسروس سے ڈیلس آؤں گا پھر میری کار کا کیا ہوگا؟‘‘

’’تم کار کی فکر نہ کرو۔‘‘ وہ بے پروائی سے بولی۔ ’’اسے ٹھکانے لگادیا جائے گا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے چونک کر کہا۔

’’مطلب یہ کہ تمہاری کار کو ہوٹل کی پارکنگ سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کردیا جائے گا۔‘‘ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی پھر استفسار کیا۔ ’’کیا تم ہوٹل سے باہر نکل آئے؟‘‘

’’ہاں..... نکل آیا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’بتائیں، اب کیا کروں؟‘‘

’’تم اس وقت ائرپورٹ بلیوارڈ پر ہو۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’تمہارے ہوٹل سے ہوسٹن ولیم ہابی ائرپورٹ صرف ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تم خراماں خراماں ائرپورٹ کی سمت چلنا شروع کردو۔‘‘

"کیا مجھے پیدل ہی ائرپورٹ پہنچنا ہوگا؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"ائرپورٹ بلیوارڈ پر ایک سیاہ گاڑی تمہارے نزدیک آکر رکے گی اور ڈرائیور تمہیں مخاطب کرکے کہے گا۔ "گیٹ ان مسٹر علی!" تم اس گاڑی میں بیٹھ جانا۔ وہ تمہیں ائرپورٹ پہنچادے گا۔ صبح سات بج کر بیس منٹ پر یونائیٹڈ ائرلائن کی فلائٹ یو اے۔ ون سیون نائن یوسٹن ولیم ہابی ائرپورٹ سے ڈیلس لووفیلڈ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگی۔ سوا آٹھ بجے صبح تم ڈیلس کی فضا میں داخل ہوجاؤ گے اور آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ پر تمہارا جہاز ڈیلس لووفیلڈ ائرپورٹ پر لینڈ کرے گا۔"

"اور ٹکٹ وغیرہ......"

میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "سیاہ گاڑی والا شخص تمہیں ائرپورٹ پر ڈراپ کرنے سے پہلے سب کچھ سمجھادے گا۔"

ڈیلفینا کی باتیں کسی اور دنیا کی محسوس ہوتی تھیں۔ اس قسم کا سیٹ اپ یا تو فلموں میں نظر آتا ہے یا پھر جادوئی ناولوں میں ناممکن چیزیں بالکل اسی طرح ممکن ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان تھا اور مادی عملی دنیا میں تھا۔ ڈیلفینا کی بہت سے باتیں مجھے ہضم نہیں ہوئیں تو میں نے پوچھا۔

"تم اتنے کم وقت میں یہ سب انتظامات کیسے کرلوگی؟"

"جب اپنی آنکھوں سے یہ سب ہوتا دیکھو گے تو تمہیں خود بہ خود یقین آجائے گا۔" وہ معتدل انداز میں بولی۔ "میں قبل از وقت کوئی وضاحت نہیں کرسکتی۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم امریکا کی فرسٹ لیڈی ہو جو تمہارے اشارے پر چٹکی بجاتے میں یہ بندوبست ہوجائے گا؟"

"نونسنس!" اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یا تم کوئی جن زادی یا کوئی جادوگرنی ہو۔" میں نے پوچھا۔ "جو جادو کی چھڑی گھما کر تم کوئی حیرت کار دکھاؤ گی۔"

"جب مجھ سے ملو گے تو پتا چل جائے گا کہ میں جن زادی ہوں یا جادوگرنی!" اس نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔"

"ڈیلس میں تم سے کہاں ملاقات ہوگی؟" میں نے دلچسپی سے جاننا چاہا۔

"ڈیلس لووفیلڈ ائرپورٹ پر اترنے کے بعد تمہیں جس ایڈریس پر پہنچنا ہے، وہ میں تمہیں ٹیکسٹ کررہی ہوں۔" اس نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اینڈ گڈ مارننگ..... !"

میں نے جواباً "گڈ مارننگ" کے الفاظ ادا کیے لیکن قبل اس کے کہ میرے یہ الفاظ ڈیلفینا کی سماعت تک رسائی حاصل کرتے، لائن بے جان ہوچکی تھی۔ میرے ذہن میں ڈیلفینا کے الفاظ گھوم گئے۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا...... "جب تک میں گڈ مارننگ نہ کہوں، تم فون بند نہیں کروگے!"

گویا اس کا مجھ سے بات کرنے کا ارادہ "گڈ مارننگ" کہنے تک ہی کا تھا اور اپنی کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔ ڈیلفینا کی اب تک کی گفتگو نے مجھے الجھن آمیز حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، بادی النظر میں وہ ایک مذاق ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے لہجے سے جھلکتا اعتماد اس امر کی غمازی کرتا تھا کہ وہ زبان کی دھنی ہے، اس نے جو بھی دعوے کیے ہیں وہ انہیں پورا بھی کرکے دکھائے گی۔

میں اس ولولہ انگیز مہم جو ہسپانوی حسینہ کی طوفانی اداؤں پر غور کررہا تھا کہ میرے سیل فون کی میسج ٹون بج اٹھی۔ یہ میسج اسی نمبر سے بھیجا گیا تھا جس پر چند لمحے پہلے میری ڈیلفینا سے بات ہوئی تھی۔

میں نے میسج کو اوپن کیا پھر ٹیکسٹ کو پڑھنے لگا۔

"سکستھ فلور میوزیم، ڈیلی پلازا، فور ڈبل ون ایلم اسٹریٹ، ڈیلس، ٹیکساس"۔ اس کے نیچے یہ فون نمبر بھی دیا گیا تھا..... "ٹو ون فور سیون فور سیون ٹرپل سکس زیرو۔"

"ایلم اسٹریٹ" کے الفاظ سے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا...... اور یک بہ یک زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے اور میں سنسان ائرپورٹ بلیوارڈ کے کنارے کھڑا گردوپیش کے سناٹے کو خوف زدہ نظر سے کھوج رہا تھا۔ ان لمحات میں میرے رونگٹے کھڑے تھے اور لاشعوری طور پر میں کسی عفریت کے ممکنہ خوفناک حملے سے خود کو بچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اسی وقت ایک سیاہ گاڑی میرے نزدیک آکر رکی۔

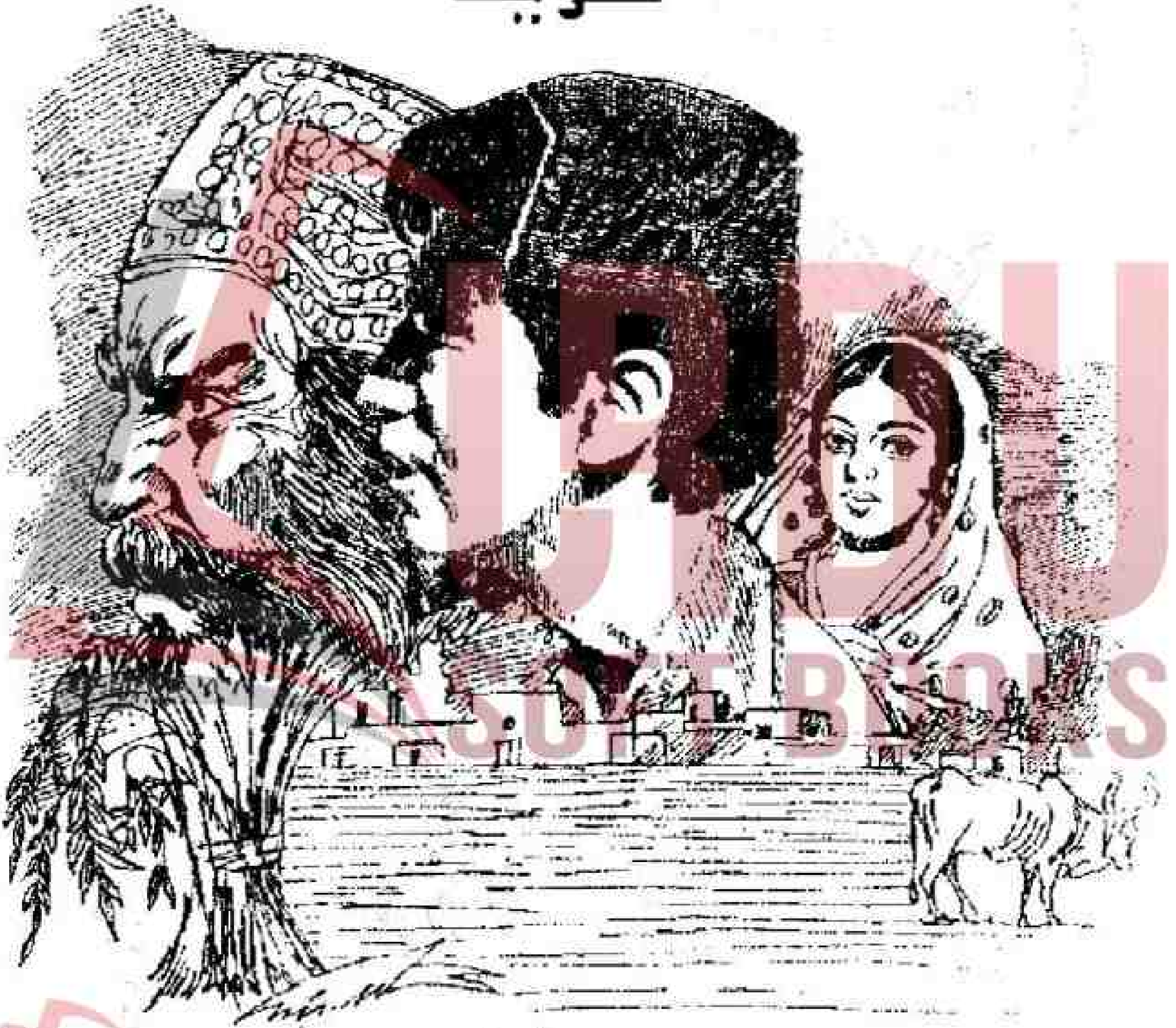
امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے سحر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

زندگی بے بھروسا ہے اور انسان کی فطرت ... اس سے بھی زیادہ... احساس تک نہیں ہو پاتا کہ کب کیا ہو جائے اور کس سمت سے حملہ آور ہو [illegible] بھی کچھ [illegible] انتقامی صورت حال میں قید تنہا اور... انتقام [illegible] چاہت کی سلگتی راکھ میں دبا ایک بھڑکا [illegible] کتنی ہی زندگیاں جل کر خاکستر ہو گئیں۔

نادانی میں بھڑکے شعلوں سے کھیلنے والے ایک نوجوان کا قصہ

محمد الیاس

تعزیت



ہمیں [illegible] سے بڑا صدمہ ہوا۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں [illegible] جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے [illegible] ہوتا ہے... یہ بتے ہوئے اندر ہی اندر سے شرمندگی محسوس ہوتی لیکن تھی۔ ہم سب پڑھا دے کر جب ماتم والے گھر سے [illegible]

نکلتے ہیں تو اگلے ہی لمحے اپنے روزمرہ کے معمولات کی جانب رجوع کرلیتے ہیں۔ چاچا خداداد کا اکلوتا شیر جوان بیٹا محمد نواز، المناک موت مرگیا۔ بلاشبہ انسانی سطح پر یہ ایک بڑا المیہ ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تھا، وہ یہ کہ معاشرے سے ایک جرائم پیشہ شخص کم ہوگیا۔ گویا چاچا خداداد پر وارد ہونے والا سانحہ، امن پسند اور شریف شہریوں کے نزدیک ایک لحاظ سے باعثِ اطمینان ثابت ہوا۔

مرنے والا ہم تینوں دوستوں کا دسویں جماعت تک ہم مکتب رہا۔ تب اس نے سولہ سترہ سال کی عمر میں پہلی بڑی واردات کرڈالی۔ یوں حصولِ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ممکن ہے اس سے قبل بھی وہ چھوٹی موٹی کارروائیاں ڈال چکا ہو۔ لیکن پھیری والے کپڑا فروش پٹھان کا قتل معما بن گیا۔ اصل گل، شہر کے مضافات اور قریب کے دیہاتوں میں بائیسکل پر گھوم پھر کے کپڑا بیچا کرتا تھا۔ ہم مضافات والوں اور آس پاس کے دیہاتیوں کے ساتھ اُس چالیس پینتالیس سالہ خوش مزاج پٹھان نے اچھے مراسم قائم کر رکھے تھے۔ وہ زیادہ تر ادھار کپڑا بیچا کرتا اور بہت زیادہ منافع لیتا۔ بڑی منفرد اور مزے کی آواز لگایا کرتا۔ ''کاپڑا لیو کاپڑا۔'' اُس نے گرمیوں کے موسم میں پرانا ادھار وصول نہ ہونے پر پچھاں والی مسجد کے مولوی صاحب کی بے عزتی کردی، جن سے میں... اور محمد نواز کے علاوہ بہت سے لڑکے لڑکیوں نے بچپن میں سبق پڑھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب بہت شریف لیکن سفید پوش تھے، ممکن ہے ادھار نہ چکا سکے ہوں۔ ہم سب آج تک اُن کا دل سے احترام کرتے ہیں، جب کہ محمد نواز کا معاملہ اور تھا، یعنی دل کا۔ زیادہ تر لڑکے اور بڑے بھی جانتے ہیں کہ مولوی صاحب کی بیٹی زینب اور نواز ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے۔ یہ ایک الگ درد بھری کہانی ہے۔ نواز ہم سے کہا کرتا کہ لوگ سسی پنوں اور ہیر رانجھا کا عشق بھول جائیں گے۔

نواز کو جب معلوم ہوا کہ اصل گل نے مولوی صاحب کو بے عزت کیا ہے تو غصے سے پاگل ہوگیا۔ کلہاڑی لے کر اُس کے تعاقب میں کھیتوں کے بیچوں بیچ اچھلتا کودتا بھاگتا ہوا نہر کنارے جا پہنچا، جہاں اصل گل چلچلاتی دھوپ سے بچنے اور پسینا خشک کرنے کے لیے درخت کے نیچے دم لینے کو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پگڑی اتار کر پلو سے چہرہ اور گردن پونچھ رہا تھا کہ نواز سر پر جا پہنچا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ دبلا پتلا نوعمر لڑکا کس نیت سے آیا ہے اور اپنے سے دگنی جسامت کے توانا مرد سے بے خطر بھڑ جائے گا۔ پہلا وار ہی ایسا کاری ہوا کہ کھوپڑی اور ماتھے کے کچھ حصے پر تین چار انچ لمبا عمودی شگاف پڑ گیا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا اور سنبھلنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ہی بغلی جیب سے ریوالور نکال لیا لیکن اسی اثنا میں کلہاڑی کی دوسری ضرب اُس کے بائیں کندھے اور گردن کے جوڑ پر پڑی۔ تیسرا وار دائیں کلائی پر ہوا، جس کے نتیجے میں ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

سرخی مائل گدلے پانی سے لبالب بھری نہر میں بہتی لاش جب آٹھ دس کلومیٹر کا سفر طے کرچکی تو لوگوں کی نظر میں آئی۔ تن پر شلوار رہ گئی یا قمیص کے نیچے بنڈی تاہم کسی جیب میں کوئی شے نہ پائی گئی۔ اس کے باوجود سب لوگ پہچان گئے کہ عرصہ دراز سے علاقے میں گھوم پھر کر کپڑا بیچنے والا اصل گل نامی پٹھان ہے۔ پولیس کے لیے معما بن گیا کہ قتل کی واردات کس مقام پر ہوئی اور مقتول کا سازوسامان کہاں گیا۔ بادی النظر میں یہی سمجھا گیا کہ کسی جرائم پیشہ گروہ نے پردیسی کو نقدی اور قیمتی پارچہ جات سے محروم کرنے کی غرض سے قتل کیا۔ علاقے کی فضا کئی روز تک سوگوار رہی۔ مقتول کی کم و بیش سبھی سے واقفیت تھی اور وہ ہم لڑکوں سے بھی بے تکلفانہ گپ شپ لگایا کرتا۔ دیس دیس سے آئی ہوئی طرح طرح کی اشیا ہمیں دکھایا کرتا۔ کئی بار اپنے ریوالور اور کمانی دار چاقو کی نمائش بھی کی۔

ایسے ہی ایک موقع پر ہم کچھ لڑکے نواز کے ڈیرے پر بیٹھے تھے اور اصل گل ریوالور ہاتھ میں لیے اس کی خوبیاں بتا رہا تھا کہ چاچا خداداد بول پڑا۔ ''اوئے پٹھانا! یہ کھلونے بچوں کو مت دکھایا کر۔ شریف گھروں کے لڑکوں کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم دراصل خود اندر سے ڈرے ہوئے ہو...... اس لیے کہ کوئی کسی روز تیرا مال نہ چھین لے......''

مجھے سردیوں کی وہ رات آج بھی یاد ہے۔ چاچا آٹھ دس قدم دور چارپائی پر نیم دراز ہوا حقہ گڑگڑاتے ہوئے دھوپ تاپ رہا تھا۔ دو چار پائیوں پر ہم دو درجن بھر لڑکوں میں گھرا اصل گل کھوکھلا قہقہہ لگا کر بول پڑا۔ ''چودھری! ہم ڈرتا ورتا کسی سے نہیں۔ اسلحہ مرد کا زیور ہوتا ہے۔ لڑکوں کو دکھانے میں کوئی خرابی نہیں۔'' چاچا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''سیانوں سے یہی سنا ہے کہ ڈرپوک بندہ اسلحے کا ڈراوا دیتا ہے۔ برا وقت آنے پر یہ سب ڈراوے بیکار ہوجاتے ہیں۔ موقع ہی نہیں ملتا...... بہرحال تمہاری اپنی سوچ ہے، میں ان چیزوں کو فضول سمجھتا ہوں۔'' چاچا نے کہا۔

پولیس اپنے طریقے سے اصل گل کے قتل کی تفتیش کرتی رہی۔ نہر بندی ہونے پر دو کلومیٹر کے فاصلے پر پلی

میں اٹکی ہوئی بائیسکل بھی مل گئی۔ عام طور پر یہی سمجھا جانے لگا کہ پولیس ایک پردیسی کے قتل کا سراغ لگانے میں دلچسپی نہیں لے رہی لہٰذا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ نواز بھی غیر محتاط ہوگیا۔ ایک روز شہتوت کی شاخ تراشنے کی غرض سے بے خیالی میں کمانی دار چاقو نکال بیٹھا، جو ہم نے مخصوص بناوٹ اور دستے کی رنگ برنگی زینت سے فوراً پہچان لیا۔ اس کو غلطی کا احساس ہوگیا، مگر فطرتاً نڈر تھا، اس لیے پسپائی اختیار نہ کی اور بظاہر بڑے سکون سے لمبی شاخ کے فالتو اجزا کی کانٹ چھانٹ میں لگا رہا۔

اللہ ہی جانے، ہم میں سے کس لڑکے کے منہ سے بات نکلی اور مختلف ساعتوں سے ہمکنار ہوکر لبوں سے ادا ہوتی پولیس تک جا پہنچی۔ گھر اور ڈیرے پر بیک وقت چھاپا پڑا اور نواز گرفتار ہوگیا۔ بھوسے کے گودام میں چھپائے گئے کپڑے کے چند تھان، گز اور قینچی بھی برآمد ہوگئی۔ تفتیش کی ابتدا میں ہی نواز نے ضد لگادی کہ وہ صرف بڑے تھانیدار سے بات کرے گا۔ ایس ایچ او نے اس کو اپنے دفتر میں بلوا کر دروازہ بند کروا دیا۔ نواز کہنے لگا۔ ''میں نے ہی پٹھان کو قتل کیا ہے۔ اس بیان پر عدالت تک قائم رہوں گا۔ اس سے صرف تیرہ سو روپے برآمد ہوئے۔ ریوالور، گھڑی اور کپڑے کے چند تھان میں نے بیچ دیے۔ ساری رقم کہاں خرچ کی، یہ کبھی نہیں بتاؤں گا، خواہ میری کھال اتار کر اپنے عملے کے جوتے بنوالو......''

ایس ایچ او نے کہا۔ ''جانتا ہوں، وہ رقم تم نے کہاں خرچ کی۔ اشرف سنار سے بالیاں بنوائیں۔ مولوی بہت شریف اور مسکین ہے۔ میں اس کی بیٹی کو مقدمے میں بالکل نہیں گھسیٹوں گا۔ تم حوصلہ رکھو......''

عدالت نے نواز کو نابالغ ہونے کی بنا پر صرف سات سال کی سزائے قید سنائی۔ چند ماہ بعد مولوی صاحب نے اچانک ہی بیٹی کا نکاح کردیا لیکن اس نے رخصت ہونے سے پہلے عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑی نواز کی ماں کو قریب بلایا، بالیاں تھمائیں اور گلے لگ کر روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ اسپتال پہنچنے تک کیڑے مار زہر کی دوا... اثر کر گئی اور جان لیوا ثابت ہوئی۔

چاچا کی ملکیتی زمین اتنی ہی تھی کہ عزت آبرو سے گزر اوقات ہوتی رہے۔ مگر بیٹے کا مقدمہ لڑتے اور بڑی عدالتوں میں اپیلیں کرتے کرتے گردن تک قرض کی دلدل میں دھنس گیا۔ بڑا صابر اور دلیر بندہ تھا۔ گلہ شکوہ زبان پر لانے کے بجائے زیادہ تر خاموش بیٹھا رہتا۔ نواز سزا پوری کرکے رہا ہوگیا۔ لوگوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ لڑکا نیم پاگل سا ہوا پھرتا رہتا ہے، بہتر ہوگا کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ انہوں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ لڑکا زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے؟ اگر اس کو میرا قتل کرنے سے چین ملتا ہے تو کرلے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ موت سے بڑا صدمہ میں نے سہہ لیا۔ جہاں بھی جاؤں، یہ داغ دامن سے زیادہ دل پر گہرا لگا ہے، لہٰذا ساتھ ساتھ ہی رہے گا۔

نواز نے مولوی صاحب سے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ کئی کئی ہفتے گھر سے غائب رہتا۔ سال بھر سے بھی کم عرصے میں نہ صرف باپ کا پائی پائی قرض چکا دیا بلکہ ٹیوب ویل بھی لگا لیا۔ وہ جب بھی لوٹتا، کسی کار یا بائیک پر سوار ہوکر آیا اور زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ باپ سمجھ گیا کہ بیٹا جرائم کی دنیا میں داخل ہو چکا ہے۔ اپنی سی کوشش کر دیکھی کہ وہ کسی طرح... راہ راست پر آجائے۔ میری مداخلت کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ

زبان

بزرگوں نے کہا ہے کہ انسان کو زبان قابو میں رکھنی چاہیے...... مگر یہ زبان قابو میں نہیں رہتی۔ دیکھنے میں یہ بظاہر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے لیکن مار ڈالنے کی طاقت رکھتی ہے۔ تلوار کا گھاؤ بھر سکتا ہے لیکن زبان کا لگا ہوا زخم نہیں بھرتا۔ یہ زبان ہی ہے جو انسان کو گدھے پر بھی بٹھاتی ہے اور گھوڑے پر بھی۔ مثلاً ایک بے وقوف سردار جی نے اپنے بائیں جانب بیٹھی خاتون سے گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے پوچھا۔ ''خاتون آپ کی شادی ہوئی ہے۔''

خاتون نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

سردار جی نے کہا۔ ''خوب، کتنے بچے ہیں۔''

اس پر جو ردعمل ہوا ظاہر ہے اس پر سردار جی نے گھبرا کر اپنے دائیں بیٹھی خاتون کو دیکھا اور ثابت ہوا کہ زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ انجام سردار جی والا ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ آپ خود لگالیں۔ ورنہ بات وہی ہوگی۔

آپ ہی اپنی اداؤں پر ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

شروع کے عرصے میں مجھے مختلف چھوٹے بڑے شہروں کے دورے کرنے پڑتے تھے۔ چند ایک بار لاہور، پنڈی، اسلام آباد اور مری میں نواز سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ ہر مرتبہ وہ اچھی گاڑی میں کسی نہ کسی عورت کے ساتھ پایا گیا۔ اُس نے خود ہی بتادیا کہ عورت اور شراب نے تباہ کرکے رکھ دیا۔ ملک کا چپا چپا گھوم پھر کے اپنی قسمت آزمائی، کوئی زیب جیسی نہ ملی۔

ہمہ وقت خطروں میں گھرا جرائم پیشہ شخص جس قدر دولت کماتا ہے، اسی طرح ضائع بھی کرتا ہے۔ وہ کئی بار قانون کی گرفت میں آیا، مگر راہ راست پر آنے کے بجائے بھٹکتا ہی چلا گیا۔ لمبا ہاتھ مارتا لیکن اگلے ہی مرحلے پر سب کچھ گنوا بیٹھتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آخری بار انتہائی نچلے درجے کی واردات کرتے ہوئے دھرلیا گیا۔ موبائل فون کان سے لگائے راہ چلتے نوعمر لڑکے کو جھپٹا مارا مگر وہ جان کی پروا کیے بغیر نواز سے لپٹ گیا۔ لڑکے کی چیخ و پکار سن کر اردگرد سے دکاندار اور عام شہری موقع واردات کی طرف لپکے۔ ساتھی فائرنگ کرتا ہوا بائیک پر نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا، جب کہ ہجوم نے نرغے میں آئے شکار کو مار مار کر کچومر نکال دیا۔ پولیس نے نیم مردہ وجود کو اسپتال پہنچایا۔ کڑیل جوان نے چند دن موت سے جنگ لڑی اور بالآخر باپ کی گود میں سر رکھے جان ہار دی۔

☆☆☆

ڈیرے پر درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چاچا اپنے بوڑھے باپ کی پائنتی بیٹھا تھا۔ چند قریبی رشتہ دار بھی موجود تھے۔ ہمارے لیے سامنے والی چارپائی خالی کردی گئی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد بھی مجھ سے تعزیت کے الفاظ ادا نہ ہو پائے۔ ساتھی باتیں کرتے رہے۔ اسی پچاسی سالہ بوڑھا دادا، پوتے کی موت پر نیم پاگل سا ہوا ہاتھوں اور ٹانگوں کو لایعنی حرکت دیتا مسلسل بولے جارہا تھا۔ مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگتا۔ بیٹا دھیرے دھیرے باپ کی پنڈلیاں اور پاؤں سہلاتا رہا۔ وقفے وقفے سے بول دیتا۔ ”اباجی! مولوی کہاں سکھی رہا، وہ بھی ہماری طرح لٹ گیا۔ تقدیر کا لکھا کون مٹا سکا ہے۔ صبر کریں۔“

بوڑھا اپنی جگہ اچھل پڑا اور واویلا کرنے لگا۔ ”میں نے مولوی کو سمجھایا تھا کہ بچی کا نکاح نہ پڑھائے۔ میرا پوتا بڑا ضدی ہے۔ وہ جیل سے آکر بھی نہیں بخشے گا۔ خوامخواہ دادا کو مروا دو گے۔ جب پہلا سیپارہ پڑھنا شروع کیا تھا، تب سے دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پورے بارہ سال بھر

روز صبح لسی میں مکھن کا پیڑا ڈال کر اور شام کو بالائی سمیت دودھ خود مولوی کے گھر دینے جاتا رہا۔ کبھی کوئی سوغات اور اچھی چیز اکیلے نہ کھائی۔ ہر شے دیتے ہوئے مولوی سے کہتا کہ اماں نے بھجوائی ہے۔ مولوی کو سمجھ کیوں نہ آئی.....“

چند لمحے خلاؤں میں گھور کر بوڑھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”پٹھان پکا نمازی تھا۔ پردیسی کا ناحق قتل ہوا۔ کیا پتا اسی گناہ کا وبال پڑا ہو۔ اللہ ہی جانے۔ میرے پوتے نے یہ قتل بھی مولوی کی خاطر کیا.....“ چاچا نے تکیہ سرکا دیا۔

وہ... باپ کو آرام سے لٹا کر بولا۔ ”اباجی! دعا کیا کریں۔ اللہ معاف کردے۔ اسپتال میں اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ لاکھوں کے ڈاکے ڈالے اور کئی قتل کیے۔ پکڑ کس جرم میں ہوئی؟..... صرف سات سو روپے کے موبائل فون پر۔ پاس ہونے کے انعام میں غریب باپ نے بیٹے کو اسی روز پرانا فون خرید کر دیا تھا۔ نواز نے بتایا کہ پٹھان سے بھی پہلے ایک قتل اتفاقیہ ہوگیا تھا، جس کا بڑا بھاری بوجھ مجھے آج بھی دل پر محسوس ہوتا ہے۔ نائیوں کے لڑکے نے لٹھے کی نئی شلوار اور ململ کا نیا ہی کرتہ پہن رکھا تھا۔ سامنے کی جیب میں پچاس روپے کے نوٹوں کی گڈی ڈال رکھی تھی۔ وہ نہر کی پٹری پر گنگناتا ہوا لاری اڈے کی طرف جارہا تھا۔ نواز مجھے کہنے لگا۔ اباجی! میں کئی دنوں سے زیب کے لیے سونے کی انگوٹھی خریدنے کا سوچ رہا تھا، اور ایک ولایتی خوشبو، جو فوارے سے نکلتی ہے۔ میں نے اسلم نائی کے بیٹے افتخار کو جیب میں بہت سارے نوٹ ڈالے دیکھ کر روک لیا اور رقم ادھار دینے کو کہا لیکن اُس نے جیب پر ہاتھ رکھا اور صاف انکار کردیا۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی، میں نے پکڑ لیا۔ وہ لڑ پڑا اور گالیاں بکنے لگا۔ میں نے گلا دبایا، وہ مرگیا۔ میں رقم لے کر ڈیرے پر آگیا۔ اس میں صرف اوپر والا نوٹ اصلی تھا۔ باقی اسی سائز کے کاغذ کاٹ کر جعلی گڈی بنائی ہوئی تھی، بے چارے نے شو مارنے کی غرض سے..... وہ شہر اپنی خالہ سے ملنے جارہا تھا.....“

دادا تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ بڑا ظلم ہوا۔ ہمارا قصور ہے۔ بیٹے کا خیال نہ رکھا۔ صرف پچاس روپے کی خاطر قتل کردیا اور خود سات سو روپے کا فون چھینتے ہوئے مارا گیا۔ اسی نائی والے قتل کے گناہ کا وبال پڑا ہوگا.....“ بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فریاد کی۔ ”اللہ جی! ہماری خطا معاف کر۔ نامراد عشق کبھی کسی کو راس نہ آیا.....“

تخت پر بٹھا دیا گیا۔

ابو اسحٰق اب تک دیکھتا رہا تھا کہ الپتگین ہر کام سبکتگین کے مشورے سے انجام دیتا تھا۔ اس روایت کو اس نے بھی برقرار رکھا۔

ظاہری طور پر وہی حکمران تھا لیکن امورِ سلطنت کے تمام اہم کام سبکتگین کی رائے سے انجام پاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں حکومت ابو اسحٰق کی تھی لیکن سبکتگین کے ہاتھوں میں تھی۔

سبکتگین نے جو خواب بھی دیکھا تھا، اس کی تعبیر اب آخری مراحل میں داخل ہو رہی تھی۔

ابو اسحٰق کو حکومت کرتے ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ قضائے الٰہی سے اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت نازک وقت تھا۔ ابو اسحٰق کو اتنا کم وقت ملا تھا کہ وہ اچھی طرح قدم بھی نہیں جما سکا تھا۔ خراسان کے اکثر شہروں میں شورشیں برپا تھیں۔ ہندوستان کے ہندو راجا بھی افغانستان پر راج نیتی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اندرونی و بیرونی خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ان خطرات سے نمٹنے کے لیے ایک مضبوط حاکم کی ضرورت تھی۔ اراکینِ سلطنت کو یہ خوبیاں سبکتگین میں نظر آئیں اور انہوں نے اسے اپنا مستقل بادشاہ تسلیم کر لیا۔ انہی اراکینِ سلطنت کی کوششوں سے اس کی شادی الپتگین کی بیٹی سے ہوئی۔

سبکتگین نے عدل و انصاف کی ترویج میں بڑا حصہ لیا اور ظلم و تعدی کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ امرائے شرفا اور ارکانِ سلطنت پر طرح طرح کی مہربانیاں اور عنایتیں کیں اور جلد ہی اپنی محبت اور جہاں داری کی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔

☆☆☆

مشرقی خراسان کے ایک شہر "بست" سے غزنی کی طرف آنے والی شاہراہ پر ایک سوار اپنے چند سواروں کے ہمراہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ یہ قافلہ کبھی کبھی غبار کی چادر میں چھپ جاتا تھا۔ رفتار دھیمی ہوتے ہی یہ غبار انہیں راستہ دیتا تھا اور وہ پھر تیزی سے دوڑنے لگتے تھے۔ ان کی رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ تو کوئی ان کے تعاقب میں ہے اور نہ وہ کسی سے خوف زدہ ہیں البتہ کوئی کام ایسا ہے جس کی انجام دہی کے لیے انہیں جلد از جلد پہنچنا ہے۔ یہ کام کیا ہے یہ اس وقت کھلا جب یہ قافلہ غزنی پہنچ گیا اور اس کے سردار کو اس کی درخواست پر محافظوں نے سبکتگین کے روبرو پیش کر دیا۔

سبکتگین نے احکامات جاری کر رکھے تھے کہ کوئی ضرورت مند جب بھی اس سے ملنا چاہے، اس کے پاس بھیج دیا جائے۔

"میرا نام طغا ہے۔" سبکتگین کے سامنے پہنچ کر قافلے کے سردار نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں بست کے قلعے پر قابض تھا۔ یہ قلعہ میں نے اور میرے آدمیوں نے اپنے زورِ بازو سے فتح کیا تھا لیکن میرے ایک دشمن "پاتور" نے اس پر حملہ کیا اور مجھے نکال باہر کیا۔ اب میں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔"

"میرے پاس کیوں آئے ہو..... مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"اگر امیر دشمن کے مقابلے میں میری مدد فرمائیں اور میں قلعے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمام عمر خدمت گاروں میں رہوں گا، خراج ادا کرتا رہوں گا اور اطاعت کے دائرے سے بھی باہر قدم نہیں رکھوں گا۔"

"جب تو قلعے کی حفاظت نہیں کر سکتا تو اس پر قبضہ رکھنے کا بھی کیا فائدہ۔"

"میرے پاس اتنی فوج ضرور ہے کہ میں اپنی حفاظت کر سکوں۔"

"پھر پاتور کے مقابلے میں تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"میں ان دنوں شکار پر گیا ہوا تھا۔ قلعے میں تھوڑے سے سپاہی رہ گئے تھے۔ پاتور نے اچانک حملہ کر دیا۔ جب تک میں پہنچتا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔"

"تو پھر شکار پر چلا جائے گا، وہ پھر قابض ہو جائے گا۔"

"جب یہ خراج ادا کروں گا تو آپ بھی تو میری حفاظت و مدد کے لیے کمربستہ رہیں گے۔ پھر کیا مجال کہ پاتور میری طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔"

سبکتگین اس کی خوش کلامی سے متاثر ہوا۔ اس کی درخواست منظور کر لی اور پاتور پر لشکر کشی کر کے اسے شکست دی اور طغا کو اس کی حکمرانی واپس دلا دی۔

سبکتگین خوش تھا کہ اس کے باج گزاروں میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ طغا سے ملتے ہی اسے اپنا دورِ غلامی یاد آ گیا تھا۔ اسے فروخت کرنے کے لیے ترکستان سے خراسان ہی لایا گیا تھا۔ اس نے خراسان میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ وہ خراسان پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ ضرور چاہتا تھا کہ خراسان جانے کا راستہ کھلا رہے۔ یہ موقع اس کو "طغا" نے فراہم کر دیا تھا۔ وہ اس کا باج گزار تھا اور اس سے ملنے کے بہانے وہ خراسان آ، جا سکتا تھا۔



کوزہ گر درویش

ضیا تسنیم بلگرامی

جس انسان کا ضمیر زندہ ہو... جس کے دل میں خوفِ خدا ہو... اور جسے صحیح غلط کی پہچان ہو وہ اللہ کا نیک بندہ کہلانے کا حق رکھتا ہے لیکن جو ان کی اعلیٰ ترین مثال بن جائے، حکمِ الٰہی کے منافی کچھ بھی نہ کرے... اس کی عبادت و ریاضت کا کیا درجہ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کوئی گناہ گار نہیں لگا سکتا۔ اس درویش کے اخلاق و کردار اور عبادتوں کی بھی کوئی مثال نہ تھی، جنھوں نے ہدایت کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

حسبِ روایت قدم قدم پر امتحان سے گزرنے والے ایک اور درویش کا قصہ

طوس (مشہد) کے نواح میں ایک چھوٹی سی جگہ ساسی ہوا کرتی تھی۔ ساسی سے پندرہ میل دور سوخار نامی ایک قریہ تھا۔ اس قریہ کے لوگ بڑے زندہ دل ہوا کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں سوخار کے لوگ جب کام کاج سے فرصت پاتے تو تفریحِ طبع کے لیے جو مشاغل اختیار کرتے، ان میں پہلوانی سرفہرست تھی۔ اکھاڑے میں اتر کر زور آزمائی کرتے ورنہ کسرت ہی کرتے رہتے تھے۔ ان دنوں ساسی کے خواجہ محمد بابا درویش کا بڑا شہرہ تھا۔

خواجہ محمد بابا جب بھی سوخار جاتے، وہاں کے ایک اکھاڑے کے قریب کھڑے ہوکر پہلوانوں کا نظارہ کرتے رہتے۔ خواجہ محمد بابا کے مقام اور حیثیت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ لوگ انہیں اس جگہ دیکھتے تو آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیتے۔

ایک دن خواجہ محمد بابا صبح صبح سوخار کے ایک اکھاڑے کے باہر کھڑے ہو گئے اور پہلوانوں کے ہنر اور داؤ پیچ کا نظارہ کرنے لگے۔ تماشائی پہلوانوں سے زیادہ حضرت خواجہ بابا کی زیارت میں مشغول ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ ''یہ درویش بابا کو کیا ہو گیا کہ اللہ اللہ کرنے کے بجائے یہاں اکھاڑے میں کشتیاں دیکھنے چلے آتے ہیں۔''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''آخر دنیاداری بھی کوئی چیز ہے، کوئی کہاں تک اللہ اللہ کرے۔''

ایک شخص نے جسارت سے کام لیا، اٹھا، آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''حضرت! آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟''

خواجہ بابا نے فرمایا۔ ''ہاں میں یہاں کیونکہ اللہ کا ایک محبوب بندہ مجھے یہاں اس اکھاڑے میں ملے گا۔ میں اس کی تلاش میں چلا آتا ہوں۔''

آپ کے جواب پر لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ آپ سے پوچھا۔ ''اس اکھاڑے میں؟ اللہ کا محبوب بندہ؟ چہ خوب! تو اب اللہ کے محبوب بندے اکھاڑوں میں کشتیاں لڑنے لگے ہیں؟''

خواجہ بابا نے جواب دیا۔ ''ہاں بھائی...... خدا کے محبوب بندے کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سے کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔''

ایک رند مشرب نے آپ کا مذاق اڑایا۔ ''تو حضرت! ذرا بلایئے تو اللہ کے محبوب بندے کو، ذرا ہم بھی اس کی زیارت کرلیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس وقت تو وہ اس اکھاڑے میں ہے نہیں۔''

کسی نے قہقہہ لگایا۔ ''جب وہ موجود نہیں ہے تو آپ خوامخواہ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تلاش کرنے والا اپنا وقت نہیں ضائع کرتا۔ تلاش میں تو آدمی کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔''

لوگوں نے ہنسنا اور مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ آپ اکھاڑے میں کچھ دیر اور ٹھہرے پھر چلے گئے۔ چونکہ سوخار سے سماسی ہر روز نہیں آیا جا سکتا تھا، اس لیے کچھ عرصہ آپ نہیں آسکے۔

ایک دن لوگوں نے پھر آپ کو اکھاڑے کے باہر ایک دیوار کے سائے میں کھڑے دیکھا۔ تماشائیوں میں آپ کا ایک ارادت مند بھی موجود تھا۔ اس نے سوچا لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے، خاموشی سے آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کو اس بدعت کے نظارے میں کیا مزہ آتا ہے جو یوں کھڑے ہو کر گھنٹوں نظارہ کرتے رہتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نادان انسان! آج اس اکھاڑے میں وہ شخص موجود ہے جس کی صحبت سے کاملین زمانہ فیضیاب ہوں گے اور اس صیدگاہ میں ایک ایسا شکار موجود ہے جو ایک ایسا مرید تیار کرے گا جس سے ایک نئے سلسلۂ تصوف کا آغاز ہوگا۔ میں اس کی تلاش میں ایک عرصے سے یہاں آتا جاتا رہا ہوں۔''

ارادت مند نے پوچھا۔ ''حضرت! وہ کہاں ہیں؟''

آپ نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ یہ نوجوان کشتی لڑنے میں مشغول تھا۔ ''وہ رہا میرا شکار، میں اسی کی تلاش میں پریشان و سرگرداں تھا۔''

آپ نے یہ آخری کلمات اتنی زور سے ادا کیے کہ ہر شخص آپ کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ نوجوان پہلوان نے بھی آپ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو نوجوان پہلوان کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ خواجہ بابا نے گویا اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ اس جگہ بالکل نہیں ٹھہرے، اپنے گھر کی راہ لی۔

نوجوان پہلوان نے مقابلہ روک دیا۔ اکھاڑے سے نکل کر کپڑے سے اپنے جسم کی مٹی پونچھی اور لباس پہن کر خواجہ بابا کے گھر کی طرف چل دیا۔

خواجہ بابا کے در پر کھڑے ہو کر نوجوان پہلوان نے کچھ توقف سے کام لیا۔ کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے پوچھا گیا۔ ''کون؟''

نوجوان پہلوان نے جواب دیا۔ ''میں ہوں شمس الدین۔''

اندر سے پھر سوال کیا گیا۔ ''یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

شمس الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! باریابی کا شرف بخشیے، پھر اپنے آنے کی غایت بھی بتادوں گا۔''

دروازہ کھل گیا۔ خواجہ بابا دروازے کے سامنے کسی اجنبی کی طرح کھڑے ہوگئے۔ پوچھا۔ ''ہاں، اب بتا میرے پاس کیوں آیا ہے تو؟''

نوجوان شمس الدین نے جواب دیا۔ ''میرے دل میں آگ لگا کر پہلے تو مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا اور جب میں آگیا تو لاتعلق بن کر مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے پاس کیوں آیا ہے تو؟''

خواجہ بابا نے کہا۔ ''جا پہلوانی کر، اپنے اکھاڑے میں واپس جا، یہاں میرے پاس کیا ہے تیرے لیے؟''

شمس الدین نے عرض کیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں واپس جانے کے لیے آپ کے پاس نہیں آیا۔ نہ میں آپ سے کچھ لینے، کچھ مانگنے آیا ہوں۔''

خواجہ بابا مسکرائے۔ ''اللہ رے یہ استغنا۔ تو کچھ لینے مانگنے نہیں آیا اور میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے مانگنے بھی آیا ہے اور کچھ لینے بھی۔ خوامخواہ جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں۔''

شمس الدین کو رونا آگیا، کہا۔ ''بابا خدا کے لیے کچھ دیجیے اور وہی چیز دیجیے جو ہمارے پاس پہلے سے موجود نہ ہو۔''

خواجہ بابا نے سکوت اختیار کیا پھر فرمایا۔ ''کوئی بھی چیز یوں...... جس طرح تو چاہتا ہے، کسی کو نہیں مل جاتی۔''

شمس الدین نے عرض کیا۔ ''بابا! میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جو مجھے درکار ہے، کس طرح ملے گی؟ جس طرح بھی ملے، مجھے ملنا چاہیے، میں ہر قسم کی محنت مشقت کے لیے تیار ہوں۔''

خواجہ بابا نے شمس الدین کو اپنے سامنے بٹھالیا اور کہا۔ ''تو نہیں جانتا کہ میں نے تیرے لیے اکھاڑے کے کتنے چکر لگائے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے تجھ کو پایا ہے۔ اب تجھ کو میرے پاس، میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میں تیری تربیت کروں گا۔''

شمس الدین کا آبائی پیشہ کلالی تھا۔ یعنی آپ کوزہ گر تھے۔ اسی نسبت سے آپ کو امیر کلال کہا جاتا تھا۔ انہوں نے خواجہ بابا کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور درخواست کی۔ ''حضرت! میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

خواجہ بابا نے جواب دیا۔ ''جب تک میں سوخار میں ہوں، تو میرے ساتھ رہ سکتا ہے لیکن جب میں سماسی چلا جاؤں گا، اس وقت میں مجبور ہوں گا۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''میں سماسی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

خواجہ بابا بہت خوش ہوئے، فرمایا۔ ''میں بہت خوش ہوں کہ تو نے لہوولعب چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کی ہے۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ سماسی لے جاؤں گا۔''

اس کے بعد خواجہ بابا نے شمس الدین پر خصوصی توجہ دینا شروع کردی۔ یہ تقریباً آٹھ سال تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت اور صحبت میں رہے۔

ایک دن خواجہ بابا نے شمس الدین سے کہا۔ ''بابا شمس الدین! میں تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ تیرے مریدوں میں ایک ایسا شخص بھی آئے گا جو تصوف میں ایک بہت بڑے سلسلے کا بانی ہوگا۔ اس لیے ہر حال میں اس محترم شخص کو تلاش کرنا اور جب مل جائے تو اس کا ساتھ چھوڑ نا مت۔''

شمس الدین نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کسی کو کیوں چھوڑنے لگا اور پھر اس شخص کو جو آپ کے بقول ایک بہت بڑے سلسلے کا بانی ہوگا۔''

امیر کلال نے اکھاڑے کی زندگی ترک کی اور اللہ سے رجوع کیا تو ان لوگوں کو بڑا دکھ پہنچا جو آپ کو ایک پہلوان کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے امیر کلال سے بڑی امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ امیر کلال ایک نہ ایک دن نامی گرامی پہلوان بن سکتے تھے۔ ان سب نے آپس میں مشورہ کیا کہ سب مل کر سماسی چلیں اور امیر کلال کو قائل کریں کہ انہوں نے پہلوانی چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ انہیں اکھاڑے میں واپس چلنا چاہیے۔ یہ لوگ خواجہ بابا کی خانقاہ میں پہنچے تو پتا چلا کہ سب جمعے کی نماز پڑھنے مسجد گئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بھی مسجد چلے گئے۔ وہاں نمازِ جمعہ ادا کی اور مسجد سے نکل کر باہر امیر کلال کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب امیر کلال بھی باہر نکلے تو ان لوگوں نے آپ کا راستہ روک لیا، کہا۔ ''امیر کلال! ہم سوخار سے آئے

ہیں اور آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
امیر کلال نے ان سب کو پہچان لیا۔ فرمایا۔ ”کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟ کرو باتیں۔“
ایک نے کہا۔ ”یہاں راہ چلتے میں کیا بات ہوسکتی ہے، کہیں خود بیٹھیے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بٹھائیے پھر بات کرنے میں بھی مزہ آئے گا۔“
امیر کلال نے ایک میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس سبزہ زار پر کیسا رہے گا؟“
جواب ملا۔ ”بہت خوب! یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔“
امیر کلال ان سب کو لے کر سبزہ زار پر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں بھائیو! اب کرو باتیں، تم لوگ سوخار سے کب آئے؟“
وفد کے بڑے نے جواب دیا۔ ”آج ہی آئے ہیں، ہم لوگ وہاں سے۔“
امیر کلال نے پوچھا۔ ”تمہیں کیا بات کرنی ہے؟ اب کرو باتیں۔“
وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”ہم لوگوں نے تم سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ تم نے اکھاڑے میں بڑی تابناک زندگی گزاری ہے۔ تمہیں اپنی اس زندگی کو یک لخت نہیں چھوڑنا تھا۔“
امیر کلال نے حیرت سے پوچھا۔ ”بھلا وہ کیوں؟ زندگی میری ہے، اس کا فیصلہ کوئی اور کیوں کرے گا؟“
ایک نے جواب دیا۔ ”وہ آپ کی زندگی نہیں تھی جس کو غلطی سے آپ اپنی سمجھتے چلے آئے ہیں۔“
امیر کلال نے پوچھا۔ ”آپ حضرات کی باتیں میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ لوگ ذرا صاف صاف اپنا مطلب ظاہر کریں تو کچھ میری سمجھ میں بھی آئے۔“
وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”آپ کشتی بہت اچھی لڑتے ہیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”لڑتا ہوں نہیں، کبھی لڑا کرتا تھا۔ اب تو میں اکھاڑے کے داؤ پیچ بھی بھول گیا۔“
ایک نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ”تمہیں ایسا نہیں کرنا تھا۔“
آپ نے پوچھا۔ ”کیوں؟“
اس نے کہا۔ ”اس طرح آپ نے ہماری محنت ضائع کردی۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اس طرح میں اپنی زندگی بے کار ضائع کر رہا تھا۔“
وفد کے سربراہ نے پوچھا۔ ”کیا آپ اپنی موجودہ زندگی سے خوش ہیں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”خوش ہیں..... کیا معنی! میں اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ لہو و لعب سے میرا پیچھا چھوٹا۔“
ایک شخص نے کہا۔ ”تم نے اکھاڑا چھوڑ کر بڑی غلطی کی۔ تم نے ہم سب کو بالکل مایوس کردیا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”اگر میں اس زندگی کو نہ چھوڑتا تو خود کو بالکل مایوس کرلیتا۔ میں سوچتا ہوں کہ ان حالات میں اپنے رب کو کیا جواب دیتا۔“
”اب بھی وقت ہے، اکھاڑے واپس چلو۔“
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ مجھ سے یہ باتیں کرنے آئے ہو؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم چاہتے ہیں کہ تم سوخار واپس چلو۔ وہاں اکھاڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”لاحول ولا قوۃ۔ آپ لوگ واپس جائیں، میرا وقت نہ برباد کریں۔“
ایک نے سوال کیا۔ ”اگر کشتی لڑنا برا کام ہے تو آپ نے یہ مشغلہ کیوں اختیار کیا تھا؟“
کسی دوسرے نے کہا۔ ”شاید آپ نے سوچا ہو کہ آپ سید زادے ہیں اور سید زادوں کو یہ مشغلہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ اس احساس، اس خیال نے آپ کو اکھاڑے سے باہر نکال لیا۔“
وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”اگر یہ کام اتنا ہی برا تھا تو آپ نے اس کام کو ایک عرصے تک اختیار کیے رکھا ہے اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اس مشغلے سے آپ کو یا آپ کے کسی دوست کو کیا فائدہ پہنچا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ان سوالوں کے جواب اس وقت میرے پاس نہیں ہیں پھر بھی ان کے جواب بھی دے دوں گا

لیکن اس وقت تو میرا پیچھا چھوڑ دو تم لوگ۔''

وفد کے سربراہ نے کہا۔ ''دیکھیے جناب! ہم یہ فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ یا تو آپ کو واپس لے جائیں گے یا پھر آپ ہمارے اس سوال کا جواب دیں گے۔ اگر کشتی کوئی برا مشغلہ تھا تو آپ نے اسے کیوں اختیار کیا اور کشتی سے آپ کو یا آپ کے ساتھیوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے ان سوالوں کے جواب ضرور دوں گا۔ اس کے لیے تم سب کو دو چار دن ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں ایسا جواب دوں گا کہ اس کے بعد بحث مباحثے اور اعتراض کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔''

ان لوگوں نے کہا۔ ''مگر ہم ٹھہریں کہاں؟ یہاں تو کوئی جاننے والا بھی نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تم نے اپنی مجبوری کا ذکر کر دیا۔ ہم خوش ہیں کہ تم نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ تم لوگ ہماری خانقاہ میں ٹھہر سکتے ہو۔ وہاں تمہیں کوئی بھی نہیں روکے گا۔''

وفد کے سربراہ نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

امیر کلال ان سب کو خانقاہ میں لے گئے اور وہاں ان کے قیام و طعام کا انتظام کر دیا۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد سب نے خواجہ محمد بابا کے پیچھے عشا کی نماز ادا کی اور سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس وقت امیر کلال نے ان سب سے فرداً فرداً پوچھا۔ ''آپ لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ کھانا پیٹ بھر کر کھالیا؟''

سب نے باری باری سے ایک ہی جواب دیا۔ ''جی کھالیا۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔''

ان سب کے دلوں پر امیر کلال کی شخصیت کا اثر ہو چلا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر وفد کے سربراہ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا میدانِ حشر میں نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص اپنا نامۂ اعمال سنبھالے ایک طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ ان بھاگنے والوں میں وفد کا سربراہ بھی شامل تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے کیچڑ میں گر گیا۔ کیچڑ، دلدل کی طرح تھی۔ وفد کا سربراہ ایسا پھنسا کہ جیسے جیسے نکلنے کے لیے زور لگاتا تھا، اندر دھنستا جاتا تھا۔ وہ شور کرنے لگا۔ ''بچاؤ بچاؤ۔''

اسی عالم میں اس نے دیکھا، ایک طرف سے امیر کلال اطمینان کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ وفد کے سربراہ نے انہیں دیکھتے ہی شور کیا۔ ''حضرت! جناب میری مدد کیجیے، میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ مجھ کو اس دلدل سے نکالیے۔''

امیر کلال اس کی طرف بڑھے۔ وفد کے سربراہ نے پوچھا۔ ''حضرت! میں بھاری جسم کا آدمی ہوں۔ کیا آپ میں اتنی قوت ہے کہ مجھے باہر نکال سکیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''کیوں نہیں۔'' اور اس کے بعد آپ نے اس شخص کو دلدل سے نکال لیا اور اس کو ایک طرف کھڑا کر کے فرمایا۔ ''میں نے پہلوانی اسی لیے سیکھی تھی۔ اب سمجھ میں آئی میری بات یا نہیں؟''

وفد کے سربراہ نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کی بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی۔''

اس کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ سو جائے مگر نہیں سو سکا۔ صبح تک جاگتا رہا۔ اسی دوران اس کو یہ احساس ہوا کہ شاید ان کے دوسرے ساتھی بھی جاگ رہے ہیں۔

صبح اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''ساتھیو! میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔''

کئی ساتھیوں نے جواب دیا۔ ''ہمارا بھی یہی خیال ہے کیونکہ امیر کلال کا جواب تو مل ہی چکا ہے۔''

ایک شخص نے پوچھا۔ ''کون سا جواب؟ کیا جواب ملا ہے تم لوگوں کو امیر کلال کا؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''جناب! میں نے رات کے پچھلے پہر ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا میں میدانِ حشر میں سب کے ساتھ اپنا نامۂ اعمال لیے کھڑا ہوں پھر ہر کوئی ایک طرف جانے لگا۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی چل پڑا۔ ایک جگہ کچھ پانی جمع تھا۔ میں نے سوچا کہ اس معمولی سے پانی کو بہ آسانی عبور کر جاؤں گا یہ سوچ کر میں نے پانی میں پاؤں رکھ دیا۔ ایک کے پیچھے دوسرا پاؤں بھی بڑھ گیا اور میں دلدل میں پھنس کر ڈبکیاں کھانے لگا پھر میں نے بچاؤ بچاؤ کا شور و غل شروع کر دیا لیکن مجھے ایسا لگا گویا مجھ کو ڈوبنے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ اسی عالم میں، میں نے ایک طرف سے امیر کلال کو آتے

دیکھا تو شور مچانا شروع کر دیا کہ امیر کلال! خدا کے لیے ہماری مدد کیجیے اور ہمیں باہر نکال لیجیے۔"
آپ نے فرمایا۔ "مت پریشان ہو، میں ابھی نکالتا ہوں تجھ کو۔"
پھر میں نے پوچھا۔ "حضرت! کیا آپ کے جسم میں اتنی طاقت ہے کہ مجھ جیسے زور آور کو دلدل سے نکال لیں؟"
آپ نے فرمایا۔ "بات بہادری کی نہیں، کسی اور ہی چیز کی ہے اور مجھ کو یہ یقین ہے کہ میں تجھ کو اس دلدل سے ضرور نکال لوں گا۔"
"اس کے بعد آپ نے مجھے دلدل سے نکال لیا۔"
وفد کے سربراہ نے بے چینی سے کہا۔ "کیا تو نے بھی یہی خواب دیکھا ہے؟"
وہاں ہر شخص ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہا تھا اور ہر شخص یہی کہہ رہا تھا کہ میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔
وفد کا سربراہ بہت مرعوب ہو چکا تھا، بولا۔ "ساتھیو! یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ ہم نے ابھی تک جو کچھ تصور رکھا تھا، معاملہ وہ نہیں ہے کچھ اور ہی ہے۔ امیر کلال کوئی معمولی شخص نہیں ہیں، کچھ اور ہی ہیں۔ اللہ نے اپنا سایہ امیر کلال پر رکھا ہے۔"
یہ سب آپ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ "حضرت! ہم لوگ واپس جانا چاہتے ہیں۔"
آپ نے پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں کو خانقاہ میں تکلیف پہنچی ہے؟"
سب نے بیک آواز جواب دیا۔ "نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔"
وفد کے سربراہ نے کہا۔ "مجھ کو میرے سوال کا جواب مل چکا ہے۔"
کئی نے بیک آواز کہا۔ "حضرت! ہم سب شرمندہ ہیں۔ ہم آپ کے مرتبے و مقام سے ناآشنا تھے۔"
امیر کلال نے وفد کے سربراہ کا کان پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو معلوم ہو گیا تجھے ہم کشتی کیوں لڑتے تھے اور ہمارے لیے طاقت ور ہونا کتنا ضروری ہے۔"
وفد کا سربراہ رونے لگا۔ آپ نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ "جا آئندہ سوظنی سے دور رہنا، بدگمانی بڑی بری شے ہوتی ہے۔"
یہ لوگ اپنا سامنہ لے کر سوخار واپس چلے گئے۔

☆☆☆

سا سی میں اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں رہ کر جب امیر کلال مرتبہ کمال کو پہنچ گئے تو سوخار چلے گئے۔ آپ نے شادی کر کے رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت پوری کی اور انسانوں کی فلاح و بہبود اور راہنمائی کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ اب آپ کے آس پاس آپ کے ارادت مندوں اور مریدوں کا ہجوم رہنے لگا تھا۔ آپ ان کی تعلیم و تربیت میں بڑے انہماک اور غور و خوض سے کام لیتے۔ آپ کا ہر عمل مریدوں کے لیے مشعل راہ ہوتا۔
دوران سفر آپ نے ایک باغ میں قیام کیا۔ مریدوں کی خاصی تعداد آپ کے ساتھ تھی۔ یہاں سب نے اپنے کپڑے دھوئے۔ باغ میں اونچے اونچے درختوں کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے درخت بھی تھے، کانٹوں کی باڑیں بھی تھیں اور زمین پر دور تک سبزے کا فرش بھی بچھا ہوا تھا۔ مریدوں نے کپڑے دھونے کے بعد انہیں درختوں کی شاخوں پر پھیلانا چاہا۔ آپ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔
مریدوں نے پوچھا۔ "حضرت! اس میں حرج کیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس میں حرج یہ ہے کہ شاخیں ٹیڑھی ہو جائیں گے اور یہ ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔"
مریدوں نے کہا۔ "تب پھر ہم انہیں کانٹوں کی باڑ پر ڈال دیتے ہیں۔"
آپ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ "نہیں، باڑ پر بھی نہ پھیلانا، کیونکہ باڑ کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"
مریدوں نے سبزے کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر سبزے پر پھیلا دیتے ہیں۔"
آپ نے اس سے بھی منع کر دیا، فرمایا۔ "دوستو! گھاس مویشیوں کی غذا ہے۔ تمہارے گیلے کپڑے اس کو خراب کر سکتے ہیں، اس لیے گھاس پر بھی مت پھیلاؤ۔"
مریدوں نے عاجز آ کر پوچھا۔ "پھر ہم کیا کریں، اپنے کپڑے کہاں پھیلائیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ ''اپنے اپنے جسموں پر، میری طرح ...... مجھے دیکھو، اس طرح۔''
مریدوں نے دیکھا، آپ نے اپنے گیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور خود دھوپ میں بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اصرار کے ساتھ کوئی صغیرہ (معمولی، چھوٹا گناہ) نہیں، (بلکہ کبیرہ، بڑا گناہ ہو جاتا ہے) اور استغفار کے ساتھ (توبہ کے ساتھ) کوئی کبیرہ (بڑا گناہ) نہیں رہتا۔''
مزید فرمایا۔ ''دوستو! خدا کی راہ اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک کوئی انسان تقویٰ کو اپنا شعار نہ بنا لے۔''
آپ اپنے مریدوں اور دوستوں کے ساتھ مشہور بزرگ خواجہ ابوحفص کبیر بخاری کی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ لوگوں کی خواہش اور بے حد اصرار پر آپ وعظ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دوران وعظ آپ مناسک حج پر آ گئے اور اس کو با تفصیل بیان فرمانے لگے۔ وہاں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو حج کر چکا تھا اور یہ جانتا تھا کہ امیر کلال نے آج تک حج نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا، یہ مسائل تو کسی ایسے شخص کو بیان کرنا چاہئیں جو خانہ کعبہ دیکھ چکا ہو۔
وعظ کے بعد آپ مسجد سے نکلے تو اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے پوچھا۔ ''اے شخص! تو درویشوں کی بابت کس طرح سوچتا ہے؟ میں تیری سوچ کو بدل دوں گا، آخر تو سمجھتا کیا ہے؟'' اس کے بعد آپ نے معترض شخص کا ہاتھ چھوڑا اور اس سے کہا۔ ''اے شخص! تو کیا سوچ رہا تھا؟ ذرا میری انگلیوں کے درمیان دیکھ کر یہ بتا کہ یہاں کیا نظر آ رہا ہے؟''
اس شخص نے بغور دیکھ کر جواب دیا۔ ''حضرت! خانہ کعبہ...... یہ تو خانہ کعبہ ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''تو نے خانہ کعبہ کو جا کر دیکھا ہے مگر میں نے اس کو یہیں بلوا کر دکھا دیا۔ چونکہ تو مفلس ہے، روحانی مفلس، اس لیے تو نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ امیر کلال بھی مفلس ہی ہوگا۔''
اس شخص نے نادم ہو کر آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دیر تک توبہ واستغفار کرتا رہا۔ اس نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ بدگمانی سے بچے گا۔
آپ اپنے مریدوں اور دوستوں کے ساتھ بزرگان دین کے مزاروں پر حاضریاں دیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ جب ایک ایسے بزرگ کے مزار پر پہنچے جن کا مزار جنگل میں واقع تھا تو مزار کے پاس ایک شیر کو کھڑے دیکھا۔ وہ سب شیر دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان سب کو بھاگتے دیکھا تو پوچھا۔ ''لوگو! بات کیا ہے؟ تم لوگ بدحواس اور خوفزدہ کیوں ہو؟''
ان لوگوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! ہم لوگ آپ سے پہلے ہی مزار تک پہنچ گئے تھے مگر ہم نے مزار کے سرہانے ایک شیر کو کھڑے دیکھا، بس اس کو دیکھ کر ہم سب بھاگ کھڑے ہوئے۔''
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ''مزار کے سرہانے شیر کھڑا ہے؟ خوب! چلو ذرا ہم بھی دیکھیں اس شیر کو۔''
لوگوں کی ہمت جواب دے چکی تھی، ایک نے عرض کیا۔ ''ہم نے آپ کو بتا تو دیا کہ وہاں شیر ہے اور شیر کے پاس جانا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ڈرو مت۔ میں جو ساتھ چل رہا ہوں۔''
ایک نے آپ سے کہا۔ ''آپ ساتھ چل رہے ہیں تو کیا شیر آپ سے ڈر جائے گا؟ درندے کا کیا اعتبار، میں تو آپ کے ساتھ چلنے سے رہا۔ آپ ہی جائیں وہاں۔''
آپ نے سب سے پوچھا۔ ''میرے ساتھ کون چلے گا؟ میں تو وہاں جاؤں گا ہی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ شیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''
چند آدمیوں نے ہمت کی اور آپ کے پیچھے پیچھے جنگل کی طرف چلے۔ جب وہ لوگ مزار کے قریب پہنچے تو انہوں نے دور ہی سے شیر کو مزار کے سرہانے کھڑے دیکھ لیا۔ ان کی گھگیاں بندھ گئیں۔ انگلیوں سے شیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! وہ دیکھیے، وہ شیر ...... اگر آپ ہمارا مشورہ مانیں تو یہیں رک جائیں اور واپس چلیں ورنہ اس درندے کا کیا بھروسا۔ ایک ہی جست میں ہمارے سروں پر آ سکتا ہے اور ہم سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔''
آپ نے ان سب کو وہیں چھوڑا اور خود شیر کی طرف بڑھے۔
شیر نے آپ کو آتے دیکھا تو خود بھی چند قدم چلا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
آپ نے شیر سے پوچھا۔ ''تو یہاں کس کے حکم سے آیا ہے؟''

شیر کیا جواب دیتا۔ سر اوپر اٹھا کر گرا لیا۔
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا میں سمجھا، اگر تو یہاں تک خدا کے حکم سے آیا ہے تو میں اسی خدا کا واسطہ دے کر تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلا جا اور اللہ کی مخلوق کو خوفزدہ نہ کر۔''
شیر نے ایک بار پھر آپ کو بغور دیکھا اور ایک طرف چل دیا۔ جب وہ نظروں سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا تو آپ نے اپنے مریدوں اور دوستوں کو اپنے پاس بلایا اور ان کے سامنے پورا مسئلہ رکھ کر سوال کیا۔ ''کیا میں نے تم سب کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ یہ شیر ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ چنانچہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شیر میری بات سنتے ہی چلا گیا۔''
شیر کے چلے جانے کے بعد بقیہ لوگ بھی آپ کے پاس پہنچ گئے لیکن وہ سب شرمندہ تھے اور ان کی نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! مجھ سے شرماؤ نہیں۔ تم نے وہی کیا جو عقل تمہیں سمجھا رہی تھی لیکن بعض معاملات عقل کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں۔ تم کوشش کرو کہ باطن کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ چیزیں بھی تم دیکھ سکو جو عقل نہیں دیکھ سکتی۔''

☆☆☆

آپ بخارا گئے ہوئے تھے۔ وہاں کی جامع مسجد میں جمعے کی نماز پڑھی اور جب گھر جا رہے تھے تو راستے میں ایک طرف وسیع میدان میں خیموں کا ایک شہر آباد دیکھا۔ آپ کو بڑی حیرت ہوئی پوچھا۔ ''لوگو! یہ سب کیا ہے؟''
کسی نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ امیر تیمور کا لشکر ہے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''پھر یہ لوگ یہاں کیوں پڑے ہیں؟''
جواب دیا گیا۔ ''امیر تیمور کو فتوحات کا بڑا شوق ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ معلوم دنیا کو فتح کر کے اپنا تابع بنا لے۔''
آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''اچھا، تو اللہ کی حاکمیت میں شریک ہونا چاہتا ہے، خوب!''
اتنے میں ایک سرخ خیمے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ چند آدمی بھی تھے۔ سرخ خیمے سے نکلنے والے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا، وہ فوراً ہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے امیر کلال کے پاس آئے اور کہا۔ ''حضرت! آپ کون ہیں؟ ہمارا امیر آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہے۔''
آپ کے مرید نے جواب دیا۔ ''جاؤ اپنے امیر کو بتا دو کہ یہ امیر کلال ہیں، اس عہد کے مشہور ترین صوفی۔ اللہ آپ کی بہت سنتا ہے اور آپ مستجاب الدعوات ہیں۔''
امیر تیمور کے ایک ہرکارے نے کہا۔ ''اچھا ہم لوگ امیر کے پاس جا رہے ہیں، خدا کے لیے آپ لوگ اس وقت تک یہیں ٹھہرے رہیں، جب تک کہ ہم امیر تیمور کے پاس سے واپس نہ آ جائیں۔''
آپ کے مریدوں نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! آپ نے امیر تیمور کا نام سنا ہے؟ ہم نے تو سنا ہے کہ بہت ہی رعب و دبدبے کا انسان ہے امیر تیمور۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ہمیں امیر تیمور کے آدمی کا انتظار کرنا چاہیے، دیکھیں وہ کیا پیغام لاتا ہے۔''
اتنی دیر میں امیر تیمور کا آدمی واپس آ گیا اور عرض کیا۔ ''حضور! امیر تیمور نے فرمایا ہے کہ وہ کسی وقت بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیں گے لیکن اس وقت آپ کو امیر تیمور کے دربار میں چلنا ہوگا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں وہاں نہیں جا سکتا۔''
تیمور کے آدمی نے پوچھا۔ ''ہمارے امیر کے پاس جانے میں کیا دشواریاں ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''دشواریاں کیسی؟ میں امیروں، بادشاہوں کے پاس نہیں جاتا۔''
آپ کے آدمی نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ اپنا وقت نہ ضائع کریں۔''
اتنے میں ایک دوسرا ہرکارہ بھی آ گیا، اس نے کہا۔ ''حضرت، خواجہ صاحب! امیر تیمور فرما رہے ہیں کہ اگر خواجہ صاحب کو میرے پاس آنے میں قباحت یا تردد ہے تو میں خود حاضر ہونا چاہتا ہوں۔''
آپ رک گئے، فرمایا۔ ''امیر سے کہہ دو میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد امیر تیمور آ گیا اور اس نے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! ہم نے تو آپ کی عظمت کے پیش نظر آپ کے پاس آنا گوارا کر لیا اور آپ ہیں کہ منہ چھپا کے چلے جا رہے ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''تو اس وقت مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''آپ کی دعائیں اور میرے ساتھیوں کا تقویٰ۔ یہ دونوں کام کریں گے۔''
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ تقویٰ تیری فوج میں کہاں سے آ گیا؟''
تیمور نے جواب دیا۔ ''میری فوج میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی دعائیں کچھ سے کچھ کر سکتی ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اگر یہ بات ہے تو ان سے کہہ کہ وہ دعائیں کریں۔''
تیمور نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کی خدمت میں یہ آرزو لے کر آیا ہوں کہ آپ اپنی زبان سے کچھ کہیں اور میں سنوں۔''
آپ نے پوچھا۔ ''میں کیا کہوں؟''
تیمور نے کہا۔ ''کچھ بھی کہیے۔ میں کچھ نہ کچھ سننا چاہتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا، اپنے خیمے میں واپس جا اور انتظار کر۔''
تیمور اپنے خیمے میں چلا گیا۔
آپ عشا کے وقت تک خاموش رہے پھر عشا کی نماز پڑھ کر مراقبے میں چلے گئے۔ مراقبے کے بعد اپنے محترم اور مقرب شیخ منصور کو آواز دی...... ''شیخ منصور! ذرا ادھر تو آنا۔''
شیخ منصور آپ کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا۔
آپ نے فرمایا۔ ''تو اسی وقت امیر تیمور کے پاس چلا جا اور میری طرف سے اس کو یہ پیغام دے کہ مشائخ بخارا کی ارواحِ طیبہ نے مملکتِ خوارزم تجھ کو بخش دی ہے۔ تو بے توقف گھوڑے پر سوار ہو کر اسی وقت خوارزم چلا جا۔ کام ہو جائے گا۔''
شیخ منصور نے امیر تیمور کو جیسے ہی یہ پیغام دیا، اس نے اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چل پڑا۔ خوارزم کے دروازے امیر تیمور پر کھل چکے تھے۔ وہ نہایت آسانی سے اس پر قابض ہو گیا۔

☆☆☆

خواجہ بہاء الدین ان دنوں سلطان قضان کے دربار میں جلادی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ امیر کلال کا ایک عقیدت مند کسی مقدمے میں ملوث ہو کر سلطان کی خدمت میں پیش ہوا۔ سلطان اس پر غضبناک ہوا اور اس کو سزائے موت سنا دی۔ ملزم کو خواجہ بہاء الدین کے حوالے کر دیا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ خواجہ بہاء الدین ملزم کی کوٹھری سے باہر صبح کے انتظار میں پڑ رہے۔
جب صبح ہوئی تو ملزم مسکراتا ہوا کوٹھری سے نکلا۔ خواجہ بہاء الدین سے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم مجھے نہیں قتل کر سکتے۔''
خواجہ بہاء الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ میں تجھے کیوں قتل نہیں کر سکتا؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، تم کوشش کر کے دیکھ لو۔''
خواجہ بہاء الدین نے کہا۔ ''کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح میں تیری باتوں میں آ جاؤں گا؟''
ملزم نے کہا۔ ''باتوں میں آنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا ہے۔ تم تجربہ کر کے دیکھ لو۔''
خواجہ بہاء الدین نے چمڑے کی قربان گاہ پر ملزم کا سر رکھ دیا اور خود تلوار اٹھا کر ذرا پیچھے ہٹے۔ انہوں نے نشانہ لے کر ملزم پر وار کیا مگر انہیں کچھ ایسا لگا گویا کسی نے انہیں دھکا دے کر ایک طرف کر دیا ہے۔ خواجہ بہاء الدین کا وار خالی گیا اور ملزم نے قہقہہ لگایا۔
خواجہ بہاء الدین کو غصہ آ گیا، کہا۔ ''یہ ہنستا کیا ہے، ایک بار وار خالی گیا مگر دوبارہ، دیکھوں گا تو کس طرح بچتا ہے۔ ناممکن جو بچ جائے۔''
ملزم نے جواب دیا۔ ''اللہ مالک ہے، میں تیرے وار سے نہیں ڈرتا۔''
خواجہ بہاء الدین نے دوبارہ ذرا پیچھے ہٹ کر ملزم پر تلوار کا بھرپور وار کیا اور اس بار پھر کسی نے ان کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر نشانے سے ہٹا دیا۔ انہوں نے ملزم سے پوچھا۔ ''اے شخص! کیا تو جادوگر ہے؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''میں جادوگر نہیں ہوں اور نہ ہی جادوگری پر میرا اعتقاد ہے۔''
خواجہ بہاء الدین نے پوچھا۔ ''پھر تو کیا ہے؟''

ملزم نے جواب دیا۔ ''میں ایک سیدھا سچا مسلمان ہوں اور امیر کلال کا ادنیٰ سا مرید۔''
خواجہ بہاء الدین نے پوچھا۔ ''یہ امیر کلال کون بزرگ ہیں؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''طوس کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ سوخار ہے، امیر کلال اسی قصبے میں رہتے ہیں۔''
خواجہ بہاء الدین نے ایک دم چونک کر کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ چالاک آدمی! تو مجھے باتوں میں لگا کر بے وقوف بنا رہا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تو کس طرح بچتا ہے میرے تیسرے وار سے۔''
ملزم نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو باتوں میں کیوں لگاؤں گا اور اگر لگاؤں گا بھی تو کتنی دیر کے لیے! آخر کار تو مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔''
خواجہ بہاء الدین نے کہا۔ ''اچھا، اب تو آنکھیں بند کر لے۔ میرے تیسرے وار سے تو نہیں بچ سکے گا۔''
ملزم نے جواب دیا۔ ''تو ایک بار پھر اپنا حوصلہ نکال لے۔''
خواجہ بہاء الدین نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے ایک بار پھر تلوار سے وار کیا۔ اس بار جیسے کسی نے انہیں دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ یہ پھسلتے لڑکھڑاتے دیوار سے جا ٹکرائے۔ اب وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔ انہوں نے تلوار ایک طرف پھینک دی اور ملزم کو اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ پوچھا۔ ''بھائی! میں معافی چاہتا ہوں، مجھے یہ بتا کہ میں تجھ کو قتل کیوں نہیں کر سکا؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''اس میں راز کی کوئی بات نہیں۔''
خواجہ بہاء الدین نے پوچھا۔ ''پھر بھی؟''
ملزم نے کہا۔ ''کل میں نے خواب میں اپنے پیر و مرشد امیر کلال کو دیکھا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اے پیر و مرشد جو جرم میں نے نہیں کیا، اس میں مجھے سزائے موت دی گئی ہے یہ کیسا انصاف ہے؟ اس پر انہوں نے مجھ سے کہا، تو مت گھبرا۔ تجھ کو کوئی بھی قتل نہیں کر سکتا۔ میں دیکھوں گا، تجھے کون قتل کرتا ہے۔ پیر و مرشد کے اس ارشاد اور یقین دہانی نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا، سامنے ہے۔''
خواجہ بہاء الدین نے پوچھا۔ ''کیا میں تیرے پیر و مرشد سے مل سکتا ہوں؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں۔ سوخار چلے جاؤ، وہاں کسی سے بھی امیر کلال کا پوچھ لینا۔''
خواجہ بہاء الدین نے کہا۔ ''اب میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ میں سوخار جا رہا ہوں۔ اپنے پیر و مرشد کے لیے تیرا کوئی پیغام؟''
ملزم نے جواب دیا۔ ''ان سے کہہ دینا کہ میں بچ گیا، وہ مجھے اپنے پاس بلا لیں۔''
خواجہ بہاء الدین نے کہا۔ ''بلا لیں کیا معنی؟ تو میرے ساتھ چل۔ اب تو کسی کا قیدی نہیں ہے۔''
ملزم نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''میں اجازت کے بغیر کس طرح جا سکتا ہوں۔ جب تک پیر و مرشد مجھ سے نہ کہہ دیں کہ چلا آ۔ اب زیادہ دیر تک ڈھول ڈھمکے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، میں فوراً ہی چلا جاؤں گا۔''
خواجہ بہاء الدین نے ملزم کو آزاد کر دیا اور اس سے کہا۔ ''میری طرف سے تو آزاد ہے لیکن خدا کے لیے جو کچھ بھی کرنا معقول اور مناسب ہو، میں اپنی عزت آبرو، وقار، ساکھ غرض ہر شے کو داؤ پر لگا کر تجھے رہائی دے رہا ہوں۔ پتا نہیں اس کی میں کیا سزا بھگتوں گا۔''
ملزم نے جواب دیا۔ ''اس کی آپ کیا سزا بھگتیں گے، میں آپ کے چھوڑنے سے جاؤں گا بھی نہیں کیونکہ میں کسی کو بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔''
خواجہ بہاء الدین نے ملزم کو رہا کر دیا اور خود پیر و مرشد کی خدمت میں چلے گئے۔
امیر کلال نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہا۔ ''صاحبزادے تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''
خواجہ بہاء الدین نے جواب دیا۔ ''میں تو آپ کا پتا بھی نہیں جانتا تھا پھر جیسے ہی پتا معلوم ہو گیا، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں نے خواجہ محمد بابا سے تیرے سلسلے میں وعدہ کیا تھا کہ تیری تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دوں گا۔ چنانچہ اب میں اپنا وہ عہد نبھاؤں گا۔''

سبکتگین کبھی کبھی "بست" کی شکارگاہ میں چلا جایا کرتا تھا جہاں جب موقع ملتا تھا، طغا بھی آجاتا تھا۔

ابھی "طغا" کے وعدے پر گرد بھی نہیں جمی تھی کہ اسے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ سبکتگین اس کے ساتھ خراسان میں شکار کھیلنے کے لالچ میں اس سے تعلق رکھنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ خراج نہ بھی ادا کرے تو بھی وہ اس سے تعلقات نہیں بگاڑے گا۔ وہ خراج ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ یوں بھی اس کے برتاؤ میں عاجزی کے بجائے حکمت نظر آنے لگی تھی۔ سبکتگین سے اس کی جب بھی ملاقات ہوتی یہ معلوم ہوتا تھا سبکتگین کی برابری کر رہا ہو۔ سبکتگین نے ضروری سمجھا کہ اسے اس کی اوقات یاد دلائی جائے۔

"طغا! کیا تم نے خراج ادا کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

"بالکل کیا تھا۔"

"پھر ٹال مٹول کیوں کر رہے ہو؟"

"کیا تمہارا گزارہ میرے خراج پر ہے؟"

"طغا! یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ کیا تم وہ وقت بھول گئے جب تم مدد کے لیے میرے پاس آئے تھے اور کیا تم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ جو قلعہ میں نے تمہیں دلوایا تھا، وہ واپس بھی لے سکتا ہوں۔"

طغا کو یہ بات اتنی بری معلوم ہوئی کہ تلوار کھینچ کر ایسی ضرب لگائی کہ سبکتگین کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔ وہ دونوں اس وقت شکارگاہ میں تھے۔ دونوں کے ساتھ ان کے چیدہ چیدہ سپاہی بھی تھے۔

سبکتگین چاہتا تھا کہ اسی زخمی ہاتھ سے طغا کا کام تمام کردے لیکن اس دوران دونوں کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے ایک دوسرے پر حملہ کردیا اور ہنگامہ بپا ہوگیا۔ اس افراتفری میں طغا کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا اور وہ "کرماج" کی طرف بھاگ گیا۔

اس سرکش کے بھاگنے کے بعد قلعہ سبکتگین کے ہاتھ آگیا۔

اب سبکتگین سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ ایسے سرکش اور بھی نمودار ہوتے رہیں گے لہٰذا گردوپیش کے ان عناصر کو سختی سے کچل دیا جائے جن سے سرکشی کا خطرہ ہو۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ مملکت وسیع ہوگی، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اردگرد کے علاقوں میں دھاک بیٹھ جائے گی اور کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔

وہ دراصل غزنی سے نکل کر ہندوستان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ افغانستان سے نکلتے ہی برہمنوں اور راجپوتوں کا دور دورہ تھا۔ وہ اس کفرستان کو نیست و نابود کردینے کا خواہاں تھا لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب اس کے اندرونی دشمنوں کی تعداد کم سے کم ہو۔

"بست" کی مہم سے فراغت ملتے ہی وہ قصرار (بلوچستان کا ایک مقام جو آج کل خضدار کے نام سے مشہور ہے) کی طرف روانہ ہوا۔ یہ قلعہ اس کی حکومت کے قریب تھا۔ وہاں پہنچ کر بخارا کے حاکم کو نظربند کیا اور اسے اپنا مطیع بنا کر قصرار کا قلعہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ بعدازاں اس حاکم کو اپنے ملازموں میں شامل کیا اور قصرار کا علاقہ اسے جاگیر میں دے دیا۔ اس فتح کے بعد سبکتگین جہاد کے قریب ہوگیا۔ وہ ہندوستان پر حملے کرنے لگا۔ جو علاقہ فتح کرلیتا، وہاں مسجدیں تعمیر کرواتا اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر غزنی واپس چلا آتا۔

راجا جے پال ان حملوں سے کہ جو وہ اس کے ملک میں کر رہا تھا، تنگ آگیا اور ان حملوں کو روکنے کے لیے تدبیریں سوچنے لگا۔

اس وقت شمالی ہند کا سب سے بڑا راجا جے پال ہی تھا۔ اس کی سلطنت ایک طرف جلال آباد، لغمان اور پارہ چنار تک اور دوسری جانب کشمیر کے جنوبی پہاڑی علاقے سے لے کر ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔

جے پال ان دنوں قلعہ بھٹنڈہ میں مقیم تھا تاکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکے۔ یہ خیال بھی اس کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا کہ اگر غزنی پر اس کا قبضہ ہوجائے تو وہ تمام مال و دولت جن کے وہ قصے سن رہا ہے، اس کے قبضے میں ہوگا۔

وہ اپنا دارالحکومت چھوڑ کر بھٹنڈہ میں اس لیے مقیم ہوا تھا کہ مسلمانوں کو لاہور (دارالحکومت) تک نہ پہنچنے دے۔ ابھی تک اپنا دفاع اس کا مقصد تھا لیکن اب اسے غزنی پر حملہ آور ہونا تھا۔ اس نے گروہ کثیر ہاتھیوں اور بہادر سپاہیوں

ایک مرتبہ آرزو نے زندگی سے پوچھا۔ "میں کب تک پوری ہوں گی؟"

زندگی نے جواب دیا۔ "کبھی نہیں۔"

آرزو نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں؟"

زندگی نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ تو انسان کو زندہ رکھتی ہے اور اگر تو پوری ہوگئی تو انسان جیے گا کیسے؟"

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

چنانچہ بہاء الدین نے آپ ہی کے پاس سکونت اختیار کر لی اور امیر کلال ان کی تربیت فرمانے لگے۔

☆☆☆

ایک بار پھر امیر تیمور نے آپ کی خدمت میں اپنا قاصد روانہ کیا اور قاصد کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی طرح امیر کلال کو دربار میں لے آئے۔

قاصد آپ کو تلاش کرتا ہوا جامع مسجد میں پہنچا۔ اس وقت آپ نماز پڑھ کر باہر تشریف لا رہے تھے۔ آپ کے آس پاس ارادت مند چل رہے تھے۔ قاصد نے آپ کا راستہ روک لیا، بولا۔ ''پیر و مرشد! میں سمرقند سے آیا ہوں، میں امیر تیمور کا قاصد ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو کسی کا بھی قاصد ہو، مجھے کیا؟ میں ایک گوشہ نشین درویش ہوں۔''

قاصد نے کہا۔ ''حضرت! آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ مجھے امیر تیمور نے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ سمرقند لے جاؤں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اپنے امیر سے کہہ دینا میں حاضری نہیں دے سکتا۔ فقیر یہیں سے دعا گو ہے۔''

قاصد نے کہا۔ ''حضرت! آپ کو میرے ساتھ چلنے میں تامل کیوں ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ وہ سورۂ نمل کو پڑھ لے اور خاص کر یہ حصہ اِنّ الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا (بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں) ''سورۂ نمل ع ۳'' پھر میرا جواب اس کی سمجھ میں آجائے گا۔''

قاصد نے کہا۔ ''آپ کا جواب امیر تیمور کو پسند نہیں آئے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا جواب اس کو پسند بھی آجائے لیکن آپ......''

آپ نے فرمایا۔ ''اپنے امیر سے میری طرف سے کہہ دینا کہ فقیروں اور شاہوں کی دوستی اچھی نہیں ہوتی۔ میں دربار میں حاضری نہیں دے سکتا۔''

قاصد سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ ''تب پھر آپ ایسا کریں کہ میرے ساتھ کسی اور کو بھیج دیجیے جو آپ کی نمائندگی کر سکے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مجھے منظور ہے۔ میں اپنے صاحبزادے امیر عمر کو تیرے ساتھ کر دوں گا انہیں لیتے جانا۔''

قاصد نے کہا۔ ''چلیے یہ بھی ٹھیک ہے۔''

آپ گھر تشریف لے گئے اور اپنے صاحبزادے امیر عمر کو اپنے فیصلے سے مطلع فرمایا۔ ''بیٹے امیر عمر! امیر تیمور کے دربار میں جانا ہے۔ وہ ہم پر بہت مہربان ہے لیکن فقیروں کو امراء، بادشاہ اور ان کے دربار راس نہیں آتے۔ امیر تیمور تجھ کو انعام دے گا۔ جاگیریں بخشنا چاہے گا لیکن تم اسے قبول نہ کرنا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اس قسم کے نذرانے قبول نہیں فرماتے تھے۔ یاد رکھو درویش ہر وقت مومنوں کے لیے دعا میں مشغول رہتے ہیں اور اگر درویش دنیا کی طرف میلان رکھے تو دعا بے اثر ہو جاتی ہے۔''

امیر عمر نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی نصیحتوں کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

قاصد آپ کے صاحبزادے امیر عمر کو امیر تیمور کی خدمت میں لے گیا۔ امیر تیمور نے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہارے باپ کہاں ہیں؟''

امیر عمر نے جواب دیا۔ ''اپنے آبائی گاؤں میں ہیں۔''

امیر تیمور نے پوچھا۔ ''امیر کلال کیوں نہیں آئے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''بابا جان درباروں میں نہیں جاتے۔''

امیر تیمور نے کہا۔ ''اچھا، اگر وہ اس میں خوش ہیں تو یہی سہی۔''

امیر عمر کے ساتھ تیمور نے بہت اچھا سلوک کیا۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ امیر تیمور ان سے بہت خوش تھا، بولا۔ ''میں نے بخارا تیرے سپرد کیا۔''

امیر عمر نے کہا۔ ''افسوس کہ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔''

امیر تیمور نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ”والد محترم نے مجھے منع کیا تھا۔“
تیمور نے کہا۔ ”اگر پورا بخارا نہیں تو اس کا کچھ حصہ ہی قبول کر لو۔“
آپ نے فرمایا۔ ”یہ بھی نہیں۔ میں جاگیر ہی نہیں، نقد انعام بھی نہیں لوں گا۔“
تیمور نے افسوس کیا۔ ”میں حضرت امیر کلال کا تقرب حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر تم مجھے اس سے روک رہے ہو۔“
انہوں نے جواب دیا۔ ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ درویشوں کا تقرب حاصل کریں اور ان کے دل میں گھر کریں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ عدل اور تقویٰ کو اپنا شعار بنالیں کیونکہ حق تعالیٰ اور خاصانِ حق کے قرب کا ذریعہ یہی چیزیں ہیں۔“
تیمور آپ کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”اگر میں سلطنت کے بکھیڑوں میں پھنسا ہوا نہ ہوتا تو اپنے لیے درویشی کو پسند کر لیتا۔“

☆☆☆

بخارا میں قیام کے دوران ایک دن آپ جامع مسجد تشریف لیے جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے مرید اور ارادت مند بھی تھے۔ آپ کے آس پاس کھیت تھے اور کھیتوں میں کسان کام کر رہے تھے۔ ایک کھیت میں اس کا مالک اپنے نوکروں سے کام لے رہا تھا۔ آپ جب ان دونوں کے پاس سے گزرے تو ملازم نے اپنے مالک سے پوچھا۔ ”جناب یہ کون لوگ ہیں؟“
مالک نے امیر کلال کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”مفت خورے ہیں۔“
اس وقت امیر کلال اور ان کے ساتھی، ملازم اور اس کے آقا سے ذرا فاصلے پر تھے اور ان کی آپس کی بات کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا لیکن امیر کلال نے ان دونوں کی باتیں بھی سن لیں۔ آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”اس کھیت کے مالک کے پاس جا اور اس سے کہہ دے کہ درویشوں کے حق میں بے اعتقادی ٹھیک نہیں۔ انہیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ ورنہ ذلیل و خوار ہو کر نہ جا۔ جس چیز سے تو واقف نہیں اس پر رائے زنی کیسی۔“
مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت! نماز کا وقت ہو چکا ہے، واپسی میں آپ کا یہ پیغام کھیت کے مالک کو پہنچا دیا جائے گا۔“
امیر کلال نے فرمایا۔ ”چلو یہی سہی لیکن اس وقت تک قضا کا تیر اپنا کام کر چکا ہوگا۔“
کچھ دیر بعد جب نماز پڑھ کر آپ واپس ہوئے تو مرید کھیت کے مالک کی طرف چلے۔ وہ کھیت میں لیٹا ہوا تھا اور اس کا ملازم پریشان حال اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے مریدوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ یہ لوگ اس کے پاس پہنچے تو مالک نے آہستہ سے کہا۔ ”امیر کلال کہاں ہیں؟“
ایک مرید نے کہا۔ ”امیر کلال فرما رہے ہیں کہ درویشوں کے حق میں بے اعتقادی ٹھیک نہیں، انہیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھو۔“
کھیت کے مالک نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ”میرا جگر کٹا جا رہا ہے۔ مجھے امیر کلال کے پاس لے چلو تاکہ میں معافی مانگ لوں۔“
لیکن اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے امیر کلال کے پاس لے جایا جاتا۔
جب ایک مرید نے امیر کلال کو بتایا کہ کھیت کا مالک آپ سے ملنا چاہتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ ”رات گئی بات گئی۔ وقت گیا، بات گیا ہوگی...... معافی کیسی؟“
کچھ دیر بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”خدا اس پر رحم فرمائے اور اس کی مغفرت کرے۔“
جب آپ کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ بہاء الدین کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ اکثریت نے بیعت کر لی لیکن چند نے اختلاف کیا اور اس مسئلے پر پیر و مرشد سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ آپ نے اختلاف کرنے والوں سے پوچھا۔ ”آخر خواجہ بہاء الدین سے بیعت کرنے میں کیا بات رکاوٹ بن گئی ہے؟“
ایک مرید نے جملہ اختلاف کرنے والوں کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”خواجہ بہاء الدین نے ذکر بالجہر (اعلانیہ) میں آپ کا ساتھ نہیں دیا جبکہ ایک مرید کی حیثیت سے ان پر واجب تھا کہ ہر معاملے میں آپ کی

اتباع کرتے۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔’’اس معاملے میں ان کا کچھ اختیار نہیں تھا۔ بہاء الدین نے جو کچھ کیا، اس میں حکمتِ الٰہی شامل تھی۔‘‘

آپ نے اختلاف کرنے والوں کو مجبور نہیں کیا کہ وہ خواجہ بہاء الدین سے بیعت ہی کرلیں۔ آپ نے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے فرمایا۔’’لوگو! شاید میں تم لوگوں میں مزید نہ رہ سکوں، اس لیے تم لوگوں کو چند ضروری نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

لوگ گوش بر آواز تھے، کہا۔’’ہم آپ کی نصیحتیں سننے کے لیے تیار ہیں۔‘‘

آپ نے فرمایا۔’’لوگو! عبادت اور ریاضت بہت ضروری اور فرض ہے لیکن اگر عبادت میں تمہاری پیٹھ کبڑی ہو جائے اور ریاضت میں تمہارا جسم کمان کے چلّے کی طرح باریک ہو جائے، تب بھی تم اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت کی قسم ہرگز مقصود تک نہ پہنچو گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے لقمے اور خرقے کو پاک رکھو اور رسول مقبول ﷺ کی شریعت کی پیروی کرو کیونکہ تمام کاموں کی اصل اسی پر ہے۔‘‘

اس کے بعد آپ نے اپنے بیٹوں کو بلوایا اور انہیں وصیتیں فرمائیں۔

’’میرے بچو اور میرے دوستو! جب تک زندہ ہو طلبِ علم سے باز نہ رہو کیونکہ طلبِ علم تمام مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ بہت سے آدمی بے علمی کی وجہ سے تباہی کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔

’’تمہیں چاہیے کہ خدا داں بھی بنو اور خدا خواں بھی۔ اور ایسا کام کرو کہ دنیا کے ساتھ ساتھ تمہارا دین بھی باقی رہے۔ ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ کوئی عبادت خدا ترسی سے بہتر نہیں۔ یاد رکھو کہ کپڑے کو پانی، زبان کو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تمہارے جسم کو نماز کا پابندی سے ادا کرنا پاک کر دیتا ہے۔ تمہارے مال کو زکوٰۃ، تمہاری راہ کو مطالبۂ حقوق کرنے والوں کی رضامندی اور تمہارے دین کو شرک سے بچنا پاک کر دیتا ہے۔ یارو! اخلاص اختیار کرو اور اخلاص کے ساتھ رہو۔

’’توبہ کرتے رہو کیونکہ توبہ تمام بندگیوں کا سر ہے۔ توبہ یہ نہیں کہ زبان سے توبہ کرلو، توبہ یہ ہے کہ تم پہلے اپنے دل میں اپنے گناہوں سے پشیمان ہو اور یہ نیت کرلو کہ آئندہ اس گناہ کی طرف نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو اور حقوق العباد ادا کرتے رہو، گریہ وزاری ایسی کرو کہ توبہ کا اثر اپنے باطن میں مشاہدہ کرلو تاکہ تائب کا حقیقی مفہوم سمجھ سکو۔

’’روزی کا غم اپنے دل سے نکال دو اور آخرت اور ادائے بندگی کے غم کو اپنے دل میں جگہ دو۔

’’جانتے ہو ارادت کیا ہے؟ ارادت نام ہے، خدا کی طلب کا، ترکِ عادت کا، وفائے عہد کا، ادائے امانت کا، ترکِ خیانت کا، اپنی تقصیر کی دید اور اپنے عمل کی نادید کا۔

’’ہر حال میں امر معروف اور نہی منکر بجالاؤ۔ اپنے اعمال کو زرِ خالص مت خیال کرو۔ انہیں شریعت کی کسوٹی پر کسو، اگر نیک ہوں تو قبول کرلو ورنہ رد کر دو۔

’’موقع اور فرصت کو غنیمت سمجھو۔ وہ کام کرو جو نجات کا سبب بن جائے۔ کسبِ حلال کی طرف بطریق غنا و کفاف (روزینہ) توجہ دو۔ لاف واسراف کے لیے نہیں۔ نفقہ کی طرف بطریق شرح توجہ دو۔ اسراف وبخل کے لیے نہیں۔ میانہ روی اختیار کرو۔ اگر صدقہ کرو تو حلال کمائی سے۔ صیام کے دنوں میں صبح وشام تک کھانے پینے اور دوسرے برے کاموں سے باز رہو۔ اپنے کانوں کو حرام سننے، ہاتھوں کو حرام پکڑنے اور پاؤں کو حرام چلنے سے روکنا بھی باطنی روزہ ہے۔ روزے کے دوران تکبر، حسد، طمع، ریا، نفاق، کینہ اور خود پسندی سے دور رہو۔ ادائیگی زکوٰۃ اور اس کی حدود کی نگہداشت میں مستعد اور کاربند رہو کیونکہ جو زکوٰۃ نہیں دیتا اس کی نماز، حج اور کوئی اور کام شرفِ قبولیت نہیں حاصل کرتا۔ بخیل اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ بخیل بہشت سے دور اور دوزخ سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سخی خدا کی رحمت اور بندگانِ خدا کے دلوں سے نزدیک اور دوزخ سے دور رہتا ہے۔

’’لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے انسان مقصودِ حقیقی تک پہنچنے سے کیوں محروم رہتا ہے؟‘‘

لوگوں نے نفی میں سر ہلایا تو آپ نے جواب دیا۔’’انہوں نے راہِ وصول کو چھوڑ دیا ہے اور دنیائے دُونی پر قناعت کرلی ہے۔ صوفی کو چاہیے کہ معرفت اور توحید میں اپنے اعتقاد کو درست رکھے۔ گمراہی اور بدعت سے دور رہے۔ اپنے اعتقاد میں

مقلد نہ بنے اور اپنی ہر بات میں دلیل اور برہان رکھتا ہو۔ دوستو! سوچو تو سہی کہ یہ کتنی بری بات ہے کہ کوئی تم سے مذہب کی بات کرے اور تمہیں اس کا کوئی علم نہ ہو۔

''تم علما کی صحبت اختیار کرو کیونکہ عالم امت محمد یہ ﷺ کے چراغ ہیں۔ جاہلوں کی صحبت سے دور ہو۔ دنیاداروں سے پرہیز کرو کیونکہ ان کی صحبت تمہیں خدا سے دور رکھے گی۔

''رقص وسماع کی محفلوں سے دور رہو کیونکہ یہ دونوں چیزیں اپنی کثرت میں دلوں کو مُردہ کردیتی ہیں۔

''دوستو! ہم چاہتے ہیں ہمارے یاروں کے کام ان وصیتوں کی روشنی میں انجام پائیں۔''

ان وصیتوں کے بعد فرمایا۔ ''ماضی میں مشائخ کرام نے اپنے اپنے مریدوں کے ذریعے اپنی تعلیمات کو پھیلایا تھا۔ آپ لوگوں سے میں نے بھی یہی توقعات قائم کرلی ہیں۔''

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''حضرات! میں خلوت میں جانا چاہتا ہوں۔''

ایک صاحبزادے نے پوچھا۔ ''وہاں آپ کیا کریں گے؟ یعنی تخلیے میں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اعتکاف میں بیٹھ جاؤں گا۔''

کسی اور نے سوال کیا۔ ''تخلیہ اور اعتکاف آخر کس لیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اللہ کی حمد میں مشغول ہوجانا چاہتا ہوں۔''

دوسروں نے اجازت دے دی اور آپ اعتکاف میں چلے گئے اور تین دن تک کسی کی صورت تک نہیں دیکھی۔

جب آپ باہر تشریف لائے تو کسی نے پوچھا۔ ''حضرت تین دن تک آپ اندر کیوں بند رہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میرے مویشیوں کی آرام کی نسبت جاننا چاہیے۔ میں تین دن تک مراقبے میں رہا اور جب نفس اور ضمیر درست رہتے ہیں تو ہر کوئی سیدھا ہوجاتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ میں نے اپنے آپ کو خود احتسابی سے دور نہیں رکھا۔''

اس کے بعد آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ''آخری بار ایک پیالہ پانی تو پلادے۔''

مرید نے روتے ہوئے عرض کیا۔ ''حضرت! ایسی بات نہ کہیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خدایا انہیں اتنی چیزیں دے دے کہ ان کے دلوں سے حرص وطمع نکل جائے۔''

پھر پوچھا۔ ''آج کون سا دن ہے؟''

آپ کے صاحبزادے نے جواب دیا۔ ''پنجشنبہ (جمعرات)''

پوچھا۔ ''مہینہ کون سا ہے؟''

جواب دیا۔ ''جمادی الاولیٰ''

آپ نے پھر پوچھا۔ ''اور تاریخ؟''

جواب دیا گیا۔ ''آٹھ''

''گویا میں ۲ ۷ ۷ ھ کو عبور نہیں کرسکوں گا۔''

مریدوں نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! ایسا نہ کہیے، ابھی ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔''

آپ نے خواجہ بہاءالدین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تم میں موجود ہیں، میں ان کے لیے جگہ چھوڑ رہا ہوں۔'' پھر بہ آواز بلند آپ نے کہا۔ ''اشھدان لاالٰہ الا اللہ واشھدان محمد رسول اللہ۔''

اس کے بعد آپ نے آخری ہچکی لی اور اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ آپ کے صاحبزادوں اور مریدوں نے سوخاری میں آپ کا مزار تعمیر کردیا جو صدیوں عوام اور خواص کا مرجع رہا ہے

عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب

(ماخذات)

حدیقتہ الاولیا، مفتی غلام سرور لاہوری... تذکرہ مشائخ نقشبند، علامہ نور بخش توکلی

تذکرہ اولیائے نقشبند، مؤلف: محمد امین شرقپوری... العتیق، مولوی عبدالحفیظ... حالات مشائخ نقشبند... مؤلف: مولوی محمد حسن

عورت کا انتقام

شاکر لطیف

کہتے ہیں کہ عورت کا انتقام کسی ناگن سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں کتنی صداقت ہے اس پر تو بحث کرنا فضول ہے البتہ انتقام کسی بھی روپ میں ہو انجام تباہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے مگر اس کا انتقام اتنا منفرد انداز لیے ہوئے تھا کہ آخری لمحوں تک وہ انتقام نہیں بلکہ کسی کی محبت کا اہتمام محسوس ہوتا رہا... کیونکہ وہ انفرادیت کی شیدائی تھی۔

سطر سطر چونکا دینے والے واقعات پر مشتمل ایک دلچسپ روداد

''عورت کا انتقام.....'' اخبار کے مدیر نے جیسے ہی کہانی کا نام پڑھا، ان کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ انہیں کہانی کے نام سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ کہانی کس قسم کی ہوگی۔ کس قدر مضحکہ خیز نام تھا جو لکھنے والے کی بچکانہ سوچ کی عکاسی بھی کر رہا تھا۔ جس لکھنے والے کو عنوان دینا بھی نہ آتا ہو، وہ کہانی کیا لکھتا تاہم کیونکہ ان کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ کسی بھی کہانی کو مسترد کرنے سے پہلے پڑھتے تھے اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کہانی کو



بھی پڑھ لیں۔
ان کا نام سلطان احمد تھا۔ وہ کراچی میں اپنا ایک ذاتی ادارہ چلاتے تھے۔ اس ادارے سے روزنامہ اور ہفتہ وار ایک میگزین نکالا جاتا تھا۔ اب اس میگزین کی شہرت پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ اس کی تمام کا پیاں بہ آسانی فروخت ہوجاتی تھیں اور یہ ملک کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے بک سینٹر پر دستیاب تھا، اس لیے اب ان کا یہ ادارہ ایک منافع بخش ادارہ بن چکا تھا۔
اگرچہ سلطان احمد اس ادارے کے مدیر اعلیٰ تھے مگر اس کے باوجود وہ میگزین کے لیے آنے والے تمام خطوط کا جواب خود ہی دیتے تھے اور اپنے میگزین کے لیے کہانیوں کا انتخاب بھی خود کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک اچھے رائٹر تھے اس لیے انہیں کسی بھی کہانی کا انتخاب کرتے وقت زیادہ مشکل پیش نہ آتی تھی۔ وہ اپنے میگزین کے لیے ملک کے نامور رائٹرز کی خدمات حاصل کرتے اور ساتھ ساتھ انہیں مناسب معاوضہ بھی دیتے تھے تاہم بہت سے نئے لکھنے کے شوقین انہیں اپنی کہانیاں بھیجتے رہتے اور بعض تو بذاتِ خود ان کے دفتر میں اپنی کہانیاں لے کر آتے تھے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ انہیں کسی نئے لکھنے والے کی کہانی پسند آتی۔ زیادہ تر کہانیوں کو وہ مسترد کر دیتے کیونکہ وہ اس قابل ہی نہ ہوتیں کہ وہ اپنے میگزین کی زینت بناتے تاہم وہ نئے لکھنے والوں کے خطوط کا جواب نہایت شائستگی سے دیتے تھے۔ وہ کسی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اگر کوئی شوقیہ رائٹر ان کے دفتر میں خود آجاتا تو اس سے بھی اچھے طریقے سے بات کرتے تھے اور اس کی راہنمائی بھی کرتے تھے۔ کئی دفعہ ان کے پاس نقل شدہ کہانیاں بھی آجاتی تھیں تاہم ان کی نظروں سے نہ بچ پاتیں۔ وہ فوراً ہی پہچان لیتے کہ کہانی نقل شدہ ہے کیونکہ کہانیوں کے معاملے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اگرچہ وہ نرم طبیعت کے آدمی تھے مگر ایسے نقالوں کے ساتھ وہ سختی سے پیش آتے۔
آج بھی ایک رائٹر اپنی کہانی کے ساتھ ان کے دفتر میں موجود تھا۔ اگرچہ سلطان احمد نے اس سے کہا بھی کہ وہ اپنی کہانی کے بارے میں بعد میں پتا کرلے مگر وہ بضد تھا کہ اس کی کہانی اس کے سامنے پڑھی جائے۔
سلطان احمد کو وہ شکل وصورت سے کوئی چھٹا ہوا غنڈا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاصا گڑیل جوان تھا۔ چہرے کے ایک طرف زخم کا گہرا نشان تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل مزید خوف ناک معلوم ہوتی تھی۔ بات کرنے کا انداز بھی خاصا جارحانہ تھا اگر وہ کسی اور میگزین کے دفتر جاتا تو شاید اس کا حلیہ دیکھ کر اسے اندر ہی نہ گھسنے دیا جاتا مگر یہ سلطان احمد کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے نہ صرف اسے اپنے دفتر میں بیٹھنے کی اجازت دی بلکہ اس کے سامنے اس کی کہانی پڑھنے پر بھی تیار ہوگئے۔ ویسے تو انہیں کہانی کے نام سے ہی کہانی کا اندازہ ہوچکا تھا تاہم پھر بھی انہوں نے کہانی پڑھنا شروع کردی۔
یہ کہانی کسی عورت کی آپ بیتی تھی، اس نے کہانی کچھ اس طرح شروع کی تھی۔
''جناب مدیر اعلیٰ صاحب السلام علیکم!
آپ کو میری کہانی کا نام شاید پسند نہ آئے مگر چونکہ کہانی کا یہی نام ضروری تھا اس لیے میں نے بھی یہی نام دے دیا ہے۔ میرا نام ماہ بانو ہے، یہ میرا فرضی نام ہے کیونکہ میں اپنا اصلی نام آپ کو نہیں بتانا چاہتی۔ میں صرف آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ میں اپنے گاؤں کا نام بھی آپ کو نہیں بتاسکتی۔ بس صرف یہ بتاسکتی ہوں کہ میرا بچپن ایک پسماندہ علاقے میں گزرا ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میری والدہ کا انتقال میری پیدائش کے تین سال بعد ہی ہوگیا تھا۔ میری پرورش میرے والد نے کی۔ اگرچہ میرے والد بہت غریب تھے تاہم پھر بھی وہ میرا اچھے طریقے سے خیال رکھتے تھے مگر میں ابھی دس سال کی ہی ہوئی تھی کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ جب تک وہ زندہ رہے مجھے زندگی کی تلخیوں کا بھی احساس نہ ہوا مگر جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی کا ایک اور روپ بھی ہے جو بہت کٹھن ہے۔
''غربت کے باوجود میرے والد مجھے پڑھا رہے تھے۔ میں دس سال کی عمر میں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرچکی تھی۔ مدیر اعلیٰ صاحب! بہت بے فکری کا دور تھا۔ یقیناً آپ بھی اس دور سے گزرے ہوں گے۔ ویسے بھی میری نسبت آپ کے لیے وہ زیادہ بے فکری کا دور ہوگا کیونکہ آپ بہرحال ایک مرد تھے مگر یقیناً آپ کو اتنی کم عمری میں ماں باپ کی محرومی کا صدمہ نہیں پہنچا ہوگا اس لیے آپ میرے غم کا صرف اندازہ لگاسکتے ہیں۔
''میرے والدین کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ والد کی موت کے بعد میرے ماموں مجھے اپنے گھر لے گئے کیونکہ میرے قریبی رشتے دار وہی تھے اور پھر کوئی دوسرا رشتے دار میری پرورش کی ذمے داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ ماموں نے مجھے اپنے علاقے کے قریبی اسکول میں

داخل کروا دیا جہاں میری تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ میں بہت دل لگا کر پڑھتی تھی مگر ساتھ ساتھ مجھے گھر کے سارے کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ گھر کی صفائی سے لے کر کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے۔ اس وجہ سے کئی دفعہ اسکول کا کام بھی رہ جاتا اور پھر استانی سے مار کھانا پڑتی مگر استانی کی مار کھانا آسان تھا اور ممانی کی مار کھانا مشکل۔

''ممانی مجھے اتنا مارتیں کہ میرے جسم پر نشان پڑ جاتے۔ درد کی وجہ سے رات کو سونا مشکل ہو جاتا۔ صبح اٹھ کر اسکول جانا ہوتا تھا۔ دوپہر کو واپس آ کر گھر کے کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ اگرچہ ماموں کا رویہ میرے ساتھ اچھا تھا لیکن ممانی کے سامنے دم مارنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ ممانی کو میرا اسکول جانا بھی قبول نہ تھا مگر ماموں نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کرا دیا تھا کہ اس طرح سے خاندان والے باتیں بنائیں گے کہ یتیم بچی کی پرورش کی ذمے داری تو لے لی مگر اسے تعلیم بھی نہ دلوائی جبکہ ماموں کے اپنے بچے تو تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

''ان تمام مظالم کی میں اب عادی ہو چکی تھی۔ مار کھا کھا کر سخت جان ہو گئی تھی مگر پھر بھی یہ میری زندگی کا بہت برا دور تھا۔ میں نے جیسے تیسے کر کے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی مگر اس سے آگے نہ پڑھ سکی کیونکہ اب میرا آگے پڑھنا میری ممانی کو کسی طور قبول نہ تھا۔ اب میری زندگی صرف گھر کے کام کرنے تک محدود ہو گئی تھی۔

''مجھے اپنی ممانی سے شدید نفرت تھی مگر میں اس نفرت کا ان کے سامنے اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ ممانی کی اولاد اگرچہ رشتے میں تو میرے ماموں زاد تھے مگر مجھے مجھے صرف ایک نوکرانی ہی سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے ان کی ماں نے انہیں جو تربیت دی تھی وہ وہی کرتے تھے۔ کوئی بھی لڑکی آخر کب تک کسی کا ظلم برداشت کر سکتی ہے۔ یا تو وہ مر جائے گی یا خودکشی کر لے گی یا پھر ان مظالم سے نجات پانے کی کوئی اور ترکیب سوچے گی۔ میں نے بھی ایک ترکیب سوچ لی تھی۔

''مدیرِ اعلیٰ صاحب! ایک لڑکا اسکول کے زمانے سے میرے پیچھے آتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں آٹھویں جماعت میں تھی۔ میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کیونکہ اس وقت ایک تو میری عمر کم تھی اور دوسرا میں اپنی ممانی سے بہت زیادہ خوفزدہ رہتی تھی۔ اب اس لڑکے نے میرے گھر کے باہر بھی چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ میں جب چھت پر کپڑے ڈالنے کے لیے جاتی تو وہ کسی پتھر کے ساتھ خط لپیٹ کر چھت پر پھینک دیتا تھا۔

تشخیص

ایک ڈاکٹر کسی خاتون کے کوائف لکھ رہا تھا۔ ''اچھا تو آپ کو چلنے میں تکلیف ہوتی ہے اور سانس بھی پھول جاتا ہے۔ بھلا آپ کی عمر کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''بس اگلے سال میں تیس کی ہو جاؤں گی۔''

''حافظہ بھی کمزور ہے۔'' ڈاکٹر نے لکھا۔

ستم ظریفی

کالونی کے ایک مکان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر سے خاتونِ خانہ نے آواز دے کر پوچھا۔

''کیا بات ہے، کون ہے؟''

''بی بی! ہم محلے والے ہیں، آپ کے ملازم کی لاش لے کر آئے ہیں۔ اس کے اوپر سے روڈ رولر گزر گیا ہے۔''

''تو پھر مجھے دروازے پر بلانا ضروری ہے کیا؟ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دو۔'' خاتون نے جواب دیا۔

آئی، سی، یو

لڑکے والے۔ ''ہمیں ایسی لڑکی کا رشتہ چاہیے جو زیادہ کھاتی پیتی نہ ہو، ہمیشہ چپ رہے اور شوہر کی سنے۔''

لڑکی والے۔ ''ایسی لڑکی آپ کو صرف اسپتال کے آئی سی یو میں ہی ملے گی۔''

چھوٹی سی بات

اگر آئینے میں ایک دم آپ کا چہرہ خوبصورت نظر آنے لگے تو جان لیجیے کہ نظر بھی کمزور ہو چکی ہے۔

جب پولیس کے سپاہی کے بجائے آپ کا ڈاکٹر آپ کو گاڑی چلانے سے منع کرے تو جان لیجیے کہ آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔

آپ کی زندگی کی تصویر آپ خود نہیں بناتے بلکہ آپ کا اخلاق آپ کی محبتیں بناتی ہیں۔

چنار کا خزاں رسیدہ پتا جب آپ کے پاؤں تلے آتا ہے تو چرچراتا ہے۔ غور کیجیے، وہ کہتا ہے خزاں تم پر بھی آئے گی۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، وٹل ہزارہ

مجھے اس کے خطوط میں بہت مٹھاس محسوس ہوتی تھی۔ مجھے اس کے محبت بھرے خطوط اچھے لگنے لگے تھے۔ اس وقت میں کچی عمر کی تھی۔ یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ خاص کر کسی لڑکی کے لیے...... اس لڑکے کی محبت دیکھتے ہوئے مجھے بھی اس سے محبت ہونے لگی تھی اور ویسے بھی اس عمر میں انجام کی کسے پروا ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنالیا۔ مجھے بس تھوڑی سی ہمت کرنا تھی۔ جیسا کہ میں یہ بتا چکی ہوں کہ میرا تعلق ایک پسماندہ علاقے سے تھا جہاں غیرت کے نام پر قتل عام سی بات تھی۔ پہلے بھی یہاں سے ایک لڑکی کسی کے ساتھ بھاگی تھی مگر گاؤں والوں نے اسے اور اس کو بھگانے والے مرد دونوں کو پکڑلیا۔

''شاید آپ یقین نہ کریں کہ یہ منظر میں نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر خود دیکھا تھا۔ دونوں کو ڈنڈے مار مار کر سرعام قتل کردیا گیا۔ میرے لیے ان دونوں کا انجام بہت خوف ناک تھا۔ ممانی کی مار کھانے کی وجہ سے پہلے ہی مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد میں کئی دنوں تک سو نہ سکی۔ اس کے باوجود میں نے اس لڑکے کے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے خط میں بتایا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اس لیے اس کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ وہ لڑکا ہمارے گاؤں کا بھی نہیں تھا، وہ ہر دوسرے دن شہر سے مجھے ملنے کے لیے آتا تھا۔ غالباً پہلی بار جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ اس گاؤں میں کسی کام سے آیا تھا۔ اب میں اس کے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار تھی۔ بس مجھے پیسوں کا بندوبست کرنے کے لیے ممانی کا زیور چوری کرنا تھا اور پھر اس کے ساتھ شہر فرار ہوجانا تھا۔''

کہانی پڑھتے پڑھتے سلطان احمد چونک گئے۔ انہیں یہ کہانی جانی پہچانی سی لگی۔ نہ جانے انہیں ایسا کیوں لگا تھا کہ شاید یہ کہانی نقل شدہ تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ سامنے بیٹھے شخص نے یہ کہانی کسی دوسرے میگزین سے نقل کی ہو۔ کہانی جاندار تھی اور اس میں ربط بھی تھا مگر جو شخص سلطان احمد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اس کی شخصیت کسی رائٹر کی شخصیت سے بالکل میل نہ کھاتی تھی اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اس نے یہ کہانی نقل کی ہو۔ تاہم انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے پوری کہانی پڑھ لی جائے اس لیے انہوں نے دوبارہ کہانی پڑھنا شروع کردی۔

''پھر ایک دن میں اس لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شہر آگئی۔ ممانی کا زیور بھی میں ساتھ لے آئی تھی۔ زیور بیچ کر ہم نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اور عدالت جاکر کورٹ میرج بھی کرلی۔ میری شہری زندگی کا آغاز بہت پُرمسرت تھا۔ اس لڑکے کے ساتھ گزارے ہوئے وہ چند ماہ میری زندگی کا یادگار دور ہے۔ مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ زندگی کی حقیقی خوشیاں کیسی ہوتی ہیں۔ میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھول گئی تھی۔ اس لڑکے کا رویّہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ممانی کے گھر سے جو زیور چوری کرکے میں لائی تھی، اسے بیچ کر جو رقم حاصل ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی تھی۔ جیسے جیسے وہ پیسے ختم ہوتے گئے، اس لڑکے کے رویّے میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ اب اس کا رویّہ سرد سا ہوگیا تھا۔

''پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس وقت میرے کیا احساسات تھے یہ آپ نہیں جان سکتے۔ بہت خوشی ہوئی ہے مگر جب میں نے اپنے شوہر کو بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو اسے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی بلکہ اس نے الٹا مجھے کہا کہ میں بچہ ضائع کروادوں کیونکہ ابھی وہ بچہ نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کردیا۔ میں ماں بننا چاہتی تھی۔

''جناب مدیر اعلیٰ صاحب! یہ میری زندگی کا بہت خوش کن دور تھا مگر یہ دور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ شاید خوشیوں کا دورانیہ بہت کم ہوتا ہے اور دکھ، آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ ایک دن وہ لڑکا بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں جب بازار سے گھر آئی تو میز پر ایک خط اور طلاق نامہ موجود تھا۔ اس نے صاف لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جارہا ہے۔ وہ مزید میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ شاید اس کا دل مجھ سے بھر گیا تھا یا پھر اسے کوئی اور مل گئی تھی۔ بات جو بھی تھی، وہ مجھے چھوڑ کر جاچکا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس وقت میری حالت کیا ہوگی۔ یقین جانیے اگر میرے پیٹ میں بچہ نہ ہوتا تو میں خودکشی کرلیتی مگر مجھے اب زندہ رہنا تھا اپنے بچے کے لیے۔ شاید یہی میری زندگی تھی کیونکہ واپس تو جا نہیں سکتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد میرے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو میں اس کرب کو بھول گئی کہ میرا شوہر مجھے چھوڑ چکا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے بیٹے کو زندگی کی تمام خوشیاں دوں گی، اسے پڑھاؤں گی اور ایک ماں کے طور پر وہ سب کچھ کروں گی جس کی مجھ میں طاقت ہوگی مگر یہ فیصلہ کرتے وقت میں بھول گئی تھی کہ میں ایک کمزور عورت تھی۔

''اپنے بچے کو پالنے کے لیے مجھے بہت سی مشکلات

کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے لوگوں کے گھروں میں کام کیا۔ برتن مانجھے، جھاڑو دی۔ بہت کچھ کیا مگر اس کے باوجود میں اپنے بیٹے کو تعلیم نہ دلوا سکی۔ میرے تمام خواب ادھورے رہ گئے۔ میں تو چاہتی تھی کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر بابو بن جائے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ وہ بابو تو بن گیا مگر مشہور بدمعاش بابو۔ آپ نے شہر کے مشہور غنڈے بابو کا نام تو سنا ہی ہوگا، میں اسی بابو کی ماں ہوں۔ شاید اسے آج کل بابو ٹارگٹ کلر کہا جاتا ہے۔''

بابو کا نام پڑھ کر سلطان احمد چونک گئے۔ انہوں نے بھی بابو کا نام سن رکھا تھا۔ وہ بھتا خوری اور قتل کی کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا مگر کبھی بھی پولیس کے ہاتھ نہ آسکا تھا۔ سلطان احمد نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ بڑے بڑے تاجروں اور امیر لوگوں سے بھتا وصول کرتا ہے۔ اس کا نام پورے شہر میں خوف اور دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ یہ کہانی بابو کی ماں کی تھی۔ سلطان احمد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ انہیں پہلی بار اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے خوف محسوس ہوا۔ نہ جانے وہ کون تھا۔ اس کی نظریں سلطان احمد کے ہاتھوں میں موجود کہانی کے صفحات پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سلطان احمد ویسے تو خوفزدہ ہوگئے تھے مگر انہوں نے کہانی پڑھنا جاری رکھی۔

''مدیر اعلیٰ صاحب! میں اپنے ساتھ ہونے والی ان تمام زیادتیوں کو فراموش کرچکی ہوں جو میری ممانی نے میرے ساتھ کیں۔ لیکن جو میرے شوہر نے میرے ساتھ کیا، اسے میں آج تک نہیں بھول پائی۔ وہ مجھے مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر اچانک ہی بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے دل میں شوہر کے لیے شدید نفرت تھی جس کے لیے میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر میں پکڑی گئی تو جان سے ماری جاؤں گی۔ میں اس کے ساتھ بھاگنے پر تیار ہوئی۔ حتیٰ کہ اس کے کہنے پر میں نے چوری تک کی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی ممانی کے مظالم سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھے امید نہ دلاتا تو میں کبھی گھر سے بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی۔ میں برسوں اسے تلاش کرتی رہی مگر وہ مجھے نہ ملا۔ میری طرح میرا بیٹا بابو بھی اپنے باپ سے شدید نفرت کرتا ہے اور یہ نفرت میں نے اسے بچپن سے لے کر جوانی تک گھوٹ گھوٹ کر پلائی تھی۔ میں اپنے شوہر سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ آپ کو میری بات عجیب لگے گی لیکن میں نے خود اپنے بیٹے کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے باپ کو تلاش کرکے قتل کردے۔ ہے نا حیرت کی بات! مگر جب آپ اپنے آپ کو میری جگہ رکھ کے سوچیں گے تو آپ کو یہ بات زیادہ عجیب نہیں لگے گی۔ میں ایک ٹارگٹ کلر کی ماں ہوں۔ ہم جیسے لوگوں میں زندگی گزارنے کی بالکل مختلف بلکہ حیران کن اقدار رائج ہوتی ہیں۔ عام زندگی میں شاید ایسا نہ ہوتا ہو۔

''پھر ایک دن میرے بیٹے نے اسے تلاش کرلیا۔ یہ خبر میری زندگی کا سب سے خوش کن لمحہ بن گئی۔ چاہتی تو یہ تھی کہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کروں مگر بیماری کی وجہ سے بستر مرگ پر ہوں اس لیے ایسا نہیں کرسکتی...... مگر کوئی بات نہیں، میرا بیٹا میرا انتقام لے گا۔ مجھے اپنے بیٹے کے سوا دنیا کے تمام مردوں سے نفرت ہے۔ اب میں آپ کو اپنا اصل نام بتاتی ہوں جناب سلطان احمد صاحب! میرا اصل نام افشاں ہے۔ وہی افشاں سلطان احمد جسے تم نے جھوٹی محبت کا جھانسا دیا اور مطلب نکلنے کے بعد ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تم اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بہت خوش وخرم زندگی بسر کررہے ہو مگر آج تمہاری خوشیوں کا آخری دن ہے۔ آج تمہارا اپنا بیٹا بابو تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا۔ اسے تم پر ذرا بھی رحم نہیں آئے گا کیونکہ اس نے صرف نفرت کرنا سیکھا ہے۔ اس کی نظریں تمہارے ہاتھوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ جیسے ہی تم آخری صفحے پر پہنچو گے، وہ پستول نکال لے گا۔ تمہیں مارنے کے بعد وہ آسانی سے تمہارے دفتر سے نکل جائے گا کیونکہ پستول دیکھ کر کوئی بھی سامنے نہیں آتا۔ تو کیسی رہی کہانی مدیر اعلیٰ صاحب! اس کا نام شاید تمہیں پسند نہ آیا ہو مگر انجام ضرور پسند آئے گا کیونکہ یہ انجام تمہاری موت پر ہوگا۔ عورت کا انتقام تمہاری زندگی کی آخری کہانی ہے۔ میرا بیٹا تمہیں آخری صفحہ پڑھتے دیکھ چکا ہوگا، ذرا نظریں تو اٹھاؤ۔''

سلطان احمد نے حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے بابو کو دیکھا جو اپنا پستول نکال چکا تھا۔ وہ جب اپنی بیوی کو چھوڑ کر گئے تھے تو بابو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا مگر اب وہ ایک کڑیل جوان کی صورت میں ان کے سامنے پستول تانے بیٹھا ہوا تھا۔

''بیٹا!'' سلطان احمد نے خوف زدہ لہجے میں اس سے کہا۔

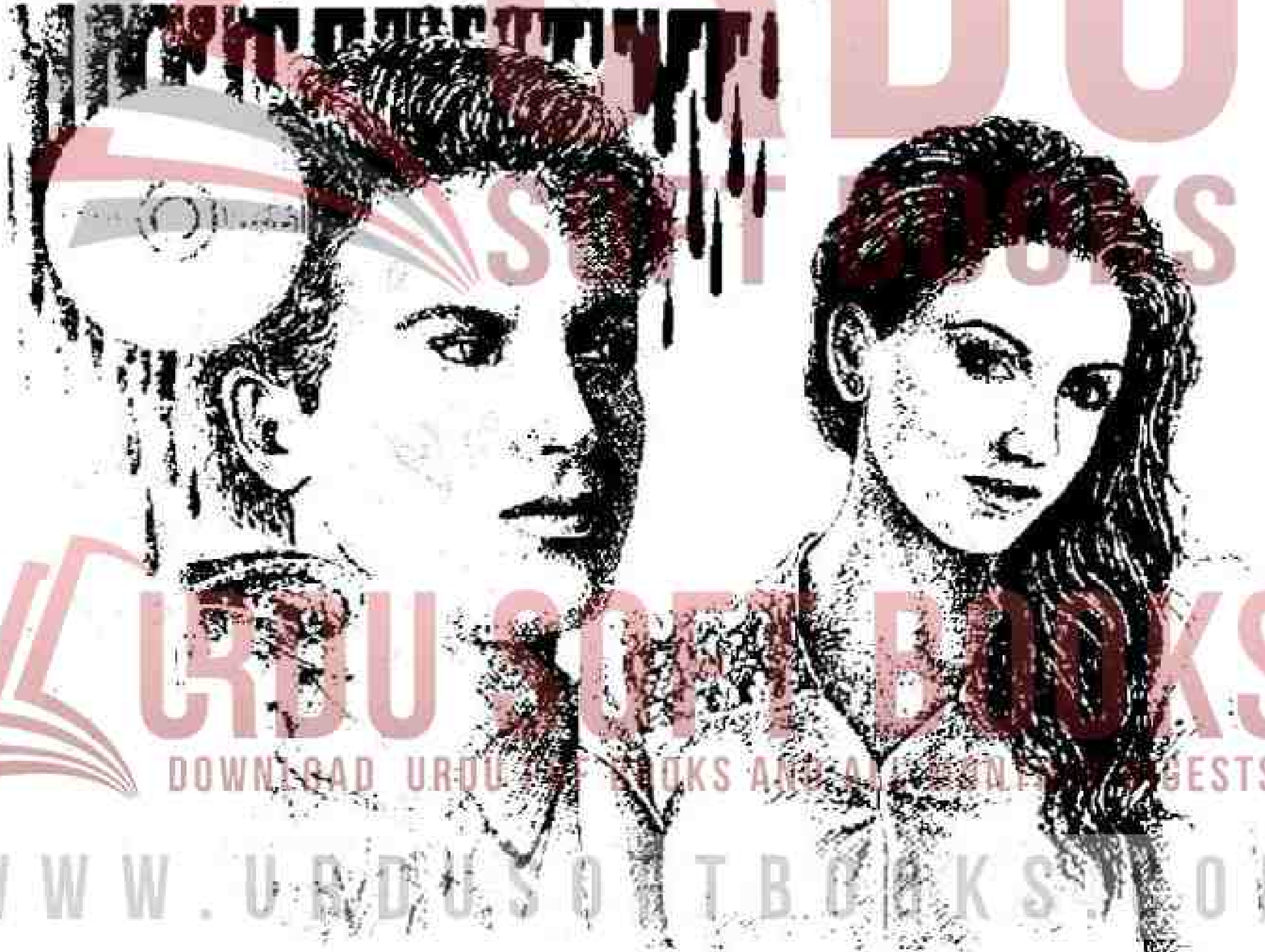
اپنے لیے بیٹے کا لفظ سن کر سامنے بیٹھے ہوئے بابو کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کے آثار نمودار ہوئے جو فوراً ہی چھٹ گئے اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور مدیر اعلیٰ صاحب ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

بھنور

سلیم فاروقی

جس طرح مہک... خوشگوار ہو یا ناگوار...
اور جس پر خواہ لاکھ پردے ڈالے جائیں، اپنا پتا آپ
دیتی ہے۔ اسی طرح نیکی ہو یا کوئی جرم... چھپائے
نہیں چھپتے... وہ بھی اتفاقاً ایک ایسے ہی لمحے کا
چشم دید گواہ بن گیا تھا جب شام کی چادر دن کے اجالے کو
اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، جس میں جانے کیا کیا راز پوشیدہ
تھے... مگر ان کا بوجھ اس کے دل پر کچھ ایسے آیا کہ دھڑکنوں
کی بے ترتیبی نے اسے خود سے بھی بے خبر کردیا لیکن... نہ جانے
کس کی دعا اور محبت کام آئی کہ موت کے سمندر نے اسے زندگی کی
جانب اچھال دیا مگر شام کی اس چادر نے اس کا پیچھا پھر بھی نہ
چھوڑا... کتنے موسم آئے اور بیت گئے... پھولوں کی مہک تعفن زدہ
ضمیروں کے آگے ہار گئی۔ رہ جو دنیاداری کی خاطر نیکی کرنے کے عادی
تھے... اور گناہ کی دلدل میں اترتے ہوئے انہیں ذرا احساس نہ تھا کہ
بادشاہت ہو یا فقیری... ایک دن فنا ہو جانے کے لیے ملتی ہے۔ جبکہ ان کی
غفلت کا یہ حال تھا کہ جو بھی ملا اسے مالِ غنیمت جان کر گلے لگالیا۔ کیا خبر تھی
کہ یہی مال ایک روز انہی کے گلے میں پھانسی کا پھندا بن جائے گا۔

بھیڑیوں کے جال میں ایک مردِ جانباز کا بے باک انداز... سسپنس کے لیے مصنف کی آخری تحریر



کا بہت بڑا لشکر تیار کیا اور غزنی کی طرف جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اسے اپنے لشکر کی تعداد اور راجپوتوں کی بہادری پر بڑا ناز تھا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں مسلمانوں کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تمام راجپوت سالاروں کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس کا مقصد حکمت عملی طے کرنا تھا بلکہ وہ مسلمانوں کی بہادری کی تعریف کر کے راجپوتوں کی غیرت کو للکارنا چاہتا تھا تاکہ وہ آخری دم تک لڑنے کا عہد کر لیں۔

جب رات کی تاریکی میں جگہ جگہ جلتے ہوئے آگ کے الاؤ کی روشنی میں یہ سالار دائرہ بنا کر بیٹھ گئے تو راجا جے پال قلعے سے نکلا اور ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔

”مہاراج! کیا جنگ کا فیصلہ ٹل گیا ہے جو ہمیں طلب کیا گیا ہے؟“

”موت کا وقت ٹل سکتا ہے مگر اب یہ جنگ ٹلنے والی نہیں۔“

”پھر وہ کون سی بپتا ہوئی کہ ہمیں بلا لیا گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں صبح ہوتے ہی بھٹنڈہ سے نکلنا ہے۔ فیصلے میں کوئی تبدیلی ضرور آئی ہے۔“

”تبدیلی تو نہیں آئی لیکن چلنے سے پہلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”مہاراج! ہم سننے کو تیار ہیں۔“

”تو سنو! ہم جس یدھ (جنگ) کے لیے جا رہے ہیں وہ کوئی معمولی جنگ نہیں۔ ہمارا مقابلہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمانوں کی بہادری کے قصے مشہور ہیں۔ ان کی تلواروں کے سامنے کسی کا ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد امر ہو جاتے ہیں، شہید ہو جاتے ہیں۔ وہ امر ہو جانے کی آرزو میں اپنی گردنیں خود تلواروں پر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بجلی کی طرح میدان میں للکارے بھرتے ہیں۔ ان کا امیر سبکتگین تو ایسا پہاڑ ہے جسے پاش پاش کرنا آسان بات نہیں۔ شاید ہمارے ہاتھی بھی اس سے ٹکرا کر واپس آ جائیں۔ اگر انہیں فتح ہوئی تو ہمارے دھرم کا نشان تک مٹ جائے گا۔“

وہ شاید ابھی کچھ اور کہتا کہ کئی راجپوت ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

”مہاراج! ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کا ایسا خوف بیٹھ جائے گا۔“

”میرے بہادر سپوتو! تم نے غلط سمجھا۔ میں مسلمانوں سے خوف زدہ نہیں۔ میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تمہیں غیر معمولی بہادری سے لڑنا ہے۔“

”آپ نے مسلمانوں کی بہادری کے قصے بیان کر دیے، یہ بیان نہیں کیا کہ راجپوتوں کی بہادری کی قسم آسمان کھاتا ہے۔ ہم جب میدان میں قدم رکھتے ہیں تو دھرتی پناہ مانگتی ہے۔ مسلمان ابھی تک آپس میں لڑتے رہے ہیں، انہیں کبھی ہم سے واسطہ نہیں پڑا۔ ہم آپ کو وچن دیتے ہیں کہ اس جنگ کے بعد آپ بھی مسلمانوں کو بہادر نہیں کہیں گے۔ اب یہ جنگ مسلمانوں سے نہیں، آپ کے غلط خیالوں کے لیے ہوگی۔ اب یہ جنگ میدانوں میں نہیں، غزنی کے بازاروں میں لڑی جائے گی۔ اب مندر نہیں، مسجدیں گریں گی۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ یہ دعوت تم میں سے ہر ایک کے لیے ہے۔ جو کوئی مسلمانوں کے امیر سبکتگین کو قتل کرے گا، میں وچن دیتا ہوں کہ جو وہ مانگے گا میں اسے دوں گا۔ اگر میری آدھی حکومت بھی مانگے گا تو میں اسے دوں گا۔“

میدان میں پھیلے ہوئے سناٹے میں کئی گنا سناٹے کا اضافہ ہو گیا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس سناٹے کو اپنی آواز سے توڑتا۔ سب خاموش تھے..... بالآخر جے پال کا سپہ سالار بھیم اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

”مہاراج! یہ شرط ہی غلط ہے۔ ہم سب صرف سبکتگین کو قتل کرنے کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارا مقابلہ پورے لشکر سے ہوگا۔ جب لشکر ہی بھاگ کھڑا ہوگا تو سبکتگین میدان میں رہ کر کیا کرے گا۔ اگر انعام کے لالچ میں ہمارا پورا لشکر سبکتگین کے تعاقب میں لگ گیا تو ہماری ترتیب بکھر جائے گی۔ پھر ہمیں شکست سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اگر آپ کو سبکتگین کے قاتل کو انعام دینا ہی ہے تو اس کا اعلان اس وقت کیجیے جب سبکتگین قتل ہو جائے یا گرفتار کر لیا جائے۔“

جے پال نے اپنے سپہ سالار کی بات مان لی اور اجلاس برخاست کر دیا۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ راجپوتوں کو بھڑکانا مقصود تھا اور وہ انہیں طیش دلا چکا تھا۔ ہر راجپوت یہ کہہ کر اٹھا تھا کہ وہ مسلمانوں کی بہادری کی شہرت کو خاک میں ملا دے گا۔

اجلاس ختم ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک نوجوان سالار قلعے کے دروازے پر آیا اور راجا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ سالار ان پہرے داروں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے بھی اسے دیکھ چکے تھے۔ اس کے باوجود راجا سے اجازت لینی ضروری تھی۔ نوجوان سالار کی خوش نصیبی کہ راجا ابھی سویا نہیں تھا۔ اس کا سپہ سالار بھیم بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

راجا نے اجازت دے دی اور پہرے داروں نے

عمران نے اپنی ہیوی بائیک سائڈ اسٹینڈ پر لگائی اور اتر کر ساحل کی طرف بڑھا۔ سینڈز پٹ کے ساحل پر اس وقت رش برائے نام ہوتا تھا اور عمران جس حصے کی طرف جا رہا تھا، وہاں تو عموماً بالکل سناٹا ہوتا تھا۔ وہ جب تھکن محسوس کرتا تو عام طور پر ساحل کے اسی حصے کا رخ کرتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دو چار سگریٹ پیتا، ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کرتا اور ایک ابھری ہوئی چٹان پر کچھ دیر تک بیٹھنے کے بعد واپسی کا رخ کرتا۔

اس وقت بھی وہ سکون ہی کی خاطر ساحل پر گیا تھا۔ ابھی اس نے اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ وہ چونک اٹھا۔ اسے وہاں سے کافی فاصلے پر دو تین افراد کے ہیولے سے نظر آرہے تھے۔ سگریٹ کا گہرا کش لے کر اس نے سوچا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟

اس نے بڑی احتیاط سے آگے بڑھ کر کیمرے کے زوم لینس کے ذریعے انہیں فوکس کیا تو وہ چونک اٹھا۔ ان افراد کے چہرے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ان میں پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اور دو معروف سیاست دان تھے۔

عمران جانتا تھا کہ دونوں سیاست دان انتہائی نیک نام ہیں پھر اس نے سوچا آخر یہ تینوں یہاں کیا کر رہے ہیں؟ ان تینوں کی ویڈیو بھی بہت اہم ہوگی۔ ویڈیو بنانے کے لیے وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ اتنے فاصلے سے ویڈیو واضح نہیں آتی۔

وہ بہت آہستگی سے آگے بڑھنے لگا۔ بڑے بڑے سیاست دان اور اعلیٰ سرکاری افسر پسند نہیں کرتے کہ ان کی اجازت کے بغیر ان کی ویڈیو بنائی جائے یا تصویر لی جائے۔ وہ ایک ساحلی چٹان کی آڑ لے کر کچھ اور آگے بڑھا۔ اب اس کا فاصلہ اتنا تھا کہ وہ ویڈیو بہت واضح طور پر بنا سکتا تھا۔

شیخ قدرت اللہ صاحب سابقہ حکومت میں منسٹر رہ چکے تھے۔ ان پر کرپشن کا ایک بھی الزام نہیں تھا۔ ان کے ساتھ عبدالوحید دقار صاحب تھے۔ وہ بھی پچھلے وقتوں میں ایک اہم وزارت پر تھے اور اب بھی ان کا ایک بھائی اور بھتیجا وفاقی اور صوبائی وزراء تھے۔

عبدالوحید صاحب ہنس ہنس کر شیخ صاحب سے کچھ بات کہہ رہے تھے۔

عمران نے اپنا کیمرا زوم کیا اور ویڈیو بنانے لگا پھر اسے ایسا لگا جیسے ان دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہو گئی ہو۔ ان کے چہروں سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

اچانک عبدالوحید صاحب وہاں سے چلے گئے۔ پولیس کا وہ اعلیٰ افسر ابھی تک خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔

پھر وہ ہنس کر شیخ صاحب سے کچھ بولا۔ شیخ صاحب نے برا سا منہ بنا کر اس کا جواب دیا۔

پھر دوسرا منظر ایسا تھا کہ عمران لرز کر رہ گیا۔ اچانک پولیس کے اعلیٰ افسر رشید خان کی نظر عمران پر پڑ گئی، وہ چیخ کر کچھ بولا۔

عمران کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس نے کیمرا سنبھالا اور اپنی بائیک کی طرف بھاگا۔ اس نے عجلت میں بائیک اسٹارٹ کی اور وہاں سے نکل گیا۔

چند منٹ بعد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا، پولیس کی ایک موبائل وین تیزی سے اس کے پیچھے آرہی تھی۔

وین کو دیکھ کر وہ تمسخر سے ہنسا اور بولا۔ ”یہ احمق سمجھتے ہیں کہ اب یہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔ اونہہ۔“ اس نے بائیک کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ اسے اپنی ہیوی بائیک کے انجن پر بھروسا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ عمران فوری طور پر ان کے چنگل سے نکل بھی جاتا تو وہ اس کی ہیوی بائیک کے ذریعے اسے پکڑ لیتے۔ شہر میں اس قسم کی ہیوی بائیکس بہت کم تھیں پھر ممکن ہے پولیس نے اس کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو۔

جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ عمران نے سر جھٹک کر سوچا اور بائیک کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ وہ فوری طور پر اس ویڈیو کو کہیں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔

وہ مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزر کر گھر پہنچا اور کیمرے کا میموری کارڈ نکال کر اس نے پوری ویڈیو اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کر لی۔ احتیاطاً اس نے اپنی بائیک عقبی گلی میں کھڑی کی تھی۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اس نے تیزی سے کارڈ ریڈر لیپ ٹاپ سے نکالا، اپنی جیب میں رکھا اور دروازے کے پاس جا کر میجک آئی سے باہر کا جائزہ لیا۔ باہر اسے پولیس کی وردی نظر آئی۔ وہ دروازہ کھولنے کے بجائے چھت کی طرف بھاگا۔

پھر وہ دیوانہ وار چھت پر پہنچا اور سیوریج پائپ کے ذریعے بہت تیزی سے عقبی گلی میں اتر گیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ بائیک پر روانہ ہو گیا۔ بائیک کی آواز سن کر پولیس ایک مرتبہ پھر اس کے پیچھے لگ گئی۔ اس نے ویڈیو لیپ ٹاپ میں محفوظ کرنے کے بعد اسے چیک نہیں کیا تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ جانے وہ ویڈیو وہاں محفوظ ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ کارڈ ریڈر بعض اوقات دوست

طور پر کام نہیں کرتا تھا۔
وہ مین روڈ پر پہنچا تو اسے پولیس کی ایک اور موبائل دکھائی دی جو سڑک پر اس انداز میں کھڑی تھی کہ راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ عمران نے بائیک اچانک بائیں طرف کچے میں اتاری اور اندھا دھند آگے بڑھا دی۔ اس وقت اس پر پولیس نے فائرنگ کی لیکن خوش قسمتی سے کوئی گولی اسے نہ لگی۔ ممکن ہے پولیس والوں نے اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی ہو۔
کچھ دور کچے میں چل کر عمران ایک مرتبہ پھر پختہ سڑک پر آگیا۔ اب وہ ایک مارکیٹ میں بائیک دوڑا رہا تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔
مارکیٹ سے باہر نکلتے ہی اسے پولیس کی دو موبائل وینز نظر آگئیں۔ اب اس کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ بائیک کی رفتار بھی خوفناک حد تک تیز تھی۔ عمران پولیس موبائل سے ٹکرایا اور ہوا میں کئی فٹ بلند ہونے کے بعد دھم سے سامنے کھڑی ہوئی ایک بس کی چھت پر گرا، وہاں سے پھسل کر نیچے گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔
پولیس والوں نے دوڑ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ عمران کی طرف تھا۔ پولیس کے ایک انسپکٹر نے جھک کر عمران کا جائزہ لیا۔ اس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن محسوس کی پھر چیخ کر بولا۔ ''یہ ابھی زندہ ہے، فوراً ایمبولینس بلاؤ۔''
آناً فاناً عمران کو ایمبولینس میں ڈال کر فوراً ایمرجنسی روم میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹرز نے اس کا معائنہ کیا اور مختلف ٹیسٹ کے بعد پولیس کو بتایا گیا کہ زخمی کوما میں چلا گیا ہے۔ فی الحال وہ نہ بول سکتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتا تھا۔ حالانکہ کوئی ہیڈ انجری نہیں تھی۔
''زخمی کی یہ کیفیت کتنی دیر رہے گی ڈاکٹر؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ممکن ہے چند گھنٹے میں زخمی کو ہوش آجائے یا پھر اسے ہوش میں آنے میں چند دن، چند ماہ یا پھر چند سال لگ جائیں۔''
انسپکٹر نے سیل فون پر اپنے اعلیٰ افسر سے رابطہ کیا۔ اسے عمران کی کیفیت سے آگاہ کیا تو وہ بھڑک کر بولا۔ ''اس کے پاس سے کیمرا برآمد ہوا؟''
''سر! کیمرا تو برآمد ہوا ہے لیکن اس میں میموری کارڈ اور ڈی وی نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔
''پھر اس حرام زادے کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو۔ اسے وہاں سے کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرا دو اور اس کے لیے خصوصی نرس کا انتظام کرو۔''
''اوکے سر!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

☆☆☆

پریس کلب میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ مختلف چینلز اور اخبارات کے صحافی عمران کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس سال اسے بہترین صحافی اور کرائم انویسٹی گیٹر کا ایوارڈ ملا تھا۔ عمران خود بھی بہت خوش تھا اور مسکرا مسکرا کر اپنے ساتھی فوٹو گرافرز کی مبارک باد قبول کر رہا تھا۔
''عمران!'' اس کے کانوں میں نوشی کی آواز آئی۔
عمران نے مڑ کر دیکھا، نوشی ایک طرف کھڑی اشارے سے اسے بلا رہی تھی۔
''ایکسکیوز می۔'' عمران نے وہاں موجود لوگوں سے معذرت کی اور نوشی کی طرف بڑھا۔ ''ہیلو نوشی!'' اس نے مسکرا کر کہا۔
''اب تو تم بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو۔'' نوشی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب تمہیں میں بھی نظر نہیں آتی۔''
''بڑا آدمی تو میں ہو گیا ہوں مس نوشین اعجاز۔'' عمران مسکرا کر بولا۔ ''لیکن اتنا بڑا ابھی نہیں کہ مجھے تم نظر نہ آؤ۔ بس یہاں سے فارغ ہو کر تمہارے گھر چلوں گا، پھر اطمینان سے بات کریں گے۔''
''یہ وعدہ تو تم تیسری مرتبہ کر رہے ہو۔'' نوشی نے تپ کر کہا۔
''لیکن آج یہ وعدہ صرف وعدہ نہیں رہے گا۔'' عمران مسکرایا۔ ''آج میں کوئی کام نہیں کروں گا۔ تم ایسا کرو، گھر جاؤ۔ میں بھی پہنچ رہا ہوں۔''
''چلو، یہ بھی کر لیتی ہوں۔'' نوشی نے کہا اور اپنا شولڈر بیگ جھلاتی ہوئی روانہ ہو گئی۔
عمران ایک مرتبہ پھر وہاں موجود لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''یار عمران!'' اس کے ایک ساتھی ظفر نے کہا۔ ''تو واقعی بہت خوش نصیب ہے۔''
''میں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔'' عمران نے کہا۔
اسی وقت ایک اجنبی عمران کے سامنے آگیا۔ ''ہیلو مسٹر عمران!'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''بہت بہت مبارک ہو۔''
''شکریہ!'' عمران نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ

سے تعلق ہے آپ کا؟''

''میرا تعلق کسی پیپر سے نہیں ہے۔'' نوجوان مسکرایا۔ ''میں مسٹر شیرازی کا پی اے ہوں۔''

''مسٹر شیرازی؟'' عمران نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''جی ہاں، مسٹر نعیم شیرازی!'' نوجوان نے کہا۔

''وہ......''

''میں جانتا ہوں۔'' عمران مسکرا کر بولا۔ ''شیرازی صاحب کو کون نہیں جانتا۔''

''وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں...... ابھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''ابھی؟'' عمران نے چونک کر پوچھا۔ ''سوری، میں آج تو ان سے نہیں مل سکتا۔ کل فون کر کے ان سے ٹائم لے لوں گا۔''

''آپ جانتے ہیں کہ شیرازی صاحب اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔'' نوجوان نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو ان سے آج ہی ملنا پڑے گا۔''

عمران نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا۔ ''آج ہی ملنا پڑے گا۔ پھر تو پرابلم ہو جائے گی۔'' پھر وہ غور سے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا نام؟''

''میرا نام سرور ہے۔''

''تو مسٹر سرور!'' عمران نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ شاید مجھے نہیں جانتے۔ میں شیرازی صاحب سے آج نہیں مل سکتا۔ انہیں اگر ملنا ہو تو وہ کل مجھے کال کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ سرور اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

عمران گزشتہ پانچ برس سے صحافت کے شعبے سے وابستہ تھا۔ صحافت کے شعبے میں وہ حادثاتی طور پر داخل ہوا تھا۔ اس کے والد کی چھوٹی سی فوٹو گرافی کی دکان تھی۔ عمران کو شروع ہی سے کمپیوٹر کا شوق تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ کمپیوٹر میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ مہارت بھی ایسی کہ وہ کسی کا بھی اکاؤنٹ ہیک کر سکتا تھا۔ کسی بھی سائٹ میں خاموشی سے گھس سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے فوٹو گرافی کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ پھر اس نے مووی کیمرا لے لیا۔

وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کئی برس پہلے اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب گھر میں صرف وہ تھا یا اس کے والد احسان صاحب۔ احسان صاحب کی فوٹو گرافی کی دکان کوئی ایسی خاص نہیں چل رہی تھی۔ بس کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔

اصل میں اب فوٹو گرافرز کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی جو اب سے بیس برس پہلے تھی۔ اب تو بہت جدید قسم کے ڈیجیٹل کیمرے مارکیٹ میں آگئے تھے۔ پھر سب سے زیادہ دھچکا انہیں سیل فونز سے پہنچا تھا۔ اب تو گویا ہر شخص فوٹو گرافر تھا جس کا جب اور جہاں دل چاہتا وہ سیلفی لے لیتا یا، ویڈیو بنا لیتا تھا۔ ایسے میں بھلا احسان صاحب کو کون پوچھتا؟ ان جیسے فوٹو گرافرز کی ضرورت اس وقت پڑتی تھی جب لوگ اپنے سیل فون یا کمپیوٹر کی تصویر کا پرنٹ آؤٹ لینا چاہتے تھے۔ احسان صاحب کمپیوٹر میں بھی کورے تھے اس لیے ان کی دکان پر ہمیشہ سناٹا رہتا تھا۔

پھر انہوں نے اپنی دکان میں فوٹو اسٹیٹ کی دو مشینیں لگائیں تو کسی نہ کسی طرح گزارہ ہونے لگا۔ اچھے وقتوں میں انہوں نے گلشن اقبال میں ایک مکان بنا لیا تھا۔

عمران نے گریجویشن کیا تو احسان صاحب نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ عمران کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں جاب کر لے لیکن عمران تو کچھ اور ہی منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔

اس نے احسان صاحب کی دکان کو نئے سرے سے آراستہ کیا، وہاں دو جدید قسم کے کمپیوٹر رکھے اور جدید بنیادوں پر کام شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فوٹو گرافی میں مہارت حاصل کی اور مختلف تقریبات کی ویڈیو بنانے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے احسان صاحب کا کاروبار چمک اٹھا۔ ان کا کام اتنا بڑھا کہ انہوں نے ساتھ والی دکان بھی کرائے پر لے لی۔ عمران نے انہیں اتنا کمپیوٹر سکھا دیا جو ان کے لیے ضروری تھا۔

ایک دن عمران نے ایک ایکسیڈنٹ کی انتہائی اہم ویڈیو ایک معروف چینل کو بھیج دی۔ اس حادثے کی کوریج دوسرے چینلز نے بھی کی تھی لیکن ''اپ ڈیٹ'' چینل کی ویڈیو بہت واضح اور بہترین تھی۔

چینل کے نیوز ایڈیٹر نے عمران کو اپنے آفس بلا لیا اور بولا۔ ''مسٹر عمران! آپ بہت بہترین مووی میکر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس قسم کی ویڈیوز آئندہ بھی اپ ڈیٹ کو بھیجتے رہیں۔''

''سر! میں شوقیہ فوٹو گرافر نہیں ہوں۔'' عمران نے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ چینل کا نیوز ایڈیٹر اس سے فری میں کام لینا چاہتا ہے۔ اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''سر! میں

پروفیشنل طور پر کام کرتا ہوں اور......"

"تو چینل آپ سے اعزازی طور پر تو کام نہیں لینا چاہتا۔" ایڈیٹر جلدی سے بولا۔ "ہم آپ کو ہر ویڈیو کا معاوضہ دیں گے۔ ہمیں آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔"

"او کے سر۔" عمران نے کہا۔ "میں سوچ کر آپ کو بتاؤں گا۔"

"آپ ضرور سوچیں۔" ایڈیٹر مسکرا کر بولا۔ "لیکن آپ سے ایک درخواست ہے۔ اب آپ جو بھی ویڈیو یا فوٹو گراف بنائیں، وہ ہمیں ہی بھیجیں۔"

"سر! میں اس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" عمران نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ "آپ کے علاوہ دو بڑے چینلز نے بھی مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ میں نے انہیں بھی یہی جواب دیا ہے کہ سوچ کر بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایڈیٹر سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"الو کا پٹھا۔" اس کے جانے کے بعد ایڈیٹر دانت پیس کر بولا۔ "خود کو بہت زیادہ ہوشیار سمجھتا ہے۔"

"ہوشیار سمجھتا نہیں ہے سر۔" اس کے ایک رپورٹر نے کہا۔ "بلکہ وہ ہوشیار ہے اور اپنی ویلیو جانتا ہے۔"

دوسرے دن پھر اسی چینل کے نیوز ایڈیٹر نے فون کر کے عمران کو بہت عمدہ سیلری اور ایک گاڑی کی آفر کی۔

عمران کو اتنی تنخواہ کی توقع نہیں تھی۔ اس نے زیادہ لالچ بھی مناسب نہ سمجھا اور اس چینل کی آفر قبول کر لی۔

یوں گزشتہ پانچ سال سے وہ اسی چینل سے وابستہ تھا اور اس وقت ان کا اہم رپورٹر اور کیمرا مین تھا بلکہ اب تو وہ کبھی کبھی ایک اچھے اینکر کے روپ میں بھی نظر آنے لگا تھا۔ اسکرین پر اس کی خوبصورت شخصیت عوام کے ذہنوں پر رنگ جمانے لگی تھی۔

پریس کلب سے عمران نوشی کے گھر پہنچا تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ "میرا تو خیال تھا کہ تم آج بھی نہیں آؤ گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اب فضول باتیں چھوڑو اور پہلے مجھے بہترین سی کافی پلاؤ، پھر کھانے کا بندوبست کرو۔ میں نے پارٹی میں اسی لیے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔"

اچانک نوشین کی امی کافی تھامے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو عمران نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ ان کے سلام کا جواب دے کر وہ بولیں۔ "بیٹا! تم کھانے کی فکر مت کرو۔ جب نوشی نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میں نے کھانا بنا لیا تھا۔"

''آنٹی! میں تو نوشی سے مذاق کر رہا تھا۔'' عمران نے کہا۔ ''ورنہ میں یہاں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ کھانا کھانے نہیں آیا۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔

''تم میرے لیے پارٹی چھوڑ کر آئے ہو، یہ بھی تمہارا احسان ہے۔'' نوشی نے منہ بنا کر کہا۔

''کیا آج تمہارا لڑنے کا موڈ ہے؟'' عمران نے پوچھا۔ ''میرا آنا اتنا گوارا گزرا ہے تو چلا جاتا ہوں۔''

''سوری۔'' نوشی جلدی سے بولی۔ ''اچھا کافی پیو ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

عمران نے وہاں کئی گھنٹے گزارے۔ اس نے نوشی کی ساری شکایتیں دور کر دیں۔ رات گئے جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو عظیمہ بیگم سو چکی تھیں۔ نوشی اسے چھوڑنے دروازے تک آئی اور بولی۔ ''عمران! اب اور تم کتنا انتظار کراؤ گے؟''

''میں کسی بھی دن ابو کو لے کر جلد آؤں گا۔'' عمران نے ہنس کر کہا اور اپنی بائیک پر بیٹھ گیا۔

عمران کی طرح نوشی بھی والدین کی اکلوتی تھی۔ اس کے والد کا پانچ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے والد بینک میں بہت اچھے عہدے پر تھے۔ انہوں نے کئی برس پہلے اپنا ذاتی مکان بنا لیا تھا۔ عظیمہ بیگم بہت سگھڑ خاتون تھیں۔ انہوں نے خاصی رقم پس انداز کر رکھی تھی، پھر نوشی کے والد کا پراویڈنٹ فنڈ انہوں نے انٹس (؟) پیارٹ کرا دیا تھا۔ یوں انہیں معاشی طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ عمران کی طرح ان کا بھی دور دنزدیک کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوئی تو نوشی نے چینل جوائن کیا اور اب نوشی، عمران کے ساتھ ہی تھی۔ وہیں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور اب وہ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

شادی کے معاملے کو عمران پچھلے ایک سال سے ٹالتا آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ترقی ہو جائے اور اس کی اتنی آمدنی ہو جائے کہ شادی کے بعد اسے اور نوشی کو کسی قسم کی مالی پریشانی نہ ہو۔

☆☆☆

عمران آفس میں تھا اور اس وقت بہت مصروف تھا جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی، کوئی اجنبی نمبر تھا۔ اس نے اپنا سیل فون سائیلنٹ پر لگا دیا۔ اس کے بعد بھی عمران کے سیل فون میں کئی دفعہ وائبریشن ہوئی لیکن اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹر نے کہا۔ ''آپ کے گھر سے کال ہے۔''

عمران چونک اٹھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''بات کراؤ۔'' دوسرے ہی لمحے اسے دکان پر کام کرنے والے لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ''عمران بھائی...... جلدی آ جائیں...... انکل کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا ابو کو؟'' عمران بلند آواز میں بولا۔ ''تم انہیں لے کر آغا خان پہنچو، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

''کیا ہوا عمران، سب خیریت تو ہے؟'' اس کے ساتھی رپورٹر جاوید نے پوچھا۔

''ابو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں اسپتال جا رہا ہوں۔''

''ٹھہرو، میں بھی چل رہا ہوں۔'' جاوید نے کہا اور جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر اٹھنے لگا۔

عمران اسپتال پہنچا تو احسان صاحب کو آئی سی یو میں منتقل کیا جا چکا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے ابو کی؟'' عمران نے دکان پر کام کرنے والے لڑکے زاہد سے پوچھا۔

''ابھی ڈاکٹر صاحب اندر ہی ہیں۔ وہ باہر نکلیں گے تو کچھ معلوم ہوگا۔'' پھر وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''عمران بھائی! ویسے انکل کی طبیعت بہت خراب تھی۔''

''اللہ انہیں شفا دے گا بیٹا!'' جاوید نے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔''

اسی وقت نوشی تقریباً بھاگتی ہوئی لابی میں داخل ہوئی اور عمران سے بولی۔ ''کیسی طبیعت ہے انکل کی؟''

''ابھی تک کسی ڈاکٹر سے میری بات نہیں ہو سکی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ڈاکٹر ابھی آئی سی یو میں ہے۔''

اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے پیچھے ان کا اسسٹنٹ باہر نکلا۔ ڈاکٹر سنجیدہ چہرہ لیے عمران کی طرف آیا اور بولا۔ ''مسٹر عمران! آئی ایم سوری...... ہی از نو مور۔''

''وہاٹ!'' عمران چیخ کر بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

جاوید نے عمران کو سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ''صبر کرو عمران، انکل ہمیں چھوڑ گئے۔''

اس وقت اگر نوشی اور جاوید نہ ہوتے تو عمران نہ جانے کیسے خود کو سنبھالتا۔ پھر جاوید اور نوشی ہی نے سارا انتظام کیا۔ عمران تو ایک طرف بیٹھا کھوئی کھوئی نظروں سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

احسان صاحب کے بعد عمران بالکل بجھ کر رہ گیا۔ کئی دن تک تو اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا۔ نوشی نے دو دن

تو آفس سے چھٹی کی، پھر آفس کے بعد وہ سیدھی عمران کے گھر پہنچ جاتی۔ عطیہ بیگم بھی تین دن تک عمران کے پاس رکی رہیں۔

اس صدمے سے نکلنے اور معمول کی زندگی کی طرف آنے میں عمران کو ایک مہینا لگ گیا۔

آخر ایک دن نوشی اور جاوید کے اصرار پر وہ آفس چلا گیا۔

آہستہ آہستہ کام میں مصروف ہو کر عمران اس غم کو بھولنے لگا۔ اسے آفس آتے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔

اب بھی اس پر کام کا اتنا دباؤ نہیں تھا۔

اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اجنبی نمبر ہونے کے باوجود اس نے کال ریسیو کرلی۔

''عمران صاحب!'' دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی۔ ''میں سرور بول رہا ہوں۔''

''کون سرور؟'' عمران نے پوچھا۔

''نعیم شیرازی صاحب کا پی اے۔'' سرور نے کہا۔

''اچھا، اچھا...... سرور صاحب! جی فرمایئے؟''

''عمران صاحب! آپ کے والد کے بارے میں سنا، بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔''

''شکریہ سرور صاحب۔''

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آج شام کو ہمارے گھر تشریف لے آئیں۔ نعیم شیرازی صاحب آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے شیرازی صاحب کا بنگلا تو دیکھا ہے نا؟''

''ہاں، میں نے دیکھا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''میں شام چھ بجے تک آؤں گا۔'' یہ کہہ کر عمران نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

شام کو وہ شیرازی کی طرف جانے کے لیے تیار ہوا تو اسے نوشی کا خیال آیا۔ وہ آفس سے سیدھی اس کے گھر چلی جاتی تھی۔

اس نے انٹرکام پر نوشی کو بتایا کہ آج شام میں ذرا دیر سے گھر آؤں گا۔

''میں بھی اپنے گھر سے فریش ہو کر جاؤں گی۔'' نوشی نے کہا۔ عمران نے زیادہ بات نہیں کی ورنہ نوشی اس کے ساتھ چلنے کی ضد کرتی۔

☆☆☆

عمران، نعیم شیرازی کے بنگلے پر پہنچا تو پورچ میں جدید ماڈل کی لینڈ کروزر اور ٹویوٹا پہلے سے موجود تھیں۔ عمران نے اپنی ہیوی بائیک بھی ان ہی گاڑیوں کے پیچھے

مختصر... مختصر...

موبائل

فقیر نے صدا لگائی...... اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ گھر سے لڑکی بولی...... کچھ نہیں معاف کرو۔

فقیر بولا۔ اپنا موبائل نمبر ہی دے دو۔ بابا دعا بھی کرے گا اور میسج بھی۔

اندھا

میاں بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ ''شہزادی! دس روپے دے دو۔ میں اندھا ہوں۔''

شوہر نے کہا۔ ''بیگم ضرور دے دو تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہوگا۔''

وجۂ تسمیہ

ابتدائی جماعت میں پڑھنے والے بچوں سے کہا گیا کہ وہ والدین پر مضمون لکھیں۔ ایک چھوٹی بچی نے لکھا جب ہمیں والدین ملتے ہیں تو ان کی عمریں کافی ہو چکی ہوتی ہیں اس لیے ان کی عادتیں تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

جدائی

بیوی فون پر...... ''تم سے پندرہ دن کی جدائی میں تو میں آدھی رہ گئی ہوں۔ کب لینے آؤ گے؟''

شوہر...... ''پندرہ دن بعد۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کیا بیزاری ہے

بس کے گیٹ پر لٹکے ہوئے مسافروں سے کنڈیکٹر نے کہا۔ ''بھائیو! اندر ہو جاؤ اس طرح گیٹ پر لٹکنا آپ کی جان کے لیے خطرناک ہے۔''

لیکن جب کوئی بھی اندر نہ ہوا تو کنڈیکٹر نے غصے سے کہا۔ ''تمہیں تمہاری گھر والی کی قسم۔ اندر ہو جاؤ۔''

کنڈیکٹر کا خیال تھا یہ فقرہ سن کر یقیناً مسافر اندر ہو جائیں گے لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جو مسافر اندر سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی گیٹ پر آ کر لٹک گئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کھڑی کر دی۔ گیٹ پر گارڈز نے صرف اس کا نام سن کر گیٹ کھول دیا تھا۔ شاید شیرازی نے انہیں عمران کے بارے میں ہدایات دے دی تھیں۔ شیرازی نے برآمدے میں عمران کا استقبال کیا۔

''آیئے، آیئے۔'' شیرازی خوش دلی سے بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسے سینئر جرنلسٹ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت میرے لیے بھی نکالا۔''

اس کے لہجے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ عمران پر طنز کر رہا تھا یا پھر واقعی اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

''یہ تو میری خوش نصیبی ہے شیرازی صاحب۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ ''وقت تو آپ کا قیمتی ہے، ہر گزرتے ہوئے گھنٹے میں آپ کے اکاؤنٹ میں ہزاروں روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''آیئے تشریف لایئے۔'' شیرازی نے اپنا ہاتھ عمران کی طرف بڑھا دیا۔

عمران نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شیرازی کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ڈرائنگ روم میں بدنام زمانہ سیاست دان آفتاب عالم کے دستِ راست نادر خان کو دیکھ کر عمران کچھ ٹھٹکا۔

نادر خان اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بہت گرم جوشی کے ساتھ عمران سے ہاتھ ملایا۔

عمران اس ملاقات کا مطلب نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ خان صاحب ہیں۔'' شیرازی نے نادر خان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ...''

''شیرازی صاحب!'' عمران نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نادر خان صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، خاصے معروف شخص ہیں۔''

''میڈیا پر تو آج کل آپ چھائے ہوئے ہیں۔'' نادر خان مسکرایا۔

اس کی بات کے جواب میں عمران صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''اصل میں آج میں نے آپ کو ایک خاص کام سے بلایا ہے۔'' شیرازی نے کہا۔

''مجھ جیسے آدمی سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟'' عمران نے کہا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''آپ نے گزشتہ مہینے عبدالوحید صاحب کا ایک خصوصی انٹرویو کیا تھا۔'' شیرازی نے کہا۔ ''اس انٹرویو کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

عمران نے کہا۔ ''کیا آپ کو بھی کوئی شکایت ہے؟ آپ کا تو سیاست سے کوئی واسطہ بھی نہیں ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''کہیں آپ بھی تو سیاست میں آنے کا ارادہ نہیں کر رہے؟''

''ہم تو تجارت پیشہ لوگ ہیں۔'' شیرازی نے کہا۔ ''سیاست سے ہمارا کیا واسطہ۔ ہاں، سیاست دانوں کی مدد ضرور کرتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ایک زبردست انٹرویو آپ آفتاب عالم صاحب کا بھی کریں۔''

آفتاب عالم انتہائی کرپٹ اور بدنام سیاست دان تھا اور نادر خان اس کا دستِ راست تھا۔ عمران بری طرح جھنجلا گیا لیکن اس نے اپنی جھنجلاہٹ کو ظاہر نہیں کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیرازی اسے خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس انٹرویو سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''ہم صرف اپنا ہی فائدہ نہیں دیکھتے۔'' نادر خان کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔ ''اپنے دوستوں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔''

''عمران صاحب!'' شیرازی نے کہا۔ ''آپ اس وقت بھی بائیک پر آئے ہوں گے؟''

''جی ہاں۔'' عمران نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ جس چینل کے لیے کام کرتے ہیں، اس کے مالکان کتنا پیسا کماتے ہیں؟'' شیرازی نے کہا۔ ''ان کے پاس دنیا کی مہنگی ترین گاڑیاں ہیں۔''

پھر اس نے سینٹر ٹیبل پر پڑی ہوئی گاڑی کی چابی اٹھا کر عمران کی طرف بڑھا دی۔ ''میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول کریں۔ گاڑی بھی باہر موجود ہے۔''

''آپ نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔'' عمران نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس جدید ماڈل کی ہنڈا سٹی موجود ہے، یہ ہیوی بائیک تو میرا شوق ہے۔ اس لیے میں گاڑی استعمال نہیں کرتا۔ رہا سوال میرے چینل کے مالکان کا تو آج ہی ان سے کہوں تو کل تک میرے پاس بہترین گاڑی موجود ہوگی۔''

''آپ شاید برا مان گئے۔'' شیرازی نے کہا۔

''میرے برا یا اچھا ماننے کو چھوڑیں۔'' عمران نے کہا۔ ''آپ کھل کر بات کریں۔''

''میں بتا تو چکا ہوں کہ آفتاب عالم صاحب کا ایک بھرپور انٹرویو کرانا چاہتا ہوں۔ سوال نامہ آپ کو مل جائے گا۔''

''سوال نامہ؟'' عمران چونک کر بولا۔

"جی ہاں، وہ سوالات جو آپ آفتاب عالم صاحب سے کریں گے۔"

"سوری شیرازی صاحب۔" عمران اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں فرمائشی انٹرویو نہیں کرتا اور اس قسم کے انٹرویو کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، مجھے اجازت دیں۔"

"ارے بیٹھیے عمران صاحب۔" شیرازی نے کہا۔ "چائے آرہی ہے۔ پی کر جایئے گا۔"

"کوئی تکلف نہ کریں۔ میں آفس سے چائے پی کر ہی نکلا تھا۔"

"اس انٹرویو کے آپ کو پچاس لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔" شیرازی نے کہا۔

عمران بھنا کر بولا۔ "مجھے پیسوں کا لالچ مت دیں شیرازی صاحب! میں نے آج تک کوئی انٹرویو اور کوئی خبر کسی دوسرے کی فرمائش پر نہیں لگائی ہے۔ ہاں، کبھی موقع آیا تو میں آفتاب عالم صاحب کا انٹرویو بھی کروں گا لیکن اپنی شرائط پر۔" اس نے باری باری شیرازی اور نادر خان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ دونوں کے چہروں پر غصے کی شدت سے نحوست برس رہی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "خدا حافظ۔" پھر وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد آفتاب عالم پردہ ہٹا کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہ دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے بھی عمران کی باتیں سن لی تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ عمران دھونس اور دھمکی سے قابو میں نہیں آئے گا۔" آفتاب عالم غصے میں اپنے دست راست سے بولا۔ "مگر تم تو اپنے غصے پر قابو ہی نہیں رکھ سکتے۔"

"ہر انسان کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔" نادر خان نے کہا۔ "میں عمران کو خرید کر دکھاؤں گا۔"

"اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو نادر خان۔" آفتاب عالم نے کہا۔

"میرے پاس ایک راستہ اور بھی ہے۔" نادر خان خباثت سے مسکرا کر بولا۔ "اپ ڈیٹ چینل کا سی ای او میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اس سے......"

"ختم کرو نادر!" آفتاب عالم نے اسے جھڑک دیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ تمہاری دوستی میں وہ عمران کو میرا خصوصی انٹرویو لینے پر مجبور کردے گا؟"

"آپ میری پوری بات تو سن لیں سر۔" نادر خان نے کہا۔

"چلو تمہاری بات بھی سن لیتا ہوں۔" آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اپ ڈیٹ چینل کا سی ای او عمران کو چینل سے نکال تو سکتا ہے۔"

"فضول بکواس سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے نادر!" آفتاب عالم نے درشت لہجے میں کہا۔ "اب مجھ ہی کو کچھ کرنا پڑے گا۔"

"مجھے ایک بات بتائیں آفتاب صاحب!" شیرازی نے کہا۔ "آخر عمران ہی کیوں؟ یہ کام تو ہم کسی دوسرے سے بھی لے سکتے ہیں۔"

آفتاب نے شیرازی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کہہ دی ہو، پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آپ کی نظروں میں وہ دوسرا کون ہے؟"

"سعید شیخ۔" نعیم شیرازی نے جواب دیا۔ "سعید شیخ بھی اپ ڈیٹ چینل ہی پر ہے۔"

"آپ کو گدھے اور گھوڑے میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا شیرازی صاحب۔" آفتاب نے تلخی سے کہا۔ "سعید شیخ کیا عمران جیسا چونکا دینے والا انٹرویو کرسکتا ہے؟"

"سر! سعید شیخ سے زیادہ ریٹنگ تو نوشین کی ہے۔" نادر نے کہا۔ "وہ کسی حد تک عمران جیسا انٹرویو کرسکتی ہے۔"

"آئیڈیا برا نہیں ہے۔" آفتاب عالم نے کہا۔ "تو پھر اس سے بات کرو۔"

نعیم شیرازی طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عمران اور نوشین ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "اپ ڈیٹ کے ڈائریکٹر نیوز اور کرنٹ افیئرز اقبال خان سے بات ہوسکتی ہے۔ وہ اسے مجبور کرسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس سے بات کرکے دیکھو، کتنے میں بکتا ہے؟"

☆☆☆

"تم کل اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے عمران؟" نوشی نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت چینل کی کینٹین میں لنچ کررہے تھے۔

"مجھے نعیم شیرازی نے بلایا تھا۔" عمران نے کہا۔ "اور جانتی ہو وہاں کون موجود تھا؟"

"کون؟" نوشی نے الجھ کر پوچھا۔

"آفتاب عالم۔ میں سمجھ گیا تھا وہ بھی وہاں موجود ہوگا۔" عمران نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آفتاب عالم شیرازی کے بنگلے پر؟ میرا خیال ہے کہ شیرازی اس وقت آفتاب عالم کی پارٹی کو بھاری فنڈز دے رہا ہے۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" عمران نے کہا۔

"شیرازی نے مجھے آفتاب عالم کے انٹرویو کے لیے بلایا تھا، پہلے سے طے شدہ انٹرویو کے لیے۔" عمران نے سر جھٹکا اور بولا۔ "مجھے بہت بڑی رقم کی آفر کی ہے ان کرپٹ لوگوں نے۔"

"اور تم نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا ہوگا؟" نوشی نے کہا۔

"نہیں۔" عمران سنجیدگی سے بولا۔ نوشی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔ "میں نے ہمیشہ کی طرح انکار نہیں کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے ان کی پیشکش ٹھکرا دی۔"

اس کی بات پر نوشی ہنسنے لگی۔

"چلو، اب اٹھو۔ کافی ہم آفس میں ہی پی لیں گے۔"

"ہاں چلو، مجھے بھی اپنے اسائنمنٹ پر کام کرنا ہے۔"

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے عمران اچانک بولا۔ "ہاں نوشی! تمہیں ایک ضروری بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ سنڈے کی شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا۔"

"کیا پرسوں کوئی کام نہیں ہے؟" نوشی نے کہا۔ "یا کوئی خاص بات ہے؟"

"پرسوں میرا آف ہے۔" عمران نے کہا۔ "ابو تو اب رہے نہیں۔ اس لیے اب یہ کام مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔"

نوشی اس کا مطلب سمجھ کر کچھ جھینپ گئی، پھر آہستہ سے بولی۔ "ٹھیک ہے، میں امی کو بتا دوں گی۔"

"ہاں مگر کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کڑھائی، شامی کباب، پلاؤ اور...... اور......"

"تمہیں پرسوں صرف دال ملے گی۔" نوشی نے منہ بنا کر کہا۔ "اتنا تکلف تو میں کر ہی سکتی ہوں۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "لیکن آ ضرور جانا۔"

دوسرے دن عمران بہت زیادہ مصروف رہا۔ نوشی خود بھی بہت مصروف تھی۔

تیسرے دن عمران آفس نہیں آیا۔ نوشی نے سیل فون پر اسے یاد دلایا۔ "آج تمہیں ہمارے گھر آنا ہے، بھول مت جانا۔ میں بھی آج جلدی ہی گھر چلی جاؤں گی۔"

"مجھے یاد ہے نوشی۔" عمران نے کہا۔ "کوئی فیصلہ کرنے کے بعد میں بھولتا نہیں ہوں۔ خدا حافظ۔"

اس دن عمران، نوشی کے گھر نہیں پہنچا۔ عظیمہ بیگم نے اس کے لیے کھانے میں اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا اور اب اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ نوشی سات بجے ہی گھر آ گئی تھی۔

پھر گھڑی کی سوئیاں آہستہ آہستہ آگے سرکتی رہیں لیکن عمران نہیں آیا۔ گیارہ بجے کے بعد عظیمہ نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "نوشی بیٹا! میں بہت تھک گئی ہوں۔ عمران عجیب لاابالی لڑکا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔ وہ آئے تو مجھے اٹھا دینا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

بارہ بجے تو نوشی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ اس نے جھلا کر ایک مرتبہ پھر عمران کو کال کی لیکن پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اس کا سیل آف تھا۔ نوشی نے جھنجلا کر سیل فون صوفے پر پھینک دیا۔ اسے عمران سے اس غیر ذمے داری کی امید نہیں تھی۔ اس نے سوچا، اگر آج عمران نہیں آیا تو میں بھی اس سے بات نہیں کروں گی۔

ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی لیکن عمران نہیں آیا۔

صبح سات بجے کے قریب اس نے پھر عمران کو فون کیا لیکن اس کے کانوں میں ریکارڈنگ کی آواز آئی۔ "آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔"

اچانک نوشی کے دل میں یہ ہولناک خیال آیا کہ عمران کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ مجھے اس کے گھر جا کر معلوم کرنا چاہیے۔

عظیمہ بیگم فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھیں تو پھر نہیں سوئی تھیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ عمران رات کو نہیں آیا۔

خلاف معمول نوشی کو تیار دیکھ کر وہ چونکیں اور بولیں۔

"تم اتنی صبح صبح کہاں جا رہی ہو نوشی؟"

"امی! مجھے عمران کی طرف سے تشویش ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آیا تھا لیکن فون کر کے اس نے معذرت ضرور کر لی تھی۔ اب تو سیل فون ہی آف جا رہا ہے۔ میں عمران کے گھر جا رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ رات کو وہ چاہے تین بجے لوٹے یا چار بجے، ہر صورت میں گھر ضرور جاتا ہے۔"

"اچھا، تم ناشتا تو کر لو۔"

"ناشتا نہیں امی، مجھے صرف ایک کپ چائے دے دیں۔" نوشی نے کہا، پھر بہت عجلت میں چائے پی اور عمران کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

عمران کے گیٹ پر تالا دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے گیٹ سے جھانک کر اندر دیکھا۔ پورچ میں عمران کی

گاڑی موجود تھی لیکن اس کی ہیوی بائیک موجود نہیں تھی۔ وہ واپسی کے لیے مڑی تو اسے وہ لڑکا نظر آیا جو عمران کی دکان اور گھر میں کام کرتا تھا۔

اس نے حیرت سے نوشین کو دیکھا اور بولا۔ ”نوشی باجی! آپ اتنے سویرے؟“

”میں عمران کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ کل اسے میرے گھر آنا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کا سیل فون بھی آف ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی اطلاع ہے؟“

”نہیں، میرے پاس تو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ میں بھی کل رات اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ عمران بھائی کھانا تو آپ کے گھر کھا کر آئیں گے اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ لڑکے نے کہا۔ ”لیکن اب مجھے بھی پریشانی ہو رہی ہے۔ عمران بھائی مجھے اطلاع ضرور دیتے۔“

مایوس ہو کر نوشی آفس چلی گئی۔ وہاں بھی کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ نوشی نے نہ صرف اپنے چینل کے رپورٹرز کو بلکہ دوسرے چینلز کے رپورٹرز کو بھی عمران کی گمشدگی کے بارے میں بتا دیا۔

☆☆☆

عمران کو شہر کے ایک اعلیٰ اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ وہاں بھی سیکیورٹی بہت سخت تھی اور پولیس والے سادہ لباس میں اسپتال کے باہر اور کوریڈور میں موجود تھے۔ پولیس نے اس کے لیے ایک خصوصی نرس کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ عمران چونکہ کوما میں تھا اس لیے اس کے کمرے کے باہر پولیس گارڈ موجود نہیں تھے۔ اسپتال کے سیکیورٹی آفیسر کے کمرے میں پولیس کا ایک چاق و چوبند اور ذہین افسر موجود تھا۔ وہ ہر آدھے گھنٹے بعد عمران کے کمرے کا چکر لگا لیتا تھا۔ عمران وہاں مُردے کی طرح پڑا تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی اور ادھ کھلی آنکھیں ویران تھیں۔

انسپکٹر شاکر اس بھاگ دوڑ سے اکتا گیا تھا۔ سیکیورٹی آفس اس بلاک سے بہت دور تھا جہاں عمران کو رکھا گیا تھا۔ انسپکٹر نے عمران کے کمرے ہی میں رکنے کی کوشش کی تھی لیکن اسپتال کے ایم ایس نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ اسپتال میں کسی اٹینڈنٹ کے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ راشد تو پھر پولیس والا تھا۔ اسے مریض کی دیکھ بھال کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟

شاکر کمرے میں داخل ہوا تو وہ بالکل اکیلا تھا۔ نرس بھی وہاں موجود نہیں تھی۔

شاکر، عمران کے بیڈ کے نزدیک پہنچا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ کسی قسم کی بھی ڈرامے بازی ہے تو یہ ڈرامے بازی تجھے بہت مہنگی پڑے گی عمران...... اس لیے تیری خیریت اسی میں ہے کہ تو ہوش میں آ جا۔“ اس نے عمران کے بال پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور چہرے پر بھرپور تھپڑ مارنے کے بعد پھر کر بولا۔ ”میں بھی دیکھتا ہوں، تیری یہ اداکاری کتنی دیر چلے گی۔“

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور اسپتال کا ایک سینئر ڈاکٹر اندر داخل ہوا اور درشت لہجے میں انسپکٹر سے بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ آپ کی حوالات نہیں بلکہ اسپتال ہے۔ یہاں آپ مریض پر تشدد نہیں کر سکتے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! آخر ہوا کیا ہے؟“

”آپ نے مریض کے بالوں کو بہت بے رحمی سے جھٹکا دیا اور اسے دو تھپڑ بھی مارے ہیں۔ اگر آپ کو تشدد کا اتنا ہی شوق ہے تو مریض کے صحت یاب ہونے کا انتظار کریں۔ آپ شاید یہ بھول گئے کہ یہاں ہر کمرے میں کیمرا ہے۔“ ڈاکٹر کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ”آئندہ ایسی حرکت ہوئی تو میں پولیس کے آنے پر پابندی لگا دوں گا۔“

”سوری ڈاکٹر صاحب!“ انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھے غصہ آ گیا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا تو اسے کیمرا دکھائی دیا۔ وہ کیمرا دیوار میں ایسی جگہ نصب تھا جہاں اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ جبکہ انسپکٹر کو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

نرس واپس آئی تو انسپکٹر شاکر وہیں بیٹھا تھا۔ شہلا خاصی حسین لڑکی تھی۔ اس کا پُرکشش جسم اسپتال کی یونیفارم میں بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ اس کے پُرکشش چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔ ”انسپکٹر صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں۔“ انسپکٹر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”اونہہ...... انسپکٹر شاکر خان فرام کرائم برانچ اب ایک نیم مردہ شخص کی نگرانی کر رہا ہے۔“

شہلا مسکرائی، پھر اس نے گھڑی دیکھی اور چونک کر بولی۔ ”مریض کے انجکشن کا ٹائم ہو گیا۔“ اس نے اٹھ کر انجکشن بنایا اور عمران کی طرف بڑھی۔

شاکر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”لائیے، یہ سرنج مجھے دیں، میں لگاتا ہوں انجکشن۔“ یہ کہہ کر اس نے سرنج شہلا کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لی اور ایسے رخ پر کھڑا ہو گیا کہ کیمرے میں صرف اس کی پشت ہی دکھائی دیتی،

عمران کا جسم دکھائی نہ دیتا۔ پھر اس نے سرنج خنجر کی طرح ہاتھ میں پکڑی اور زور سے عمران کے شانے میں گھونپ دی۔
"ارے ارے، یہ کیا طریقہ ہے؟" شہلا ناگواری سے بولی۔ "آپ مریض کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتے۔ آپ کو یہاں رہنے سے کوئی پریشانی ہے تو اس کی جھنجلاہٹ آپ مریض پر کیوں اتار رہے ہیں؟"
"میں صرف یہ چیک کررہا تھا کہ یہ حرام زادہ واقعی بے حس ہے یا ڈراما کررہا ہے۔"
"یہ چیک کرنا ڈاکٹرز کا کام ہے۔" شہلا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ پلیز جائیں یہاں سے۔"
"ڈونٹ وری بے بی۔" شاکر مکاری سے ہنسا۔ "میں جارہا ہوں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اس حرام زادے نے ابھی پلک جھپکی تھی۔" یہ کہہ کر انسپکٹر باہر نکل گیا۔
شہلا نے غور سے عمران کا جائزہ لیا۔ وہ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں فضا میں معلق تھیں۔ بس سانسوں کے زیروبم سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ شہلا نے دواؤں کی آخری خوراک اس کے سرہانے لگے ہوئے گلوکوز کے بیگ میں انجکٹ کی اور عمران کو کمبل اوڑھا کر لائٹ آف کردی۔ اب کمرے میں صرف نائٹ بلب کی مدھم روشنی تھی۔

☆☆☆

نوشی بہت اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ عمران کو غائب ہوئے تیسرا دن تھا۔ ابھی تک اسے عمران کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کے دل میں بُرے بُرے خیال آرہے تھے۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ دشمنوں نے عمران کو اغوا کرلیا ہے۔ اس کے دشمن بھی تو بے شمار تھے۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ اسے مار کے لاش کہیں ٹھکانے لگادی گئی ہے۔
وہ اپنے خیالات میں ایسی گم تھی کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے پر بری طرح اچھل پڑی۔ اسکرین پر ایک چینل کے رپورٹر فہد کا نمبر دیکھ کر اس نے کال فوراً ریسیو کرلی۔
"ہیلو فہد!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
"نوشی! میں نے عمران کی بائیک کا سراغ لگالیا ہے۔"
"بائیک کا سراغ مل گیا؟" نوشی نے خوش ہوکر کہا۔ "عمران کہاں ہے؟"
"عمران کے بارے میں کچھ علم نہیں۔" فہد نے کہا۔ "میں نے اپنے ذرائع سے بائیک کا سراغ لگایا ہے۔ وہ ایک پولیس اسٹیشن میں کھڑی ہوئی ہے۔ بائیک کی حالت سے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہو۔"
"اس کا مطلب ہے کہ......"
"نہیں نوشی! ابھی کوئی مطلب مت نکالو۔" فہد نے کہا۔ "میں نے بائیک کی تصویریں لینے کے بعد پولیس اسٹیشن کے انچارج سے ملاقات کی اور اس سے عمران کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں ناظم آباد کے علاقے سے یہ بائیک ملی تھی۔ اگر عمران اس پر ہوگا بھی تو کسی اسپتال میں ہوگا۔"
"تم اس وقت کہاں ہو؟" نوشی نے پوچھا۔
"میں اس وقت اس پولیس اسٹیشن کے نزدیک ہوں۔" فہد نے جواب دیا۔
"تم مجھے ایڈریس سینڈ کرو اور وہیں ٹھہرو، میں پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔" نوشی نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور شولڈر بیگ شانے پر لٹکا کر باہر نکل گئی۔
وہ مطلوبہ پولیس اسٹیشن تک تقریباً بیس منٹ میں پہنچی۔ فہد اس کے انتظار میں پولیس اسٹیشن کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔
نوشی کی گاڑی دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا اور بولا۔ "شکر ہے تم پہنچ گئیں۔ ابھی انچارج صاحب نکل جاتے تو ہر آدمی یہی بہانہ بناتا کہ انچارج صاحب ہی کچھ بتائیں گے۔"
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ فہد خاصا معروف کرائم رپورٹر تھا۔ وہ سیدھا انچارج کے کمرے میں چلا گیا۔ انچارج اس وقت ٹیلی فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ فہد اور نوشی کو دیکھ کر اس نے ناگواری سے منہ بنایا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے ماؤتھ پیس میں بولا۔ "میں تھوڑی دیر بعد کال کرتا ہوں۔" پھر ریسیور رکھ کر وہ فہد سے مخاطب ہوا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ موٹر سائیکل روڈ ایکسیڈنٹ میں ملی تھی، پھر آپ......"
"بائیک آپ کو کہاں سے ملی تھی؟" نوشی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ کس علاقے سے؟"
"یہ بائیک...... یہ ہمیں نارتھ ناظم آباد کے علاقے سے ملی تھی۔" انچارج اس سوال پر کچھ تذبذب کا شکار ہوگیا تھا۔
"نارتھ ناظم آباد تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ مجھے وہ جگہ بتایئے جہاں سے آپ کو یہ بائیک ملی ہے؟" نوشی نے سرد لہجے میں پوچھا۔
"ایک منٹ۔" فہد نے کہا۔ "نارتھ ناظم آباد کا علاقہ تو آپ کے تھانے کی حدود میں شامل نہیں ہے۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" انچارج اب فہد سے

نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟'' فہد نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اگر چوری کی واردات ہو جائے، کوئی بندہ قتل ہو جائے تو آپ لوگوں کو اپنی حدود فوراً یاد آجاتی ہیں۔ مقتول کی لاش دو چار فٹ دوسرے تھانے کی حدود میں ہو تو آپ لوگ اسے ہاتھ تک نہیں لگاتے کہ یہ کیس دوسرے تھانے کا ہے۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟''

''دیکھیے مسٹر فہد!'' انچارج نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' فہد نے کہا پھر نوشی سے مخاطب ہوا۔ ''اس بات چیت کی ویڈیو بنالی ہے تم نے؟''

''ہاں ویڈیو اور آڈیو دونوں بن گئی ہیں۔'' نوشی نے بھی بلف کیا اور ہاتھ میں لیا بال پین یوں شولڈر بیگ میں رکھ لیا جیسے وہی کیمرا اور آڈیو ریکارڈر ہو۔

فہد اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''چلو، انچارج صاحب تو ہمیں جواب دہ نہیں، شاید ان کی ویڈیو دیکھ کر ان کا کوئی سینئر کچھ بتا دے۔''

انچارج ایک دم بوکھلا گیا اور بولا۔ ''فہد صاحب! چوری چھپے کسی کی تصویریں اور ویڈیو بنانا بھی ایک جرم ہے۔''

''تو پھر اسی جرم میں مجھے گرفتار کریں اور لاک اپ میں بند کر دیں۔'' فہد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ بائیک یہاں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کی پولیس لے کر آئی تھی۔'' انچارج نے کہا۔

''اور آپ نے بغیر کسی بحث مباحثے کے بائیک یہاں رکھ لی؟'' فہد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اگر کوئی سینئر حکم دے تو اسے ماننا ہی پڑتا ہے۔'' انچارج نے کہا۔

''اچھا، تو آپ کے کسی اعلیٰ افسر نے یہ بائیک آپ کے حوالے کی تھی؟'' نوشی نے پوچھا۔

''جی ہاں، اگر پولیس موبائل کے ساتھ ساتھ وہ نہ ہوتے تو میں یہ بائیک نہ رکھتا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ بائیک کس کی ہے؟''

''یہ بائیک عمران کی ہے۔''

''وہ عمران جو......''

''جی ہاں، وہی عمران!'' فہد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اب ذرا مجھے ان اعلیٰ افسر کا نام بھی بتا دیں۔''

انچارج نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا، پھر تھوک نگل کر رہ گیا۔

''اچھا نام چھوڑیں۔'' نوشی نے کہا پھر باتوں میں اپنے مطلوبہ پولیس اسٹیشن کا نام معلوم کر لیا۔ تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے انچارج نے بتا تو دیا مگر سنبھل کر بولا۔

''لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ اطلاع آپ کو مجھ سے یا میرے اسٹاف سے نہیں ملی ہے۔''

''فکر مت کریں۔'' فہد نے کہا۔ ''آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔''

وہ دونوں وہاں سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو نوشی چونک کر بولی۔ ''فہد تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''میری گاڑی یہیں کھڑی ہے۔'' فہد نے کہا پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے میں گاڑی لے ہی لوں۔ مجھے ابھی ایک پریس کانفرنس بھی کور کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پولیس اسٹیشن سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' نوشی چونک کر بولی۔

''میں پچھلے بارہ سال سے کرائم رپورٹنگ کر رہا ہوں نوشی۔'' فہد مسکرا کر بولا۔ ''میں ان پولیس والوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ ویسے چل کر معلوم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ مطلوبہ پولیس اسٹیشن پہنچے تو وہ اعلیٰ افسر موجود تھا۔ وہ ایس ایس پی انتہائی کرپٹ اور موقع پرست شخص تھا۔

وہ فہد کو دیکھ کر چونکا، پھر ہنس کر بولا۔ ''آیئے مسٹر فہد! آج آپ بغیر برات کے آئے ہیں؟''

''ہر وقت برات کی ضرورت نہیں پڑتی ایس ایس پی صاحب۔'' فہد مسکرایا۔ ''ضرورت پڑے گی تو برات بھی آجائے گی۔ فی الحال تو میں اکیلا ہی آیا ہوں۔''

''ان خاتون کی موجودگی کے باوجود آپ خود کو تنہا کہہ رہے ہیں؟'' ایس ایس پی نے حریص نظروں سے نوشی کے سراپا کا جائزہ لیا۔

''یہ خاتون میرے ساتھ نہیں ہیں بلکہ اپ ڈیٹ چینل سے ہیں۔''

اپ ڈیٹ کا نام سن کر ایس ایس پی چونکا پھر بولا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ایس ایس پی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

فہد نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ ''عمران کہاں ہے؟''

''کون عمران؟'' ایس ایس پی نے کرخت انداز میں پوچھا لیکن اس کا لہجہ اعتماد سے عاری تھا۔

''کیا اس شہر میں پولیس کا کوئی ایسا افسر بھی ہے جو عمران کو نہیں جانتا؟'' فہد نے طنز کیا۔

"میں صرف ایک ہی عمران کو جانتا ہوں۔" ایس ایس پی ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ "وہ اپ ڈیٹ چینل کا......"

"میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" فہد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟"

"واقعی؟" فہد نے چڑانے والے انداز میں کہا، پھر وہ نوشی سے مخاطب ہوا۔ "نوشی! تم کیمرا مین اور دوسرے اسٹاف کو بلا لو۔ حسن صاحب کو بھی برات کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی اپنے کیمرا مین کو بلا لیتا ہوں۔" اس نے نوشی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر آگیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" نوشی نے کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ میں ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تھانہ انچارج نے ہمیں مس گائڈ کیا ہے نوشی۔ اب وہ بہت اطمینان سے کہہ دے گا کہ میں نے تو آپ کو صحیح اطلاع دی تھی لیکن وہ ایس ایس پی نہیں مان رہا ہے تو میں کیا کروں؟" فہد نے کہا۔

"ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ عمران کی بائیک کی تصویر چینل پر چلا دیں۔ عمران کی گمشدگی کے ساتھ بائیک کی تصویر بھی ہوگی اور خبر یہ ہوگی کہ اپ ڈیٹ کے کرائم رپورٹر عمران گزشتہ کئی روز سے لاپتا ہیں۔ ان کی بائیک فلاں تھانے میں موجود ہے۔ بقیہ اطلاعات تھانے کے انچارج سے حاصل کی جا رہی ہیں۔" نوشی نے کہا۔

"گڈ!" فہد مسکرا کر بولا۔ "عمران کے ساتھ رہ کر تم بھی کرائم رپورٹر بنتی جا رہی ہو لیکن بائیک کی تصویروں سے ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے۔"

"کیوں؟" نوشی نے پوچھا۔ وہ لوگ ابھی تک پولیس اسٹیشن کے برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ "کیوں ثابت نہیں کر سکیں گے؟"

فہد نے اپنا سیل فون نکال کر اسے بائیک کی تصویریں دکھائیں۔ کسی بھی تصویر میں بائیک کا رجسٹریشن نمبر نظر نہیں آ رہا تھا۔ "رجسٹریشن نمبر اس لیے نظر نہیں آ رہا ہے کہ نمبر پلیٹ ہے ہی نہیں۔" فہد نے کہا۔

اچانک کسی نے نوشی کو پکارا۔ "نوشین میڈم!"

نوشی نے گھوم کر دیکھا، وہ لیڈی کانسٹیبل امینہ تھی۔ نوشی نے اپنے ایک شو میں مختلف شعبوں سے ورکنگ وومن کو بلایا تھا۔ ان میں امینہ بھی تھی۔

"کیسی ہو امینہ؟" نوشی نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"نوشین میڈم! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے لیکن یہاں نہیں۔"

"تم باہر چلو۔" نوشی نے کہا۔ "میں اپنی گاڑی میں آ رہی ہوں۔ تمہیں کچھ دور جا کر گاڑی میں بٹھا لوں گی۔"

"نہیں میڈم!" امینہ نے کہا۔ "آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں۔ میں رات نو بجے کے قریب آپ کے گھر پہنچ جاؤں گی۔"

نوشی نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اس کی پشت پر اپنا پتا لکھ کر کارڈ امینہ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا بتانا چاہ رہی تھی؟" فہد نے کہا پھر بولا۔ "اوکے نوشی! اب میں چلتا ہوں لیکن اس بدلحاظ ایس ایس پی کو اب میں چھوڑوں گا نہیں۔"

نوشی اپنی گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی اجنبی نمبر تھا۔ نوشی نے کال ریسیو کیے بغیر سیل فون پسنجر سیٹ پر رکھ دیا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر کے روانہ ہوگئی۔

ابھی نوشی کچھ ہی دور گئی تھی کہ سیل فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ بھی وہی اجنبی نمبر تھا۔ نوشی اس پر توجہ دیے بغیر ڈرائیونگ کرتی رہی۔

وہ آفس تک پہنچی تو اسے اجنبی نمبر سے سات مرتبہ کال کی گئی تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے سوچا کہ ممکن ہے کوئی پریشانی میں مبتلا ہو اور مجھے کال کر رہا ہو۔ لوگ عموماً ایک دو مرتبہ کال کرنے کے بعد کال نہیں کرتے ہیں۔

وہ سیل فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے ہی والی تھی کہ اسی نمبر سے کال ایک مرتبہ پھر آگئی۔ نوشی نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو، نوشین میڈم!" دوسری طرف سے امینہ کی آواز سنائی دی۔

"ہاں امینہ۔" نوشی نے کہا۔ "کوئی پریشانی ہے؟"

"میڈم! آپ کے کارڈ پر آپ کا سیل نمبر بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ سے ملنے کے بجائے ٹیلی فون ہی پر بات کر لوں۔ مجھے کسی نے آپ کے گھر کے آس پاس بھی دیکھ لیا تو میں بے موت ماری جاؤں گی۔"

"ایسی کیا بات ہے امینہ؟" نوشی نے پوچھا۔

"میڈم! مجھے معلوم ہے کہ عمران صاحب کہاں ہیں؟"

"کہاں ہیں وہ؟"

جواب میں امینہ نے اس شاندار اسپتال کا نام بتایا جو آبادی سے بہت دور تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ اسپتال ایک ملٹی نیشنل

فرم نے غریب مریضوں کے لیے قائم کیا تھا اور ایکڑوں کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ عمران وہاں ہیں؟"

"میرا ایک کزن رمضان وہاں وارڈ بوائے ہے۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ اب یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ عمران صاحب اس اسپتال میں کہاں ہیں۔" یہ کہہ کر اینہ نے سلسلہ منقطع کردیا۔

نوشی کا دل بہت بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ عمران کا سراغ مل گیا تھا لیکن اینہ کے رویے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کسی کی قید میں ہو۔ اس نے اپنے ایک رپورٹر اکبر کو بلانے کے ارادے سے انٹرکام اٹھایا پھر اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں نے آفس کے کسی بھی فرد کو عمران کے بارے میں بتایا تو سب لوگ اسپتال کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ یہ صورت حال دیکھ کر عمران کو وہاں لے جانے والے اسے فوری طور پر کہیں غائب بھی کرسکتے تھے۔ یہ سوچ کر اس نے تنہا وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ سب سے پہلے رمضان سے ملنا چاہتی تھی۔ وہی اسے عمران کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

شہلا عمران کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں اردو اور انگریزی کے کچھ میگزین تھے۔ عمران کی حالت جوں کی توں تھی۔ شہلا کا کام صرف عمران کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اب بھلا ایک نیم مُردہ شخص کی کیا دیکھ بھال۔ بےخیالی میں میگزین اس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر گر گئے۔ وہ میگزین اٹھانے کے لیے فرش پر جھکی تو اس کے جسم پر اس وقت بھی نرسوں والی چست یونیفارم تھی جس کا گلا کافی کھلا ہوا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے عمران اسے گھور رہا ہو۔ عورتوں میں ایک مخصوص حس ہوتی ہے جس کے ذریعے انہیں علم ہوجاتا ہے کہ کوئی انہیں گھور رہا ہے۔

شہلا یہ احساس ہوتے ہی جلدی سے سیدھی کھڑی ہوگئی پھر اس نے عمران کو دیکھا۔ وہ اسی حالت میں ادھ کھلی آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔

"ارے" شہلا نے بلند آواز میں کہا۔ "کیا تم دیکھ سکتے ہو؟ بولو، کیا تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے؟" اس نے آگے بڑھ کر عمران کو بری طرح جھنجوڑ دیا پھر اسے خود ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "سوری... سوری! میں شاید پاگل ہوگئی ہوں۔" پھر اس

نے چادر بہت احتیاط سے عمران کے جسم پر پھیلا دی۔

اسی وقت ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو شہلا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کیمرے کو اس نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے گہری نظروں سے شہلا کا جائزہ لیا پھر عمران کی طرف دیکھا۔

"کیا سچویشن ہے پیشنٹ کی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"حسب معمول سر۔" شہلا نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ایسا لگا تھا کہ پیشنٹ کی سانس اکھڑ گئی ہو۔ میں نے اس بے چارے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔"

"میں جانتا ہوں سسٹر۔" ڈاکٹر نے کہا اور ایک مرتبہ پھر شہلا کو گھورا اور کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک وارڈ بوائے کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا اور ہنس کر بولا۔ "سسٹر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میری طبیعت کو کیا ہوا؟"

"پھر آپ نے یہ بیماروں والا کھانا کیوں منگوایا ہے؟" اس نے کھانے کی ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کھانا تو اس پیشنٹ کے لیے ہے۔" اس نے بے حس و حرکت عمران کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے لیے...... یہ کھانا یہ کھائے گا؟" وہ حیرت سے بولا۔ "یہ کیسے کھائے گا؟"

"کیا تم کھانا نہیں کھاتے ہو؟" شہلا نے پوچھا۔ "اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟"

وارڈ بوائے کچھ نہ بولا اور کھانے کی ٹرالی واپس لے کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہلا نے ایک مرتبہ پھر عمران کا جائزہ لیا۔ اس کی ڈرپ ختم ہو چکی تھی۔ شہلا نے لیور گھما کر آہستہ آہستہ بیڈ کا سرہانہ اونچا کیا، عمران کی پشت پر مزید ایک تکیہ لگایا اور چمچے سے اسے سوپ پلانے کی کوشش کی لیکن سارا سوپ چھلک کر عمران کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر بہنے لگا۔

وہ ٹشو پیپر سے عمران کے ہونٹ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک پیالہ الٹ کر شہلا کے جسم پر گر پڑا۔ سوپ اس کی گردن اور سینے پر پھیل گیا۔ شہلا نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا، پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے عمران نے ہاتھ مار کر پیالہ الٹ دیا ہو پھر اسے خیال آیا کہ عمران تو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بے چارہ تو خود ہلنے جلنے سے معذور ہے۔ اس نے سوچا اور بڑبڑانے لگی۔ "کاش...... کاش یہ ڈیشنگ پرسنالٹی والا مریض صحت یاب ہو جائے۔"

"لیکن تمہیں اس کی صحت یابی کی کیا فکر ہے سسٹر؟" دروازے کے نزدیک سے انسپکٹر کی آواز آئی۔

شہلا کو احساس ہوا کہ وہ بلند آواز سے بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ "مریض کی صحت یابی کے بارے میں اچھا ہی سوچنا چاہیے۔"

"تمہارے خیال میں یہ پیشنٹ کب تک ہوش میں آ جائے گا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

شہلا مسکرائی اور بولی۔ "اس سوال کا جواب تو ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔"

☆☆☆

نوشی اسپتال پہنچی تو سورج ڈھل رہا تھا۔ اس نے ایک وارڈ بوائے سے رمضان کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر بولا۔ "میں ہی رمضان ہوں، فرمایئے۔"

"مجھے امینہ نے بھیجا ہے۔" نوشی نے کہا اور اپنے پرس سے ہزار ہزار روپے کے کچھ نوٹ نکال لیے۔

"پیسے واپس رکھیں اور میرے ساتھ آئیں۔" رمضان نے کہا۔

نوشی نے پیسے واپس رکھ لیے اور رمضان کے پیچھے چلنے لگی۔

رمضان طویل کوریڈور میں چلتے چلتے ایک کمرے میں مڑ گیا۔ وہ کمرا شاید کسی ڈاکٹر کا تھا۔ کرسی کی پشت پر سفید گاؤن پڑا ہوا تھا۔ ٹیبل پر رائٹنگ پیڈ، تھرمامیٹر اور بی پی آپریٹس رکھا ہوا تھا۔

"عمران صاحب کو وارڈ نمبر سیون میں رکھا گیا ہے۔ وہ وارڈ ابھی حال ہی میں تیار ہوا ہے۔ وہاں ابھی تک باقاعدہ کام نہیں شروع ہوا ہے۔"

"وارڈ نمبر سیون ہے کہاں؟" نوشی نے پوچھا۔

"کوریڈور سے باہر نکل کر دائیں ہاتھ پر چلی جائیں، یہاں کافی فاصلے پر آپ کو الگ تھلگ سا بلاک نظر آئے گا۔ وہی وارڈ سیون ہے۔ اس کے فرسٹ فلور پر کونے والے کمرے میں عمران صاحب موجود ہیں۔"

"تم جانتے ہو کہ اب ان کی طبیعت کیسی ہے، کیا وہ زیادہ زخمی ہیں؟"

"زخم تو میں نے کوئی نہیں دیکھا میڈم!" رمضان نے کہا۔ "وہ تو کوما میں ہیں۔"

"تو کیا وہ آئی سی یو میں ہیں؟" نوشی نے پوچھا۔

''نہیں، اس طرف آئی سی یو تو نہیں ہے۔'' رمضان نے جواب دیا پھر بولا۔ ''آپ خود جا کر دیکھ لیں لیکن ٹھہریں۔'' اس نے کرسی کی پشت پر پڑا ہوا گاؤن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پہن لیں اور یہ اسٹیتھو اسکوپ بھی گلے میں ڈال لیں ورنہ کوئی آپ کو وہاں گھسنے نہیں دے گا۔''

''تم وہاں نہیں جا سکتے؟'' نوشی نے پوچھا۔

''وہاں صرف ڈاکٹر جا سکتا ہے میڈم...... آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کو وہاں کا ایڈریس بتا کر میں نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔''

''کیوں؟'' نوشی نے پوچھا۔ ''تم میری خاطر اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

''آپ کی خاطر نہیں میڈم!'' رمضان مسکرایا۔ ''امینہ کی خاطر۔''

نوشی وہاں سے ڈاکٹر کا گاؤن اور اسٹیتھو اسکوپ لے کر باہر نکلی تو راستے میں کئی وارڈ بوائز اور دوسرے اسٹاف نے اسے سلام کیا۔ نوشی بلاک سیون کے فرسٹ فلور پر پہنچی تو ایک کمرے سے شہلا نکلتی دکھائی دی۔ نوشی جلدی سے ستون کی آڑ میں ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ تیزی سے عمران کے کمرے کی طرف لپکی۔ اسی وقت اس کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو کمرے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ ان دونوں نے گہری نظر سے نوشی کا جائزہ لیا لیکن اسے روکا نہیں۔

نوشی جلدی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ عمران سامنے ہی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ نوشی لپک کر تیزی سے اس کے نزدیک پہنچی اور بے اختیار اسے آواز دی۔ ''عمران!''

عمران کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ حرکت تو دور کی بات، اس کی تو پلکیں بھی نہ جھپکیں۔

''عمران!'' اس نے پھر بلند آواز میں اسے پکارا لیکن عمران نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی۔ نوشی بری طرح رونے لگی۔ خوش قسمتی سے نوشی ایسے انداز میں کھڑی تھی کہ کیمرے کی طرف اس کی پیٹھ ہوگئی۔

اسی وقت ا... کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کوئی چیخ کر بولا۔ ''تم لوگ کیا بھنگ پی کر بیٹھے ہو۔ یہاں کوئی لڑکی آئی ہے؟''

نوشی نے خود کو سنبھالا اور ادھر ادھر دیکھا۔ اس کمرے سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے وہ کمرے میں آئی تھی۔ وہ لپک کر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں اور تین آدمی دندناتے ہوئے کمرے میں آگئے۔

نوشی پلٹ کر باہر بھاگی۔ ان لوگوں کو بھی نوشی کے بھاگنے کا علم ہوگیا۔ وہ چیختے ہوئے نوشی کے پیچھے لپکے۔ نوشی بھاگتی ہوئی فرسٹ فلور سے نیچے آئی۔ اسی وقت ایک آدمی ٹیرس سے چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آگیا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ نوشی کو گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے چلا۔

☆☆☆

پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اور ایس ایس پی حسن جاوید کے علاوہ انسپکٹر شاکر بھی کمرے میں موجود تھا۔

''وہ لڑکی وہاں پہنچی کیسے؟'' افسر چیخ کر بولا۔

''میں بہت جلد ہی یہ بھی معلوم کرلوں گا کہ اس جرنلسٹ کو وہاں کا ایڈریس کس نے بتایا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ویسے جب وہ اسپتال میں داخل ہوئی تھی تو مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کو اندر جانے سے نہ روکیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر عمران کا ری ایکشن کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ ڈراما کر رہا ہے تو اس لڑکی کو دیکھ کر وہ ڈراما ختم کردیتا۔ میں ڈاکٹر کے کمرے میں مانیٹر پر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔''

''پھر عمران نے کوئی حرکت کی..... کوئی بھی رسپانس دیا؟'' افسر اعلیٰ اضطراب کے عالم میں بولا۔

''نو سر!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''اس لڑکی نے کئی دفعہ عمران کو پکارا، اسے ہلایا لیکن وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ حالانکہ عمران اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

ایس ایس پی حسن جاوید نے کہا۔ ''سر! مجھے لگتا ہے کہ عمران اب بھی نارمل نہیں ہوسکے گا۔'' ایس ایس پی نے افسر اعلیٰ کو دیکھا۔ ''ہم کیوں اتنا درد سر مول لے رہے ہیں....... خاموشی سے اسے کہیں پھینک دیتے ہیں۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟'' افسر اعلیٰ غرا کر بولا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس نے ہماری کتنی اہم فلم بنائی ہے۔ میں پوائنٹ ون پرسنٹ بھی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ فلم اگر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی تو کئی افراد کا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔ میری ملازمت بھی جائے گی اور میں اگر پھانسی کے پھندے سے بچ گیا تو جیل میں نظر آؤں گا۔''

''لیکن سر! اس کا کیمرا تو خالی تھا۔ اس میں کوئی ڈی وی ڈی نہیں تھی۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

''وہی ڈی وی ڈی تو ہمارے لیے ڈیتھ وارنٹ ہے۔'' افسر اعلیٰ نے کہا۔

"سر! پھر عمران کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں اسے ہوش میں لانا چاہتا ہوں تاکہ اس سے ظلم کے بارے میں معلوم کرسکوں۔" ایس ایس پی نے کہا۔

"اس لڑکی نے کچھ بتایا؟" افسرِ اعلیٰ نے پوچھا۔

"اس لڑکی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو وہ کیا بتائے گی؟" ایس ایس پی نے کہا۔

"کسی بھی طرح وہ ڈی وی ڈی حاصل کرو۔" افسرِ اعلیٰ نے کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

☆☆☆

شہلا کے دل میں نہ جانے کیوں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ عمران پوری طرح ہوش و حواس میں ہے اور وہ ڈراما کررہا ہے۔ وہ بہت غور سے عمران کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے سوچا، اگر عمران ڈراما کررہا ہے تو جرنلسٹ سے زیادہ اچھا اداکار بھی ہے۔

اسی وقت انسپکٹر شاکر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر شہلا پر ڈالی، پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے اس ہیرو کی حالت میں کچھ فرق پڑا؟"

"نہیں، ابھی تک وہی کنڈیشن ہے۔" اس نے بے حس وحرکت پڑے ہوئے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اس زندہ لاش کا ہم کیا کریں گے، فضول میں اتنا دردِ سر مول لینے سے فائدہ؟" یہ کہہ کر وہ کچھ پیچھے ہٹا تاکہ کیمرے کی رینج سے نکل جائے، پھر اس نے اچانک اپنا پسٹل نکال لیا اور بولا۔ "اس زندہ لاش کو میں واقعی لاش میں تبدیل کرنے جارہا ہوں۔ اس کی کھوپڑی کے لیے ایک گولی ہی کافی ہوگی۔" اس نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور عمران کی طرف تان لیا۔

شہلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ "تم ایسا نہیں کرسکتے انسپکٹر۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "ہمیں اس مُردے کی ضرورت نہیں ہے۔"

شہلا جھپٹ کر عمران کے سامنے آگئی اور انسپکٹر سے بولی۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اس وقت یہ مریض میری ذمے داری ہے۔"

"دیکھو سسٹر!" انسپکٹر غرا کر بولا۔ "تم مجھے کب تک روکوگی۔ ہم کل اسے یہاں سے لے جائیں گے، پھر تمہاری ڈیوٹی ختم اور اس کا کھیل بھی ختم۔"

"اس وقت تم جو دل چاہے کرنا۔" شہلا نے کہا۔ "لیکن میرے پاس نہیں۔ ناؤ پلیز گیٹ آؤٹ۔"

انسپکٹر نے قہر آلود نظروں سے شہلا کو دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

شہلا نے گہرے گہرے سانس لیے اور پانی پینے لگی۔ اچانک اس کی نظر وال کلاک پر پڑی تو وہ چونک کر بولی۔ "مجھے تو عمران کو وہیل چیئر پر باہر لے جانا تھا۔" اس نے باہر نکل کر ڈیوٹی پر موجود ایک آدمی کو بلایا۔ اس کی مدد سے عمران کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہاں مریضوں کے لیے لفٹ بھی تھی۔ شہلا لفٹ کی طرف بڑھی تو ان دونوں نگراں پولیس والوں نے اس کے پیچھے آنے کی زحمت نہیں کی۔ اس بلاک کے عقب میں بڑا سا ایک سوئمنگ پول تھا۔ وہاں بھی اس وقت سناٹا تھا۔ شہلا، عمران کی وہیل چیئر روک کر وہیں ٹھہر گئی اور کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

ایک مرتبہ پھر اسے احساس ہوا کہ عمران کی نظریں اس پر گڑی ہوئی ہیں۔

شہلا، عمران کے نزدیک پہنچی اور چیخ کر بولی۔ "تم آخر بولتے کیوں نہیں، کیوں مجھے گھورتے رہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دیکھتے ہو۔ بتاؤ، تم یہ ڈراما کیوں کررہے ہو؟"

جواب میں عمران ساکت بیٹھا رہا، اس کی ادھ کھلی آنکھیں خلا میں تک رہی تھیں۔

"انسپکٹر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، تمہارا مرجانا ہی بہتر ہے۔" وہ عمران کی کرسی کی پشت پر پہنچی اور سوئمنگ پول کے کنارے پہنچ کر اس نے کرسی کو جھٹکے سے آگے کیا اور اسے سوئمنگ پول میں پھینک کر بولی۔ "اب اگر تم ڈراما کررہے ہو تو خود کو بچاؤ گے ورنہ ڈوب جاؤ گے۔ میں کہہ دوں گی کہ تمہاری وہیل چیئر مجھ سے سنبھل نہ سکی اور تم پول میں گر گئے۔" اس نے عمران کی طرف دیکھا، وہ بے حس وحرکت پول کی تہ میں جارہا تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "او مائی گاڈ! یہ تو واقعی مر جائے گا۔" اس نے گھبرا کر اچانک پول میں چھلانگ لگادی اور ہاتھ پیر مار کے عمران کو ڈھونڈنے لگی۔ ایک دفعہ وہ سانس لینے کو اوپر آئی، پھر دوبارہ پول میں غوطہ لگایا لیکن عمران اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ دوبارہ سطح پر ابھری تو عمران نے پشت سے اسے دبوچ لیا۔ شہلا کے حلق سے سریلی سی ایک چیخ برآمد ہوئی لیکن فوراً ہی حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ عمران نے اسے پانی میں غوطہ دے دیا تھا۔

وہ خاصا بڑا سوئمنگ پول تھا۔ عمران اسے لیے ہوئے دوسرے سرے پر پہنچا۔ اس طرف گھنی خودرو جھاڑیاں اور درخت تھے۔

عمران سوئمنگ پول سے نکلا اور شہلا کو گھسیٹتا ہوا ان جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔

"چھوڑ دو مجھے۔" شہلا چیخ کر بولی۔ "تم دھوکے باز، فریبی! اتنے دن سے سب ڈاکٹرز کو اور مجھے دھوکا دے رہے تھے؟"

"خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہو۔" عمران نے درشت لہجے میں کہا۔ "ورنہ ابھی تمہاری گردن دبا کر لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا...... چلو۔" اس نے پھر شہلا کو گھسیٹنا اور اسے لے کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں میں چلتے ہوئے خاردار جھاڑیوں سے ان دونوں کے کپڑے پھٹ رہے تھے، ہاتھوں... چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر خراشیں پڑ رہی تھیں لیکن عمران اسے بے رحمی سے گھسیٹ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے بولا۔ "تم تو مجھے قتل کرنا چاہتی تھیں، اب کیا ہوا؟ مارو مجھے۔"

"میں صرف تمہارا یہ ڈھونگ ختم کرنا چاہتی تھی۔" شہلا نے اس کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی تھی کہ اگر تم ڈھونگ کر رہے ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے یہ ڈھونگ ختم کر دو گے ورنہ میں تمہیں مرنے نہیں دیتی۔ میں نے تمہیں بچانے ہی کے لیے پول میں چھلانگ لگائی تھی۔"

"آپ کی بہت نوازش، کرم میڈم۔" عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کہ آپ نے میری جان بچائی لیکن آپ کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے زندہ دیکھ کر وہ لوگ میری زندگی موت سے بھی بدتر کر دیں گے۔ رکو مت، چلتی رہو۔" عمران نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر شاکر، عمران کے کمرے میں داخل ہوا تو بیڈ خالی تھا۔ اس نے چونک کر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ "اب تک تو شہلا کو واپس آجانا چاہیے تھا۔" وہ تیزی سے باہر نکلا اور وہاں موجود دونوں نگرانوں سے پوچھا۔ "وہ نرس اسے کب یہاں سے باہر لے گئی تھی؟"

"سر! اسے گئے ہوئے تو دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"اور تم یہاں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے ہو...... کس طرف گئی تھی وہ؟"

اس شخص نے سامنے کی روش کی طرف اشارہ کر دیا۔ انسپکٹر چیخ کر بولا۔ "اسے ڈھونڈو ایڈیٹ...... اگر عمران نے کوئی ڈراما ہی کیا تھا تو اب تک وہ نکل چکا ہوگا۔" پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ "اسپتال کے مین گیٹ کو بلاک کر دو، کوئی بھی مشکوک آدمی باہر نہ نکلنے پائے۔" پھر وہ خود بھی دوڑتا ہوا اسی طرف چلا گیا جہاں اس کے آدمی گئے تھے۔

دوڑتے دوڑتے اس نے پسٹل بھی نکال لیا تھا۔ اس کے دونوں آدمی سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

وہاں عمران کی وہیل چیئر اوندھی پڑی تھی اور دونوں نگران حیرت سے کرسی کو دیکھ رہے تھے۔

"اب یہاں گم صم کیوں کھڑے ہو؟" انسپکٹر چیخا۔ "جاؤ، اس حرام زادے کو تلاش کرو۔ وہ یہیں جھاڑیوں میں کہیں ہوگا۔" پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایس ایس پی حسن جاوید کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا۔ "سر! وہ......"

"کیا بات ہے شاکر؟" ایس ایس پی نے پوچھا۔

"سر! وہ...... عمران...... کمرے سے فرار ہو گیا۔" انسپکٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"فرار ہو گیا؟" ایس ایس پی نے حیرت سے کہا۔

"سر! نرس اسے وہیل چیئر پر باہر لے گئی تھی۔ وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"اسے ڈھونڈو شاکر۔" ایس ایس پی چیخ کر بولا۔ "ورنہ ہم سب غائب ہو جائیں گے۔ باس ہماری کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دے گا۔ وہ نرس کہاں ہے؟"

"اس کا بھی کوئی پتا نہیں ہے سر۔" پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "اسے تلاش کرنے کے لیے میں نے اپنے آدمیوں کو لگا دیا ہے۔ اسپتال کا مین گیٹ بلاک کرا دیا ہے اور......"

"یہ سب انتظامات کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ڈھونڈو، اس کا زندہ ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔" ایس ایس پی نے کہا۔ "میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

شاکر نے نئے سرے سے وہاں کا جائزہ لیا۔ پول کے دوسرے سرے پر اسے ایسے نشانات دکھائی دیے جیسے کوئی پانی میں شرابور ہونے کے بعد وہاں سے گزرا ہو۔ کافی دیر گزر چکی تھی اس لیے یہ نشانات سوکھ رہے تھے پھر اسی طرح کے نشانات اسے جھاڑیوں کی طرف جاتے نظر آئے۔

"مجید، اصغر۔" انسپکٹر چیخا۔ "ادھر آؤ، اس طرف تلاش کرو۔ تم میں سے ایک آدمی جا کر سرچ لائٹ لے آئے۔"

"او کے سر!" دور سے کسی کی آواز آئی۔

اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ شاکر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نوجوان سپہ سالار کو اس کمرے تک پہنچا دیا جہاں راجا اس وقت بیٹھا تھا۔

"کہو کیسے آنا ہوا؟"

"میں آپ کی پیشکش پر وچن دینے آیا ہوں۔"

"کیسی پیشکش؟"

"میں سبکتگین کو قتل کرنے کا عہد لے کر آیا ہوں۔"

"تم نے یہ بات بھرے اجلاس میں کیوں نہیں کہی؟"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے نیچا دکھانے کے لیے خود بھی اس پیشکش کو قبول کرلے۔ اس قتل کے سلسلے میں مجھے جو کچھ چاہیے تھا، وہ ایسا نہیں تھا جو سب کے سامنے مانگا جاسکے۔"

"تم عجیب الجھی ہوئی باتیں کررہے ہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، صاف صاف کہو۔"

"مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ تو میں کہہ چکا۔"

"تم یقیناً انعام میں اضافے کی بات کرنے آئے ہوگے۔ میں آدھی سلطنت تک دینے کو تیار ہوں۔"

"اَن داتا! حکومتیں تو راجاؤں کو زیب دیتی ہیں۔ میری مانگ تو کچھ اور ہے۔"

"عجیب آدمی ہو کہ حکومت ٹھکرا رہے ہو۔ پھر تمہیں کیا چاہیے؟"

"آپ وچن دیں کہ اگر میں کوئی ناگوار بات کر بیٹھوں تو مجھے معاف کردیا جائے گا۔ آپ کے وزیر کی بیٹی سے مجھے عشق ہوگیا ہے۔ اس کے بغیر میرا جینا بے کار ہے۔ اگر میں سبکتگین کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی بیٹی سے میری شادی ہوجائے۔"

جے پال کو اس کی یہ شرط ناگوار تو گزری تھی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ چیز مانگو جو میری ہو لیکن اس وقت یہ شرط مان لینے ہی میں بھلائی تھی۔

"میں وچن دیتا ہوں کہ اس لڑکی سے تمہاری شادی کرادی جائے گی۔"

ابھی نوجوان پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہوا تھا کہ بھیم بول پڑا۔

"مہاراج! بیٹیوں کی شادی کا اختیار ماں باپ کو ہوتا ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں وچن دینے والے۔ اور یوں بھی وزیر مہاراج برہمن ہیں اور یہ نوجوان راجپوت ہے۔ وہ بھی اس رشتے پر تیار نہ ہوگا۔"

"میں راجا ہوں۔ راجا جے پال۔ وہ میرا حکم کبھی نہیں ٹال سکے گا۔ تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

راجا کے تیور دیکھ کر بھیم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ راجا نے ایک مرتبہ پھر نوجوان سالار کو مخاطب کیا۔

"تم کسی کی باتوں میں نہ آؤ۔ ہم تمہاری خواہش کا ضرور احترام کریں گے۔ پردھان منتری تو کیا چیز ہے، ہندوستان کا کوئی راجا بھی ہمارے حکم کو نہیں ٹال سکتا۔"

"ایک بات اور ہے۔"

"بولو۔"

"میرے پاس پانچ ہزار فوج ہے۔ میں چاہوں گا کہ جب جنگ شروع ہو تو مجھے اور میرے لشکریوں کو الگ رکھا جائے۔" اس نے بھیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جب چاہوں گا اور جس طرف سے چاہوں گا، حملہ آور ہوکر سبکتگین پر ٹوٹ پڑوں گا۔"

"تم ہر طرح آزاد ہوگے۔ جس طرح چاہو یہ کارنامہ انجام دو۔"

"تو میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ سبکتگین کو قتل کیے بغیر واپس نہیں آؤں گا۔"

"مجھے بھی اپنا وچن یاد رہے گا۔"

نوجوان کے چلے جانے کے بعد جے پال نے بھیم کو اعتماد میں لیا۔

"صرف بہادری ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ مصلحت ہی تھی کہ نوجوان کی شرط مان لی جائے۔ وہ منتری کی بیٹی سے پریم کرتا ہے۔ پریم میں کتنی شکتی ہوتی ہے یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ وہ اپنی پریمیکا کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اگر اس نے سبکتگین کو قتل کردیا تو ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"میں تو اس لیے بولا تھا کہ آپ اپنا وچن پورا کرسکیں گے؟"

"یہ تو اس وقت دیکھا جائے گا جب وہ اپنا قول پورا کردے گا۔ اگر ہم اپنا وچن پورا نہ کرسکے تو وہ ہمیں مجبور نہیں کرسکے گا۔"

بھیم سوچ رہا تھا کہ راجا کتنا عیار ہے۔ بے چارے کی جوانی داؤ پر لگادی جبکہ وہ اپنے وچن میں مخلص بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

سبکتگین کو جب ان تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے بھی لشکر ترتیب دیا اور غزنی سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کو آگے بڑھنے کا موقع دے حالانکہ اس کے بعض سرداروں کا مشورہ یہ تھا کہ جے پال کو کابل تک آنے دیا جائے۔ ہم ان علاقوں سے واقف ہیں، اسے

انسپکٹر شاکر کی آواز عمران نے بھی سنی تھی لیکن آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاکر ان سے کافی فاصلے پر ہے۔

''ابھی تھوڑی دیر میں وہ سرچ لائٹس لے کر آ جائیں گے اور یہاں کا کونا کونا چھان ماریں گے، پھر تم کسی چوہے کی طرح پکڑے جاؤ گے۔''

''تم زیادہ مت چہکو۔'' عمران نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں مرنے سے پہلے تمہیں تو ختم کر ہی دوں گا۔''

''مجھے تو ابھی ختم کر دو۔'' شہلا نے بے خوفی سے کہا۔

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔'' عمران نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم فکر مت کرو، وقت آیا تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

وہ شہلا کو گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں میں اندر تک گھس گیا تھا۔

اچانک کوئی میگا فون پر چیخا۔ ''عمران! خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ بھاگو گے تو تمہارا جرم مزید سنگین ہو جائے گا۔''

''میرا جرم؟'' عمران نے حیرت سے کہا۔ ''میرے کس جرم کی بات کر رہے ہیں یہ لوگ؟''

''عمران! یہ مت سمجھنا کہ تم اس نرس کو یرغمال بنا کر ہمیں بلیک میل کر سکو گے۔ ہمارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، تم اسے مار دو یا چھوڑ دو لیکن ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

عمران نے شہلا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

''بولو، اب کیا کہتی ہو؟'' عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ان کے نزدیک تو تمہاری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''مائی فٹ۔'' شہلا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تھوکتی ہوں ان پر اور ان کی ملازمت پر۔''

''تھوکنے کے لیے تو تمہیں پھر انہی لوگوں کے پاس جانا پڑے گا۔'' عمران کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

اچانک فضا کتوں کے بھونکنے سے گونج اٹھی۔ عمران نے اندازہ لگایا کہ وہ کتے تعداد میں دو سے زیادہ ہیں۔ ان کی آوازیں مختلف قسم کی تھیں۔

''وہ لوگ کتے لے آئے ہیں۔'' شہلا نے متوحش لہجے میں کہا۔

''تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ وہ لوگ کتے میرے لیے لائے ہیں۔'' عمران نے اطمینان سے کہا اور ایک درخت کی مضبوط شاخ توڑنے لگا۔

''لیکن کتا نام پوچھ کر نہیں ادھیڑتا۔'' شہلا گھبرا کر بولی۔

''ٹرینڈ کتا گردن پکڑنے سے پہلے نام ضرور پوچھتا ہے، خدا حافظ۔'' عمران نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

''ٹھہرو۔'' شہلا کے لہجے میں خوف تھا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو؟''

''تو کیا کروں، تمہیں ڈھول کی طرح گلے میں لٹکا لوں؟'' عمران نے ہنس کر کہا۔

''عمران پلیز! مجھے ان کتوں سے بچا لو......'' شہلا نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''کن کتوں کی بات کر رہی ہو؟'' عمران نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''وہ کتے جو غراتے ہوئے ہمارے پیچھے دوڑ رہے ہیں یا وہ کتے جو......''

''عمران!'' شہلا چیخ کر بولی۔ کتوں کی غراہٹیں اب کچھ واضح ہو گئی تھیں۔

عمران نے ارد گرد دیکھا پھر درخت سے توڑی ہوئی اس شاخ کو ڈنڈے کی طرح ہاتھ میں پکڑا اور شہلا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے روانہ ہو گیا۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ عمران اتنی دیر سے اندھیرے میں تھا اس لیے اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ اچانک اسے ایک گھنا درخت نظر آیا۔

درخت دیکھ کر اس نے شہلا سے پوچھا۔ ''بچپن میں کبھی درخت پر چڑھی ہو؟''

''کیوں؟'' شہلا نے پوچھا۔

''ہم اس گھنے درخت پر چڑھیں گے۔'' عمران نے کہا۔

''عمران! اس درخت پر تو سانپ اور بچھو بھی ہو سکتے ہیں۔'' شہلا نے کہا۔

''شیر اور چیتے بھی ہو سکتے ہیں۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن فی الحال ہمیں کتوں سے بچنا ہے۔ چلو، اس درخت پر چڑھ جاؤ۔'' عمران درخت کے مضبوط تنے کے پاس کھڑا ہو گیا اور شہلا کو اوپر چڑھنے میں مدد دی۔ شہلا اس کے کندھے پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ گئی۔ اس کے چڑھنے کے بعد عمران بھی اچھل کر بندر کی طرح اس درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کی مضبوط شاخیں اوپر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے شہلا کو مزید اوپر چڑھنے کو کہا اور خود بھی شاخوں کے سہارے اوپر پہنچ گیا۔ اب وہ کتوں کی پہنچ سے بہت دور تھے۔

''اب ہم کتوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن کچھ دیر بعد پولیس کے لوگ بھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنی سرچ لائٹس کے ذریعے ہمیں فوراً ہی ڈھونڈ لیں گے۔'' شہلا نے کہا۔

''تم کچھ دیر خاموش رہو اور مجھے کچھ سوچنے دو۔'' عمران نے اسے جھڑک دیا۔

شہلا خاموش ہو گئی۔ وہ دونوں شاخوں میں یوں الجھ کر بیٹھے تھے کہ اگر سو بھی جاتے تو نیچے نہیں گر سکتے تھے۔ کتوں کی آوازیں مزید واضح ہو گئی تھیں۔ ہوا مخالف سمت میں چل رہی تھی اس لیے کتوں کو ان کی بو تک پہنچنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ ان تک پہنچ چکے ہوتے۔

عمران نے وہاں کا جائزہ لینے کے لیے مزید اوپر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہلا سے کہا۔ ''تم یہیں رکو، میں مزید اوپر چڑھ کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔''

پھر وہ ایک مضبوط شاخ منتخب کر کے مزید اوپر چڑھ گیا۔ اوپر چڑھنے کے بعد اس نے اردگرد کا جائزہ لیا تو اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ایکڑوں میں پھیلے ہوئے اس اسپتال کی باؤنڈری وال اس درخت کی شاخوں سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔

عمران نے سوچا کہ درخت سے باؤنڈری وال تک پہنچنا آسان تو نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔ بس یہ خطرہ تھا کہ جس شاخ کے ذریعے وہ باؤنڈری وال تک جائیں، وہ شاخ اتنی مضبوط ہو کہ ان کا بوجھ سہار سکے۔

''شہلا۔'' عمران نے پکارا لیکن شہلا کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوسری مرتبہ کچھ بلند آواز میں اسے پکارا۔

''کیا ہوا عمران؟'' شہلا نے پوچھا۔ ''کیا کوئی کتا اوپر آ گیا؟''

''کتے واقعی آ گئے تو تمہاری ساری شوخی دھری رہ جائے گی۔'' عمران نے کہا۔ ''اوپر آؤ۔''

شہلا نے اوپر آنے کی کوشش کی لیکن آنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

''جلدی کرو شہلا۔'' عمران نے جھنجلا کر کہا۔

''آنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' شہلا نے کہا۔ ''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میرے لیے سیڑھی لگا دی ہو۔'' پھر وہ کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ ہی گئی۔

''وہ باؤنڈری وال نظر آ رہی ہے؟'' عمران نے کہا۔

شہلا نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہاں نظر تو آ رہی ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''یہ اسپتال کی باؤنڈری وال ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم اتنی دور تک دوڑتے ہوئے آئے ہیں۔''

''اچھا اب میری بات سنو۔'' عمران نے کہا۔ ''ہمیں شاخوں کے سہارے اس باؤنڈری وال تک پہنچنا ہے۔''

''بہت مشکل ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''تو پھر تم یہیں بیٹھ کر ان لوگوں کے آنے کا انتظار کرو۔'' عمران نے کہا۔ ''میں تو جا رہا ہوں۔''

''اے سپر مین!'' شہلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ ناممکن ہے۔ میں نے بھی ایسی بہت سی دیواریں پھلانگی ہیں۔''

''چلو، پھر ایک اور سہی۔'' عمران نے کہا۔ ''پہلے تم باؤنڈری وال تک پہنچو، پھر میں آتا ہوں۔''

''اوکے۔'' شہلا اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پیروں میں جوتے ہیں اس لیے کچھ مشکل ہو گی۔''

''جوتے نہ ہوتے تو مشکل ہوتی۔'' عمران نے کہا۔ ''میں تو ننگے پیر ہوں اور اسی حالت میں اس خاردار جنگل سے گزر کر آیا ہوں۔ جاؤ جلدی کرو، کتے درخت کے نیچے پہنچنے ہی والے ہیں۔''

کتوں کی آوازیں اب واضح ہو گئی تھیں۔ وہ کسی بھی وقت اس درخت تک پہنچ سکتے تھے۔ شہلا نے بھی کتوں کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ ایک گھنی شاخ پر بیٹھی اور بندر کی طرح اس پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھی۔ جب وہ باؤنڈری وال کے نزدیک پہنچی تو لچک دار شاخ کمان کی طرح مڑ گئی۔ وہ شاخ کے سرے پر مزید جھکی اور دیوار پر پہنچ گئی۔ شاخ زناٹے سے اوپر کی طرف آئی۔ عمران نے بھی وہ شاخ چھوڑ دی تھی اور دوسری زیادہ مضبوط شاخ تھام لی تھی۔

اچانک انہیں کتوں کی خوفناک آوازیں بالکل نیچے سنائی دیں۔ وہ وحشیانہ انداز میں غرا رہے تھے۔ عمران کا اندازہ درست تھا۔ وہ دو سے زیادہ تھے۔

''آ جاؤ عمران۔'' شہلا نے کہا۔

''خاموش رہو۔'' عمران غرا کر بولا اور اللہ کا نام لے کر اس شاخ کے ذریعے باؤنڈری وال تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ شہلا کی طرح شاخ پر بیٹھا نہیں تھا بلکہ اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر لٹک گیا تھا، پھر وہ ہاتھوں کے بل کھسکتا ہوا باؤنڈری وال تک پہنچ گیا۔ اچانک وہ شاخ زور سے چٹخی مگر عمران نے باؤنڈری وال پر چھلانگ لگا دی۔

وہ باؤنڈری وال اتنی چوڑی تھی کہ اگر ایک آدمی اس پر لیٹنا چاہتا تو بہ آسانی لیٹ سکتا تھا۔

عمران نے دوسری طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے اندھیرے میں کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ زمین وہاں سے کتنی

پیچھے ہے۔

''مجھے یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔'' عمران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اگر ہم نے زیادہ دیر لگائی تو ان لوگوں کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ہم باؤنڈری وال کے ذریعے وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔'' تھوڑی دیر بعد ان کے فرار کے راستے مسدود ہو جاتے اور..... اب تک کی محنت پر پانی پھر جاتا۔

''تم کس رسک کی بات کر رہے ہو عمران؟'' شہلا نے پوچھا۔

''میں یہاں سے کود رہا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ دیوار کی بلندی باہر سے کتنی ہے لیکن ہم رات بھر یہاں بیٹھے بھی نہیں رہ سکتے۔''

عمران اچانک پیٹ کے بل دیوار پر لیٹ کر دوسری طرف لٹک گیا پھر اس نے اپنے پورے جسم کا بوجھ ہاتھوں پر ڈالا اور دیوار پکڑ کر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

دوسرے ہی لمحے اس کے پیر زمین سے ٹکرائے اور وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گر گیا۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں بھاگنے سے اس کے پیر بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ زمین پر گرنے سے اس کے تلوؤں کی جلد کچھ اور ادھڑ گئی۔

وہ لنگڑاتا ہوا اٹھا اور منہ اٹھا کر آہستہ سے بولا۔

''شہلا! تم اس جگہ لٹک جاؤ جہاں سے میں کودا ہوں۔ پھر یہیں چھلانگ لگا دینا۔ میں تمہیں گرنے نہیں دوں گا۔''

شہلا بھی عمران کی طرح لٹک گئی۔ اس کے پیر عمران کے اٹھے ہوئے ہاتھوں سے دو ڈھائی فٹ کے فاصلے پر تھے۔

''ہاں شہلا۔'' عمران نے کہا۔ ''اب دیوار چھوڑ دو۔'' شہلا نے دیوار چھوڑ دی۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی عمران نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور اسے ساتھ لیے ہوئے دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شہلا اس صورتِ حال پر بری طرح ہنسنے لگی۔

''دانت بعد میں نکالنا، پہلے میرے اوپر سے اٹھو۔'' عمران نے کہا۔

شہلا جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' عمران نے کہا اور دیوار کو دیکھ کر اندازہ لگانے لگا کہ اسپتال کا مین گیٹ کس طرف ہوگا۔ اچانک اسے دور سے روشنی کی لکیر نظر آئی جو فوراً ہی دوسری سمت میں مڑ گئی۔ عمران کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مین گیٹ سڑک کی جانب ہی تھا اور جہاں سے روشنی کی لکیر اس کی طرف آئی تھی اس طرف مین روڈ تھی۔ انہیں اس کی مخالف سمت میں چلنا تھا۔ عمران نے بھی اسی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس سمت میں روانہ ہو گیا جو سڑک کے مخالف تھی۔

کافی دیر تک چلنے کے باوجود وہ کسی سڑک تک نہیں پہنچے۔ عمران کا اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی کسی دوسری سڑک تک پہنچ جائیں گے۔

''ہم راستہ بھٹک کر کہاں آ نکلے ہیں؟'' عمران منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر شہلا سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارے پاس سیل فون ہے؟''

''بہت دیر میں خیال آیا۔'' شہلا ہنس کر بولی۔ ''میرے پاس سیل فون تو ہے لیکن سوئمنگ پول کے پانی کی وجہ سے وہ اب ناکارہ ہو گیا ہے۔ دوسری جیب میں میرا والٹ بھی ہے۔ اس کے بھی تمام کاغذات بھیگ چکے ہوں گے۔''

''اس میں کچھ نوٹ بھی ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ پیسے بھی ہوں گے لیکن......''

''نوٹ پانی میں بھیگنے کے بعد بھی ناکارہ نہیں ہوتے۔'' عمران نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اب اور کتنا چلنا پڑے گا؟'' شہلا نے کہا۔ ''چلتے چلتے میرے تو پیروں میں چھالے پڑ چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چلتے ہوئے تین گھنٹے تو ہو چکے ہوں گے۔''

''ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''لیکن چلتے رہنا ہماری مجبوری ہے۔ میرے بھی تو پاؤں بری طرح زخمی ہیں۔''

''ہاں، مجھے یاد آیا۔'' شہلا نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا دوپٹا پھاڑ کر دیتی ہوں۔ اسے پیروں پر لپیٹ لو۔''

''دوپٹے کی زیادہ ضرورت اس وقت تمہیں ہوگی۔ خاردار جھاڑیوں اور درخت کی شاخوں میں الجھ کر تمہاری قمیص بری طرح پھٹ چکی ہوگی۔''

پھر وہ گرتے پڑتے چلتے ہی رہے۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ کافی دیر چلنے کے بعد شہلا ایک جگہ زمین پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''عمران! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔''

''فضول گفتگو سے پرہیز کرو۔'' عمران نے کہا۔ ''فالتو بکواس کرنے سے بھی انرجی ضائع ہوتی ہے۔ ایسا کرو، تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کی بات پر تھکن کے باوجود شہلا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''تم اپنے تھکے ہوئے جسم اور زخمی پیروں کے ساتھ میرا بوجھ کہاں تک ڈھو سکو گے؟''

"تو پھر چلنے کی کوشش کرو۔ ہم اس ویرانے میں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔"

شہلا، عمران کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو۔" اس نے کہا اور نڈھال قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اب شہلا محض اپنی قوتِ ارادی کے بل پر چل رہی تھی۔ خود عمران کا بھی یہی حال تھا۔

مزید کچھ دور چلنے کے بعد شہلا پھر بیٹھ گئی۔ اس نے منہ سے کچھ بھی نہ کہا، بس ہانپتے ہوئے عمران کو دیکھتی رہی پھر عمران بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

انجام کی پروا کیے بغیر عمران نے ٹانگیں پھیلا دیں اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

پھر شاید تھکن کی وجہ سے غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ یوں بھی اتنے بڑے حادثے سے گزرنے کے بعد شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک کسی گاڑی کی آواز سے عمران کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جھنجوڑ کر شہلا کو جگایا اور اسے گھسیٹ کر درخت کے تنے کی اوٹ میں ہوگیا پھر اچانک گاڑی کے انجن کی آواز معدوم ہوگئی۔ شاید مین روڈ نزدیک ہی تھی پھر اسے اپنی حماقت پر ہنسی آگئی۔ اس درخت کا تنا اتنا موٹا نہیں تھا کہ وہ دونوں اس کے پیچھے چھپ سکتے۔ اگر گاڑی والے اس طرف آتے تو وہ ان دونوں کو ضرور دیکھ لیتے، بس یہ اس کا اضطراری عمل تھا۔

شہلا بھی بیدار ہوگئی تھی لیکن تھکن کے باعث آنکھیں موندے پڑی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ رات کا اندھیرا پھیکے اجالے میں تبدیل ہونے لگا۔ گویا وہ دونوں ساری رات چلتے رہے تھے۔ اب نہ جانے وہ کراچی کے کس علاقے میں تھے۔ عمران کو تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ کراچی میں ہیں بھی یا نہیں۔

"شہلا!" عمران نے کہا۔ "اٹھو، صبح ہو رہی ہے۔"

"مجھے سونے دو عمران۔" شہلا نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اٹھو۔" عمران نے اسے جھنجوڑ دیا۔

شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ صبح کاذب کے اجالے میں عمران کی نظر شہلا پر پڑی تو وہ بری طرح ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟" شہلا نے کہا۔ اس نے عادت کے مطابق منہ بھی بنایا ہوگا۔ اس وقت شہلا کا حلیہ ایسا تھا کہ کمزور دل کا کوئی آدمی اس وقت اسے دیکھ لیتا تو چیخ مار کے بھاگ جاتا۔ اس کے بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔

اچانک شہلا بھی اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی حالت شہلا سے مختلف نہیں ہوگی۔ وہ بھی بری طرح مٹی میں اٹا ہوگا۔ اپنی حالت کا تصور کر کے عمران بھی ہنسنے لگا۔

"بہت آرام کرلیا۔" عمران نے شہلا سے کہا۔ "اب اٹھ جاؤ۔"

شہلا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کانوں میں پھر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی، چند منٹ بعد دوسری آواز آئی اور معدوم ہوگئی۔

"مین روڈ یہاں سے نزدیک ہی ہے شہلا۔" عمران نے کہا۔ "بس اب زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔"

ہمت کر کے شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں لڑکھڑاتے ہوئے اس سمت میں چل دیے جس طرف سے گاڑیوں کے انجنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

چلتے چلتے عمران نے سوچا، آخر میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لیے کیوں گھوم رہا ہوں؟ کیا رشتہ ہے میرا اس سے؟ اس کے دماغ نے جواب دیا، انسانیت کا رشتہ، ہر رشتے سے بڑا ہوتا ہے۔ نہیں...... اس نے اپنے دماغ کی بات مسترد کر دی۔ انسانیت کا رشتہ نہیں ہوسکتا، اس لڑکی نے تو تمہاری جان لینے کی کوشش کی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو عمران؟" شہلا نے کہا۔ "وہ دیکھو سامنے مین روڈ ہے لیکن مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ یہ کراچی کی کون سی سڑک ہے؟"

عمران نے غور سے اس سڑک کو دیکھا۔ عجیب پتھریلا سا علاقہ تھا۔

"ہمیں سڑک پر لگے ہوئے کسی سنگ میل سے معلوم ہوسکے گا کہ ہم کہاں ہیں۔" عمران نے کہا۔

"مجھ میں اب مزید چلنے کی سکت نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔

"اچھا، تم یہاں بیٹھو، میں معلوم کر کے آتا ہوں۔" عمران نے کہا۔

"چلو، میں بھی چلتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "تم جاؤ گے اور سنگ میل دیکھ کر پھر یہاں آؤ گے اس سے بہتر ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں۔"

وہ دونوں سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ گاڑیاں

زناٹے سے ان کے پاس سے گزرتی رہیں۔ اسی وقت کچھ فاصلے پر عمران کو سنگِ میل نظر آ گیا۔ شہلا نے بھی سنگ میل دیکھ لیا تھا۔ ان دونوں میں زندگی کی گویا ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ تیز رفتاری سے سنگِ میل کی طرف بڑھنے لگے۔ سنگ میل دیکھ کر وہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔ اس پر لکھا تھا۔

''زیارت تین سو بیس کلومیٹر۔''

اچانک شہلا نے کہا۔ ''ایسا کرتے ہیں، کوئٹہ چلتے ہیں۔''

''کوئٹہ میں کیا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''کوئٹہ میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ وہ میرے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی پھر بہت کم عمری میں اس کی شادی ہوگئی اور وہ کوئٹہ چلی گئی۔''

''اس وقت کراچی تو میں بھی نہیں جانا چاہتا۔'' عمران نے کہا۔ ''لیکن پہلے یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ تمہاری وہ دوست کس حد تک قابلِ اعتبار ہے؟''

''وہ بہت سنجیدہ اور کم گو تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح ادھر کی بات، ادھر نہیں کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں۔''

''اس کا فیصلہ کوئٹہ پہنچنے کے بعد ہی کروں گا۔'' عمران نے کہا۔ ''ممکن ہے وہاں پہنچتے پہنچتے میرے ذہن میں کسی اور کا خیال آ جائے۔''

''اس وقت تو کوئی بس والا بھی ہمیں مشکل ہی سے بٹھائے گا۔'' شہلا نے کہا۔

اچانک انہیں دور سے ایک بس آتی دکھائی دی۔

''تمہارے پاس پیسے کتنے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

شہلا نے اپنی جیب سے والٹ نکال کر نوٹ نکالے اور بولی۔ ''تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے ہیں۔''

''فوری طور پر ان سے کام چل سکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

بس اب نزدیک آ چکی تھی۔ عمران اسے دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ بس کی رفتار کم ہوئی، پھر وہ عمران سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی۔

کنڈیکٹر نے دروازے سے سر باہر نکالا اور بولا۔ ''کدھر جائے گا؟''

''کوئٹہ۔'' عمران نے کہا۔

''ٹکٹ کا پیسا ہے؟'' کنڈیکٹر نے اس کا حلیہ دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔ پیسا ہے ہمارے پاس۔'' عمران نے کہا۔

کنڈیکٹر نے انہیں بس میں چڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں لپک کر بس میں چڑھ گئے۔ بس کے مسافروں نے ان دونوں کو ناگواری سے دیکھا۔ مسافروں کی پروا کیے بغیر عمران دو افراد کی ایک خالی سیٹ دیکھ کر بیٹھ گیا۔

بس کی آرام دہ نشست پر بیٹھ کر عمران کو ایسا لگا جیسے برسوں تک چلتا رہا ہو ..... ان آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر وہ دونوں ہی سو گئے۔

بس زیارت پر رکی تو عمران کی آنکھ کھلی۔ بس کے تقریباً سبھی مسافر نیچے اتر چکے تھے۔ شہلا کھڑکی میں سے کسی چائے والے سے بات کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چائے والا پانی کا میلا سا جگ اور گلاس، دو کپ چائے اور کیک پیس لے کر واپس آ گیا۔ کیک پیس کھاتے ہوئے عمران کو احساس ہوا کہ وہ نہ جانے کب سے بھوکا ہے۔ پیٹ پوجا کے بعد بس دوبارہ چلی تو وہ دونوں ایک مرتبہ پھر اونگھنے لگے۔

کوئٹہ پہنچ کر عمران کو مشکل کا احساس ہوا۔ اکتوبر کا مہینا تھا اس لیے کراچی کا موسم اتنا سرد نہیں تھا۔

عمران بس اسٹاپ سے نکل کر کچھ آگے بڑھا تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی پرانے جوتے لیے بیٹھا تھا۔ عمران اسے دیکھ کر رک گیا اور اپنے لیے ..... آرام دہ جوتے لے لیے۔ وہ جوتے پہن ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور شخص دکھائی دیا۔ اس کے کندھے پر بہت سے استعمال شدہ شلوار سوٹ پڑے ہوئے تھے۔ عمران نے اشارے سے اسے بلایا اور اپنے سائز کا ایک شلوار سوٹ لے لیا۔

''میری تو شاپنگ ہوگئی۔'' عمران نے کہا۔ ''اب تم بھی ریڈی میڈ کپڑوں کی کسی دکان سے اپنے لیے سستا سا کوئی سوٹ خرید لو۔''

وہ دکان کی تلاش میں کچھ آگے بڑھے تو انہیں فٹ پاتھ کے کنارے بہت سے زنانہ سوٹ لٹکے ہوئے نظر آئے۔ شہلا نے سستا سا ایک سوٹ خرید لیا۔

''سارے پیسے تو اس شاپنگ میں خرچ ہوگئے۔ اب ہم کیا کریں گے؟''

''فکر مت کرو۔'' عمران نے کہا۔ ''پہلے ریلوے اسٹیشن چل کر اپنے کپڑے بدل لیں، پھر سوچیں گے۔'' ریلوے اسٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ پہلے شہلا باتھ روم میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ دیر بعد نہا کر نکلی تو عمران کو پہلے سے زیادہ نکھری نکھری اور خوب صورت نظر آئی۔ پھر اپنے کپڑے لے کر عمران بھی باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ساری تھکن پانی کے ساتھ بہہ گئی ہو۔

وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو شہلا نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔ ابھی تک کوئی دوسرا مسافر اس ویٹنگ روم میں نہیں آیا تھا۔ عمران نے اپنے اور شہلا کے کپڑوں کا بنڈل بنایا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔ عمران خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ باہر نکل کر اسے ٹیلی فون بوتھ کی تلاش تھی پھر شہلا کپڑوں کا بنڈل لے کر کھڑی ہو گئی۔ عمران ایک میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔

میڈیکل اسٹور کے مالک نے اسے ٹیلی فون استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ عمران نے کوئٹہ میں موجود اپنے چینل کے ایک بندے.... عظیم کا نمبر ملایا تو دوسری ہی گھنٹی پر عظیم نے اس کی کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو عظیم!'' عمران نے کہا۔ ''میں عمران بول رہا ہوں۔''

''ارے آپ کہاں ہیں سر! آپ......''

''زیادہ جوش میں مت آؤ اور میری بات غور سے سنو۔''

پھر اس نے مختصراً اپنا موجودہ پتا بتایا اور فوراً پہنچنے کا کہا۔

اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر کوڑے کا بڑا سا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ عمران نے کپڑوں کا بنڈل لیا اور ٹہلتا ہوا کوڑے کے ڈرم کی طرف بڑھ گیا پھر اس نے کپڑوں کا بنڈل اس میں پھینک دیا۔ کافی انتظار کے بعد عظیم وہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ عمران اور شہلا گاڑی میں بیٹھ گئے تو عظیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے عمران سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ عظیم کا گھر نزدیک ہی تھا۔ گھر کیا خاصا بڑا بنگلا تھا۔ عمران جانتا تھا کہ عظیم کے والد ڈرائی فروٹ کے بہت بڑے ایکسپورٹر تھے۔ عظیم جاب تو محض شوق میں کر رہا تھا ورنہ وہ اپنے والد کا بزنس سنبھالتا تھا۔ اس نے عمران کے لیے گیسٹ ہاؤس کھلوا دیا۔

''اب ذرا کچھ کھانے کو بھی لے آؤ۔'' عمران نے کہا۔

خوب ڈٹ کر کھانا کھانے کے بعد عمران نے گرما گرم کافی کا ایک کپ پیا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ جی اٹھا ہو۔

''ہاں، اب بتایئے۔'' عظیم نے کہا۔

عمران نے مختصر طور پر اسے سب کچھ بتا دیا۔ کچھ ضروری باتیں اس نے عظیم کو بھی نہیں بتائیں۔

''آپ اطمینان رکھیں سر۔'' عظیم نے کہا۔ ''میں اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتاؤں گا کہ عمران صاحب یہاں مقیم ہیں اور اخراجات کی طرف سے بھی بے فکر ہو جائیں میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تم سے پیسے لے لوں اور کراچی جا کر تمہیں بھیج دوں۔''

''نو پرابلم سر۔'' عظیم نے ہنس کر کہا۔

''فوری طور پر تو مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے۔ اس کی سم بھی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' عظیم نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اس دوران میں شہلا کو ان دونوں نے نظرانداز کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عظیم واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ عمران کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ''سر! یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔ مزید ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔''

''شکریہ عظیم!'' عمران نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس رقم سے میرا کام چل جائے گا۔''

پھر اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سیل فون نکال کر عمران کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ''اس کا سم نمبر میں نے اس میں محفوظ کر دیا ہے، مائی نمبر کے نام سے۔''

''تھینک یو ویری مچ بوائے۔''

''مجھے شرمندہ تو مت کریں۔'' عظیم نے کہا اور بولا۔ ''میری گاڑی کی چابی میز پر رکھی ہے۔ آپ جب تک یہاں ہیں، استعمال کریں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے میں ٹی وی بھی موجود تھا۔ عمران نے شہلا سے کہا۔ ''ذرا ٹی وی آن کرو۔ معلوم تو ہو شہر میں کیا ہو رہا ہے؟''

شہلا نے ٹی وی آن کر دیا۔ اس میں اس وقت اشتہارات دکھائے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد خبروں کا بلیٹن شروع ہو گیا۔ پہلی ہی خبر چونکا دینے والی تھی۔ ''پولیس نے پچھلے ہفتے میں جس دہشت گرد کو گرفتار کیا تھا وہ پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا ہے۔ ملزم کئی بم دھماکوں اور دہشت گردی کی بڑی بڑی وارداتوں کا ماسٹر مائنڈ ہے۔ پولیس نے فی الحال اس کا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے۔''

عمران نے شہلا سے ریموٹ لے کر اپ ڈیٹ لگا لیا۔ وہاں سے بھی خبریں آ رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''ملزم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور ایک بڑے ادارے میں معقول عہدے پر فائز بھی ہے۔ کچھ دیر بعد ڈی آئی جی کرائم اس کیس کے سلسلے میں میڈیا سے بات چیت کریں گے۔''

''میرا فوری طور پر کراچی پہنچنا بہت ضروری ہے شہلا! ورنہ یہ حرام زادے دہشت گردی کی تمام وارداتوں کو مجھ پر تھوپ دیں گے۔''

''ابھی تمہارا کراچی جانا مناسب نہیں ہے۔'' شہلا نے کہا۔ ''پھر پولیس نے ابھی تک تمہارا نام اور ادارے کا

نام ظاہر نہیں کیا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' عمران نے کہا۔

''مجھے نوشی کی فکر بھی ہے۔ اس کا نہ جانے کیا حال ہوگا؟''

''کون نوشی؟'' شہلا نے پوچھا۔

''نوشی وہ لڑکی ہے جسے پولیس نے اسپتال سے گرفتار کیا تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آگئی تھی۔''

''اچھا وہ لڑکی۔'' شہلا نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تعلق اگر پریس سے تھا تو وہ اپنے چینل کی پوری ٹیم کے ساتھ وہاں آتی۔ پھر پولیس کی جرأت نہیں ہوتی اسے گرفتار کرنے کی۔''

''جب تک وہ ٹیم کو لے کر وہاں پہنچتی، وہ لوگ مجھے کہیں اور منتقل کردیتے۔ پولیس کے مخبر تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، اپ ڈیٹ میں بھی ضرور ہوں گے۔''

''تو کیا وہ لڑکی بھی تمہاری کولیگ ہے؟'' شہلا نے پوچھا۔

''وہ میری کولیگ بھی ہے اور میری ہونے والی شریک حیات بھی ہے۔''

عمران نے دیکھا، شہلا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔ پھر ڈی آئی جی کرائمز کی پریس کانفرنس شروع ہوگئی۔ عمران نے والیوم کچھ بڑھا دیا۔

''سر! پولیس نے اس خوفناک دہشت گرد کو کہاں سے گرفتار کیا تھا؟'' ایک کثیر الاشاعت ماہنامے کے کرائم رپورٹر نے سوال کیا۔ ''کیا اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی؟''

''ہم نے اسے ایک انتہائی حساس علاقے سے گرفتار کیا تھا۔ اسے گرفتار کرتے ہوئے پولیس کے دو جوان بری طرح زخمی ہوگئے ہیں۔'' ڈی آئی جی نے بہت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''آپ نے اب تک ملزم کا نام بھی نہیں بتایا۔'' اپ ڈیٹ کے کرائم رپورٹر نے سوال کیا۔

''ابھی اس کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہاں، ہماری ایک ذہین لیڈی انسپکٹر شہلا اس تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی طرف سے اطلاع ملتے ہی ہم اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔''

عمران کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر دس کلووزنی ہتھوڑا رسید کردیا ہو۔ عمران نے گھوم کر شہلا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اچھا تو تم نرس نہیں بلکہ انسپکٹر شہلا ہو۔ ان لوگوں نے تمہیں میری دیکھ بھال کے لیے نہیں بلکہ میری نگرانی کے لیے رکھا تھا۔''

سچ بیانی

آپریشن کے لیے بے ہوشی کا ٹیکا لگواتے سے پہلے ڈاکٹر نے مریضہ سے پوچھا۔ ''آپ کی عمر کیا ہے؟''

مریضہ نے کہا ''اٹھائیس سال۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''محترمہ! آپ کو یقین ہے نا آپ کی عمر یہی ہے، کیونکہ میں نے آپ کی عمر کے حساب سے آپ کی بے ہوشی کی دوا مقرر کرنی ہے۔''

مریضہ نے کہا ''تیس سال۔''

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ''آپ دیکھ لیجیے دوا کی کم یا زیادہ مقدار سے یا تو مریض آپریشن کے دوران ہی ہوش میں آجاتا ہے یا پھر کومے میں بھی جاسکتا ہے۔''

مریضہ نے کہا ''اڑتیس سال۔''

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ''اگر آپ عمر غلط بتائیں گی تو دوا کی کم و بیش مقدار کا اثر سیدھا گردوں پر پڑتا ہے اور وہ فیل بھی ہوسکتے ہیں۔''

مریضہ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''انچاس سال...... اب بھلے آپریشن تھیٹر سے میری لاش ہی کیوں نہ باہر نکلے، میں اس سے زیادہ عمر بالکل بھی نہیں بڑھاؤں گی۔''

مرسلہ: محمد امجد ریاض، اقبال نگر چیچہ وطنی

کیڑے مکوڑے

''ویٹر! یہ میری چائے میں کیا تیر رہا ہے؟''

''سر! مجھ سے نہ پوچھیں۔ مجھے کیڑوں مکوڑوں کی زیادہ پہچان نہیں ہے۔''

سوپ

جناب! آپ کیوں اتنا شور مچا رہے ہیں؟ مجھے تو اس کافی میں کوئی خرابی نظر نہیں آرہی ہے۔

خرابی یہ ہے جسے آپ کافی کہہ رہے ہیں، آپ کا ویٹر اسے سوپ کہہ کر میری میز پر رکھ گیا ہے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

فاصلے

فاصلے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور تو ضرور کردیتے ہیں لیکن اچھے انسان ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ دلوں میں بھی، لفظوں میں بھی اور دعاؤں میں بھی۔

مرسلہ: سجاد اختر رانا، پاک پتن شریف

”مجھ پر شبہ مت کرو عمران۔“ شہلا نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے نگرانی کے لیے ضرور رکھا گیا تھا لیکن میں نے تمہارا بُرا نہیں چاہا۔“

”تمہیں کچھ کرنے کا موقع ہی کب ملا تھا؟“ عمران نے کہا۔

”میرے پاس بہت موقع تھے عمران صاحب!“ شہلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس نے شرٹ کے نیچے شاید کوئی شمیز وغیرہ پہن رکھی تھی۔ اس نے دوسری طرف رخ کر کے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اپنا سیل فون نکال لیا جو پولیتھین بیگ میں تھا۔ ”یہ سیل فون پانی میں بھیگا ہی نہیں تھا۔“ شہلا نے کہا۔ ”میں ہر وقت پولیس سے رابطہ کر سکتی تھی لیکن میں نے سیل فون ہی آف کر دیا۔“ اس نے سیل فون عمران کے سامنے پھینک دیا۔ ”اسے اچھی طرح چیک کر لو عمران۔“ شہلا کی آواز میں غصہ تھا۔ ”میں تو اسی وقت اپنے ڈیپارٹمنٹ سے متنفر ہو گئی تھی جب انہوں نے میگا فون پر یہ کہا تھا کہ ہمارے لیے اس نرس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کے برعکس مجھے تم میں انسانیت نظر آئی تھی۔ تم چاہتے تو مجھے وہیں پھینک کر آگے بڑھ جاتے، میری وجہ سے تم خود مشکل میں پڑ گئے تھے۔ تم چاہتے تو مجھے اس وقت چھوڑ سکتے تھے جب ہم نے باؤنڈری وال پھلانگ لی تھی۔“ شہلا بری طرح رونے لگی۔

”اچھا، یہ آنسو بہانا بند کرو شہلا بلکہ انسپکٹر شہلا۔“ عمران نے ہنس کر کہا۔ ”اب مجھے کچھ سوچنے دو۔“

شہلا اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”اب تم ایک کام کرو۔“ عمران نے کہا۔ ”تم پولیس کے پاس واپس چلی جاؤ اور ان سے یہ......“

”نہیں عمران!“ شہلا نے کہا۔ ”اب میں ان لوگوں میں واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ لوگ اب مجھ پر اعتبار نہیں کریں گے۔“

”اچھا، تم اپنے سیل فون سے اس انسپکٹر کا نمبر ملاؤ جو اسپتال میں میرے سر پر مسلط تھا۔ اس سے کہنا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ عمران مجھے مار دے گا۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔“

شہلا نے سیل فون پولیتھین بیگ سے نکالا، اسے آن کیا اور انسپکٹر کا نمبر ملانے لگی۔ عمران نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ٹی وی کی آواز بالکل بند کر دی۔

”ہیلو!“ شہلا نے کہا۔ ”میں انسپکٹر شہلا بول رہی ہوں۔“ اس کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”تم کہاں ہو شہلا؟“ عمران کو اس منحوس انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ شہلا نے فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

”میں عمران کے قبضے میں ہوں سر۔“ شہلا نے کہا۔ ”اب تک تو یہ مجھے ایک نرس سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں انسپکٹر شہلا ہوں۔ عمران غصے میں پاگل ہو رہا ہے سر! وہ کسی بھی وقت مجھے مار دے گا۔“

عمران نے شہلا کو اشارہ کیا کہ وہ ظاہر کرے جیسے عمران آ گیا ہے۔ ”سر! مجھے بچا لیں پلیز...... وہ...... وہ آ...... گیا۔“ اچانک اس نے سیل فون عمران کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کس سے بات کر رہی ہو شہلا؟“ وہ سیل فون چہرے کے نزدیک لا کر بولا۔ ”ہیلو، کون؟“

”میں انسپکٹر شاکر ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”تم نے اپنی اس انسپکٹر کو میرے پیچھے لگایا تھا نا، یہ تو بہت ہی بودی نکلی۔ اس نے تمہارے ایس ایس پی کا اور تمہارا پورا کچا چٹھا کھول دیا۔ میں نے اس کا بیان ویڈیو میں محفوظ کر لیا ہے۔ کل اس کی لاش ملے گی اور اس کے ساتھ ہی کسی ٹی وی چینل پر یہ ویڈیو چلے گی تو سوچو کیا ہوگا؟“

”اس الو کی پٹھی کی بات کا کون یقین کرے گا؟“ انسپکٹر نے کہا۔

”اس نے ایسے ایسے ثبوت پیش کیے ہیں کہ تمہاری اور ایس ایس پی کی ملازمت تو خیر جائے گی ہی، سزا الگ ہوگی۔ میں نے اس سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ اب تم اپنی اس ہونہار انسپکٹر کو بچا سکتے ہو تو بچا لو۔“

”ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”ہمارے خلاف بات کر کے وہ کسی رعایت کی حق دار نہیں رہی۔ میری طرف سے تم ابھی اسے ختم کر دو۔ اگر تم نے ختم نہ کیا تو پھر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی ہمارے خلاف زبان کھولنے کی؟“

”ٹھیک ہے، پھر تم اور ایس ایس پی صاحب دونوں اپنے انجام کا انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر عمران نے لائن کاٹ دی۔

اسی وقت عظیم کا ایک ملازم دستک دے کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔

”ذرا عظیم صاحب کو بھیجو۔“ عمران نے کہا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

تھوڑی دیر بعد عظیم کمرے میں داخل ہوا۔

”عظیم!“ عمران نے کہا۔ ”ہم آج ہی کراچی جانا چاہتے ہیں۔ ذرا انکوائری سے معلوم کرو کہ کراچی کی کوئی

فلائٹ ہے یا نہیں؟''

عظیم نے معلومات کے بعد اگلی صبح کی فلائٹ میں دو سیٹیں بک کرادیں۔

عظیم کے جانے کے بعد شہلا نے پوچھا۔''تم کیا اسی حالت میں کراچی جاؤ گے؟''

''کیا ہوا میری حالت کو؟'' عمران نے کہا۔ اس کے جسم پر اب بھی وہی سوٹ تھا جو اس نے بس اسٹینڈ کے نزدیک ایک شخص سے خریدا تھا۔

''اگر تم کہتی ہو تو میں دوسرے کپڑے لے لیتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ شاپنگ کر کے لوٹ رہے تھے کہ عمران کی نظر دو نوجوانوں پر پڑی۔ وہ مختلف دکانوں میں جھانک کر کسی کو تلاش کر رہے تھے۔

عمران کی نظروں کے تعاقب میں شہلا نے نظر دوڑائی تو چونک اٹھی اور بولی۔''عمران! یہاں سے نکلو۔ یہاں خطرہ ہے۔''

''کیا کوئی بھوت دیکھ لیا؟'' عمران نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بھوت ہی سمجھو۔'' شہلا نے کہا۔''پولیس کے دو آدمی مجھے یہاں منڈلاتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ ایس ایس پی کو یقیناً یہ علم ہو گیا ہے کہ ہم کوئٹہ میں ہیں۔ میں ان دونوں کو پہچانتی ہوں۔'' اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

ان کا حلیہ اور حرکات وسکنات چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھیں کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے۔

''یہاں اور بھی لوگ ہوں گے۔'' شہلا نے کہا۔

''لیکن یہ یہاں تک پہنچے کیسے؟''

''یہ یہاں پہنچے نہیں ہیں بلکہ پہلے سے موجود ہوں گے۔'' عمران نے کہا۔''ان میں سے زیادہ تر لوگ تمہیں پہچانتے ہوں گے اس لیے میں تمہارے لیے ایک برقع بھی خرید لیتا ہوں۔''

''شاید انسپکٹر نے تمہاری کال ٹریس کر لی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''اب ''شاید'' کی گنجائش نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔''اسے علم غیب نہیں ہے۔ اب اپنا سیل فون آف کر دو۔ میں تمہارے لیے برقع لے کر آتا ہوں۔''

''سیل فون تو میں نے اسی وقت آف کر دیا تھا۔'' شہلا نے کہا اور محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔

☆☆☆

ایس ایس پی اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے۔ اس کے سامنے انسپکٹر شاکر بیٹھا تھا۔ ایس ایس پی نے ابھی کچھ دیر پہلے اسے جھاڑ پلائی تھی اس لیے انسپکٹر کے چہرے پر ناراضی کے تاثرات تھے۔

''اس لڑکی نوشین کو چھوڑ دو۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

''چھوڑ دوں؟'' انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔''وہ یہاں سے باہر نکلتے ہی میڈیا کے سامنے سب کچھ بک دے گی۔''

''اس کے پاس کیا ثبوت ہے ہمارے خلاف؟'' ایس ایس پی نے کہا۔''کیا وہ ثابت کر سکتی ہے کہ عمران ہماری قید میں تھا یا ہم نے اس لڑکی کو قید کیا تھا؟''

''لیکن سر! اسے چھوڑنا تو......''

''کبھی اپنی عقل سے بھی کام لیا کرو۔'' ایس ایس پی نے کہا۔''اسے چھوڑ دو لیکن اس کی نگرانی کرواؤ۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ تمہارے آدمیوں کی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ عمران آج یا کل اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ وہ عمران سے ملنے جائے گی یا عمران خود اس کے پاس آئے گا اور ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔'' پھر ایس ایس پی کچھ توقف کے بعد بولا۔''اس لڑکی کا لینڈ لائن فون اور سیل فون دونوں آبزرویشن پر لے لو۔''

''لیکن سر! عمران اور انسپکٹر شہلا تو کوئٹہ میں ہیں۔'' شاکر نے کہا۔

''وہ کوئٹہ میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔'' ایس ایس پی نے درشت لہجے میں کہا۔

''ویسے ہمارے آدمی ائرپورٹ اور ٹرین کے علاوہ روڈ کی بھی کڑی نگرانی کر رہے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔''میں نوشین کا بندوبست کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

نوشین کی حالت ابتر تھی۔ ایک لیڈی کانسٹیبل اس کے پاس پہنچی اور بولی۔''اٹھو، تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔''

نوشین کو دو سپاہیوں کی نگرانی میں انسپکٹر کے کمرے میں لایا گیا۔

''تشریف رکھیے مس نوشین۔'' خلاف توقع انسپکٹر کے نرم رویے پر نوشین کو حیرت ہوئی۔''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ جرنلسٹ ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ محض ایک غلط فہمی کی بنا پر آپ کو زحمت اٹھانی پڑی۔ آپ نے بھی اپنی شناخت ظاہر نہیں کی۔''

نوشین چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر انسپکٹر کو دیکھتی رہی پھر بولی۔''یہ الہام آپ کو کب ہوا کہ میں جرنلسٹ ہوں؟''

بہ آسانی شکست دے سکیں گے۔ ہم پہاڑوں میں چھپ کر بیٹھ جائیں اور پھر اچانک اس پر ٹوٹ پڑیں۔‘‘ لیکن سبکتگین کا مشورہ اس کے برعکس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ لڑائی اُس کے دارالحکومت کے قریب ہو تاکہ اس کے کمزور پڑتے ہی ہم اس کے دارالحکومت لاہور پر قبضہ کرلیں۔

’’ہندو اپنے دارالحکومت کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ بھاگنا بھی چاہیں تو نہیں بھاگیں گے۔‘‘

’’میں بھی ایک فیصلہ کن جنگ کا حامی ہوں۔ میں انہیں موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ بھاگ کر لاہور کا رخ کریں۔ چھوٹے موٹے حملے تو میں بھی بہت کرچکا۔ اب آخری جنگ لڑنا چاہتا ہوں تاکہ اسلامی پرچم غزنی سے لاہور تک لہرانے لگے۔‘‘

مسلمانوں کا لشکر پہاڑوں اور میدانوں کو عبور کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اس لشکر کی خاص بات یہ تھی کہ اس جہاد میں اس کا کم عمر بیٹا محمود شوقِ جہاد میں اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل چودہ پندرہ سال ہوگی لیکن وہ جنگی تربیت سے آشنا ہوچکا تھا۔ فطری دلیری اس کی رگوں میں شامل تھی۔ اسی لیے امراء کی مخالفت کے باوجود سبکتگین اس خطرناک معرکے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

یہ لشکر سفر کرتا ہوا ایک ایسے مقام تک پہنچ گیا جس کے تین اطراف بلند وبالا پہاڑ تھے اور ایک جانب میلوں لمبا میدان پھیلا ہوا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اگر ہم اور آگے چلتے رہیں تو ملتان کی سرحد تک پہنچ جائیں گے جہاں سے لاہور کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں۔ دراصل وہ پشاور اور کابل کے درمیان کسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ مزید آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ تجربہ کار سبکتگین نے مخالف سمت سے آنے والی ہوا میں کچھ سونگھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے لشکر کو رکنے کا مشورہ دیا۔ اگلی صف کے قدم رکے تو پیچھے آنے والا لشکر خودبخود رک گیا۔ اس نے اپنے چند سرداروں کو اپنے پاس بلایا۔

’’میرا تجربہ کہتا ہے کہ دشمن ہم سے بہت قریب ہے۔ کسی کو بھیج کر معلوم کرو کہ دشمن کتنے فاصلے پر ہے اور کس حالت میں ہے۔ سفر کررہا ہے یا پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔‘‘

جوشیلے نوجوانوں کی کیا کمی تھی۔ ایک نوجوان اپنا گھوڑا لے کر آگے بڑھا۔ ’’امیر معظم! یہ کام میرے سپرد کیجیے۔‘‘ اس نوجوان نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک درّے میں غائب ہوگیا۔

’’خدا جانے اس نے کیا سمجھا اور کس طرف چل دیا۔‘‘ سبکتگین نے کہا۔ ’’اسے تو میدان کی طرف جانا چاہیے تھا۔ یہ اس درّے میں کیوں چلا گیا۔‘‘

اب دوپہر ہوگئی تھی۔ سورج کی کرنیں ترچھی ہوکر میدان میں پڑ رہی تھیں لیکن نوجوان سوار کی واپسی تک خیمے نصب نہیں کیے جاسکتے تھے۔

تیز دھوپ میں اس کا انتظار کیا جارہا تھا۔

خلافِ توقع وہ سوار بہت جلد اسی درّے کے ذریعے واپس آگیا۔ سب کو تعجب ہورہا تھا کہ وہ الٹے رخ سے گیا تھا اور پھر بھی اتنی جلدی واپس آگیا۔ سوار نے اس علم کی طرف دیکھا جس کے نیچے سبکتگین اور دوسرے امراء موجود تھے۔

’’کیا دیکھ کر آئے؟‘‘

’’دشمن زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہاں سے کوئی دو میل کے فاصلے پر اس نے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔‘‘

’’تم نے کتنی تعداد کا اندازہ لگایا؟‘‘

’’جے پال کا لشکر حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے تمام ہندوستان کے راجا اس کے ساتھ مل کر آگئے ہیں۔ ایک لاکھ سے کیا کم تعداد ہوگی۔‘‘

مسلمانوں نے اسی میدان میں خیمے لگالیے۔ طویل سفر کے بعد ضروری تھا کہ آرام کرلیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ جے پال آگے بڑھتا ہے یا وہیں رک کر مسلمانوں کا انتظار کرتا ہے۔

جے پال کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلمان قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب وہ یہ خواب نہیں دیکھ سکتا تھا کہ غزنی کے قریب پہنچ کر جنگ کا آغاز کرے۔ اس نے لشکر میں اعلان کرادیا کہ کل صبح پوجا کے بعد فوج کے دستے آگے بڑھیں گے اور مناسب فاصلے پر پہنچ کر صفیں ترتیب دے لی جائیں گی۔

مسلمانوں نے ابھی ایسا کوئی اعلان نہیں کیا تھا۔

سبکتگین کے خیمے سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس کا بیٹا محمود (محمود غزنوی) ابھی ابھی اس کے پاس آکر بیٹھا تھا۔ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، باپ کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

’’بابا حضور! ہمارا لشکر راجا کے مقابلے میں بہت کم ہے۔‘‘

’’جب ہم جنگ شروع کریں گے تو دشمن کا لشکر ہماری تعداد سے بھی کم رہ جائے گا۔‘‘

’’بابا حضور! دشمن کو بھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم بہادر ہیں تو دوسری طرف راجپوت ہیں۔ ان کی بہادری بھی ضرب المثل ہے۔‘‘

"آپ کے کچھ ساتھی یہاں آئے تھے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "وہ آپ کی گمشدگی سے بہت پریشان تھے۔ اس وقت میں یہاں موجود نہیں تھا ورنہ اسی وقت آپ کو رہا کر دیتا۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔" انسپکٹر نے کہا اور بولا۔ "ٹھہریے، اپنا شولڈر بیگ تو لے لیں۔" انسپکٹر نے الماری سے نوشین کا شولڈر بیگ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

"دیکھ لیں، سب چیزیں موجود ہیں؟"

"میرا سیل فون!" نوشین نے کہا۔

"سوری، وہ تو میں بھول ہی گیا۔ آپ کا سیل فون، کلائی کی گھڑی اور انگوٹھی سب کچھ اس شاپر میں ہے۔" انسپکٹر نے اپنی دراز سے ایک شاپر نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

نوشین نے شاپر سے اپنا سیل فون نکالا اور بولی۔ "تو اب میں جاؤں؟"

"جی ہاں، اب آپ جا سکتی ہیں۔"

"شکریہ۔" نوشین نے کہا اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

عمران اس وقت شلوار قمیص، واسکٹ اور سواتی ٹوپی میں کسی سردار یا خان کا بیٹا لگ رہا تھا۔ وہ اس وقت کوئٹہ کے ائرپورٹ پر موجود تھا۔ وہ کوئٹہ کے دو ذی حیثیت افراد کے ساتھ تھا۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے عمران نے رے بین کا چشمہ بھی لگایا تھا اور شانے پر بڑی سی ایک شال تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتا ہوا ائرپورٹ کے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ شہلا اس سے علیحدہ برقع میں ملبوس تھی۔ اس نے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک خاتون تھیں جو اپنے لباس اور چال ڈھال سے کسی بڑے گھر کی بیگم لگ رہی تھیں۔ یہ سارا بندوبست عظیم نے کیا تھا۔ اس کے ایک دوست اپنی بیگم کے ساتھ کراچی جا رہے تھے۔ عظیم نے عمران کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا تھا تاکہ کوئی عمران پر زیادہ توجہ نہ دے۔ شہلا ان صاحب کی بیگم کے ساتھ تھی۔

وہ لوگ بغیر کسی پریشانی کے کراچی پہنچ گئے۔ کراچی ائرپورٹ پر بھی عمران بہت محتاط تھا۔ وہاں سے بھی عمران اور شہلا دو الگ الگ ٹیکسیوں میں روانہ ہوئے۔ فی الحال عمران اپنے ایک دوست ظہیر کے گھر جا رہا تھا۔ وہ ڈیفنس میں رہتا تھا۔ شہلا کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔

ظہیر کی مختصر سی فیملی میں بیوی اور دو بچے تھے۔ وہ عمران کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ پھر عمران نے چینل جوائن کر لیا اور ظہیر کو ایک غیر ملکی فضائی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔

ظہیر نے بہت پرتپاک انداز میں عمران کا استقبال کیا۔ ظہیر مسکرا کر بولا۔ "یار! کیا تو کراچی سے پشاور یا سوات شفٹ ہو گیا ہے؟"

"نہیں یار۔" عمران مسکرایا۔ "ہم جرنلسٹ کو بھی بعض اوقات بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ آج کل میں ایک بہت اہم کیس پر کام کر رہا ہوں اس لیے......"

"بس یار! اتنی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔" ظہیر نے ہنس کر کہا۔

"یہ وضاحت میں اس لیے کر رہا ہوں کہ تجھے بعد میں حیرت نہ ہو۔ ابھی میری ایک کولیگ شہلا بھی یہاں پہنچنے والی ہے۔ وہ بھی اپنی شناخت چھپانے کے لیے برقع میں ملبوس ہے۔"

"یار! میں نے تو سنا تھا کہ تو کہیں لاپتا ہو گیا ہے؟" ظہیر نے کہا۔

"میں لاپتا نہیں ہوا تھا بلکہ دو چار دن کے لیے منظرِ عام سے ہٹ گیا تھا۔"

"یار، میں تو تجھے زیادہ وقت دے نہیں پاؤں گا۔" ظہیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میری سالی کی شادی ہو رہی ہے اسی لیے سعدیہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اب مجھے بھی جانا ہے۔"

"کوئی پرابلم نہیں ہے یار۔" عمران نے کہا۔ "ہمیں سر چھپانے کو ایک ٹھکانا چاہیے تھا۔ تو اطمینان سے شادی میں شرکت کر۔"

"ویسے فریج اور ڈیپ فریزر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔" پھر وہ عمران سے بولا۔ "اب رات کو ملاقات ہوگی۔" وہ مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ابھی ظہیر اپنی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ ظہیر نے آگے بڑھ کر گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھولی تو اسے برقع میں ملبوس شہلا نظر آئی۔ ظہیر مسکرا کر بولا۔ "مس شہلا؟" شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں ظہیر ہوں، آیئے تشریف لایئے۔"

"شکریہ۔" شہلا نے اندر داخل ہو کر اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

"آیئے، میں آپ کو اندر تک چھوڑ دوں۔" ظہیر نے کہا اور شہلا کو لے کر اندر چلا گیا۔ شہلا کو عمران کے بیڈروم میں پہنچانے کے بعد ظہیر روانہ ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر شہلا نے یوں برقع اتارا

جیسے اب تک وہ اس برقع میں قید رہی ہو۔

''اب ہمیں وہ ڈی وی ڈی تلاش کرنا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''تلاش کرنا ہے؟'' شہلا حیرت سے بولی۔

''ہاں، وہ ڈی وی ڈی اگر میرے پاس ہوتی تو پولیس مجھ سے چھین چکی ہوتی۔'' عمران ہنس کر بولا۔ ''وہ ڈی وی ڈی بھاگتے ہوئے میں نے ایک دکان میں...... پھینک دی تھی۔ شاید وہ وہاں محفوظ ہوگی۔''

''کمال کرتے ہو تم......'' شہلا نے کہا۔ ''ڈی وی ڈی یوں بے پروائی سے پھینک کر تم اسے محفوظ سمجھ رہے ہو؟''

''اگر اسے نہ پھینکتا تو میرے دشمن مار کے مجھے پھینک چکے ہوتے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں ذرا صفدر سے بات کرلوں۔ اس سے یہاں کے بارے میں خاصی اپ ڈیٹس مل سکتی ہیں۔'' عمران نے ٹیلی فون سیٹ شہلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ذرا نمبر ملاؤ۔''

عمران نے اسے صفدر کا سیل نمبر بتایا۔ شہلا نے فوراً اس سے رابطہ کرلیا اور دوسری طرف کی آواز سن کر بولی۔

''ہیلو! کیا صفدر صاحب موجود ہیں؟''

''جی ہاں، میں بول رہا ہوں۔'' صفدر کی بھاری آواز کمرے میں گونجی کیونکہ عمران نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ''آپ کون بول رہی ہیں؟''

اچانک عمران نے کہا۔ ''صفدر! میرا نام مت لینا۔ میں تمہارا دوست بول رہا ہوں۔''

''تم...... تم...... کہاں ہو...... ہمیں تمہاری طرف سے بہت پریشانی تھی یار۔''

''میں خیریت سے ہوں۔ ہاں، تمہیں اپنی بھابی کی بھی کوئی خیر خبر ہے یا نہیں؟'' عمران نے نوشی کا نام لیے بغیر کہا۔

''بھابی خیریت سے ہیں۔ تین دن کی چھٹی گزار کر آج ہی آئی ہیں لیکن تم......''

''میں تفصیلی ملاقات میں سب کچھ بتادوں گا۔ اپنی بھابی سے کہنا کہ آج شام کو آٹھ بجے لالہ زار ریسٹورنٹ پہنچ جائیں۔ میں وہاں ان کا انتظار کروں گا۔''

''یار! میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ......''

''باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' عمران نے جلدی سے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

''تو گویا پولیس نے نوشی کو رہا کردیا ہے تو وہ اپنے گھر گئی ہوگی۔ اس کا لینڈ لائن نمبر دو۔ میں اس کے گھر پر ٹیلی فون کرتی ہوں۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''پولیس نے نوشی کو رہا کیسے کردیا؟''

''یہ بعد میں سوچیں گے۔'' عمران نے کہا۔ ''ابھی نوشی سے ملاقات ہوگی تو وہ خود ہی سب کچھ بتادے گی۔ چلو اٹھو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ لالہ زار پہنچنے میں بھی کافی وقت لگے گا۔ ہمارے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔''

شہلا باہر نکلنے لگی تو عمران نے کہا۔ ''اپنا برقع لے لو۔''

''اس برقع سے کب چھٹکارا ملے گا؟'' شہلا نے جھنجلا کر کہا۔

''جب مجھے وہ ڈی وی ڈی مل جائے گی۔'' عمران نے مسکرا کر کہا۔

شہلا نے برقع اوڑھ لیا۔ عمران ایک مرتبہ پھر اسی لباس اور گیٹ اپ میں تھا جس میں وہ کوئٹہ سے آیا تھا۔ ایک ٹیکسی ان کے سامنے سے گزری لیکن اس میں سواریاں موجود تھیں۔ وہ لوگ پیدل ہی مین روڈ کی طرف چل دیے۔

''عمران!'' شہلا نے چلتے چلتے کہا۔ ''یہاں تمہاری گاڑی بھی تو موجود ہوگی؟''

''تو کیا میں پہلے اپنی گاڑی لے کر آؤں؟''

کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی تو عمران نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹیکسی تھی۔ یہ غالباً وہی ٹیکسی تھی جو ابھی سواریاں لے کر گئی تھی۔

عمران اور شہلا ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔ عمران نے اسے یونیورسٹی روڈ چلنے کو کہا۔

''پانچ سو روپیہ ہوئے گا۔'' ڈرائیور نے کہا۔

عمران اس وقت ٹیکسی ڈرائیور سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ اس نے سر ہلا کر ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور شاید اس سے پہلے کار ریسنگ میں حصہ لیتا رہا تھا اور اپنی ٹیکسی کو بھی ریسنگ کار سمجھ کر دوڑا رہا تھا۔ اس کے باوجود انہیں لالہ زار پہنچتے پہنچتے آٹھ بج کر دس منٹ ہوچکے تھے۔

عمران اور شہلا ٹیکسی سے اترے تو موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکے بھی وہاں آکر رکے۔ ان دونوں نے شلوار سوٹ پہن رکھے تھے، بالوں میں دونوں ہی نے خوب تیل لگا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔

شہلا بہت غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر دو لڑکے مزید وہاں آئے۔ انہوں نے پہلے آنے والوں کو کوئی اشارہ کیا اور دونوں وہیں کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے۔ بعد میں آنے والوں کی پشت عمران اور شہلا کی طرف تھی۔

ان میں سے ایک لڑکا سیل فون پر بات کرتے ہوئے گھوما تو شہلا بری طرح چونک اٹھی اور بولی۔ ”عمران! یہاں خطرہ ہے، واپس چلو۔“

”کیا ہوا؟“ عمران چونک کر بولا۔

”ابھی ابھی جو دو لڑکے یہاں پہنچے ہیں، وہ دونوں سرکاری آدمی ہیں۔ ان میں سے ایک کو میں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ان سے پہلے بھی دو آدمی آئے تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں اشارے بازی بھی کی ہے۔ یہاں سے نکلو۔ وہ لوگ تمہاری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔“

عمران ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رکا اور شہلا سے بولا۔ ”تم برقع میں ہو۔ وہ لوگ تمہیں نہیں پہچان سکیں گے۔ تم کسی طرح نوشی کو اطلاع دے دو کہ ہم اس کے گھر میں اس کا انتظار کریں گے۔“

”لیکن یہ لوگ وہاں بھی آجائیں گے۔“ شہلا نے کہا۔ ”یہ لوگ غالباً نوشی کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں اسے سامنے والے پارک میں بلاتی ہوں۔“ شہلا نے کہا۔

اسی کشمکش میں ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ عمران اور شہلا پھر ایک جگہ ٹھہر گئے تھے۔ اچانک ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے سے نوشی باہر نکلی تو عمران چونک اٹھا۔ نوشی بہت پریشان نظر آرہی تھی۔

”یہ کہاں جا رہی ہے؟“ شہلا نے عمران سے کہا۔

عمران نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر نوشی کے پیچھے دو موٹر سائیکل سوار بھی وہاں سے نکلے۔ نوشی پیدل چل رہی تھی اس لیے وہ دونوں بھی موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے پیدل چل رہے تھے۔ پھر ایک گاڑی اور موٹر سائیکل مزید حرکت میں آئی۔ موٹر سائیکل والوں نے گاڑی میں سوار افراد کی طرف کوئی اشارہ کیا اور مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ گاڑی بھی مخالف سمت میں روانہ ہو گئی۔

”نوشی گھر ہی جا رہی ہے۔“ عمران نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”ہم بھی اس کے گھر چلتے ہیں۔“

”لیکن ہمیں نوشی سے پہلے پہنچنا ہوگا۔“

”مجھے نوشی کا ایڈریس بتا دو۔ میں نوشی کے گھر چلی جاتی ہوں۔ تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ تم گھر جاؤ۔ میں نوشی سے مل کر آتی ہوں۔“

عمران نے جیب سے اپنا والٹ نکالا، اس میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی پشت پر نوشی کا ایڈریس لکھ دیا۔

ایک ٹیکسی ان سے کچھ فاصلے پر رکی تھی اور ڈرائیور سواریاں اتار رہا تھا۔ شہلا اسی ٹیکسی کی طرف بڑھ گئی۔

عمران نے سوچا، حالات یہی رہے تو وہ لوگ مجھے آج نہیں تو کل گھیر لیں گے۔ مجھے بھی اپنے لوگوں سے مدد لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس کے ذہن میں دو نام آئے۔ صفدر اور اعجاز۔ صفدر تو اپ ڈیٹ ہی کا رپورٹر تھا۔ اعجاز ایک دوسرے بڑے چینل کا نیوز ایڈیٹر تھا۔ وہ عمران سے بہت زیادہ بے تکلف بھی تھا اور اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ اس کی فیملی ساہیوال میں تھی۔ یہاں وہ تنہا گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔

عمران کو اپنی حماقت پر غصہ بھی آیا کہ ظہیر کے بجائے وہ اعجاز کے پاس کیوں نہ گیا۔ صفدر اور اعجاز دونوں قابلِ اعتبار تھے۔ عمران نے اپنا سیل فون نکالا اور پہلے اعجاز کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری کوشش میں اسے کامیابی ہوئی اور اعجاز کی مخصوص ہیلو سنائی دی۔

”اعجاز۔“ عمران نے کہا۔ ”میرا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں......“

”آپ ہیں کہاں؟“ اعجاز نے کہا۔ ”میں آپ کی آواز لاکھوں آوازوں میں شناخت کرسکتا ہوں۔“

”میں اس وقت شدید خطرے میں ہوں اور اس وقت لالہ زار ریسٹورنٹ میں ہوں۔ تم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہو؟“

”میں بیس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ عمران نے سلسلہ منقطع کیا اور دوبارہ ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی بھی مشتبہ شخص دکھائی نہ دیا۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا اور ایسے رخ سے بیٹھا کہ داخلی دروازے پر نظر رکھ سکے۔ ویٹر کو اس نے چائے کا آرڈر دیا اور سوچنے لگا کہ اس نے کوئٹہ ہی سے اعجاز کو کال کیوں نہیں کی۔

اس نے چائے ختم کر کے ویٹر سے سگریٹ منگوائی۔ وہ سگریٹ نوشی کا عادی تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھار پی لیتا تھا۔

ٹھیک بیس منٹ بعد اعجاز ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے ریسٹورنٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔

اسی وقت ویٹر سگریٹ لے آیا۔ عمران نے سگریٹ سلگایا اور سیل فون نکال کر اعجاز کو کال کرنے لگا۔ اعجاز نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور بولا۔ ”عمران صاحب! آپ کہاں ہیں؟“

''میں تمہارے بالکل سامنے ہوں۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ ''سواتی ٹوپی اور......''

اعجاز نے اچانک سامنے دیکھا اور بولا۔ ''میں آرہا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد اعجاز اس کے سامنے تھا۔ اس نے عمران کو گلے لگالیا اور بولا۔ ''آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں، فی الحال تو خیریت سے ہوں۔ ایسا کرو، گھر چلو۔ وہیں چل کر تفصیل سے بات کریں گے۔''

عمران نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

اعجاز اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو عمران کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر شہلا کا نام تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سیل فون کان سے لگالیا۔

''عمران!'' شہلا نے کہا۔ ''میں ٹریفک جام میں پھنس گئی تھی اس لیے پہلے نہیں پہنچ سکی۔ میں ابھی نوشی کے گھر کے نزدیک کھڑی ہوں۔ گھر کے باہر ایک سرکاری آدمی مستقل موجود ہے اور دوسرا اس سے کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔ میں گھر کے اندر جارہی ہوں۔''

''تم ابھی گھر میں مت جاؤ بلکہ گلشن اقبال آجاؤ۔ میں تمہیں ایڈریس ایس ایم ایس کردیتا ہوں۔''

اعجاز اس وقت تک گاڑی اسٹارٹ کرکے مین روڈ پر پہنچ گیا تھا۔ عمران نے اعجاز سے ایڈریس پوچھا اور شہلا کو ایس ایم ایس کردیا۔

دس منٹ بعد اعجاز اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کا فلیٹ چوتھے فلور پر تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچے۔

اعجاز نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے گیٹ اپ تو زبردست کیا ہے۔ اسی لیے تو میں آپ کو پہچان نہ سکا۔ اب بتائیے، آپ اب تک کہاں رہے؟''

عمران نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا اس لیے پانی کا گلاس اٹھالیا۔

''میں ذرا کافی بنالوں، پھر سکون سے بات کریں گے۔ آپ ایسا کریں، بیڈروم میں چل کر بیٹھیں۔''

اعجاز کافی لے کر آیا تو عمران بیڈ پر نیم دراز تھا۔ وہ کافی کا کپ عمران کو دیتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ نے بہت جان جوکھوں کا کام کیا ہے۔ اتنے عرصے تک بے حس و حرکت رہنا تم سے کم میرے بس کی بات تو نہیں ہے۔''

''دراصل میں پہلے تو واقعی اس کیفیت میں تھا۔ کئی گھنٹے بعد میں اس قابل ہوا کہ دوسروں کی بات سن سکوں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مریض اس حالت میں ایک دن بھی رہ سکتا اور ایک سال بھی اور ساری زندگی بھی۔ اپنی معذوری کے احساس سے میرا دل لرز اٹھا۔ میں نے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پیر ہلانا تو دور کی بات، میں تو اپنی پلک بھی نہیں جھپکا سکتا تھا۔ ڈاکٹرز کا یہ خیال غلط تھا کہ میں کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا نہ سن سکتا ہوں۔ میں دیکھ بھی سکتا تھا اور سن بھی سکتا تھا۔ اس حالت میں وہ لوگ مجھے جھنجوڑتے تھے، میرا مضحکہ اڑاتے، مجھے گالیاں دیتے تھے لیکن میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان دنوں مجھے احساس ہوا کہ بے بسی کیا ہوتی ہے۔ دوسرے دن میرے جسم میں سنسنی کی سی کیفیت پیدا ہوئی، پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتا ہوں۔ میرا دل چاہا کہ ابھی اٹھ کر ناچنا شروع کردوں لیکن میں نے بہت مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا اور سوچا کہ ابھی مزید کچھ دن تک ان پر ظاہر نہ کروں کہ میں اس فالج زدہ کیفیت سے باہر آچکا ہوں۔ میں نے چادر کے اندر غیر محسوس طریقے سے اپنی انگلیوں کو حرکت دی، ہاتھ کی مٹھی بنائی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب میرا جسم نارمل ہے۔ مجھے زیادہ دیر تک مفلوج رہنے کی اداکاری نہیں کرنا پڑی۔ شہلا نے میری مشکل آسان کردی۔''

''اب سب سے پہلے تو ہمیں وہ ڈی وی تلاش کرنا ہوگی۔'' اعجاز نے کہا۔

کال بیل بجی تو عمران کے ساتھ ساتھ اعجاز بھی چونک اٹھا، پھر عمران مسکرا کر بولا۔ ''دروازے پر شہلا ہوگی۔''

دروازے پر واقعی شہلا تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے سب سے پہلے برقع اتار کے پھینکا۔

''اب تک تو تمہیں برقع کا عادی ہوجانا چاہیے۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''کیا نوشی کے گھر کی مسلسل نگرانی ہورہی ہے؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''انہوں نے شاید نوشی کو اسی لیے رہا کیا ہے کہ اس کے ذریعے عمران کو ٹریپ کرسکیں۔'' اعجاز نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو نوشی کا لینڈ لائن اور موبائل بھی آبزرویشن پر ہوگا۔'' عمران نے کہا۔

''فی الحال آپ نوشی سے دور ہی رہیں۔'' اعجاز نے کہا۔ ''ڈی وی ملنے کے بعد ہی ان سے ملاقات کیجیے گا۔ آپ لوگ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔''

اعجاز کے جانے کے بعد عمران نے رائٹنگ پیڈ سنبھالا اور اس پر کچھ لکھنے لگا پھر وہ شہلا سے بولا۔ ''دیکھو شہلا! یہ

ہے وہ علاقہ جہاں میں بھاگ رہا تھا۔ اسٹریٹ کے دونوں طرف دکانیں ہیں۔ یہ وہ دکان ہے جہاں ایک شوکیس میں، میں نے ڈی وی پھینکی تھی۔ اب یا تو وہ دکان دار کو ملی ہو گی یا پھر وہیں شوکیس کے نیچے پڑی ہو گی۔ وہ ڈی وی عام آدمی کے لیے تو بالکل بیکار ہے، کوئی فوٹو گرافر یا مووی بنانے والا ہی اسے پہچان سکتا ہے۔"

"وہ دکان ہے کس چیز کی؟" شہلا نے پوچھا۔

"وہ شاید کوئی جنرل اسٹور ہے یا پھر اسٹیشنری کی دکان ہے۔ اس کے بعد تین دکانیں اور ہیں پھر وہ اسٹریٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی مارکیٹ ہے لیکن تمہیں وہیں جانا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "تم کنفیوژ ہو جاؤ گی اس لیے مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔"

"لیکن تمہارے لیے باہر خطرہ ہے عمران۔" شہلا نے کہا۔

"تو کیا میں ہمیشہ گھر میں بند رہوں گا؟ جتنا خطرہ میرے لیے ہے، اتنا ہی تمہارے لیے بھی ہے۔" عمران نے کہا۔

"میں تو اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں۔" شہلا نے کہا اور جھک کر اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا پسٹل نکال لیا۔

"یہ...... یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" عمران نے چونک کر پوچھا۔

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں نے چار سال تک پولیس میں ملازمت کی ہے۔ میرے لیے یہ پسٹل حاصل کرنا کیا مسئلہ ہے؟" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "اسلحے کے بارے میں تمہیں تو شاید زیادہ معلومات نہیں ہوں گی۔ یہ پوائنٹ تھری ایٹ کا پسٹل ہے اور اس کے چیمبر میں نو گولیاں آتی ہیں۔ میرے پاس اس کے فاضل میگزینز بھی ہیں۔"

"لیکن اشد ضرورت کے بغیر تم یہ گن نہیں استعمال کرو گی۔" عمران نے سرد لہجے میں کہا۔

شہلا نے پسٹل دوبارہ اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے ہولسٹر میں رکھ لیا۔ پھر اعجاز کھانا لے کر آ گیا اور کھانا کھاتے ہوئے عمران نے اسے بتا دیا کہ کل وہ ڈی وی لینے جائے گا۔

"خطرناک رہے گا۔" پھر اعجاز نے اٹھ کر الماری کھولی اور اس کی اندرونی دراز کھول کر سیاہ رنگ کا ایک پسٹل نکال لیا۔ "یہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے خریدا تھا۔ اب یہ آپ کے کام آئے گا۔"

"لیکن مجھے پسٹل چلانا بھی نہیں آتا۔" عمران نے گھبرا کر کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے دیکھ کر ہی لوگوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔" اس کے اصرار پر عمران نے وہ پسٹل لے لیا۔

دوسرے دن عمران اور شہلا اپنے مشن پر جانے کو تیار ہو گئے۔ اعجاز پہلے ہی جا چکا تھا۔ اس کام میں زیادہ افراد کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے عمران نے اعجاز کو ساتھ لے جانے سے انکار کیا تھا۔

عمران ٹیکسی کے ذریعے اس علاقے تک پہنچ گیا پھر اس نے اس اسٹریٹ پر پہنچ کر دکانوں کا جائزہ لیا۔ جلد ہی اسے وہ دکان نظر آ گئی۔ وہ جنرل اسٹور تھا، نہ اسٹیشنری کی دکان۔ وہ کاسمیٹکس کی دکان تھی۔ دیواروں میں تین طرف فرش سے لے کر چھت تک شیشوں والی الماریاں تھیں جن میں کاسمیٹکس کا سامان بھرا ہوا تھا۔ عمران نے ڈی وی بائیں طرف کی الماری میں پھینکی تھی۔

شہلا برقع میں تھی لیکن دکان میں داخل ہونے سے پہلے اس نے نقاب الٹ دیا تھا۔

دکان کا مالک فربہ بدن کا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے کوئی کاؤنٹر نہیں بنایا تھا بلکہ دکان کے آخری سرے پر ایک آفس ٹیبل اور چیئر ڈال کر بیٹھا ہوا تھا۔

شہلا کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔ "جی میڈم! فرمایئے؟" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"میں ہمیشہ کاسمیٹکس کا سامان آپ کی دکان ہی سے خریدتی ہوں۔"

"یہ تو ہماری کامیابی ہے میڈم۔" وہ منکسر المزاجی سے بولا۔ "کسٹمر ایک دفعہ یہاں آ جائے تو پھر وہ کہیں نہیں جاتا۔"

"ابھی کچھ دن پہلے میں یہاں شاپنگ کرنے آئی تھی کہ اچانک ہنگامہ ہو گیا۔ شاید فائرنگ بھی ہوئی تھی، پھر بازار میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔"

"جی ہاں، مجھے یاد ہے۔ اس ہنگامے میں ہماری مارکیٹ کے بھی تین آدمی زخمی ہوئے تھے۔"

"اسی بھگدڑ میں میرا کچھ سامان یہاں گر گیا تھا۔ وہ سامان تو میں نے اٹھا لیا تھا لیکن ایک ڈی وی شاید یہیں رہ گئی تھی۔"

"ڈی وی؟" دکان دار الجھ کر بولا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" عمران نے پہلی دفعہ زبان کھولی پھر جیب سے ایک ڈی وی نکال کر دکان دار کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے، ڈی وی اس طرح کی ہوتی ہے۔"

"اچھا اسے ڈی وی کہتے ہیں۔ کل میں نے دکان کا

فرش دھلوایا تو اسی طرح کی ایک وی ڈی...... میرا مطلب ہے کہ ڈی وی ڈی مجھے ملی تھی۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔'' شہلا نے کہا۔

دکان دار نے ٹیبل کی دراز کھول کر ڈی وی ڈی نکالی اور شہلا کی طرف بڑھا دی۔ عمران کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈی وی ڈی شہلا کے ہاتھ سے چھین لے۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' شہلا نے کہا اور عمران سے بولی۔ ''چلو، ابھی بہت کام کرنا ہیں۔''

اچانک باہر سے دو آدمی دکان میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

دکان دار بوکھلا کر بولا۔ ''ارے...... ارے، کون ہیں آپ لوگ اور یہ دروازہ کیوں بند کیا ہے؟''

''خاموش رہو۔'' ان میں سے ایک نے گن نکال لی اور دکان دار سے بولا۔ ''پولیس۔'' پھر اس نے شہلا سے کہا۔ ''چلو میڈم! بہت دوڑ بھاگ کر لی ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''ایس ایس پی صاحب تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔''

شہلا نے گھوم کر اتنی پھرتی سے اس کے ہاتھ پر لات ماری کہ اس کی گن اچھل کر دور جا گری۔

عمران نے آگے بڑھ کر دوسرے آدمی کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے اس کے دونوں شانے پکڑے اور اس کے چہرے پر زبردست ٹکر ماری۔ وہ آدمی لہرایا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر گیا۔ گن والا زیادہ مصیبت میں تھا۔ شہلا نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ بھی ناک آؤٹ ہو گیا۔ شہلا نے آگے بڑھ کر اس کی گن اٹھا لی اور دکان دار سے بولی۔ ''پولیس۔'' پھر عمران نے دروازہ کھولا اور وہ ان دونوں کو بے ہوش چھوڑ کر باہر نکلنے لگے۔

عمران کو خدشہ تھا کہ باہر بھی ان کے آدمی موجود ہوں گے اس لیے وہ بہت محتاط تھا۔ عمران کو ارد گرد کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا لیکن دھماکے سے ایک گولی چلی اور دکان کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔

شہلا پھرتی سے زمین پر لیٹ گئی۔ اس نے چیخ کر عمران کو بھی زمین پر لیٹنے کو کہا۔ عمران بھی زمین پر لیٹ گیا۔ بازار میں پھر بھگدڑ مچ گئی۔ شہلا آہستہ آہستہ زمین سے اٹھی اور جھکے جھکے تیزی سے باہر کی طرف جانے لگی۔ عمران بھی اسی انداز میں باہر کی طرف بڑھا۔

اچانک پھر دو فائر ہوئے لیکن گولی کسی کو بھی نہ لگی۔ شہلا نے گھوم کر دیکھا۔ دو آدمی گنیں لیے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آ رہے تھے۔ شہلا کے ہاتھ میں وہی گن تھی جو اس نے اپنے شکار سے چھینی تھی۔ اس نے اچانک ان دونوں پر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک اذیت ناک چیخ سنائی دی، پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ زخمی ہونے والا بھی لنگڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ایک فائر کی وجہ سے ان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ شہلا اور عمران اب اٹھ کر تیزی سے دوڑے اور مارکیٹ سے باہر نکل گئے۔

حملہ آور بھی ان کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ پیچھے سے چکر کاٹ کر دوبارہ ان کے سامنے آگئے۔ شہلا نے پھر ان پر فائر جھونک مارا پھر ایک انسانی چیخ سنائی دی۔ اس مرتبہ ان لوگوں نے بھاگنے کے بجائے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ فائر کرنے کے بعد شہلا، عمران کا ہاتھ پکڑ کر مخالف سمت میں بھاگی تھی۔ حملہ آوروں نے پھر دو فائر کیے تو شہلا بری طرح چیخی۔ عمران کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ شہلا بہت بری طرح زخمی ہو گئی ہے یا...... اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔

''چلو عمران!'' شہلا نے چیخ کر کہا اور تیزی سے مخالف سمت میں بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا پسٹل بھی نکال لیا۔ اس نے عمران سے نکلنے کو کہا اور خود دونوں ہاتھوں سے حملہ آوروں پر فائر کرنے لگی۔ وہ تو شکر ہے کہ صبح کا وقت تھا، ابھی کچھ دیر پہلے ہی مارکیٹ کھلی تھی۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ جو لوگ موجود تھے، وہ پہلی گولی چلتے ہی سر پر پیر رکھ کر بھاگ لیے تھے۔ اگر مارکیٹ میں زیادہ رش ہوتا تو کوئی راہ گیر شہلا یا حملہ آوروں کی گولیوں سے زخمی یا ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔

حملہ آور پھر آگے آ رہے تھے۔ شہلا نے یکے بعد دیگرے دو فائر مزید کیے۔ اس مرتبہ اس نے نشانہ لے کر فائر کیے تھے اس لیے حملہ آوروں کے دو آدمی مزید زخمی ہو گئے۔ وہ گھبرا کر پیچھے کی طرف بھاگے۔ شہلا تیزی سے عمران کی طرف لپکی اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے وہاں سے مین روڈ پر نکل آئے۔ شہلا نے اس بدمعاش کی گن بھاگتے ہوئے پھینک دی تھی۔ اپنا پسٹل اس نے جھک کر پنڈلی کے ہولسٹر میں رکھ لیا اور پھر مین روڈ پر تیز قدموں سے چلنے لگی۔

اسی وقت عمران کو ایک خالی رکشا مل گیا۔ وہ دونوں جھپٹ کر رکشا میں سوار ہوئے اور اس سے گلشن اقبال چلنے کو کہا۔

''میں اس طرف نہیں جا رہا ہوں۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''تو پھر ہمیں کہیں راستے میں چھوڑ دینا۔'' عمران

نے کہا۔

کچھ دور جا کر انہیں ٹیکسی مل گئی اور وہ اعجاز کے فلیٹ تک بہ خیریت پہنچ گئے۔

کمپلیکس میں داخل ہونے سے پہلے عمران نے اردگرد کا جائزہ لیا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

فلیٹ میں پہنچ کر شہلا نے برقع اتارا تو اسے شہلا کا دائیں بازو خون میں ڈوبا نظر آیا۔

''اسپتال چلو شہلا۔'' عمران گھبرا کر بولا۔ ''تمہارے زخم سے تو بہت خون بہہ رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' شہلا نے کہا۔''گولی میرے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔''

''پھر بھی زخم تو ہے نا۔'' عمران اس مرتبہ چیخ کر بولا۔ ''میرے ساتھ اسپتال چلو۔''

''کس اسپتال میں لے جاؤ گے تم؟ بتاؤ، کیا تم مجھے اسپتال لے جا سکتے ہو؟''

''اچھا تم بیٹھو، میں تمہاری ڈریسنگ کر دوں۔'' عمران نے کہا۔ اس نے باتھ روم میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھا تھا۔ وہ باکس لے کر آ گیا۔ شہلا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے قینچی لے کر شہلا کی قمیص کندھے کے پاس سے کاٹ دی پھر اس نے ہائیڈروجن پرآکسائڈ میں کاٹن ڈبوئی اور شہلا کا زخم صاف کرنے لگا۔ ویسے شہلا کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ خون بہنا بھی بند ہو گیا تھا۔ عمران نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اس کے زخم کی ڈریسنگ کر دی۔

''تھینک یو۔'' شہلا نے مسکرا کر کہا۔''اگر تم اتنی توجہ سے میری مرہم پٹی کرو گے تو میں روز زخمی ہونا شروع کر دوں گی۔''

''اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔'' عمران نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ اس نے شہلا سے کہا۔ ''یہ پی لو، تمہارا بہت خون ضائع ہو گیا ہے۔''

شہلا نے خاموشی سے دودھ کا گلاس لیا اور دودھ پینے لگی۔

عمران کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے چونک کر سیل فون نکالا اور آن کر کے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف اعجاز تھا۔

''ہاں سر! مشن کیسا رہا؟''

''زبردست۔'' عمران نے کہا۔ ''میں وہ ڈی وی ڈی لے آیا ہوں۔''

''گڈ!'' اعجاز نے کہا۔''میں ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

اعجاز وہاں پہنچا تو شہلا سو گئی تھی۔ عمران بھی اونگھ رہا تھا۔ فلیٹ میں گھستے ہی اعجاز کی نظر شہلا کی خون آلود آستین پر پڑی جو عمران نے کاٹ دی تھی۔ اعجاز بری طرح گھبرا گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''عمران صاحب!''

عمران ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

''عمران صاحب! یہ خون کیسا ہے؟''

''شہلا زخمی ہو گئی تھی۔'' عمران نے بتایا۔''وہاں اچانک فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔''

''فائرنگ۔'' اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔''فائرنگ کون کر رہا تھا؟''

عمران نے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ اعجاز کو بتا دیا۔

''زخم زیادہ گہرا تو نہیں ہے؟'' اعجاز نے پوچھا۔ ''ہڈی تو محفوظ ہے نا؟''

''ہڈی بالکل محفوظ ہے۔'' شہلا نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

''تم جاگ رہی ہو؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''اب تو جاگ ہی گئی ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔'' شہلا نے کہا پھر وہ چونک کر بولی۔ ''عمران! وہ ڈی وی ڈی دیکھ لو۔''

اعجاز نے وہ ڈی وی ڈی لگائی تو اسکرین پر جھائیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ ان تینوں کے چہرے مایوسی سے لٹک گئے۔ سب سے زیادہ صدمہ عمران کو تھا۔ اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''یار...... یہ تو...... کچھ بھی نہیں تھا۔''

''فکر مت کرو۔'' اعجاز جبراً مسکرایا۔ ''میرا ایک جاننے والا اسے ری اسٹور کر دے گا لیکن وہ شخص بہت لالچی اور بے اعتبار ہے۔ کام کرانے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔''

''اس کی کہیں دکان ہے یا وہ کہیں جاب کرتا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ریگل پر اس کی بہت بڑی دکان ہے۔'' اعجاز نے کہا۔''ہم شام کو وہاں چلیں گے۔''

''میں ابھی آتی ہوں۔'' شہلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میری شرٹ خراب ہو گئی ہے۔ میں کپڑے لے کر ابھی آتی ہوں۔''

''تم اس حالت میں باہر جاؤ گی؟'' عمران نے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔ ہم لوگ شام کو جائیں گے تو تمہارے لیے

شاپنگ بھی کرلیں گے۔"

☆☆☆

وہ آدمی دیکھنے ہی میں کائیاں لگتا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں اور چہرے پر نحوست برس رہی تھی۔ عمران نے اسے دیکھتے ہی ناپسند کردیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو عمران شاید اس سے بات بھی نہ کرتا لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ وہ شخص اپنے فن کا ماہر تھا۔

اعجاز نے اسے ڈی وی دیتے ہوئے کہا۔ "انیس بھائی! اس ڈی وی میں میری ایک بہت اہم ویڈیو تھی۔ ڈی وی پانی میں گرگئی تھی اس لیے اب اس میں کچھ نظر نہیں آرہا۔"

"فکر مت کریں۔" انیس نے کہا۔ "ابھی سب کچھ نظر آنے لگے گا۔"

"تو پھر کردیں۔" اعجاز نے کہا۔

"پانچ ہزار روپے ہوں گے۔" انیس نے کہا۔

"انیس بھائی!" اعجاز نے کہا۔ "میں راتوں رات کروڑ پتی نہیں ہوا ہوں۔ اس سے پہلے بھی اس طرح کے کام کراتا رہا ہوں، آپ پانچ سو سے زیادہ لیتے نہیں تھے اور اب ......"

"دیکھو اعجاز بھائی۔" انیس نے کہا۔ "اس سے پہلے آپ نے چھوٹا موٹا کام کرایا تھا۔ یہ تو پوری ڈی وی ہے۔"

"او کے، آپ کام کریں، میں آپ کو پانچ ہزار دے دوں گا۔" عمران نے کہا۔

انیس نے غور سے عمران کو دیکھا پھر کوے جیسی آواز میں بولا۔ "او ہو عمران صاحب! آپ تو سر بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ میری شاپ پر کیسے آگئے؟"

"بس اعجاز صاحب کے ساتھ چلا آیا۔ اکثر مجھے بھی مختلف ڈی ویز وغیرہ ری اسٹور کرانے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اسی لیے میں بھی چلا آیا۔"

"موسٹ ویلکم۔" انیس نے کہا۔

پھر اس نے بہت مہارت سے اپنا کام شروع کردیا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مصروف رہا، پھر اس نے ڈی وی چلانے کے لیے پلیئر میں لگادی اور مانیٹر روشن کردیا۔ دس منٹ تک ڈی وی کے مختلف حصے دیکھنے کے بعد اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ "سوری اعجاز بھائی! اس کا ٹیپ تو بہت بری طرح تباہ ہوگیا ہے۔"

"پھر؟" عمران نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"پھر یہ کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"آپ نے اتنی دیر تک اس پر محنت کی، اپنا قیمتی وقت لگایا۔ اس کی بھی تو کچھ فیس ہوگی؟" اعجاز نے کہا۔

"نو۔" انیس منہ بنا کر بولا۔ "میں اپنے کام کے پیسے لیتا ہوں۔ آپ کا کام نہیں ہوا اس لیے کوئی فیس نہیں۔"

"بہت شکریہ انیس بھائی۔" یہ کہہ کر اس نے عمران کو چلنے کا اشارہ کیا اور باہر آگیا۔ انیس سے مل کر عمران بھی باہر نکل آیا۔ عمران کو اتنی مایوسی تھی کہ اس سے چلنا بھی محال ہورہا تھا۔

اس وقت انسپکٹر شاکر وہاں سے گزرا۔ وہ عمران کو انیس کی شاپ سے نکلتے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ وہ اس وقت تنہا تھا ورنہ عمران کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ عمران اس کی آنکھوں کے سامنے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ انیس کی شاپ میں داخل ہوا تو انیس اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ "آیئے انسپکٹر صاحب!" اس نے کہا۔ "کیسے آنا ہوا؟"

"ابھی تمہاری دکان سے عمران باہر نکلا ہے؟" انسپکٹر نے کہا۔

"کون عمران؟" انیس نے مکاری سے کہا۔

"ابھی جو آدمی تمہاری دکان سے نکلا ہے، میں اس کی بات کررہا ہوں۔"

"اچھا وہ...... وہ تو مشہور جرنلسٹ عمران صاحب تھے۔"

"وہ یہاں کیوں آیا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ ایک ڈی وی لے کر آئے تھے۔ کہہ رہے تھے پانی میں گرگئی ہے۔ اس میں میری ایک بہت قیمتی ویڈیو ہے، اسے ری اسٹور کردو۔"

"پھر؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ ڈی وی پانی میں کافی دیر تک پڑی رہی تھی اس لیے بالکل خراب ہوگئی۔ اس میں کچھ بھی ری اسٹور نہ ہوسکا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ڈی وی اب بھی ٹھیک نہیں ہوگی؟"

"جی ہاں، مجھے یقین ہے۔" انیس نے کہا۔ "میں نے اس پر آدھے گھنٹے تک محنت کی، ہر حربہ آزما لیا لیکن وہ ڈی وی ری اسٹور نہیں ہوسکی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" انسپکٹر نے کہا اور دکان سے باہر نکل گیا۔

انیس نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ "اسے کیا ہوا؟ اس بے چارے کی ایک قیمتی ویڈیو ضائع ہوگئی اور یہ خوش ہورہا ہے۔"

انسپکٹر وہاں سے سیدھا ایس ایس پی کے گھر پہنچا۔ وہ جانتا تھا کہ ایس ایس پی اس وقت گھر پر ہوگا۔ اس نے ایس

ایس پی کو زوردار قسم کا سیلیوٹ کیا۔

ایس ایس پی ہنس کر بولا۔ ''کیا بات ہے انسپکٹر..... بہت خوش نظر آرہے ہو؟''

''سر! بات ہی خوشی کی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہوگئی، کیا وہ ڈی وی ڈی مل گئی؟''

''وہ ڈی وی ڈی تباہ ہوگئی سر......!''

''صاف صاف بات کرو انسپکٹر۔'' ایس ایس پی نے درشت لہجے میں کہا۔

انسپکٹر نے جواب میں اسے ڈی وی ڈی کی کہانی سنادی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب عمران کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بس اب اس کا پیچھا چھوڑ دو۔'' ایس ایس پی نے کہا۔ ''وہ خاصا معروف جرنلسٹ ہے۔ اس کی طرف سے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ صحافی برادری کو ہمارے خلاف کھڑا نہ کردے۔''

''چلیے اس کا پیچھا تو چھوٹ گیا۔ اب اس وحید سے بھی اپنا پیچھا چھڑائیے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ایس ایس پی حسن جاوید نے چونک کر اسے دیکھا۔

''قدرت اللہ صاحب نے اپنے بھائی سے جو فنڈز ریلیز کرایا تھا، وہ وحید کی کمپنی کو کیوں ملے؟ اس کے لیے میں نے بھی ایک فیک کمپنی بنالی ہے۔ آپ وہ فنڈ اس میں ٹرانسفر کرائیے۔''

''لیکن پھر وحید کو کیا ملے گا؟'' حسن جاوید نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''ساری رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائے گی۔''

''یعنی پورے دو ارب روپے تمہارے اکاؤنٹ میں جائیں گے۔'' حسن جاوید نے کہا۔

''سر! میں تو سرکاری آدمی ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں کیسے جاسکتے ہیں۔ کمپنی کا اکاؤنٹ تو ابھی کھلا ہی نہیں ہے۔ میں اپنے بھائی کا اکاؤنٹ کھلوادوں گا، آپ چاہیں تو اپنے کسی آدمی کو نامزد کردیں۔ ان دونوں کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھل جائے گا۔'' انسپکٹر نے مکاری سے کہا۔

''پہلے اس کی شرائط طے کرلو۔'' حسن جاوید نے کہا۔

''تھرٹی، سیونٹی؟''

''اب یہ بھی بتا دیں کہ تھرٹی کس کا اور سیونٹی کس کا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''بھئی ظاہر ہے سیونٹی پرسنٹ میرا اور تھرٹی پرسنٹ تمہارا۔'' حسن جاوید نے کہا۔

اس کی بات پر انسپکٹر نے بہت زور سے قہقہہ لگایا۔

''ایس ایس پی حسن جاوید صاحب! عمران کی ڈی وی ڈی تو ضائع ہوگئی ہے لیکن پوری ویڈیو میرے پاس موجود ہے۔''

''تمہارے پاس موجود ہے؟'' ایس ایس پی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ عمران وہ ڈی وی ڈی لے کر سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا۔ وہاں اس نے پوری ویڈیو اپنے لیپ ٹاپ پر لگا کر دیکھی تھی اور غیر شعوری طور پر اسے محفوظ کرلیا۔ جب میں نے اس کی تلاش میں گھر پر چھاپا مارا تو مجھے وہاں سے عمران کا لیپ ٹاپ بھی ملا تھا۔'' انسپکٹر مکاری سے ہنسا۔ ''اب بتائیے کتنے پرسنٹ لیں گے آپ؟''

''تم تو انتہائی گھٹیا اور نیچ انسان ہو۔ بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد رہنے والوں کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن تم تو مجھے بھی بلیک میل کررہے ہو۔''

''توبہ توبہ۔'' انسپکٹر نے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''سر! میں اور بلیک میل، میں تو صرف آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ وہ ویڈیو میرے پاس ہے۔''

''اور تم سیونٹی پرسنٹ شیئر چاہتے ہو؟'' حسن جاوید نے پوچھا۔

''یس سر!'' انسپکٹر نے مکاری سے ہنس کر کہا۔

''تم اپنے ہی افسر اعلیٰ کو بھول رہے ہو جو......''

''میرے افسر اعلیٰ تو آپ ہیں۔'' انسپکٹر نے ڈھٹائی سے ہنس کر کہا۔ ''رہی ان کی بات تو ان کی ڈیل تو عبدالوحید وقار سے تھی۔''

''تم بہت کمینے ہو انسپکٹر، بہت زیادہ کمینے۔''

''چلو پھر میرا تھرٹی پرسنٹ ہی سہی۔'' حسن جاوید اس وقت ایس ایس پی کے رینک سے گر کے بالکل انسپکٹر کی سطح پر آگیا تھا۔

☆☆☆

''میرے خیال میں اب تمہیں وحید صاحب اور پولیس کے افسر اعلیٰ کی مخالفت چھوڑ دینا چاہیے۔'' شہلا نے کہا۔

وہ لوگ اس وقت اعجاز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''میں ان سے کیا کہوں کہ جناب اب آپ میری جاں بخشی کردیں۔ میں نے آپ کی مخالفت ترک کردی ہے۔''

''تم ہر وقت مرچیں کیوں چباتے رہتے ہو؟'' شہلا نے کہا۔ ''آخر یہ مخالفت برائے مخالفت کب تک چلتی رہے گی؟''

''جب تک مجھے اپنی شکست کا احساس نہیں ہوجاتا۔'' پھر بولتے بولتے اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے اسے

کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔ وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''میں جب وہ ڈی وی ڈی لے کر گھر گیا تھا تو میں نے چیک کرنے کے لیے وہ ڈی وی ڈی لیپ ٹاپ پر لگا کر دیکھی تھی۔''

''پھر؟'' اعجاز نے کہا۔

''پھر یہ کہ میں نے چیک کرتے ہوئے وہ ڈی وی ڈی لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک میں محفوظ کر دی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ انسپکٹر شاکر وہاں سے لے گیا ہے۔ وہ ابھی ایس ایس پی حسن جاوید کی تحویل میں ہوگا۔ لیپ ٹاپ پر ہمارے چینل اپ ڈیٹ کا موٹو گرام ہے۔''

''انسپکٹر نے ایسا کوئی لیپ ٹاپ ایس ایس پی صاحب کی تحویل میں نہیں دیا۔'' شہلا نے کہا۔ ''میں اس وقت وہیں موجود تھی۔ وہ تمہارے کمرے سے کچھ فضول قسم کی یو ایس بیز، کچھ ردی فائلیں اور کچھ فوٹو گراف اٹھا کر لے گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ لیپ ٹاپ ابھی تک انسپکٹر شاکر کے قبضے میں ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''اگر کسی طرح ہمیں وہ لیپ ٹاپ مل جائے تو......''

عمران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ لیپ ٹاپ شاکر نے اپنی ذاتی الماری میں بند کر رکھا ہوگا۔'' شہلا نے کہا۔

''اس کے گھر میں کون کون ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کی والدہ، بیوی اور دو بیٹیاں...... ایک بیٹی سات سال کی ہے اور دوسری نو سال کی۔''

''مجھے اس کے گھر میں گھسنا پڑے گا۔'' عمران خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''اس کے گھر میں گھسنا تو آسان ہے لیکن اس الماری کا لاک کھولنا آسان نہیں ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

شہلا چند لمحے غور سے عمران کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''عمران! اگر تمہیں وہ لیپ ٹاپ نہ ملے تو......''

''میں آخری سانس تک اسے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ اگر وہ لیپ ٹاپ تمہیں کوشش کے باوجود نہ ملے تو کیا کرو گے؟''

''تو؟'' عمران نے عجیب سی نظروں سے شہلا کو دیکھا۔ ''تو میں جرنلزم ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا اور کوئی کاروبار کروں گا۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا لیپ ٹاپ نہ ملے، ڈی وی ڈی مل جائے تو؟'' شہلا نے کہا۔

''وہاٹ نان سینس شہلا۔'' عمران بھنا گیا۔ ''ہم یہاں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے ہیں اور تم بچوں کی طرح سوالات کر رہی ہو۔''

''میں سیریس ہوں۔'' شہلا نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں وہ ڈی وی ڈی چاہیے؟''

''تم جانتی ہو کہ وہ لیپ ٹاپ یا ڈی وی ڈی میرے لیے کتنی اہم ہے۔'' عمران نے کہا۔

''چلو، پھر میرے ساتھ چلو۔'' شہلا نے کہا۔

عمران نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے، اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''کہاں؟''

''کوئی سوال نہیں۔'' شہلا نے سنجیدگی سے کہا۔

''چلو۔'' عمران بھنا کر کھڑا ہو گیا۔ ''دور جانا ہے تو اعجاز سے گاڑی لے لوں؟'' عمران نے کہا۔

''ہاں، گاڑی سے ہمیں آسانی ہو جائے گی۔''

شہلا مسکرائی تو اعجاز نے میز سے اٹھا کر گاڑی کی چابیاں عمران کی طرف اچھال دیں۔

وہ باہر نکلے تو عمران نے کہا۔ ''گاڑی بھی تم خود ہی ڈرائیو کرو۔''

''میں خود بھی تم سے یہ کہنے والی تھی۔'' شہلا پھر مسکرائی۔

پھر گاڑی مختلف سڑکوں سے مڑتی ہوئی ایک بنگلے کے سامنے جا رکی۔ اس دوران میں عمران اپنے ہی خیالات میں گم رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ بنگلا آئی جی سندھ کا بنگلا تھا۔ عمران یہاں کئی دفعہ آ چکا تھا۔ اس نے حیرت سے شہلا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟''

''کوئی سوال نہیں۔'' شہلا نے کہا۔

اسی وقت بنگلے کا گیٹ کھل گیا۔ شہلا نے گاڑی اندر لے جا کر پورچ میں روک دی۔ وہاں پہلے سے ایک ہنڈا اکارڈ اور لینڈ کروزر کھڑی ہوئی تھیں۔

''دیکھو شہلا! اگر یہ کوئی چال ہے تو بہت ہی گھٹیا چال ہے...... میں......''

''شش!'' شہلا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور برآمدے سے گزرنے لگی تو وہاں کھڑے ہوئے سنتری نے شہلا کو سلام کیا۔

وہ اس کے سلام کا جواب دیتی ہوئی سیدھی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ عمران روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

وہ شہلا کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو

"پھر تم یہ کہنا چاہتے ہو گے کہ ہم مقابلے کا خیال چھوڑ دیں اور واپس لوٹ جائیں۔"

"ایسی بزدلی کا خیال میرے دل میں آ ہی نہیں سکتا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب دشمن کی طاقت زیادہ ہو تو طاقت سے زیادہ حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"حکمتِ عملی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میری تجویز یہ ہے کہ ہم جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ان پہاڑوں میں دفاعی مورچے بنالیں تاکہ دشمن جب وہاں پہنچے تو اسے حیران کن حملوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ پانچ پانچ ہزار سواروں کے دستے بنائے جائیں۔ یہ دستے باری باری لڑیں۔ پہلے ایک دستہ میدان میں جائے، جب یہ دستہ تھک جائے تو دوسرا روانہ ہو۔ اس طرح ہم ہر وقت تازہ دم فوج کے ساتھ جنگ لڑیں گے۔"

سبکتگین نے مسکرا کر محمود کی طرف دیکھا۔

"مجھے آج اپنی تربیت پر فخر ہو رہا ہے۔ تم نے بالکل مناسب رائے دی ہے۔ اگر میں بھی کچھ دیر غور کرتا تو اسی نتیجے پر پہنچتا۔"

محمود کی تجویز کے مطابق مورچے قائم کر دیے گئے۔

دوسری جانب راجا جے پال کے لشکر میں رت جگا ہو رہا تھا۔ جے پال کے خیمے میں اس کا سپہ سالار بھیم بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان آنے والی جنگ کے بارے میں مشورے ہو رہے تھے۔

"کچھ مسلمانوں کے لشکر کے بارے میں معلوم ہوا؟" جے پال نے پوچھا۔

"میرے آدمی خوب اچھی طرح جائزہ لے کر آ گئے ہیں۔" بھیم نے اطلاع دی۔

"تمہارے خیال میں مسلمان کتنی تعداد میں ہوں گے؟"

"ہم سے ایک چوتھائی بھی نہیں ہوں گے۔ یہی کوئی بیس تیس ہزار۔"

"اور ہم ایک لاکھ ہیں۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ بس غزنی ہمارے ہاتھ آنے والا ہے۔ وہ دن کتنا بھاگ والا ہوگا جب غزنی کے بازاروں سے ہماری فتح کا جلوس نکلے گا۔"

"ہونا تو یہی چاہیے لیکن مجھے ایک وہم آتا ہے۔ مسلمان بڑی چالاک قوم ہے۔ کہیں انہوں نے باقی فوج پہاڑوں میں نہ چھپا دی ہو۔"

"بھگوان کی کرپا سے وہ فوج چھپی ہی رہے گی۔ ہماری ایک لاکھ فوج انہیں کچل کر رکھ دے گی۔"

حیرت سے گنگ رہ گیا۔ وہاں آئی جی صاحب کے ساتھ اس کے چینل کے سی ای او ناصر شجاع صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے پیچھے صفدر بھی تھا جو نہ جانے کن انتظامات میں مصروف تھا۔

عمران نے ناصر صاحب اور آئی جی صاحب کو سلام کیا تو آئی جی صاحب نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور بولے۔ ''مجھے تم پر فخر ہے عمران، جب تک قوم کی مائیں تم جیسے سپوتوں کو جنم دیتی رہیں گی، تب تک ان شاء اللہ یہ ملک قائم رہے گا۔''

''سر! یہ شہلا مجھے زبردستی یہاں لے کر آئی ہے۔'' عمران نے بوکھلا کر کہا۔ ''میں ابھی تک نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

''تمہیں وہ ڈی وی ڈی چاہیے؟'' آئی جی صاحب مسکرائے۔

''یس سر!'' عمران نے کہا۔

''اس ڈی وی ڈی کا تم کیا کرو گے؟'' انہوں نے عمران کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ''وہ مجھے ہی دو گے نا، تو سمجھو مجھے ڈی وی ڈی مل گئی۔''

''آپ کو ڈی وی ڈی مل گئی؟'' عمران پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

آئی جی صاحب نے کسی کو اشارہ کیا اور کمرے میں رکھے ہوئے ایل ای ڈی پر وہی ویڈیو شروع ہو گئی جس کے لیے عمران نے اتنے مصائب جھیلے تھے۔

''یہ...... یہ...... آپ کے پاس...... کہاں سے آئی؟''

''اپنا منہ ٹھیک کرو۔'' آئی جی صاحب پھر مسکرائے۔ ''ہم آن ایئر جانے والے ہیں۔''

پھر اسکرین پر صفدر ظاہر ہوا اور اس نے کہا۔ ''ناظرین! اب تک آپ نے میری زبانی صرف اس ویڈیو کی کہانی سنی ہے اب ذرا وہ ویڈیو دیکھ بھی لیں۔''

اسکرین پر پھر وہی ویڈیو چلنے لگی۔ اب اس میں بیک گراؤنڈ میوزک کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

عمران سکتے کی حالت میں وہ مووی دیکھتا رہا پھر صفدر کی آواز پر چونکا۔ ''ناظرین! اب ان کرداروں سے بھی مل لیں جو اس ویڈیو کو بنانے، اس کی حفاظت کرنے اور دوبارہ دشمنوں سے چھیننے میں جنونیوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ یہ ہیں آپ کے جانے پہچانے اینکر اور نیوز پرسن جناب عمران احمد، یہ انسپکٹر شہلا خان، یہ نوشین مصطفیٰ...... جی بی ڈی کے نیوز ایڈیٹر...... اور اب میں اپ ڈیٹ چینل کے مالک سے درخواست کروں گا کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور آ کر انعامات تقسیم کریں۔''

عمران ساری کارروائی خواب کے عالم میں دیکھتا رہا۔ یہ کارروائی رات کو ایک بجے ختم ہوئی۔ اس دوران میں پولیس حسن جاوید، شاکر اور عبدالوحید وقار کو گرفتار کر چکی تھی۔ ان گرفتاریوں کی بنیاد وہی ویڈیو تھی۔ اس میں حسن جاوید کو صاف دکھایا گیا تھا وہ قدرت اللہ صاحب کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ وہ منظر دیکھ کر عمران گھبرا گیا تھا۔ اس وقت حسن جاوید کی نظر عمران پر پڑی تھی اور یہ کہانی شروع ہوئی تھی۔

عمران نے شہلا کو تلاش کیا تو وہ ہنستی ہوئی اس کے سامنے آ گئی اور بولی۔ ''تمہارے پوچھنے سے پہلے ہی بتائے دیتی ہوں۔ تم نے جب مجھے دکان کا پتا سمجھایا تھا جہاں تم نے ڈی وی ڈی پھینکی تھی تو میں نے اس رات اپنے آدمیوں کو فون کر کے وہاں بھیج دیا تھا۔ جو کومت، میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑی نہیں تھی بلکہ مجھے آئی جی صاحب نے اس خصوصی مشن پر تمہارے ساتھ لگایا تھا۔ جب ان لوگوں نے تمہیں گرفتار کیا تو وہ اسلام آباد میں تھے۔ ان کی واپسی پر میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ لگا دیا۔ میرے آدمی پہلے ہی ڈی وی ڈی لے کر وہاں سے جا چکے تھے۔ میری ہدایت کے مطابق دکاندار نے تمہیں وہ ناکارہ ڈی وی ڈی دے دی۔ وہاں میرے چہرے سے نقاب اٹھ گیا اور شاکر کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے بعد تم جانتے ہو کہ وہاں کیا ہوا۔ میں نے وہ ڈی وی ڈی آئی جی صاحب کو پہنچا دی اور آئی جی صاحب ان لوگوں کی گرفتاری کے انتظامات کرنے میں لگ گئے۔ انہوں نے ہی ناصر صاحب اور دوسرے اسٹاف کو کوریج کے لیے بلایا تھا۔ ناصر صاحب نوشین کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ میری خواہش تھی۔''

عمران نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا، پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تم واقعی بہت گھنی ہو، اتنی مشکلوں کے بعد بھی منہ سے نہ پھوٹیں کہ تم نے ابھی تک پولیس کی ملازمت نہیں چھوڑی ہے۔ تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا، ذرا اس نوشین کی خبر لے لوں۔''

تمام ملزمان کی گرفتاری کے ایک ہفتے بعد عمران نے نوشین سے شادی کر لی۔ اس شادی میں شہلا بھی شریک ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ پاگل لڑکی واقعی عمران کو چاہنے لگی تھی لیکن کسی کو سکھ پہنچا کر جو خوشی ملتی ہے، اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

”بھگوان سے پرارتھنا تو یہی ہے لیکن میری بھی ایک تجویز ہے۔ ہم پوری فوج میدان میں نہ بھیجیں۔ مسلمان لڑاکا قوم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جنگ کئی روز جاری رہے گی۔ ہم اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کردیں۔ ایک دن ایک حصہ میدان میں جائے دوسرے دن دوسرا اور تیسرے دن تیسرا حصہ۔ اس طرح ہم ہر روز تازہ دم فوج سے لڑیں گے۔“

”مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ تین دن انتظار کروں۔ ایک لاکھ فوج لے کر جاؤ اور چند گھنٹوں میں فیصلہ کرکے مسلمانوں کو غزنی تک بھگاتے ہوئے لے جاؤ۔ سبکتگین کو معلوم تو ہو کہ جے پال سے ٹکرانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“

”لشکر میں اعلان کردو کہ کل صبح ہوتے ہی میدان جنگ میں پہنچ جائیں۔ اس سے پہلے کہ مسلمان آگے بڑھ کر ہم تک پہنچیں میں ان تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”مہاراج جیسا چاہیں گے ویسا ہوگا۔“

☆☆☆

مسلمانوں کے لشکر میں فجر کی اذان بلند ہوئی۔ صفیں بن گئیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد جتنے سالار تھے، سب سبکتگین کے گرد جمع ہوگئے۔ سبکتگین نے دعا مانگنے کے بعد انہیں مخاطب کیا۔

”معلوم ہوتا ہے دشمن آج ہی ہم سے ٹکرانے کا ارادہ کررہا ہے۔ ہمیں اس کا اعلانِ جنگ منظور ہے۔ تم بھی یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اپنی صفیں بنالو۔ کوشش کرو کہ پہل اس جانب سے ہو۔ جب وہ حملہ کریں تو دفاعی جنگ کرتے ہوئے انہیں خوب تھکادو۔ ان کے تھکتے ہی میں اپنے دستے کے ساتھ قلب میں آجاؤں گا اور پھر باقاعدہ جنگ شروع ہوجائے گی۔ اپنی پشت سے بےفکر رہنا کیونکہ دفاعی مورچوں میں ہماری سپاہ چھپی بیٹھی ہے۔“

مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے اور مسلح ہوکر میدانِ کارزار میں پہنچ گئے۔

ہندوؤں کی لشکر گاہ میں بھی ناقوس کی صدائیں بلند ہوگئیں۔ جے جے کار کے نعرے لگنے لگے، ان کا لشکر بھی روانہ ہوا اور مسلمانوں سے کچھ فاصلے پر آکر صف بستہ ہوگیا۔

راجا جے پال گھوڑے پر سوار ہوا اور ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کا لشکر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کے ٹڈی دل لشکر کے سامنے اس تعداد کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے لشکر پر نظر ڈالی۔ اس وقت صاف نظر آرہا تھا کہ اس کی آنکھیں کسی کو تلاش کررہی ہیں۔ وہ نوجوان سالار اور اس کا دستہ نظر نہیں آرہا تھا جس نے سبکتگین کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ اس اونچے ٹیلے سے اترا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنی ہی فوج کی صفوں میں گھس گیا۔ میمنہ، میسرہ، قلب، آگے پیچھے سب دیکھ آیا۔ وہ کسے تلاش کررہا ہے، کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ تھک ہار کر وہ بھیم کے پاس آیا اور سرگوشی میں اس سے کچھ پوچھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کے بعد جے پال مطمئن نظر آنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ اس نوجوان نے یہ عہد لے لیا تھا کہ اسے اور اس کے دستے کو باقی فوج سے الگ رکھا جائے۔ وہ اپنی مرضی سے جب اور جہاں سے چاہے، سبکتگین پر حملہ آور ہو۔

مسلمانوں کی طرف سے پہل نہیں ہورہی تھی اور جے پال کو غزنی جانے کی جلدی ہورہی تھی۔ اس نے تنگ آکر اپنی فوجوں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ دونوں فوجیں آگے بڑھیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہوگئیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مسلمانوں میں تھکن کے آثار پیدا ہوگئے اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ اسی وقت سبکتگین، محمود غزنوی اور دوسرے سردار محض چند سواروں کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن پر جھپٹ پڑے۔ جے پال اپنے ہاتھی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ ”اس مسلمان امیر کی عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ میری ایک لاکھ کی فوج کے سامنے چند ہزار لے کر نکلا ہے۔“ اس کی ہنسی اچانک قہقہے میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک درّے سے وہی نوجوان سالار اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکلا جس نے سبکتگین کے قتل کا عہد کیا تھا۔ اس نے دراصل اسلامی لشکر کی پشت سے حملہ کیا تھا۔ اس کا نشانہ سبکتگین تھا۔ وہ اس تک پہنچ بھی گیا تھا لیکن دفاعی مورچوں میں چھپے ہوئے دستوں میں سے ایک دستہ باہر نکلا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سب گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ گئے۔ وہ سالار ابھی تک ڈٹا ہوا تھا لیکن جلد ہی محمود کی تلوار کا نشانہ بن گیا۔

یہ خبر سب سے پہلے بھیم نے جے پال کو سنائی۔ وہ اس وقت اپنی فوجوں سے الگ ہٹ کر لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی اسے یقین ہوگیا کہ اب کسی انتظار کی ضرورت نہیں، باقاعدہ جنگ کرنی پڑے گی۔

نوجوان سالار کے قتل کی جتنی خوشی بھیم کو ہوئی تھی، کسی

کو نہیں ہوگی۔ اس نے اس سالار کو یہ ترکیب سمجھائی تھی کہ اسلامی لشکر کی پشت سے حملہ آور ہو۔ اس نے اس درّے کی نشاندہی کی تھی جس میں داخل ہو کر وہ مسلمانوں کی پشت تک پہنچا تھا حالانکہ بھیم جانتا تھا کہ پہاڑوں میں اسلامی لشکر کے مورچے بنے ہوئے ہیں۔ یہ قدم بھیم کو اس لیے اٹھانا پڑا تھا کہ پردھان منتری کی بیٹی چمپا کا ایک امیدوار وہ بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر نوجوان سالار سبکتگین کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو چمپا سے اس کی شادی یقینی ہے۔

اب اس کے راستے کا یہ کانٹا نکل گیا تھا۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب وہ مندر کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بھیم کے مندر آنے کی وجہ سے عام لوگوں کا داخلہ روک دیا گیا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ دو لڑکیاں مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت ہے جس کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری ہے۔ یہ عورت ان لڑکیوں کی ماں نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے لباس سے نوکرانی معلوم ہو رہی تھی۔

ان میں سے ایک لڑکی اتنی حسین تھی کہ اس کے بدن سے پھوٹنے والی روشنی سے مندر کی سیڑھیاں چمکنے لگی تھیں۔ پھولوں کی ایک ڈالی تھی جو بل کھاتی مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ کسی بات پر ہنسی تو بھیم لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ جے پال کی فوج کا سپہ سالار نہیں بلکہ اس لڑکی کے قدموں میں بیٹھنے والا ایک عام سا آدمی ہے۔ اس نے فوراً اپنی حالت پر قابو پالیا اور اپنے ساتھ چلنے والے سپاہیوں کو ڈانٹا۔

''تم تو کہتے تھے مندر کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں پھر یہ کون لڑکیاں ہیں جو ہماری موجودگی کے باوجود مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہیں؟''

''مہاراج! ہم انہیں نہیں روک سکتے تھے۔ ان میں سے ایک منتری جی کی بیٹی ہے۔'' سپاہیوں میں سے ایک نے اسے بتایا۔

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''کچھ دن پہلے تک میں منتری کی حویلی پر پہرے دار تھا۔ میں نے اسے وہیں دیکھا تھا۔''

''دوسری لڑکی کون تھی اور وہ عورت؟''

''لڑکی کو تو میں نہیں جانتا لیکن اس کے ساتھ آنے والی عورت منتری کے گھر میں نوکرانی ہے۔''

معما اب بھی برقرار تھا کہ ان دو لڑکیوں میں سے منتری کی بیٹی کون سی تھی۔ سپاہی سے یہ پوچھتے ہوئے اسے شرم آئی کہ ان میں سے منتری کی بیٹی کون سی تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں مندر کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر مندر کے اندر جا چکی تھیں۔ یہ اسے اچھا نہیں لگا کہ دوبارہ مندر میں جائے اور تصدیق کرے۔ اس نے دوبارہ سپاہیوں کو ڈانٹا مگر اب اس کی آواز میں طاقت نہیں تھی۔

''آئندہ خیال رکھنا۔ جب ہم مندر میں آئیں تو کوئی نہ آئے۔''

سپاہیوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے اس کا ''رتھ'' تیار کھڑا تھا۔ اس کے محافظ اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھے اور رتھ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

گھر پہنچتے ہی بھیم نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بستر پکڑ لیا۔ اس کا ذہن کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ شاید میں اسی لڑکی کے انتظار میں تھا۔ شاید یہی لڑکی مجھے ملنے والی تھی۔ کیا میں اسے حاصل کر لوں گا؟ کیوں نہیں۔ میں جے پال جیسے راجا کا سپہ سالار ہوں۔ میرے پاس بے پناہ دولت ہے۔ بس ایک کمی ہے جسے سمجھانا ہے۔ میری عمر چالیس کے قریب ہو گئی ہے اور وہ لڑکی بمشکل اٹھارہ کی ہوگی۔ عمروں کا یہ فرق راستے کی رکاوٹ نہ بن جائے۔ یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے۔ میری ماتا میرے پتا جی سے بیس سال چھوٹی تھیں۔ ایک کمی اور بھی ہے۔ اس نے سوچا۔ لڑکیاں دو تھیں۔ جس نے مجھے خرید لیا، وہ کون ہے منتری کی بیٹی یا کوئی اور؟ میں کس لڑکی کا خیال لے کر منتری کے گھر تک جاؤں؟ پھر بھی مجھے جانا تو چاہیے۔ وہ جس گھر میں رہتی ہوگی اس گھر کی دیواریں بھی اس کے ہونے کی گواہی دیں گی۔ گھر کی دہلیز پر خوشبو کھڑی پہرا دے رہی ہوگی۔'

بھیم کا رتھ، منتری کے دروازے پر جا کر رکا اور پہرے داروں نے دوڑ کر اندر خبر کی تو منتری کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ راج نیتی پر کیا افتاد آن پڑی جو بھیم میرے گھر تک چلا آیا۔ سلطنت کا کوئی معاملہ تھا تو مجھے دربار میں بلایا جا سکتا تھا۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ملازموں نے بھیم کو مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ بھیم اتنی دیر میں سوچ چکا تھا کہ اسے اپنے آنے کے جواز میں کیا بہانہ پیش کرنا ہے۔

منتری کمرے میں داخل ہوا تو ابھی تک اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

''آج میرے غریب خانے کو شوبھا دینے کا خیال آپ کو کیسے آ گیا؟''

''بات ہی ایسی تھی کہ آپ سے مشورے کی ضرورت مجھے یہاں کھینچ لائی۔''

''سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''غزنی کے بادشاہ نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔''

''مہاراج کئی مرتبہ مجھ سے اس کا ذکر کر چکے ہیں۔''

''اب وہ اس کے خلاف لشکر کشی کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

''یہ بھی مجھے معلوم ہے۔''

''آپ کے خیال میں کیا یہ فیصلہ ٹھیک ہے؟''

''اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس بیچ آپ کیا کہتے ہیں؟'' منتری نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اختلاف ہے تو یہ کہ وہ یہ جنگ غزنی پہنچ کر لڑنا چاہتے ہیں۔''

''اس پر بھی آپ کو اعتراض کیوں ہے؟''

''مسلمان لڑاکا قوم ہے۔ ایک تو یوں بھی ان سے لڑنا آسان نہیں۔ اگر ہم غزنی پر حملہ آور ہوئے تو ارد گرد کی دوسری طاقتیں بھی اسلام کے نام پر اس کی مدد کو آ جائیں گی۔''

''شری بھیم! آپ تو راجپوت ہیں۔ آپ کے دل میں ڈر کیوں آیا؟ ہم برہمن مارا ماری سے دور رہتے ہیں۔ ہم ایسی باتیں کریں تو شوبھا بھی دیتا ہے۔ پھر یہ کہ آپ کے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ جورو نہ جاتا۔ آپ کو کیا فکر۔''

''کچھ دنوں بعد آپ یہ طعنہ نہیں دے سکیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ شاید میں شادی کر لوں۔''

''ارے واہ، کون ہے ہماری بھرجائی۔''

''ایک لڑکی دیکھی تو ہے۔ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔''

''تم اب بھی مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''تم سے کیا چھپانا مگر بات یہ ہے کہ میں ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''یہ خوب کہی۔''

''میں نے اسے مندر میں دیکھا تھا۔ کون ہے، کس کی بیٹی ہے ذرا چھان بین کر لوں تو پھر تم سے بات کروں گا۔''

وہ مہمان خانے میں بیٹھا تھا اور اب اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک مانوس سی خوشبو اسے چھوتی ہوئی گزر گئی... اس کے ساتھ ہی منتری نے کسی کو آواز دی۔

''چمپا، دیکھو بھیم چاچا آئے ہیں۔ ان کے لیے ملازموں سے کہہ کر جل پانی کا انتظام کرو۔''

اس نام پر بھیم نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیکھنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہی لڑکی جسے اس نے مندر میں دیکھا تھا، دروازے تک آئی اور ''اچھا'' کہہ کر دروازے کے قریب سے گزرنے والی راہداری کی طرف چلی گئی۔

وہ اس امید میں بیٹھا رہا کہ شاید چمپا دوبارہ آئے لیکن جب ملازموں نے کئی قسم کے پکوان میز پر سجا دیے اور وہ نہیں آئی تو بھیم کا منہ لٹک گیا۔

''جسے آپ نے چمپا کہہ کر بلایا تھا، کیا وہ آپ کی بیٹی تھی؟''

''آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔''

''یہ مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں گئی۔ کیا میں اتنا ڈراؤنا ہوں؟''

''شاید کہیں جانے کے لیے ادھر سے گزری ہو۔ جلدی میں ہوگی ورنہ آتی ضرور۔ اس کی ایک سہیلی ہے جو ملتان سے آئی ہوئی ہے۔ آج کل اسی کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی طرف گئی ہوگی۔''

بھیم کو یاد آ گیا کہ مندر میں اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہی ہوگی جو ملتان سے آئی ہوئی ہے۔

اسے فی الحال منتری سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس نے اجازت لی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ راستے بھر اس کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ ''دیکھو بھیم چاچا آئے ہیں۔'' میری اور اس کی عمروں میں واقعی اتنا فرق ہے؟ میں اس لڑکی کا ہاتھ مانگتا ہوا کیا اچھا لگوں گا لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اسے پھر یاد آ گیا کہ اس کا باپ اس کی ماں سے بیس سال بڑا تھا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ جے پال غزنی کی طرف بڑھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ بار بار بھیم سے مشورے کر رہا تھا۔ بھیم بار بار کی ملاقاتوں میں جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ غزنی پر حملہ آور ہونے کا خیال دل سے نکال دے کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر ایک مرتبہ وہ اس جنگ میں پھنس گیا تو نہ جانے کب نکلنا ہو۔ اس کی کوششیں بے کار جا رہی تھیں۔ جے پال کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جنگ کے اس ماحول میں اتنی نازک بات وہ منتری سے کس طرح کر سکتا تھا جبکہ منتری یہ بہانہ کر سکتا تھا کہ ابھی سلطنت کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اسی دوران وہ واقعہ پیش آ گیا تھا جب نوجوان سالار نے جے پال سے وچن لیا کہ اگر وہ سبکتگین کو قتل کر دے تو اس کی شادی منتری کی بیٹی سے

کردی جائے گی۔ بھیم نے اس وقت بھی نوجوان کی دل شکنی کی اور مہاراج کو یہ وچن دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے اسی وقت تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس نوجوان کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ یہ موقع اسے جنگ شروع ہونے سے ایک دن پہلے مل گیا جب وہ گھوڑے پر سوار ہوکر میدان کے جائزے کے لیے نکلا اور میدان کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اس درّے تک پہنچ گیا جسے پار کرنے کے بعد اسے اسلامی لشکر کی پشت پر پہنچنا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اسے دفاعی افواج سے ٹکرانا پڑ گیا۔

☆☆☆

جے پال نے بھیم کی اجازت کے بغیر ہی آگے بڑھنے کا بگل بجوا دیا جس کا مطلب تھا تمام فوج ایک ساتھ حملہ کردے۔ بگل بجتے ہی جے پال نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا، مجبوراً بھیم کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔ اسّی ہزار کا لشکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور اتنا شدید تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لاکر بڑی دور تک پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ کچھ دور جاکر سنبھلے اور پھر مقابلے پر آئے لیکن ہندو لشکر کی تعداد اتنی تھی کہ انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ ہر طرف سے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔ یہ نعرے ہی کمک کو بلانے کا اشارہ تھے جسے سنتے ہی تمام اسلامی لشکر دفاعی مورچے چھوڑ کر مدد کے لیے آگیا۔ جنگ کا بازار ایسا گرم ہوا کہ خدا کی پناہ۔ ہندوؤں کو چونکہ اپنی کثرت پر گھمنڈ تھا اس لیے بے خوفی سے آگے بڑھ رہے تھے اسی لیے ان کا نقصان بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگ جاری رہی تو ایک ہندو بھی باقی نہیں بچے گا۔ اب معلوم نہیں یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی یا ہندوؤں کی کہ وقت نے اپنے پر سمیٹ لیے۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ راجپوتوں نے واپسی کا بگل بجایا۔

رات ہوئی تو دونوں طرف سے چند سائے نکلے اور اپنی اپنی لاشیں میدان سے اٹھانے لگے۔

دوسرے دن پھر دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔ دن بھر میدان گرم رہا۔ غروب آفتاب کے وقت پھر بے نتیجہ جنگ ختم ہوئی۔ بڑی تعداد میں مسلمان بھی شہید ہوئے اور راجپوت بھی۔

تیسرے دن بھی معرکہ گرم رہا۔ کبھی مسلمان پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوجاتے تو کبھی راجپوتوں پر لرزہ طاری ہوجاتا لیکن کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ تین دن کے سخت معرکے کے بعد بھی نہ کسی کو فتح ہوئی نہ شکست۔

تین دن گزرنے کے بعد تشویش کا ہونا لازمی تھا۔ یہ جنگ آخر کب تک جاری رہے گی؟ اسلامی لشکر میں بددلی ظاہر ہونے لگی تھی۔ سب کو یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا اس کے باوجود بھی فیصلہ نہیں ہوسکے گا۔ یہی حال جے پال کے لشکر کا بھی تھا بلکہ انہیں زیادہ پریشانی تھی۔ وہ اپنی عددی برتری پر نازاں تھے لیکن اس کے باوجود فتح نصیب نہیں ہورہی تھی۔ ہندو بڑی تعداد میں ہلاک ہوئے تھے۔ وہ تو اب یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر ہمارے لوگ اسی طرح مرتے رہے اور جنگ کچھ دن اور جاری رہی تو ہماری تعداد مسلمانوں کی تعداد... سے بھی کم ہوجائے گی۔

سبکتگین نے اپنے سرداروں کا اجلاس طلب کیا تھا اور اس صورت حال پر غور کیا جارہا تھا۔

"جے پال کے لیے رسد اور کمک کے راستے بند نہیں ہیں۔ وہ اس جنگ کو مزید طول دے سکتا ہے لیکن ہم غزنی سے دور آگئے ہیں۔ اس جنگ کا فیصلہ ہو تو کیونکر ہو۔"

بعض نے یہ رائے دی کہ جے پال سے صلح کرلی جائے لیکن محمود تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔

"میں صلح کے حق میں ہرگز نہیں۔ اس سے ہندوؤں کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ وہ جب چاہیں گے ہمیں پریشان کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے ان کا سر کچلنا ہوگا۔"

"ہمیں کب انکار ہے لیکن کوئی صورت تو ہو۔ تین دن گزر گئے کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اس سے پہلے کہ ہمیں شکست ہو، صلح کرلینی چاہیے۔ نقصان ہندوؤں کا زیادہ ہوا ہے، وہ ضرور صلح پر تیار ہوجائیں گے۔"

"میں اس ذلت کے حق میں نہیں۔" محمود نے کہا۔

"جنگوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں ہندوؤں کی طاقت کا اندازہ ہوگیا ہے۔ آئندہ اسی کے مطابق تیاری کے ساتھ ہم دوبارہ آسکتے ہیں۔"

"اگر ہم نے صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اسے ہماری کمزوری سمجھا جائے گا اور ہندو اپنی شرائط پر صلح کریں گے۔ کوئی شرط ہمارے لیے ذلت کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی کمزوری ظاہر نہ ہونے دیں۔ میں یہ بات ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم ڈٹے رہے تو جے پال صلح کے لیے مجبور ہوجائے گا۔ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ کل کا سورج نکلتے ہی اس شدت سے حملہ کرو کہ یا تو شہادت نصیب ہو یا ہم فتح یاب ہوں۔"

محمود کی باتوں نے سب کو متاثر کیا اور سب نے یہ عہد کیا کہ ہم فتح کی تلاش میں آخری دم تک لڑیں گے۔

سبکتگین نے دعا کرائی کہ......

''اے اللہ! تیرے یہ عاجز بندے تیرے دین کو ہندوستان کے کفرستان تک پھیلانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ ہم نے اپنی طاقت کا پورا مظاہرہ کر دیا۔ تین دن ہو گئے، ہمیں فتح حاصل نہیں ہوئی۔ کوئی ایسا معجزہ دکھا، کوئی ایسی سبیل نکال کہ ہندو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہمیں باعزت صلح نصیب ہو یا فتح۔''

اس رات کی صبح ہوئی تو جنگ شروع ہونے سے قبل دو واقعات رونما ہوئے جن کی اہمیت اسے بعد میں معلوم ہوئی۔

دو سوار سفید پرچم لہراتے ہوئے اسلامی لشکر کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ان سواروں نے آتے ہی سبکتگین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں سبکتگین کے پاس پہنچا دیا گیا۔

سبکتگین مسلح ہو کر میدان جنگ میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے ان دو سواروں کی آمد کی اطلاع ملی اور پھر انہیں سبکتگین کے حضور باریاب کر دیا گیا۔ سبکتگین نے نہایت شفقت سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

''اگر تم لوگ صلح کے لیے آئے ہو تو تمہارا آنا کافی ہے۔ صلح کا معاہدہ تحریری ہوتا ہے اور ذمے دار اشخاص کے درمیان ہوتا ہے۔''

''ہم صلح کے لیے نہیں آئے ہیں، صرف آج کی مہلت درکار ہے۔ ہم چاہتے ہیں آج جنگ نہ ہو۔''

''وہ کس لیے؟''

''ہمارے لوگ بہت بڑی تعداد میں مارے گئے ہیں۔ ہم رات بھر لاشیں اٹھاتے رہے لیکن اب بھی بہت سی لاشیں کھلے میدان میں پڑی ہوئی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ان لاشوں کو اٹھا لیں اور چتائیں جلانے کا وقت مل جائے۔ ہمارے راجا نے پیغام بھجوایا ہے کہ آج جنگ نہ کی جائے۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہاری طرف سے دھوکا نہیں ہوگا؟''

''ہم راجپوت ہیں، وچن کے پکے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم تحریری طور پر لکھ کر دینے کو بھی تیار ہیں۔''

سبکتگین نے کچھ دیر سوچا۔ اس میں اسے کوئی حرج نظر نہیں آیا۔ اس نے سوچا اچھا ہے، اس کے سپاہیوں کو بھی آرام کا موقع مل جائے گا۔ گھوم پھر کر یہ بھی دیکھ لیا جائے گا کہ ادھر ادھر کسی مسلمان کی لاش پڑی تو نہیں رہ گئی ہے۔ اس نے ان سواروں کو یقین دلا دیا۔ اپنے لشکر میں بھی کہلوا دیا کہ آج آرام کا دن ہے لیکن یہ بھی ہدایت کر دی گئی کہ چوکنا رہیں تاکہ راجپوتوں کی طرف سے چالاکی دکھائی گئی اور اچانک حملہ کر دیا گیا تو مقابلہ کیا جا سکے۔

کچھ لوگوں نے آرام کو ترجیح دی لیکن کچھ لوگ پہاڑوں پر گھوم پھر کر راجپوتوں کی نقل و حرکت کا جائزہ بھی لیتے رہے۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ سورج پوری طرح اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ سردی کی شدت میں بھی کمی آ گئی تھی کہ ایک نہایت ضعیف عورت جس کی کمر جھکی ہوئی تھی، لکڑی ٹیکتی ہوئی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوئی اور لشکر میں داخل ہوئی۔ اس ویرانے میں اتنی ضعیف عورت کی موجودگی سب کے لیے حیران کن تھی۔ چند سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔

''اماں! یہاں تو دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں، تم کہاں سے نکل آئیں اور وہ بھی اس جنگ کے موسم میں۔''

''پہلے تو یہ سن لو کہ میں مسلمان ہوں پھر یہ سنو کہ میں تمہارے امیر سے ملنے آئی ہوں۔'' وہ ضعیفہ سنسکرت نہیں بلکہ فارسی بول رہی تھی لہٰذا بہت سوں کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

''تم ہمارے امیر سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟''

''میں نے سنا ہے وہ غزنی کا بادشاہ ہے۔''

''ہاں، وہی غزنی کا بادشاہ ہے۔''

''مجھے اس کے پاس لے چلو۔ مجھے جو بتانا ہے اسی کو بتاؤں گی۔''

اسے سبکتگین کے پاس پہنچا دیا گیا۔

''مجھے خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ جس کی تجھے ضرورت ہے، تجھے وہ بتاؤں۔''

''مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟''

''جہاں ہندوؤں نے خیمے لگائے ہوئے ہیں، اس کے قریب ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ اس چشمے کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر اس میں غلاظت یا کسی جانور کا خون ڈال دیا جائے تو دیوتا ناراض ہو جاتے ہیں اور شدید برف پڑتی ہے اور طوفان آتا ہے۔ اتنا کہ انسانی اختیار سے باہر۔''

یہ حکایت سن کر سبکتگین کو ہنسی آ گئی۔

''اے بادشاہ! یہ تمہارے لیے اس لیے ہنسی کی بات نہیں کہ یہ تمہارا نہیں ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔''

''اسی لیے تو ہنس رہا ہوں کہ یہ کیسا عقیدہ ہے اور یہ تم

مجھے کیوں سنانے آگئیں؟‘‘

’’اس لیے کہ مجھے یہی بشارت ہوئی تھی کہ اس عقیدے کی بابت میں تمہیں بتاؤں اور تم اس چشمے میں غلاظت ڈلوا دو۔ سخت طوفان آئے گا اور برف باری ہوگی۔ یہ چشمہ ہندوؤں کے خیموں کے قریب سے گزرتا ہے اس لیے اس طوفان کا اثر وہاں زیادہ ہوگا۔ ہندو سمجھ جائیں گے کہ ان کے دیوتا ان سے ناراض ہوگئے ہیں لہٰذا اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔‘‘ (ڈبلیو ہنٹر کی کتاب تاریخ ہند میں ہندوؤں کے اس عقیدے کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ یہ اطلاع ایک بڑھیا نے دی تھی)۔

’’اگر یہ چشمہ اتنا ہی اہم ہے تو وہ اس کی حفاظت کیوں نہیں کرتے؟ کسی کو غلاظت کیوں ڈالنے دیتے ہیں؟‘‘

’’ارے کیا کریں حفاظت کر کے پہاڑ اور میدان ہی تو ہیں۔ طوفان آتا ہے تو آئے اور پھر ہر ہندو کو معلوم ہے اس لیے کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ جب سے تم لوگ یہاں آئے ہو وہ خوب حفاظت کر رہے ہیں۔ انہیں یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں لیکن یہ سوچ کر مطمئن بھی ہیں کہ مسلمانوں کو اس عقیدے کا علم کہاں ہوگا۔‘‘

’’جب وہ چشمے کی حفاظت کر رہے ہیں تو ہم اسے غلیظ کیسے کریں گے؟‘‘

’’میں تمہیں ایک ایسے مقام کا پتا بتاؤں گی جہاں سے یہ چشمہ نکلتا ہے اور بہتا ہوا ہندوؤں کے خیموں کی طرف جاتا ہے۔ پھر اگر طوفان نہ بھی آیا تو وہ پانی کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ پانی کو گندا کر دیا گیا ہے اور اب ان کی خیر نہیں۔ لہٰذا وہ بھاگ کھڑے ہوں گے اور واقعی اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو بھی تمہارا فائدہ ہے۔‘‘

’’تمہیں اس عقیدے کا علم کیسے ہوا؟‘‘

’’بادشاہ سلامت! میری عمر 135 سال ہوگئی ہے۔ میں بچپن سے ہی سنتی چلی آئی ہوں۔ میرے بزرگوں کو معلوم تھا اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔‘‘

’’تم اس ویرانے میں کیسے آئی ہو؟‘‘

’’یہاں سے کچھ فاصلے پر چھوٹی سی آبادی ہے۔ میں وہیں رہتی ہوں۔ تمہاری اور جے پال کی فوجوں کو دیکھ کر ہم لوگ اور آگے کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ اس خواب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں تجھ تک پہنچوں۔‘‘

’’تم کسی کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئیں...... کیا تمہارا کوئی نہیں ہے؟‘‘

’’تمہیں تعجب ہوگا کہ اس گاؤں میں ہم دو مسلمان تھے۔ میں اور میرا شوہر۔ کچھ دنوں پہلے میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ میں اس کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھوا سکی۔ یونہی دفن کر دیا۔ اب میں وہاں اکیلی ہوں۔‘‘

’’تم ہمارے ساتھ غزنی چلو گی؟‘‘

’’لو، کوئی اپنے شوہر کو چھوڑ کر بھی جاتا ہے۔ اب میری زندگی کتنے دن کی رہ گئی ہے۔ مرنے کے بعد میری قبر بھی میرے شوہر کے برابر بن جائے گی۔ کہیں اور چلی گئی تو اپنے شوہر کی قبر سے دور چلی جاؤں گی۔‘‘

’’کیا تم ہم میں سے کسی کو وہ چشمہ دکھاؤ گی؟‘‘

’’کسی کو میرے ساتھ بھیج دو۔ میں وہ چشمہ دور سے دکھا دوں گی اور اسی طرف مڑ جاؤں گی جہاں آج کل میرے گاؤں والے خیمہ ڈالے پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

سبکتگین نے اس بڑھیا کے ساتھ دو نہایت اہم ذمے داروں کو کر دیا کہ وہ اس چشمے کو دیکھ کر آئیں کیونکہ ابھی تک یہ شک بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بڑھیا کا دماغ نہ چل گیا ہو اور وہ غلط اطلاع دے رہی ہو۔ کسی نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ کہیں یہ بڑھیا انہیں دھوکے سے کہیں نہ لے جا رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ راجپوت کہیں گھات لگا کر بیٹھے ہوں لہٰذا یہ بھی طے کیا گیا کہ کچھ مسلح لوگ بھی ان کے ساتھ کر دیے جائیں۔ ضعیفہ پیدل چلنے پر بضد تھی لہٰذا دو سردار اس کے ساتھ پیدل چلے اور مسلح گروہ اپنے گھوڑوں پر سوار دلکی چال سے چلتے ہوئے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ سب پریشان تھے کہ چشمہ اگر دور ہوا تو یہ بڑھیا اس دھیمی چال کے ساتھ کب تک وہاں پہنچے گی۔

وہ بڑھیا انہیں لے کر ایک درّے میں داخل ہوئی۔ درّہ عبور کرنے کے بعد ایک میدان آ گیا۔ یہ میدان بہت طویل تھا لیکن شکر ہے کہ میدان پورا پار نہیں کرنا پڑا۔ وہ درمیان ہی سے مڑ گئی اور ایک پہاڑ کے نیچے جا کر کھڑی ہوگئی۔

’’میں تو اس پہاڑ کے نیچے چلتے چلتے وہاں پہنچ جاؤں گی جہاں ہم لوگ تم لوگوں کی جنگ کی وجہ سے اپنا گاؤں چھوڑ کر چلے گئے ہیں لیکن تمہیں اس پہاڑ پر چڑھنا پڑے گا۔ یہ پہاڑ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اوپر جا کر جب تم نیچے دیکھو گے تو تمہیں وہ چشمہ نظر آ جائے گا۔ یہی چشمہ آگے چل کر راجپوتوں کے خیموں تک چلا جائے گا۔ اس کا پانی اتنا شفاف ہے کہ جب تم اس میں خون ڈالو گے تو اس کا پانی فوراً گدلا ہو جائے گا اور ہندو سمجھ لیں گے کہ اس میں کسی نے غلاظت پھینکی ہے۔‘‘

یہ کہہ کر بڑھیا تو چلی گئی اور مجاہدوں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ چوٹی پر پہنچ کر انہوں نے مشرق کی طرف دیکھا تو صاف نظر آیا کہ کچھ لوگ اس چشمے کے کنارے گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ دور نہیں تھے اس لیے آسانی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ ایک چٹان ان کے درمیان حائل تھی اس لیے شاید وہ لوگ انہیں دیکھ سکتے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ نیچے کیسے اترا جائے تاکہ غلاظت چشمے میں ڈالی جا سکے۔ وہ پہاڑ پر چلتے ہوئے دور تک چلے گئے ایک جگہ پہاڑ سے نیچے اترنے کے لیے ایسی ڈھلان تھی جس سے کسی بھی جانور کو بہ آسانی نیچے اتارا جا سکتا تھا۔ وہ خود بھی جائزہ لینے کے لیے نیچے اتر گئے۔ یہ چشمہ کسی پہاڑ سے بہتا ہوا آرہا تھا۔ وہ اس چشمے کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چشمہ بل کھا کر مشرق کی طرف مڑ گیا تھا، گویا راجپوتوں کے خیموں کی طرف جا رہا تھا۔ پہاڑ کے اوپر سے ان کے خیمے نظر آرہے تھے لیکن یہاں پہاڑ اس طرح حائل ہو گیا تھا کہ اس طرف کا منظر نظر نہیں آرہا تھا، نہ وہ (راجپوت) اس طرف کا منظر دیکھ سکتے تھے۔

''ہم دو گھوڑے کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچا دیں۔ یہیں انہیں ذبح کریں اور ٹکڑے کر کے چشمے میں ڈال دیں۔ دو گھوڑے پانی کو اتنا بدرنگ ضرور کر دیں گے کہ ہندو ڈر جائیں گے اور اگر واقعی رات میں طوفان آگیا تو ہندو بالکل ہی بدحواس ہو جائیں گے۔''

ان کے ساتھی جن گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے وہ نہایت قیمتی تھے۔ انہیں ذبح کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سبکتگین کو بتانا بھی تھا لہٰذا وہ واپس چلے آئے اور سبکتگین کے سامنے تمام ماجرا بیان کیا۔ جنگ کے دوران جو گھوڑے زخمی ہو گئے تھے، ان میں سے دو گھوڑے الگ کر لیے گئے۔ ایک مرتبہ یہ لوگ پھر اس پہاڑ کی طرف گئے اور کسی نہ کسی طرح ان گھوڑوں کو پہاڑ پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا اور جہاں سے یہ چشمہ بل کھا کر مشرق کی طرف جاتا تھا، وہاں ان گھوڑوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے چشمے میں ڈال دیا۔

☆☆☆

شام ہونے کے قریب تھی کہ ہندوؤں کے لشکر میں ایک شور برپا ہوا۔ ہے بھگوان، ہے بھگوان کی آوازیں بلند ہوئیں اور لوگ چشمے کی طرف دوڑنے لگے۔ کنارے پر ایک میلا سا لگ گیا۔ ہر چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار تھے۔

''پانی کا رنگ بدل گیا ہے۔''

''یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟''

''مسلمانوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ کوئی ہندو تو یہ کر نہیں سکتا کہ چشمے کو ناپاک کرے۔''

عام سپاہیوں میں خبر پھیلی تو بھیم تک بھی پہنچی۔ وہ جے پال کے پاس پہنچا۔

''تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' جے پال نے پوچھا۔ ''کیا حملہ ہو گیا؟''

''حملے سے بھی بڑی بات ہو گئی ہے مہاراج۔ کسی نے متبرک چشمے میں خون ڈال دیا۔''

''خون ڈال دیا؟ یہ کس پاپی کی حرکت ہے۔''

''سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی حرکت ہے۔''

''مسلمان یہاں سے کہاں سے آگئے؟''

''یہ خون پہاڑوں کی چوٹی سے ڈالا گیا ہے۔''

''مسلمانوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ چشمہ متبرک ہے؟''

''یہ سب تو مجھے نہیں معلوم مگر ایسا ہو چکا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر اس چشمے میں غلاظت ڈالی جائے تو دیوتاؤں کا غضب نازل ہوتا ہے۔ بزرگوں سے بھی یہی سنتے چلے آئے ہیں۔ اب ہماری رکھشا کون کرے گا۔ دیوتا تو ہماری حفاظت سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ سب لوگ سجدے میں گر جائیں اور رو رو کر دعائیں مانگیں۔ شاید دیوتاؤں کو رحم آجائے۔''

پورے لشکر میں رونے اور چیخنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ وہ رو رو کر دیوتاؤں کو خوش رکھنے میں مصروف رہے اور کوئی ایسی تدبیر نہ کر سکے کہ ممکنہ طوفان سے بچا جا سکے کیونکہ ان کا عقیدہ ہی یہ تھا کہ چاہے جتنی کوشش کر لی جائے، طوفان تو آ کر رہے گا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ رات آگے چلنے لگی۔ ہواؤں میں تیزی آگئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ طوفان کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہندو اسے اتفاق نہیں سمجھتے تھے۔ طوفان سے بچاؤ کرنا، دیوتاؤں سے لڑنا تھا اس لیے جو جہاں تھا، وہیں سہما بیٹھا رہا۔ آگ کے الاؤ تک روشن نہیں کیے کہ کچھ تو سردی کم ہوتی۔

دیکھتے دیکھتے ہواؤں نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے آگئے۔ پہاڑوں پر برف گر رہی تھی۔ ہوائیں برف کی

سلوں سے ٹکرا کر آتیں تو خنجر کی طرح بدن میں اتر جاتیں۔ لگتا تھا یہ سب بھی برف کی طرح جم جائیں گے۔ جانور تک اس سردی کی تاب نہ لا کر مرنے لگے تھے۔ لگتا تھا صبح تک شاید کوئی بھی زندہ نہ بچے۔

مسلمانوں کے لشکر میں بھی حال اس سے مختلف نہیں تھا لیکن ایک تو وہ شدید سردی کے عادی تھے، دوسرے انہوں نے روتے رہنے میں وقت نہیں گزارا تھا۔ وہ اسے قدرتی آفت سمجھ رہے تھے اس لیے مسلسل تدبیروں میں معروف رہے۔ سرد ملک کے رہنے والے تھے اس لیے ایسی پوشاکیں بھی ان کے پاس تھیں جو انہیں سردی سے بچا سکتی تھیں۔ بڑے پیمانے پر لکڑیاں جلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے برتنوں میں انگارے بھر کر خیموں میں رکھ لیے گئے تھے۔ خیموں کی چوبوں پر بھی بار بار ہتھوڑے برساتے رہتے تھے تاکہ اکھڑ نہ جائیں۔ غرض وہ اپنا بچاؤ کرتے رہے۔ ان کا نقصان بہت کم ہوا۔

رات کے آخری پہر میں ہوا کی تیزی میں کچھ کمی آنے لگی اور صبح تک ہوائیں تھم گئیں البتہ کہرا اتنا تھا کہ دن میں رات کا منظر تھا۔ جب خوب دن چڑھ گیا تو سورج نے آنکھیں دکھائیں۔ سردی اب بھی تھی لیکن دھوپ کی تمازت اس کی شدت کو کم کر رہی تھی۔ ہر طرف بربادی کا سماں تھا۔ خیمے اکھڑے پڑے تھے۔ انسانی لاشیں اکڑی پڑی تھیں۔ بھیم، جے پال کے قدموں میں اکڑوں بیٹھا تھا۔

"مہاراج! ہمارے یہاں سے جائے بغیر دیوتاؤں کے غضب میں کمی نہیں آئے گی۔ جتنی جلدی ہو، ہمیں یہ میدان خالی کر دینا چاہیے۔"

"میں مسلمانوں کو شکست دیے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"تو کیا آپ دیوتاؤں سے لڑیں گے؟"

"میری کیا مجال مگر میں مسلمانوں سے ضرور لڑوں گا۔"

"لشکر میں بہت بددلی پھیلی ہوئی ہے۔ رات بھر میں ہزاروں افراد مر گئے ہیں۔ لڑنے کی طاقت کس میں ہے، جو کوئی ہمارے لیے لڑے گا۔ اگر ہم نے زبردستی کی تو سب ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے ایک برہمن نے بتایا تھا کہ جب بھی ایسا ہو تو وہ جگہ خالی کر دو تاکہ دیوتا اپنی داسیوں کے ساتھ اتریں اور چشمے کی صفائی کریں۔ ورنہ ہر رات ایسے ہی طوفان آتے رہیں گے۔"

"بھیم، لشکر میں اعلان کر دو کہ ہم آج ہی لاہور کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔ میں دوبارہ اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"مہاراج! مسلمان ہم پر نظر رکھے ہوں گے۔ اگر انہوں نے دیکھا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو وہ ہمارا تعاقب کریں گے اور ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گے اور ممکن ہے لاہور پر قابض ہو جائیں گے۔"

"عجیب آدمی ہو، واپسی کا مشورہ بھی دیتے ہو اور واپسی سے روکتے بھی ہو۔"

"اگر ہم صلح کر کے جائیں تو واپسی کا راستہ عزت سے طے ہو جائے گا۔"

"میں ایک ملیچھ کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھاؤں؟"

"کیا کریں مجبوری ہے۔ ہم یہ سب دیوتاؤں کے سکون کی خاطر کریں گے۔"

"وہ صلح پر آمادہ ہو جائے گا؟ اگر اس نے صلح سے انکار کر دیا تو یہ میری اور بھی بے عزتی ہو گی۔"

"سلطان غزنی اس صلح سے انکار نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے ہمارے لشکر کی کثرت کا علم ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ تین دن گزرنے کے باوجود وہ ہم پر غالب نہ آ سکا۔ رات جو طوفان آیا ہے۔ اس نے اسے بھی دہلا دیا ہو گا۔"

جے پال نے سب کے مشورے سے ایک وفد ترتیب دیا اور اس وفد کو کچھ اختیارات دے کر سلطان ناصر الدین سبکتگین کے پاس روانہ کر دیا۔

سبکتگین کو معلوم ہوا کہ راجا جے پال کی طرف سے کوئی وفد ملاقات کے لیے آیا ہے تو اس نے بھی اپنے فرزند محمود اور مزید دو سرداروں کو اپنے خیمے میں طلب کر لیا اور وفد کو حاضری کا پروانہ جاری کر دیا۔

سبکتگین نے ایسا وفد اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وفد کے ارکان کے چہروں پر سخت خوف طاری تھا اور جسم پر ہلکی سی لغزش طاری تھی جو کسی خوف کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"آپ لوگ اتنی گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ لشکر میں سب خیریت تو ہے؟"

"خیریت کہاں..... کیا آپ نے رات کا طوفان نہیں دیکھا؟"

"یہ طوفان تو ہم پر بھی گزرا ہے۔ ہم نے تو اسے قدرتی آفت سمجھ کر برداشت کر لیا۔"

"ہمارے دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اب ہم مزید جنگ نہیں کر سکتے۔ ہمارے راجا نے صلح کا پیغام لے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اپنے ملک واپس چلے جائیں اور ہم بھی واپس ہو جائیں ورنہ ایسا ہی ایک طوفان آج رات بھی آئے گا۔"

''اس کے باوجود ہم صلح پر تیار نہیں۔'' محمود نے دخل دیا۔
سبکتگین کو محمود کی رائے سے اختلاف تھا۔ اس کی رائے میں ان حالات میں صلح ہی بہترین راستہ تھی۔ اب محمود اور سبکتگین میں بحث ہونے لگی تھی۔ دوسرے سرداروں نے بھی محمود کی حمایت کی اور بات اس نتیجے پر پہنچی کہ اس وقت صلح کرنا دانش مندی نہیں۔
راجپوتوں کا وفد مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔
یہ وفد واپس گیا تو جے پال کامیابی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔
''کن شرائط پر صلح کر کے آئے ہو؟''
''صلح کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سلطان نے ہمارا پیغام ٹھکرا دیا بلکہ یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ سلطان تو صلح کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن اس کے بیٹے محمود نے مخالفت کی۔''
''کیا تم نے راجپوتوں کی عددی کثرت سے انہیں خائف نہیں کیا؟''
''وہ ہماری کثرت سے بالکل بھی خائف نہیں۔''
''تم نے انہیں طوفان یاد نہیں دلایا تھا؟''
''وہ اسے اتفاق سمجھتے ہیں۔''
''کیا وہ نقصان سے بھی خائف نہیں؟''
''ہم نے ان کا کوئی خیمہ گرا ہوا نہیں دیکھا۔ اس طوفان نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''
''اس کا مطلب ہے دیوتا صرف ہم سے ناراض ہیں۔ اب یہ صلح اور بھی ضروری ہے۔''
''یہ صلح ہو تو کیسے ہو؟ اس کا بیٹا اور دوسرے سردار صلح کے لیے بالکل تیار نہیں۔''
مایوسی پاؤں پکڑنے لگی تھی کہ سپہ سالار بھیم نے درمیان کا راستہ نکالا۔
''سلطان صلح کرنے میں شاید اس لیے تاخیر کر رہا ہے کہ وہ ہمیں مجبور کر کے تاوانِ جنگ طلب کر سکے۔''
''تو کیا میں یہ ذلت منظور کر لوں جبکہ اس جنگ میں میرا نقصان زیادہ ہوا ہے۔'' جے پال نے کہا۔
''اس وقت ہم کسی بھی قیمت پر صلح کرنے کے لیے مجبور ہیں۔'' بھیم بولا۔
''اگر ہم جنگ کر کے اسے صلح پر مجبور کر دیں؟''
''ہمارے سپاہیوں میں لڑنے کی ہمت نہیں۔ دیوتا بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔''
''وہ کتنا زرتاوان طلب کرے گا؟''
''تاوان کی کمی بیشی پر بات کی جاسکتی ہے لیکن وہ کچھ نہ کچھ تاوان تو طلب کرے گا۔''
جے پال نے اب دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک ایلچی کو بہت سی باتیں سمجھا کر سبکتگین کے پاس بھیجا۔
وفد کو روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایلچی آ گیا۔ سلطان کے خیمے میں ابھی تک اس کے سردار جمع تھے اور مشورے ہو رہے تھے۔ ایلچی کو بھی وہاں پہنچا دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر صلح کے پیغام پر بحث ہونے لگی۔ محمود اب پہلے سے بھی زیادہ طیش میں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے صلح کے پیغام کو سختی سے ٹھکرا دیا۔
''اب یا تو جے پال غزنی پہنچے گا یا ہم لاہور پر حکمرانی کریں گے۔ اس سے کم پر بات نہیں ہوگی۔''
اب ایلچی نے وہ داؤ چلایا جو سبکتگین کے جذبۂ ترحم کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔
''ابھی آپ اہلِ ہند اور خاص طور پر راجپوتوں کی جہالت اور تعصب کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں۔ اس قوم کی جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو یہ مجبور ہو کر یہ قدم اٹھاتے ہیں کہ اپنا تمام مال و اسباب اور بیش قیمت اشیا مایوس ہو کر آگ کی نذر کر دیتے ہیں اور اس فعل کو اپنی آخرت کی بہبودی تصور کرتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تو اپنے قدیم رواج کے مطابق اپنی عورتوں اور حرم سراؤں کو بھی نذرِ آتش کر دیتے ہیں اور پھر جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس دنیاوی مال و متاع کچھ نہیں رہا تو پھر یہ دشمن سے زبردست معرکہ آرائی کرتے ہیں اور اس معرکے میں اپنے آپ کو بالکل فنا کر دیتے ہیں اور سوائے مٹی کے ان کا نام و نشان کچھ باقی نہیں رہتا۔
''سلطان محترم! اب ان کی مصیبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اپنے پرانے دستور کے مطابق عمل کریں۔ اگر آپ کو ان کی تباہی و بربادی ہی منظور ہے تو خیر ورنہ بہتر یہی ہے کہ آپ صلح کر کے انہیں اس تباہی سے بچا لیں۔''
اس ایلچی کی یہ تقریر اتنی پُراثر تھی کہ سب کو متاثر کر گئی۔ سبکتگین تو ویسے ہی نہایت نرم دل تھا، محمود بھی پگھلنے لگا لیکن وہ جلد بازی کے حق میں بھی نہیں تھا۔
''ہم صلح پر تیار ہیں لیکن اپنے راجا سے کہو وہ ہمارے نقصان کے ازالے کے لیے تاوان کی رقم ادا کرے۔''
''نقصان تو ہمارا بھی ہوا ہے۔''
''پہل بھی تمہارے راجا نے کی تھی۔ لڑنے کے لیے

ہم نہیں آئے تھے، وہ نکلا تھا۔ ہم تو اس کا راستہ روکنے آئے تھے، البذا وہ اپنے نقصان کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''

''آپ کتنا تاوان طلب کریں گے؟ آپ کوئی رقم مقرر کرلیں تا کہ میں راجا سے منظوری لے لوں۔''

''ہم اپنی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں کرتے۔ اپنے راجا سے کہنا وہ جس قدر ادا کرسکتا ہے خود بتادے لیکن اسے یہ بھی باور کرادینا کہ رقم ہمارے نقصان اور ہماری حیثیت کے مطابق ہو۔''

محمود نے زرِ تاوان کی رقم کے تعین کا فیصلہ جان بوجھ کر جے پال پر چھوڑا تھا تاکہ اسے یہ تاثر نہ ملے کہ اسے مجبور کیا جارہا ہے۔ دوسرے یہ کہ رقم کا تعین کرتے ہوئے جے پال کی عزتِ نفس کو ٹھیس لگتی تھی۔

ایلچی اٹھ کر چلا گیا۔ فاصلہ ہی کتنا تھا۔ وہ منظوری لے کر بہت جلد واپس آگیا۔

''مہاراج، آپ کو پچاس ہاتھی اور ایک لاکھ درہم کے برابر رقم دینے کو تیار ہے۔''

''ہمیں منظور ہے۔'' سبکتگین نے کہا۔

''یہ ضمانت کون دے گا کہ راجا بدعہدی نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت تو وعدہ کررہا ہے لیکن ہندوستان جاکر اپنے وعدے پر قائم بھی رہے گا۔''

''میری تو کوئی حیثیت نہیں کہ میں ضمانت لوں۔ یہ تو راجا ہی بتاسکتا ہے۔'' ایلچی نے کہا۔

ایلچی اٹھ کر چلا گیا اور ایک قابلِ قبول ضمانت لے کر واپس آگیا۔

''مہاراج، اپنے ایک معتبر رکن ''دولت'' کو اس تاوان کے عوض گروی رکھیں گے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کی ایک جماعت ہمارے ساتھ کردیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ اس جماعت کو زرِ تاوان اور پچاس ہاتھی دے کر بہت جلد لاہور سے روانہ کردیں گے۔ جب یہ لوگ آپ کے پاس پہنچ جائیں تو آپ بھی ہمارے رکن سلطنت ''دولت'' کو رہا کر کے لاہور بھیج دیجیے گا۔''

بات معقول تھی سبکتگین نے اس پر اتفاق کیا۔

جب جے پال کا نمائندہ پہنچ گیا اور اپنے آپ کو سبکتگین کے حوالے کردیا تو سبکتگین نے بھی مسلمانوں کی ایک جماعت جے پال کے کیمپ میں بھیج دی۔

اس جماعت کو لاہور جانا تھا اور زرِ تاوان اور پچاس ہاتھی لے کر غزنی پہنچنا تھا۔ یہ جماعت پچاس افراد پر مشتمل تھی جس کی سربراہی سبکتگین کا ایک سردار کررہا تھا۔

''ابا جان! اب ہمیں بھی واپسی کی تیاری کرنی چاہیے۔'' محمود نے مشورہ دیا۔

''میں چاہتا ہوں جے پال رخصت ہوجائے اس کے بعد ہم بھی غزنی کا رخ کریں گے۔''

''جے پال تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔ اب تک لشکر کی روانگی ہونے لگی ہوگی۔''

''ہمیں جلدی نہیں۔ میں اسے یہ موقع دینا نہیں چاہتا کہ وہ چلتے چلتے پلٹ پڑے اور پشت سے ہم پر حملہ کردے۔ میں چاہتا ہوں وہ کم از کم آدھا راستہ طے کرلے، اس کے بعد ہم واپس ہوں۔''

''تو کیا یہ رات ہم یہیں گزاریں گے؟''

''کچھ ہی دیر میں رات پڑ جائے گی۔ ہم یہ رات یہیں گزار لیں تو بہتر ہے۔''

''اگر آج رات بھی طوفان آیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔''

''مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ آج رات ہمارا امتحان نہیں لے گا۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو ہم نے پورا انتظام کررکھا ہے۔''

جے پال کے خیموں کی طرف سے یہی خبریں آرہی تھیں کہ لشکر آہستہ آہستہ میدان چھوڑ رہا ہے۔ یہ لوگ اتنی تیزی سے جارہے ہیں کہ بس کچھ ہی دیر میں میدان خالی ہوجائے گا۔

ابتدائی شب ہی تیز ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں لیکن اب مستقل خاموشی تھی۔

ایک مرتبہ پھر سب سر جوڑ کر بیٹھے اور دوسرے دن کی روانگی کے بارے میں معاملات طے کیے جانے لگے۔ گفتگو کے دوران اس بوڑھی عورت کا بھی ذکر نکل آیا۔

''چلنے سے پہلے ہم اپنی محسنہ کا شکریہ تو کر جاتے۔''

''واقعی اسے محسنہ ہی کہنا چاہیے۔ اس نے ہندوؤں کے عقیدے سے ہمیں واقف کیا۔ نہ وہ توجہ دلاتی اور نہ ہم چشمے میں غلاظت ڈالتے۔ اتفاق سے طوفان آبھی گیا اور ہندو یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ واقعی وہ بڑھیا خدا کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی فرشتہ تھی۔ تم لوگ گئے تو تھے، یہ تو دیکھا ہوگا کہ وہ رہتی کہاں ہے۔''

''اس نے ہمیں چشمے کی طرف بھیج دیا تھا اور خود دائیں طرف مڑگئی تھی۔ کہتی تھی یہیں کچھ فاصلے پر اس نے اور اس کے گاؤں والوں نے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ جنگ ختم ہوجائے گی تو وہ پھر اپنے گاؤں والوں کے ساتھ گاؤں میں چلی آئے گی۔''

''ہم کل صبح ہوتے ہی اس سے ملنے اس کے گھر

جائیں گے اور ممکن ہوا تو اسے اپنے ساتھ غزنی چلنے پر مجبور کریں گے۔''

صبح ہوئی تو وہ ان لوگوں کو ساتھ لے کر جو اس بوڑھی عورت کے ساتھ گئے تھے، روانہ ہوا۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے لہٰذا اس مقام تک بہت جلد پہنچ گئے جہاں سے وہ بوڑھی عورت اپنے پڑاؤ پر جانے کے لیے مڑی تھی۔ کئی میل چلے گئے۔ آبادی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

''تم لوگوں نے ٹھیک سے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرف آئی تھی؟ یہاں تو کوئی انسان دور تک نظر نہیں آتا۔ وہ نہیں تو کوئی تو یہاں ہوتا۔''

''امیر! ہم نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ اسی طرف آئی تھی۔''

''میرے عزیز ساتھیو! تم غلط نہیں کہہ رہے ہو گے لیکن وہ یہاں نہیں رہتی۔ وہ کہیں بھی نہیں رہتی۔ خدا نے اسے ہماری مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اب اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو اور واپس چلو۔''

سب نے واپسی کے لیے باگیں موڑ لیں۔ رات بھر کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

''اللہ مسلمانوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ بوڑھی عورت کوئی غیبی اشارہ تھا اور کچھ نہیں۔'' سبکتگین نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

سواروں کا ایک دستہ راجپوتوں کے لشکر میں جا کر دیکھ آیا تھا۔ وہاں اب کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لشکر رات ہی کو کسی وقت روانہ ہو گیا تھا۔

سبکتگین کو یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے بھی واپسی کا بگل بجا دیا۔ خیمے وغیرہ پہلے ہی کھول کے لپیٹ لیے گئے تھے۔ بس اب چلنے کی دیر تھی۔ اسلامی لشکر منتشر ہوا اور شہر غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

محمود اس روز بہت اداس تھا۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ اسے صلح کی پیشکش قبول کرنی پڑی ورنہ وہ لاہور تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ وہ ایک دن ہندوستان پر حملہ آور ضرور ہو گا اور ان راجاؤں کا گھمنڈ توڑے گا جس میں وہ مبتلا تھے۔

☆☆☆

جے پال اس تیزی سے لاہور کی طرف روانہ ہوا جیسے اسے کسی تعاقب کا خطرہ ہو یا اہلِ لاہور کو کسی خوش خبری سے آگاہ کرنا ہو۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ یہ خوش خبری ہی تو ہے کہ دیوتاؤں نے ہمیں کسی بڑے نقصان سے دوچار کیے بغیر لاہور تک آنے دیا۔ صلح کا معاملہ بھی بہ خیروخوبی نمٹ گیا۔

لاہور کے شہریوں کو معلوم ہوا کہ راجا واپس آ رہا ہے تو وہ شہر سے باہر نکل کر اس کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ فتح یاب ہو کر لوٹا ہے۔ اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ لشکر تو شہر سے باہر ہی چھاؤنی کی طرف چلا گیا۔ راجا کو جلوس کی شکل میں اس کے محل تک لایا گیا۔ اراکینِ سلطنت جو راجا کے استقبال کے لیے آئے تھے، ان پچاس آدمیوں کو راجا کے جلوس میں دیکھ کر سخت حیران تھے جو سبکتگین نے زرِ تاوان کی وصولی کے لیے روانہ کیے تھے۔

راجا نے محل میں پہنچنے کے بعد ان پچاس آدمیوں کو قلعے کے ایک حصے میں ٹھہرا دیا اور خود آرام کرنے کے بہانے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتانے سے گریزاں ہو گیا۔ اس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ دو دن تک کسی سے ملاقات نہیں کرے گا۔

بھیم ابھی تک چمپا کو بھولا نہیں تھا۔ لاہور واپسی کے فوراً بعد اسے چمپا کی یاد آئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی لہٰذا اب منتری سے بات کی جا سکتی تھی لیکن اس سے پہلے وہ منتری پر چند احسانات کر دینا چاہتا تھا تاکہ جب وہ چمپا سے سگائی کے لیے اس سے بات کرے تو وہ منع نہ کر سکے۔ اسی دن رات کو جب شہر میں چراغاں ہو رہا تھا وہ اس سے ملنے اس کے گھر گیا۔ منتری نے اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ بھیم آج ہی شہر میں آیا ہے اور آج ہی اس سے ملنے چلا آیا۔

بھیم اس کے دروازے پر پہنچا تو سپہ سالار نہیں عاشق دلگیر تھا۔ منتری نے گھر سے نکل کر اس کا استقبال کیا اور اپنے دیوان خانے میں لے کر آیا۔

''آپ سینا پتی ہیں۔ تھکے ہوئے بھی ہوں گے اور آج ہی مجھ سے ملنے چلے آئے۔''

''بس بات ہی ایسی تھی کہ آنا پڑ گیا۔''

''حکم کیجیے۔''

''آپ کو راجا سے یہ پوچھنے کی فرصت تو ملی نہیں ہو گی کہ اسے فتح ہوئی یا شکست؟''

''راجا نے موقع ہی نہیں دیا لیکن اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ اگر فتح ہوئی تو آپ لوگ غزنی میں ہوتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ غزنی کے بادشاہ نے راجا کی عظیم طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہوں اور باج گزار بننے کا فیصلہ کر لیا ہو۔''

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ راجا نے بڑی شرم کا کام کیا ہے۔ وہ تاوان ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر کے آیا ہے۔"

"تاوان ادا کرنے کا وعدہ کر کے آیا ہے؟ یہ تو راجپوتوں کے لیے......"

"سب راجپوتوں کو نہ کہو۔ یہ راجا کا فیصلہ تھا۔ مجھے بھی مجبور ہونا پڑا۔"

"اور یہ اس کے ساتھ غزنی کے لوگ کیوں آئے ہیں؟"

"ان کو راجا تاوان کی رقم دے کر غزنی روانہ کرے گا۔"

"اب پوری بات سمجھ میں آ گئی۔ راجا نے اسی لیے دو دن تک کسی سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس عرصے میں وہ کوئی بہانہ سوچ لے گا لیکن میں اس سے پوچھوں گا ضرور کہ جب اسے یہی کرنا تھا تو وہ غزنی پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا ہی کیوں تھا اور یہ آپ کو بھی پوچھنا تھا کہ سیتا کے ہزاروں آدمی مروا کر اس نے بزدلی کا ثبوت کیوں دیا۔"

"منتری جی! میں تو راجا کا ملازم ہوں اور راجپوت ہوں۔ آپ اس کے وزیر ہیں۔ وہ آپ کو اپنا دایاں بازو کہتا ہے۔ آپ برہمن بھی ہیں۔ یہ سوال آپ اس سے کر سکتے ہیں لیکن میرا نام نہ آئے۔ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں۔"

"سیناپتی! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے آگاہ کیا۔ آپ کی طرف سے میرے دل میں بڑی جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ فکر نہ کریں، میں آپ کا نام نہ آنے دوں گا۔"

اس پوری گفتگو کے دوران چمپا اسے نظر نہیں آئی۔ یہ پوچھنا بھی مناسب معلوم نہ ہوا کہ چمپا کہاں ہے۔ وہ بہت خوش آیا تھا، نہایت افسردہ ہو کر اٹھا۔

جب دو دن گزر گئے تو منتری وہ پہلا آدمی تھا جس نے راجا سے ملاقات کی۔

"مہاراج! جب سے آپ آئے ہیں لاہور میں ایک افواہ اڑی ہوئی ہے۔"

"افواہوں کا کیا ہے، اڑتی ہی رہتی ہیں۔ افواہ یہی سنی ہو گی کہ ہم نے غزنی کے بادشاہ سے صلح کر لی۔"

"کیا یہ محض افواہ ہے؟"

"نہیں بلکہ ہم صلح کر کے ہی آئے ہیں لیکن کیا تم اس کی وجہ سننا پسند نہیں کرو گے؟"

"کیا ہماری سینا نے لڑنے سے انکار کر دیا تھا؟"

"نہیں بلکہ بات یہ ہوئی تھی۔" راجا جے پال نے چشمے میں غلاظت ڈالنے سے لے کر طوفان کی آمد تک تمام داستان سنا ڈالی۔ "اب بتاؤ، میں صلح نہ کرتا تو کیا کرتا۔"

منتری، برہمن ہونے کے ناتے اتنا متاثر ہوا کہ "زرِ تاوان" کا طعنہ دینا ہی بھول گیا۔ اسے پیسے کمانے کا خیال آ گیا۔

"یہ تو بہت بڑا پاپ ہو گیا۔ اب آپ کو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ برہمنوں میں بڑے پیمانے پر دولت تقسیم کیجیے۔ خزانے سے کچھ رقم مجھے نکالنے کی اجازت دیجیے تاکہ میں مندروں میں خصوصی پوجا پاٹ کا انتظام کروں۔" راجا نے یہ سوچ کر سکھ کا سانس لیا کہ منتری نے اس صلح پر کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا نہیں کیا۔

اس نے ایک بھاری رقم برہمنوں میں تقسیم کرنے... اور پوجا پاٹ کے لیے اس کے حوالے کر دی۔

بھیم نے دو چار روز بعد پھر اسے بھڑکایا۔ وہ پھر راجا کے پاس پہنچ گیا۔

"دیوتا بڑے سخت ناراض ہیں۔ اتنی آسانی سے خوش ہونے والے نہیں۔ کچھ رقم اور دی جائے تاکہ پنڈتوں میں دان کی جائے۔"

حکومت راجپوتوں کی تھی لیکن عمل داری برہمنوں کی تھی۔ ان پنڈتوں سے جے پال بھی ڈرتا تھا۔ اس نے چپ چاپ ایک بڑی رقم منتری کے حوالے کر دی۔ وہ پنڈتوں سے ڈرتا ضرور تھا لیکن اسے اپنا خزانہ بھی عزیز تھا۔ یہ خزانہ اسے اتنا عزیز تھا کہ ایک مہینا گزر جانے کے باوجود وہ سبکتگین کو زرِ تاوان روانہ نہیں کر سکا تھا۔ مسلمانوں کی جماعت ابھی تک اس کی مہمان بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی ممکنہ سازش سے بچنے کے لیے منتری کو خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی موقع تھا جب بھیم نے بھی اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے جے پال سے ملاقات کی۔

"آپ کو یاد ہے آپ نے آنجہانی نوجوان سالار کو وچن دیا تھا کہ آپ اس کی شادی منتری کی بیٹی سے کرا دیں گے؟"

"مجھے یاد ہے مگر اس نے وچن دیا تھا کہ وہ غزنی کے بادشاہ کو قتل کر کے لوٹے گا۔ وہ اپنا وچن پورا نہ کر سکا۔"

"وہ تو اس دنیا میں نہیں رہا لیکن میں بھی ایک امیدوار ہوں۔ آپ منتری سے میری شادی کی بات کریں۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی لیکن چمپا کو دیکھ کر لگا کہ میں اسی لڑکی کی تلاش میں تھا۔ اگر چمپا مجھے نہیں ملی

تو میں سیناپتی کا عہدہ چھوڑ کر سنیاس لے لوں گا۔"

"بھیم! تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا منتری برہمن ہے اور وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی راجپوت سے نہیں کرے گا۔ تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ تم ایک راجپوت ہو؟"

"آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہندوستان کے کسی راجا میں یہ طاقت نہیں کہ آپ کی بات ٹال سکے، منتری کیا چیز ہے۔"

"اس وقت تک کی بات اور تھی۔ سبکتگین سے صلح کرنے کے بعد میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ منتری اب میرے سامنے اس طرح آتا ہے جیسے وہ یہاں کا راجا ہو۔"

"مگر راجا تو آپ ہی ہیں۔"

"برہمنوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے میں بھی خائف ہوں، تم بھی ہو گے۔ میں اپنی من مانی کر کے برہمنوں سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔"

بھیم اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن یہ بات دل میں لے کر اٹھا کہ وہ منتری کے ہاتھوں راجا کو مزید ذلیل کروائے گا تاکہ منتری کے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا ہو اور راجا پر دباؤ بڑھے۔

بھیم نے ساز باز کر کے منتری کو تیار کر لیا کہ وہ غزنی سے آئی ہوئی مسلم جماعت کو مہمان کے بجائے قیدی بنانے پر راجا کو مجبور کرے۔

"دیوتا آپ کی راج نیتی کے سخت خلاف ہو گئے ہیں۔" ایک دن منتری نے کہا۔ یہ وہی زبان تھی جو بھیم نے منتری کو سکھائی تھی۔

"اس کی وجہ کیا ہے جبکہ میں جی کھول کر دان دے رہا ہوں۔"

"اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جن لوگوں نے متبرک چشمے میں غلاظت ملائی تھی، آپ نے انہی کو اپنا مہمان بنایا ہوا ہے۔ ان کی سیوا کرنے کے لیے نوکر چاکر ہیں۔"

"دیوتاؤں سے کہو، وہ بہت جلد چلے جائیں گے۔"

"وہ ان کے چلے جانے سے بھی خوش نہیں ہوں گے بلکہ دیوتا تو اس بات سے خوش ہوں گے کہ ان لوگوں کو قیدی بنا کر رکھا جائے اور ہر طرح کے ظلم ان پر توڑے جائیں۔"

"اچھا، میں تمہاری یہ فرمائش بھی پوری کر دوں گا۔ بس مجھے تھوڑی مہلت دو۔"

وزیر کے چلے جانے کے بعد وہ حسین لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں جنہیں راجا "کرشن گوپیاں" کہا کرتا تھا۔ ان میں ایک رادھا بھی تھی، نہایت چنچل بلا کی مسخری۔ ایسی جملے باز کہ کوئی روتا ہوا بھی ہو تو اسے ہنسا دے۔ راجا اس وقت ان لڑکیوں کے چونچلے برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ان لڑکیوں کو کمرے سے نکال دیا لیکن رادھا منت سماجت کر کے اس کے پاس ٹھہر گئی۔

"مہاراج! میں دیکھ رہی ہوں کوئی آج کی بات نہیں، کئی دن ہوئے آپ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

"ہاں، بس ہے کوئی ایسی بات۔"

"آپ جب پریشان ہوتے ہیں تو مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ مجھے عقل کی دیوی کہتے ہیں۔ یہ کیسی پریشانی ہے جو مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ شاید میرے پاس اس کا کوئی علاج ہو۔"

"مجھے میرے منتری نے پریشان کر رکھا ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو، میں نے غزنی کے بادشاہ سے کچھ پیسوں کے عوض صلح کر لی تھی۔ بس اسی کو بنیاد بنا کر وہ اپنی لوٹ مار دکھا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔ اگر اس صلح کے بارے میں میرے درباریوں کو معلوم ہوا تو وہ سب میرا نہیں منتری کا ساتھ دیں گے۔"

"اس صلح کے بارے میں اور کس کس کو معلوم ہے؟"

"بھیم کو معلوم ہے یا ان ایلچیوں کو معلوم تھا جو صلح کا پیغام لے کر سبکتگین کے پاس گئے تھے۔"

"وہ اب کہاں ہیں؟"

"میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے انہیں راستے ہی میں قتل کرا دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے بھیم کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔"

"لشکر کے دوسرے افسروں سے میں نے یہ کہا تھا کہ ہم کسی مناسب وقت تک کے لیے میدان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

"کمال ہے، اتنی سی بات سمجھنے میں آپ سے چوک ہو گئی۔ بھیم اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وزیر کو بھڑکا رہا ہے۔"

"ایک مقصد ہے تو سہی اس کا۔ وہ منتری کی بیٹی چمپا سے پریم کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں وزیر سے اس کی سگائی کی بات کروں۔"

"اور آپ نے انکار کر دیا؟"

"ہاں۔ منتری اپنی بیٹی کی شادی کبھی ایک راجپوت سے نہ کرتا۔ میری بات بھی جاتی۔"

"معاملہ صاف ہے۔ وہ آپ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اپنے طور پر کوشش میں لگ گیا اور منتری کی جی

کے دل میں جگہ پیدا کرنے کے لیے اسے سب باتیں بتادیں۔ منتری جی آپ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"یہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن اگر میں نے کوئی قدم اٹھایا تو فوج میں بغاوت ہوسکتی ہے۔"

"آپ کو قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ منتری تک بھیم کا پیغام پہنچادیں کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دونوں کے درمیان گٹھ جوڑ خود بخود ختم ہوجائے گا۔"

راجا اتنی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ ہر ایک کی بات ماننے کو تیار تھا۔ رادھا کی بات بھی مان لی اور منتری کو خاص طور پر اپنے پاس بلوایا۔

"منتری جی! میں نے ایک خاص پیغام آپ تک پہنچانے کے لیے بلوایا ہے۔"

"کیسا پیغام؟"

"میں یہ کڑوے بول کبھی آپ تک نہ پہنچاتا لیکن مجھ پر زور دیا گیا ہے اس لیے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔"

"مہاراج! صاف صاف بتایئے بات کیا ہے؟"

"بھیم آپ کی بیٹی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس نے مجھ سے منت کی ہے کہ چمپا کے بارے میں آپ سے بات کروں۔"

"مہاراج! بیٹی ہوتی ہی اس لیے ہے کہ اس کی شادی کی جائے لیکن بھیم راجپوت ہے اور ہم برہمن...... برہمن لڑکی راجپوت سے کیسے بیاہی جاسکتی ہے؟"

"میں نے بھی اسے یہ بتایا تھا لیکن اس کا خیال ہے کہ میں تمہیں حکم دوں گا اور تم میرا حکم مانو گے۔"

"آپ فرمایئے، حکم دے رہے ہیں یا پیغام پہنچا رہے ہیں۔"

"میں نے پیغام پہنچادیا... باقی آپ کی مرضی۔"

وزیر نے اجازت لی اور رخصت ہوگیا۔ راجا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی بات سننے کے بعد بھی وزیر کو غصہ نہیں آیا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے بات سنی تھی اور چلا آیا تھا۔

وزیر نے گھر پہنچتے ہی اپنی پتنی کو پاس بٹھایا اور اسے پوری بات بتائی۔

"چمپا کی ماں، اب چمپا کا انتظام کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ بھیم کا کوئی بھروسا نہیں کہ وہ کیا قدم اٹھا بیٹھے۔"

"میں نے آپ سے ڈر کے مارے ذکر نہیں کیا تھا۔ پچھلی مرتبہ ماتا جی آئی تھیں تو انہوں نے چمپا کے لیے ایک لڑکا بتایا تھا۔ بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ آپ کہیں تو میں چمپا کو اپنے ساتھ ملتان لے جاؤں؟ لڑکا بھی دیکھ لوں گی۔ مناسب لگا تو آپ بھی آکر دیکھ لیجیے گا۔ چمپا یہاں ہوگی نہیں تو خطرے کی کوئی بات بھی نہیں ہوگی۔"

چمپا اپنی ماں کے ساتھ ملتان چلی گئی۔

بھیم نے راجا کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد منتری سے خود بات کی لیکن اسے معلوم ہوا کہ ملتان کے کسی گھرانے میں اس کی بات پکی ہوگئی ہے۔ ایک ہفتے بعد پھیرے بھی ہوجائیں گے۔ بھیم نے یہ اطلاع بھی نہایت سکون سے سنی لیکن دل میں ٹھان لی کہ وہ اس کا بدلہ راجا سے ضرور لے گا کیونکہ اس کے خیال میں راجا نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور منتری نے اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور طے کردی۔

بھیم اب بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک بوڑھے پنڈت کو اس بات پر تیار کرلیا کہ وہ منتری سے بات کرکے اسے مجبور کرے کہ وہ چمپا کی منگنی توڑ دے اور بھیم سے اس کی شادی ہونے دے۔

"آپ پنڈت ہوکر مجھے صلاح دے رہے ہیں کہ میں ایک راجپوت سے اپنی بیٹی کی شادی کردوں؟"

"اب ویدوں کا زمانہ نہیں رہا۔ برہمن بھی اب وہ برہمن نہیں رہے۔ اب کیا راجپوت اور کیا غیر راجپوت۔"

"کچھ بھی ہوجائے میں اپنے خاندان میں پیوند نہیں لگا سکتا۔"

"میں نے تو چمپا بٹیا کی بھلائی سوچی تھی۔"

"اپنی بیٹی کی بھلائی مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سوچ سکتا۔"

اس پنڈت نے بھیم سے وفاداری نبھانی چاہی تھی لیکن منتری نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ راجپوتوں کی طرف سے اپنے دل میں کتنا بغض رکھتا ہے۔ اب بھیم کو راجا کے ساتھ ساتھ منتری کو بھی اپنی سازش کا نشانہ بنانا تھا۔

اس نے راجا سے ملاقات کی اور ایک ایسی تجویز پیش کی جو اس وقت تک کسی نے پیش نہ کی ہوگی۔

"مہاراج! غزنی کے بادشاہ سے جنگ میں مجھے ایک تجربہ ہوا ہے۔"

"کیسا تجربہ؟"

"یہی کہ اب کبھی ہم جنگ پر نکلیں تو پنڈت بھی ہمارے ساتھ ہوں۔"

"بھلا جنگ سے ان کا کیا کام۔ یہ کام تو راجپوتوں اور کھتریوں کا ہے۔ بھلا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہمن اور پنڈت پوجا پاٹ کے علاوہ کوئی اور کام کریں۔"

"پوجا پاٹ ہی کے لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اگر جنگ میں پنڈتوں کی جماعت ہمارے ساتھ ہوتی تو وہ لوگ جاپ کرتے، منتر پڑھتے اور دیوتاؤں کا غضب ہم پر نازل نہ ہوتا۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"اگر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تو یہ کام منتری جی کے سپرد کیجیے۔ وہ پنڈتوں کا انتخاب کریں اور وہی اس جماعت کی سربراہی کرتے ہوئے ہمارے ساتھ جنگ پر چلیں۔ وہ لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے بلکہ اپنے خیموں میں رہ کر اشلوک پڑھیں گے اور جو مناسب سمجھیں مذہبی رسمیں ادا کریں گے۔ ان کی پرارتھنا سے ہمیں فتح ملے گی۔ دیوتا خود آکاش سے اتر کر ہماری مدد کریں گے۔ دیوتا خوش ہوں گے تو بھگوان بھی ہم سے خوش ہوگا۔"

"بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن کیا منتری ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوگا؟"

"منتری جی آپ کا حکم نہیں ٹال سکتے اور اگر ٹالیں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ کئی پڑھے لکھے برہمن ایسے ہیں جو وزارت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ کسی کو بھی منتری کی گدی پر بٹھا دیجیے۔ موجودہ منتری کو کسی بھی دور دراز مقام پر بھیج کر زبان بند کر دیجیے گا۔"

"میرے خیال میں تو دوسرے پنڈت بھی آسانی سے تیار نہیں ہوں گے۔"

"انہیں بھاری تنخواہ کا لالچ دے کر تیار کیا جا سکتا ہے۔"

راجا نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور وزیر کے نام حکم نامہ جاری کر دیا۔ وزیر کا چراغ پا ہونا لازمی تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اکیلے میں نہیں بلکہ بھرے دربار میں یہ مسئلہ اٹھایا۔

"راجا جی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ برہمن اعلیٰ ذات ہیں۔ ان کا کام دیوتاؤں کو خوش رکھنا ہے، جنگوں میں حصہ لینا نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔"

"یہ ضروری بھی نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہوتا رہے۔" راجا کے بجائے بھیم نے جواب دیا۔

"ایسا کہنا بھی پاپ ہے۔"

"تم بھی ہماری طرح انسان ہو۔ جب ہم جنگ کا حصہ بن سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں۔ ایک دیش میں رہتے ہو۔ ہمارے کام الگ ہیں تمہارے الگ۔ میدان جنگ میں بھی ساتھ رہو گے۔ تم اپنا کام کرو گے، ہم اپنا کام کریں گے۔"

"ہم کسی کی ہتھیا ہوتے نہیں دیکھ سکتے چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"پھر جنگ پر جانے کی حمایت کیوں کرتے ہو؟"

"اس لیے کہ وہاں ہم نہیں تم جاتے ہو۔"

"منتری جی! یہ تو تمہاری ذاتی رائے ہوگی، پنڈتوں سے تو پوچھو کہ وہ کسی جنگ میں فوج کے ساتھ جانے کو تیار ہیں یا نہیں۔"

راجا کی طرف سے جو فرمان جاری ہوا تھا، اس میں پنڈتوں کو بھاری معاوضے کا لالچ دیا گیا تھا لہٰذا کئی پنڈتوں نے اس قانون کی حمایت کی۔

"سیناپتی کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔ جب ہمیں جنگ پر جا کر تلوار نہیں اٹھانی ہے تو جانے میں حرج ہی کیا ہے۔ جب بھی وقت آیا ہم تیار ہوں گے۔"

اب بولنے کی باری راجا کی تھی۔

"منتری جی! آپ نے ساری باتیں سن لیں۔ اگر اب بھی آپ میرا فرمان ماننے کو تیار نہیں تو میں پنڈتوں کی سرداری کسی اور کو سونپ دوں گا۔ پھر آپ کو پشاور یا کسی اور مقام پر جانا ہوگا۔"

منتری نے بازی الٹتے ہوئے دیکھی تو خود بھی پلٹ گیا۔

"میرا مقصد تو یہ تھا کہ سب کی رائے سامنے آجائے۔ اسی لیے میں نے اتنی بحث کر لی ورنہ آپ میرے ان داتا ہیں۔ میں آپ کے حکم سے باہر نہیں۔" منتری نے فتح یاب نظروں سے بھیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب بھیم کو ایک اور چال چل کر جے پال کو کسی بڑی جنگ میں الجھانا تھا۔ اس کے لیے اسے کسی بڑی کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔ غزنی کا سبکتگین اس کا بڑا اشکار تھا۔

اب بھیم کا کام ہی یہ رہ گیا تھا کہ وہ جے پال کو سبکتگین کے خلاف بھڑکاتا رہے اور زرتاوان ادا نہ کرنے کی ترغیب دیتا رہے۔ بھیم کے پاس راجا کو بھڑکانے کے لیے ایک ہی ہتھیار تھا۔

"ایک راجپوت کی سب سے بڑی ذلت و رسوائی یہی ہے کہ وہ کسی مسلمان کو زرتاوان ادا کر کے اپنی جان بچائے۔"

بہت جلد یعنی محض دو ایک ملاقاتوں ہی میں جے پال کو یہ احساس ہونے لگا کہ نہ صرف یہ کہ وہ راجپوت ہے بلکہ راجا بھی ہے۔ اسے واقعی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ زرتاوان ادا کرے۔ اسے یہ لالچ بھی آیا کہ وہ اگر بھیم کے مشورے

پر عمل کرے تو اس کی رقم بچ سکتی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کا منتری نے بھی اس کی حمایت کی۔

''اگر ہم سبکتگین کا مطالبہ پورا نہ کریں تو ہم پر کوئی الزام نہیں کیونکہ جس وقت یہ مطالبہ مانا گیا تھا، اس وقت آپ کی مجبوری تھی اب یہ مجبوری دور ہوگئی تو آپ پابند بھی نہیں رہے۔''

''اس سلسلے میں ہمارا دھرم کیا کہتا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''مسلمان سے عہد توڑنا کوئی پاپ نہیں۔ ہاں اگر معاہدہ کسی ہندو سے کیا جاتا تو اور بات تھی۔''

''میں ان مسلمانوں کا کیا کروں جنہیں میں زرِ تاوان ادا کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔''

''وہ آپ کے قبضے میں ہیں، چاہیں تو آزاد کردیجیے۔ وہ خالی ہاتھ غزنی لوٹ جائیں گے، چاہیں تو قید میں پڑا رہنے دیں۔ خود ہی مر کھپ جائیں گے یا قتل کرادیجیے کہ ہماری سرزمین گندگی سے پاک ہوجائے۔''

''میرا بھی ایک اہم آدمی سبکتگین کے پاس گروی رکھا ہوا ہے۔''

''غزنی کے بادشاہ کو خط لکھ دیجیے کہ وہ اسے رہا کردے، آپ اس کے پچاس آدمیوں کو رہا کردیں گے۔ میرے خیال میں وہ ایک آدمی کے بدلے میں پچاس کو رہا کرانے کے حق میں ہوگا۔''

بھیم کو معلوم ہوا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ تمام کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہے تھے۔ اب جو کرنا تھا، اسے کرنا تھا۔ وہ ابھی کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ غزنی کی طرف سے آئے ہوئے دو قاصد لاہور میں داخل ہوئے۔ وہ مسلمان تھے۔ اپنے لباس اور حلیوں سے الگ ہی جانے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے گرد ننگ دھڑنگ، نچلے بدن پر دھوتیاں لپیٹے ہندوؤں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان پر طرح طرح کے فقرے کسے جا رہے تھے۔

وہ قاصد ان کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے لیکن انہیں یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ یہ لوگ ان دونوں کا مذاق بھی اڑا رہے ہیں اور برا بھلا بھی کہہ رہے ہیں۔ وہ اپنے انداز سے چلتے جا رہے تھے کہ دو پنڈت ایک مندر کی سیڑھیوں سے بھاگتے ہوئے آئے اور انہیں پکڑ کر منتری کے پاس لے گئے۔ منتری کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دونوں غزنی کے بادشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے قاصد ہیں۔ یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ کس لیے آئے ہوں گے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ان دونوں کو قتل کرادے۔ جے پال کو خبر ہی نہیں ہوسکے گی کہ کون آیا تھا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن پھر اسے یہ جاننے کی جلدی ہوئی کہ جے پال ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اس نے ان کی آمد کی خبر جے پال تک پہنچا دی۔

جے پال چاہتا تو یہ تھا کہ وہ قاصدوں سے نہ ملے لیکن اس تجسس نے اسے بھی ملنے پر مجبور کردیا کہ وہ قاصد کیا پیغام لے کر آئے ہیں۔ وہ ان قاصدوں سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا لیکن منتری انہیں لے کر آیا تھا اس لیے اسے بھی ساتھ بٹھانا پڑا۔

''میں تم سے پوچھتا ہوں میری راجدھانی کو ناپاک کرنے کیوں چلے آئے ہو؟'' جے پال نے ان قاصدوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ ہمیں مسلمانوں کے امیر کی جانب سے ایک مراسلہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔''

''اس مراسلے میں تمہارے امیر نے کون سی نئی بات لکھ دی ہے، تم خود ہی پڑھ کر سنادو۔''

یہ قاصد کئی درباروں میں گئے تھے لیکن ایسا انوکھا دربار انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال انہوں نے مراسلہ پڑھنا شروع کیا۔

''ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے عہد سے پھر گئے ہو اور وعدے کے مطابق زرِ تاوان ادا کرنے سے بھاگ رہے ہو۔ دنیا کے ہر مذہب میں عہد شکنی کو برا سمجھا جاتا ہے اور تم عہد شکنی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اس مراسلے کو آخری مراسلہ سمجھو اور میرے جو پچاس آدمی تمہارے پاس ہیں انہیں رہا کرکے زرِ تاوان فوراً ان کے حوالے کردو۔ کسی خون ریزی سے بچنے کا ایک یہی واحد راستہ تمہارے پاس ہے۔''

''تمہارا امیر کیا اتنا بھوکا ہے کہ زرِ تاوان کی رقم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا؟''

''ہمیں صرف یہ حکم ہوا ہے کہ مراسلہ آپ تک پہنچادیں۔ یہ حکم نہیں کہ آپ کے کسی سوال کا جواب دیں۔'' قاصد نے کہا۔ ''ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ زرِ تاوان ادا نہیں کرنا چاہتے تو اس کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔ فی الحال آپ ان آدمیوں کو ہمارے ساتھ روانہ کردیں جو آپ کے پاس ہیں۔''

''ایک آدمی ہمارا بھی آپ کے پاس ہے۔''

''ہم جیسے ہی اپنے آدمیوں کو لے کر پہنچیں گے، آپ کا آدمی آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔''

"تمہارے امیر کا کچھ ٹھیک نہیں۔ پہلے ہمارا آدمی ہمیں مل جائے پھر ہم تمہارے آدمی بھی چھوڑ دیں گے۔"

"آپ یہ باتیں لکھ کر دے دیجیے، ہم اپنے امیر تک پہنچا دیں گے۔"

"اس کے لیے تمہیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہم مشورہ کرنے کے بعد تمہیں جواب دیں گے۔"

جے پال نے وزیر کو حکم دیا کہ ان قاصدوں کے رہنے کا بندوبست کردے اور کل ہمارے سامنے پیش کرے۔

کچھ دیر بعد جے پال نے بھیم کو طلب کیا۔ وزیر بھی موجود تھا۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ قاصدوں کو کیا جواب دیا جائے۔ اس موقع پر بھیم اور وزیر میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ وزیر کو معلوم تھا کہ اگر تاوان ادا نہ کیا گیا تو جنگ ہونا لازمی ہے اور اب یہ طے پا گیا تھا کہ وزیر بھی پنڈتوں کی ایک جماعت کے ساتھ اس جنگ میں شامل ہوگا اس لیے اس نے یہ مشورہ دیا کہ تاوان ادا کردیا جائے یا کچھ مہلت طلب کی جائے۔ عجیب بات تھی کہ پہلے اسی نے جے پال کو مشورہ دیا تھا کہ تاوان ادا نہ کیا جائے اور اب وہی حمایت کر رہا تھا۔ بھیم نے سختی سے مخالفت کی۔

"منتری جی! آپ برہمن ہیں۔ آپ کو کیا معلوم راجپوت کی غیرت کیا ہوتی ہے۔ ہماری غیرت کبھی یہ گوارا نہیں کرے گی کہ ہم تاوان ادا کریں۔"

"اس وقت آپ کی غیرت کہاں گئی تھی جب آپ نے صلح کے لیے تاوان کا سہارا لیا تھا۔" وزیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اور اس وقت آپ کی برہمیت کہاں گئی تھی جب آپ نے کہا تھا کہ مسلمانوں سے عہد توڑنا کوئی پاپ نہیں۔"

"میرا کہنا ٹھیک تھا لیکن انسانی جانوں کے ضائع ہونے سے بہتر ہے کہ تاوان ادا کیا جائے۔ اگر جنگ ہوگی تو مسلمان ہی نہیں ہندو بھی مارے جائیں گے۔ تلوار نہیں دیکھتی کون برہمن ہے، کون راجپوت۔"

"منتری جی! یہ راجپوتوں کا کھیل ہے، آپ اس میں دخل نہ دیں۔"

جے پال اس بحث کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ بھیم کی باتیں اس کے دل میں اترتی جارہی تھیں اور جب بھیم نے غزنی کے مرغزاروں کا نقشہ کھینچا اور دولت کے انبار بیان کیے تو جے پال کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے فوراً اس پنڈت کو طلب کیا جو اس کی طرف سے کتابت کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس نے لکھوایا۔

"ہندوستان کے مہاراجا جے پال کی جانب سے......

غزنی کے امیر کے نام!

تمہارے مراسلے کو پڑھ کر ہنسی آئی۔ تمہیں ابھی تک تاوان کی رقم یاد ہے۔ اچھا یہی ہے کہ اسے بھول جاؤ۔ میرے آدمی کو فوراً رہا کردو۔ اس کے جواب میں تمہارے آدمی رہا کردیے جائیں گے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو خط لکھ دیا ہے۔ وہ میرا ساتھ دیں گے۔ اس مرتبہ جنگ متبرک چشمے کے کنارے نہیں لڑی جائے گی اس لیے جیت ہماری ہوگی۔ سنا ہے تم بڑے رحم دل ہو تو اس خون ریزی سے بچو۔"

☆☆☆

غزنی میں ان قاصدوں کا بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا جنہیں لاہور روانہ کیا گیا تھا۔ غزنی سے لاہور تک گھنٹوں کا نہیں دنوں کا فاصلہ تھا۔ ان کے آنے سے پہلے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جے پال کیا جواب دے گا۔ اس معاملے میں سبکتگین اور اس کے سرداروں میں روز قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ محمود ابھی تک اپنی رائے پر قائم تھا کہ ہم ہندوؤں سے عہد شکنی کے سوا کوئی امید نہیں رکھ سکتے جبکہ سبکتگین کی نیک نیتی اب بھی پُرامید تھی اور وہ یہی کہہ رہا تھا کہ اتنا بڑا راجا اپنے قول سے پھر نہیں سکتا۔ ضرور کوئی مجبوری ہوگئی ہوگی ورنہ وہ اب تک اپنا وعدہ وفا کرچکا ہوتا۔

دن گزرتے گئے اور پھر ایک دن یہ قاصد واپس آگئے۔ انہوں نے جے پال کا مراسلہ سبکتگین کے سامنے رکھ دیا۔ اس مراسلے میں کھلی دھمکی دی گئی تھی۔

قاصدوں نے جو کچھ زبانی بتایا، اسے سن کر تو سبکتگین کے ہوش اڑ گئے۔ وہ عام طور پر اتنی جلدی طیش میں نہیں آتا تھا لیکن اس وقت تو اس کے لفظوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اس جھوٹے راجا کی سرکوبی کے لیے لشکر تیار کرو۔ ہم اس کے گھر کی دہلیز پر جاکر بتائیں گے کہ مسلمان نہ عہد توڑتا ہے، نہ عہد توڑنے والے کو برداشت کرتا ہے۔"

غزنی کے قاصدوں کے روانہ ہوتے ہی جے پال نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ اس نے دلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے راجاؤں کو خطوط لکھے۔ ان خطوں میں اس نے ان راجاؤں کو اطلاع دی تھی کہ وہ غزنی کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے کا تہیہ کرچکا ہے۔ یہ ہم سب کا قومی فریضہ ہے کہ آپس میں اتحاد کرکے ہندوستان کو غزنی تک پھیلا دیں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہندوستان کے

تمام حکمران اپنی اپنی فوجیں میرے پاس روانہ کریں اور ہم سب مل کر غزنی پر ٹوٹ پڑیں اور اگر سبکتگین ہماری روانگی سے پہلے ہی ہم پر حملہ آور ہوتا ہے تو ہم پنجاب ہی میں اسے روک لیں۔

راجا جے پال کی سلطنت کابل کے قریب لمغان تک پھیلی ہوئی تھی اور لاہور اس کا دارالخلافہ تھا۔ اگر راجا جے پال شکست کھا جاتا تو پھر ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کی خیر نہیں تھی۔ دلی، کالنجر، اجمیر، قنوج کوئی مقام بھی محفوظ نہ رہتا۔ یہی سوچ کر ان راجاؤں نے جے پال کی آواز پر لبیک کہا۔ پہلے جوابی خطوط آئے اور پھر لشکروں کے آنے کی اطلاعات آنے لگیں۔ سب سے پہلے دہلی کا لشکر مکمل جنگی سازوسامان کے ساتھ پہنچ گیا۔

اس لشکر کے پہنچتے ہی جے پال کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا۔ وہ تصور ہی تصور میں غزنی کے بازاروں میں ٹہلنے لگا۔ یہ لشکر ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ اتنا بڑا اکیلا لشکر ہی فتح کے جھنڈے گاڑنے کے لیے بہت تھا جبکہ ابھی دوسرے راجاؤں کی طرف سے بھی امداد آنے کی امید تھی۔ یہ لشکر دریائے راوی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک شہر تھا جو ویرانے میں آباد ہو گیا تھا۔ اجمیر، کالنجر اور قنوج وغیرہ سے لشکر آئے تو زمین پر اندھیرا چھا گیا۔ اتنے عظیم لشکر کے لیے رسد کی ضرورت تھی۔ راجا نے آس پاس کے دیہات سے غلہ منگوالیا۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دی جانے لگیں۔ جنگ کے نام پر شہریوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کی جارہی تھیں۔ راجا نے اتنا اہتمام کیا تھا کہ خزانے میں جھاڑو پھر گئی تھی۔ یہ خیال بھی نہیں رکھا گیا تھا کہ لشکر کے چلے جانے کے بعد شہری کھائیں گے کہاں سے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ قحط پڑ جائے گا۔

تیاری کا یہی حال غزنی میں بھی دیکھا جارہا تھا۔ سبکتگین نے جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ مجاہدین اس جہاد میں شرکت کے لیے غزنی پہنچ رہے تھے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب جنگ کے بادل منڈلا رہے ہوں تو شہروں میں خوف کا سناٹا پھیل جاتا ہے لیکن غزنی کی رونق تو اور بڑھ گئی تھی۔ رات رات بھر دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ مسلمان اپنے اختلافات بھلا کر سبکتگین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ وہ اس حقیقت سے اب بھی بے خبر تھے کہ جے پال کے لشکر کے سامنے ان کی تعداد کچھ بھی نہیں۔ مسلمانوں کو اس تعداد کی پروا بھی نہیں تھی۔ گزشتہ جنگ میں بھی وہ اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر سے مقابلہ کر چکے تھے۔ ان کے دل شوقِ شہادت سے لبریز تھے۔

تمام تیاریوں کی تکمیل کے بعد بالآخر... وہ دن آگیا جب اسلامی لشکر کو روانہ ہونا تھا۔ یہ منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر سردار کا رسالہ ایک ایک کر کے گزر رہا تھا۔ شہری ان کو رخصت کرنے کے لیے شہر کے دروازے پر موجود تھے۔ سب سے آخر میں سبکتگین اپنے رسالے کے ساتھ شہریوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا گزرا۔

دوپہر ہونے کو آئی تو سب رسالے بھی شہر سے باہر نکل گئے۔ ہر رسالے نے رفتار پکڑی اور شہر سے دور ہوتے چلے گئے۔

جے پال کے جاسوس خبریں لے کر لاہور پہنچ چکے تھے۔ ان کی اطلاع کے مطابق سبکتگین اپنی فوج لے کر غزنی سے چل پڑا تھا۔ دربار میں کھلبلی مچ گئی۔ جے پال کو یہ امید نہیں تھی کہ مسلمان اس سے پہلے حملہ آور ہونے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے۔

”میں یہ جنگ لاہور کے نواح میں لڑنا نہیں چاہتا۔ ایک پل ضائع کیے بغیر لشکر کو روانگی کا حکم دیا جائے۔“

بھیم نے حکم کی تعمیل کی اور لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا۔ دو لاکھ کے لشکر اور باربرداری کے ہزاروں چھکڑے لے کر نکلنا آسان نہیں تھا۔ میدان خالی ہونے میں دو تین دن لگ گئے۔ راجا کو یہ فکر تھی کہ مسلمان اس کے ملک میں نہ گھس آئیں۔ بھیم مطمئن تھا جیسے اسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔ اسے فکر تھی تو وزیر کی کہ کہیں راستے سے وہ غائب نہ ہو جائے اسی لیے اس نے اسے راجا کے ہاتھی پر بٹھایا تھا۔

”منتری جی! میں نے سنا ہے غزنی بہت بڑا تجارتی مرکز ہے اور وہاں بہت دولت ہے۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے۔“

”فکر مت کرو۔ اب یہ ساری دولت ہماری ہوگی۔ میں اپنے ساتھ دو سو ہاتھی اور بے شمار چھکڑے اسی لیے تو نہیں لے جارہا ہوں۔ سبکتگین نے لوٹ مار سے جو بے شمار دولت جمع کی ہے وہ سب ان پر لاد کر لاؤں گا۔“

اس کا وزیر شاہی حکم سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ چلنے پر رضامند تو ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ راجا کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہوا تھا۔

”مہاراج! ایک مشورہ جی میں آیا ہے۔“

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

''ہماری لشکر تو بہت دیر میں سفر کرے گا۔ لشکر کا کچھ حصہ آگے روانہ کیجیے۔''

''وہ کس لیے؟''

''پشاور اور اس کے مضافات میں جو قلعے ویران پڑے ہیں ان کی ضروری مرمت کرائیے اور کچھ غلہ اور اناج ان میں چھوڑتے جائیے۔''

''بھلے مانس وہ کس لیے؟''

''اگر بھگوان نہ کرے ہمیں شکست ہو جاتی ہے تو یہ قلعے ہماری پناہ گاہ بن سکتے ہیں۔''

''منتری جی! ایسی بات بھی منہ سے مت نکالنا۔ تم میلوں تک پھیلے ہوئے میرے لشکر کو دیکھ رہے ہو۔ یہ راجپوتوں کا لشکر ہے، برہمنوں کا نہیں۔ شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری فوج میں ایک لاکھ سوار، دو لاکھ پیادے، دو سو ہاتھی ہیں۔ مسلمانوں کو میں چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔''

وزیر نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی۔ اس نے بھی دور تک پھیلے ہوئے لشکر پر نظر ڈالی تو اسے بھی راجا کی بات پر یقین آنے لگا۔ اتنے بڑے لشکر کی موجودگی میں شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے واقعی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس نے راجا کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر غزنی کا ذکر چھیڑ دیا۔ لیکن راجا کا دھیان کسی اور طرف تھا۔

''منتری جی! ہمیں جنگ کی مصروفیات میں یاد ہی نہیں رہا۔ ان مسلمان قیدیوں کا کیا ہوا جو تاوان لینے غزنی سے ہمارے پاس آئے ہوئے تھے؟''

''وہ اسی طرح قلعہ لاہور میں قید ہیں۔''

''کیا مناسب نہیں تھا کہ ہم انہیں قتل کرا کے جان چھڑا لیتے؟''

''میں نے انہیں جان بوجھ کر زندہ رکھا ہے۔ کسی وقت وہ ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔''

''وہ ہمارے کس کام کے؟''

اس سے پہلے کہ وزیر کوئی جواب دیتا، بھیم اپنا ہاتھی اس کے برابر لے آیا۔

''میرے بھیجے ہوئے جاسوس واپس آ گئے ہیں۔ انہوں نے کئی میل آگے مسلمانوں کا لشکر دیکھا ہے۔'' بھیم نے راجا کو مطلع کیا۔

''تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''مہاراج! ہم اس وقت لغمان کے میدان سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے لشکر کا کچھ حصہ قریب کے پہاڑوں میں چھپا دیں اور باقی لشکر لے کر آگے بڑھ جائیں۔ اگر مسلمان ہمیں روندتے ہوئے آگے بڑھ بھی آئے تو یہ چھپا ہوا تازہ دم لشکر انہیں اپنی تلواروں پر رکھ لے گا۔''

راجا نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اسلامی لشکر میں بھی یہ خبر پھیل چکی تھی کہ راجا جے پال لغمان کے میدان تک آ گیا ہے۔ انہیں یہ خبر نہیں مل سکی تھی کہ جے پال کچھ لشکر پہاڑوں میں چھپا کر آگے بڑھے گا۔ انہوں نے تیزی سے گھوڑے دوڑائے۔ وہ ابھی لغمان تک نہیں پہنچے تھے کہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہندو بالکل سامنے آ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو لغمان میں یہ لڑائی لڑنا نہیں چاہتے۔ وہ اس طویل میدان کو طے کر کے آگے بڑھ آئے ہیں۔ امیر سبکتگین نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر جے پال کی فوج اور اس کی طاقت کا اندازہ کیا۔ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ جے پال کا لشکر ایک بپھرے ہوئے دریا کے مانند ہے جس میں لشکریوں کی تعداد حدِ شمار سے باہر ہے لیکن اس کی کثرتِ سپاہ سے وہ قطعاً مرعوب نہ ہوا۔ اپنے اور دشمن کے معرکے کو شیر اور بکری کی لڑائی جان کر پہاڑ سے نیچے اترا اور اپنے فوجی سرداروں سے مل کر ان میں سے ہر ایک کا دل بڑھایا اور اس جنگ کو جہاد قرار دیتے ہوئے انہیں لڑنے کی ترغیب دینے لگا۔

اس کے ایک سردار نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ ہندوؤں کے لشکر کی تعداد بے شمار ہے، اس سے نمٹنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔

سبکتگین نے یہ تجویز پیش کی کہ جب ہندو حملہ آور ہوں تو ہمارا صرف ایک دستہ جس میں محض پانچ سو مجاہدین ہوں، ان کا مقابلہ کرے۔ اگر خدانخواستہ وہ ختم ہو جائے یا شکست اٹھا کر پیچھے آئے تب دوسرا پانچ سو سواروں کا دستہ حملہ آور ہو۔ غرض یہ کہ پانچ پانچ سو کے دستے بنا لیے جائیں اور وہ حسبِ ضرورت باری باری حملہ کریں۔ اس طرح تمام فوج ایک ساتھ نہیں تھکے گی۔

سبکتگین چاہتا تھا کہ حملے میں پہل وہ کرے لیکن جے پال کو غزنی پر قبضہ کرنے کی ایسی جلدی تھی کہ میدان میں پہنچتے ہی اس نے اعلان جنگ کرا دیا۔ پہلے ناقوس بجائے گئے پھر ڈھول تاشوں کی آوازیں آنے لگیں۔

سبکتگین نے بھی اعلان کرا دیا کہ ہندو حملہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں، مسلمان بھی تیاری کر لیں۔

ہندوؤں نے ایک خاص فاصلے پر پہنچ کر دور تک اپنی صفیں قائم کرلیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اگلی صف کو حرکت ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلے حملے کے جواب میں محمود اپنے دستے کے ساتھ آگے بڑھے گا لہٰذا جیسے ہی اس نے ہندوؤں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا، اس نے اپنے دستے کو اشارہ کیا۔ جے پال کے پیدل نے صرف پانچ سو سواروں کو آتے ہوئے دیکھا۔ جے پال اپنے ہاتھی پر تھا اور بھیم ادھر سے ادھر گھوڑا دوڑاتا پھر رہا تھا۔ انہوں نے جب پانچ سو سواروں کو آتے ہوئے دیکھا تو بھیم اپنی صفوں کے آگے آکر کھڑا ہو گیا اور چلا کر جے پال کو مخاطب کیا۔

''شاید مسلمان صلح کے لیے ہماری طرف آرہے ہیں۔''

''لڑنے سے پہلے صلح؟''

''مسلمان ہماری تعداد دیکھ کر ڈر گئے ہوں گے لیکن آپ صلح نہ کیجیے گا۔ یہ خیال بھی دل میں نہ لائیے گا۔''

ابھی بھیم یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایسے گھوڑے پر سوار محمود نظر آیا لیکن اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صلح کے لیے نہیں آرہا تھا۔ بھیم زور سے چلایا۔

''ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ یہ صلح کا پیغام نہیں، ہم پر حملہ ہے۔ راجپوت دلاورو آگے بڑھو اور مٹھی بھر مسلمانوں کو نیست و نابود کردو۔''

اپنے سپہ سالار کا حکم سنتے ہی راجپوت بھی تلواریں سونت کر آگے بڑھنے لگے حالانکہ اب تک وہ بھی یہی سمجھتے رہے تھے کہ مسلمان صلح کرنے آرہے ہیں ورنہ پانچ سو کا دستہ لے کر کون جنگ میں اترتا ہے۔ راجپوتوں نے بھی صرف پندرہ بیس ہزار آدمی ان سے مقابلے کے لیے بھیجے۔

خیال یہی تھا کہ پندرہ بیس ہزار سپاہیوں کے سامنے پانچ سو سواروں کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ منٹوں میں کچل کر رکھ دیں گے لیکن ان کا خیال اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب دوپہر سے مغرب ہو گئی لیکن وہ ان پانچ سو سواروں کو پیچھے نہ دھکیل سکے۔ سو ڈیڑھ سو مسلمان شہید ضرور ہوئے لیکن اس کے جواب میں ہزار سے زیادہ راجپوت کٹ گئے۔

اندھیرے کی وجہ سے دونوں فریق پیچھے ہٹ گئے۔

دوسرے دن ایک دوسرے سردار کی سربراہی میں پانچ سو کا دستہ آگیا لیکن یہ شام تک نہ لڑ سکا۔ بہت سے آدمی شہید کرا کے واپس ہو گیا۔ پھر ایک ایک گھنٹے بعد نئے دستے آتے رہے۔ بھیم پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ ''یہ مذاق ہے یا جنگ۔''

پانچ سو سپاہی آتے تھے اور میدان میں ہلچل مچا کر واپس لوٹ جاتے تھے۔

تیسرا دن طلوع ہوا تو راجپوتوں پر سستی طاری ہو گئی۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ ہمیشہ کی طرح پانچ سو سپاہی آئیں گے اور دس پانچ ہزار راجپوتوں سے لڑنے کے بعد چلے جائیں گے۔ انہوں نے صفیں تک قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ سبکتگین نے حکمت عملی تبدیل کردی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت روزانہ کی طرح پانچ پانچ سو کے دستے میدان میں نہیں اترے بلکہ تمام اسلامی لشکر نے سارے ہندو لشکر پر حملہ کردیا۔ ہندو اس حملے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ اسی ہزار کا لشکر ایک دم ان پر ٹوٹا اور وہ بھی تازہ دم لشکر تو ہندوؤں کے ہوش اڑ گئے۔ جتنی دیر میں وہ صفیں ترتیب دیتے، ہزاروں سر تن سے جدا ہو گئے۔ راجپوتوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ میدان جنگ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جو لشکر پیچھے تھا، اسے تو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ ہوا کیا۔ اسے تو اس وقت معلوم ہوا جب مسلمان فوج کا ایک دستہ نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا، اچانک پشت سے برآمد ہوا۔ اب راجپوت دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مسلمان ہندوؤں کی صفوں میں گھستے چلے گئے۔ جنگ اتنی گرم ہو گئی تھی کہ خود جے پال ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر آگیا تھا۔ جانبازی اور مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔

کئی گھنٹوں کی کاوش کے بعد معجزانہ طور پر راجپوتوں نے پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ اس وقت سبکتگین کی نظر جے پال پر پڑی۔ وہ اپنا گھوڑا لے کر اس طرف بڑھا۔ جے پال پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ میدان سے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر عام لشکریوں کے قدم بھی اکھڑ گئے۔ انہوں نے بھی بھاگنا شروع کردیا۔ اب جو رکتا، اپنی جان سے جاتا۔ بھیم نے لشکر کو روکنے کی کوشش کی لیکن بساط الٹ چکی تھی۔ اسے بھی بھاگنا پڑا۔ سامان سے لدے چھکڑے کھڑے رہ گئے۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔

جے پال یہ سوچ کر بھاگا تھا کہ لغمان کے میدان میں چھپے ہوئے اس کے فوجی دستے تعاقب کرنے والوں پر اچانک ٹوٹ پڑیں گے لیکن یہ دستے اس سے پہلے فرار ہو چکے تھے۔ میدان خالی پڑا تھا۔ جے پال نے اپنے ساتھیوں اور بچے کھچے لشکر کے ساتھ پشاور میں جا کر دم لیا۔

سلطان سبکتگین تعاقب کرتا ہوا پشاور تک پہنچ گیا۔

جے پال یہاں سے بھی بھاگا۔

لغمان و پشاور کے ملک دریائے نیلاب کے کنارے تک مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ سبکتگین چاہتا تھا کہ لاہور تک پہنچ کر جے پال کی راجدھانی پر قبضہ کرلے لیکن جے پال نے جاتے وقت دریائے اٹک کا پل منہدم کردیا تھا۔ کشتیوں کے بغیر دریا کو عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بخارا کی طرف سے وحشت انگیز خبریں آرہی تھیں۔

سبکتگین کا آقا الپتگین جب غزنی پر قابض ہوا تھا تو خراسان خالی ہوگیا تھا۔ امیر منصور نے وہاں کی حکومت ابو الحسن ہجوری کو دے دی تھی۔ اب اس کا بیٹا ابو علی ہجوری وہاں حکمران تھا جو امیر نوح سامانی کی پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ سبکتگین نے بخارا فتح کرکے وہاں کے حاکم کو اپنا مطیع بنا کر ''قصرار'' کا علاقہ اسے جاگیر میں دے دیا تھا۔ اب بخارا کا امیر باغی ہوکر خراسان چلا گیا تھا اور ابو علی ہجوری کے پاس پناہ گزین ہوگیا تھا۔

وہ ابھی پشاور ہی میں تھا کہ امیر نوح سامانی نے ابو نصر فارسی کو اس کے پاس بھیجا۔ اس نے خراسان و بخارا کی حالت کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا اور مدد کرنے کی درخواست کی۔ آلِ سامان سے اس کا پرانا تعلق تھا۔ اس کا آقا الپتگین اسی آلِ سامان کا غلام تھا۔ ذرا سی غلط فہمی نے تعلقات میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ آل سامان کی بے چارگی کی داستان سن کر وہ بے چین ہوگیا۔ اسی وقت اپنے ایک سردار کو دو ہزار سواروں کے ساتھ پشاور میں چھوڑا اور اس علاقے کے آس پاس کے افغانی اور خلجی صحرانشینوں کو مطیع کرتا ہوا غزنی واپس آگیا۔ یہاں سے وہ ماوراالنہر کی طرف روانہ ہوا تاکہ امیر نوح سامانی سے ملاقات کرے۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کررہی تھی کہ ملاقات کے وقت اپنے گھوڑے سے اتر کر امیر کی رکاب کو بوسہ دے جیسا کہ قاعدہ تھا لہٰذا اس نے کہلوا دیا تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اسے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔

ایک مقام سرخس پر امیر نوح اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ سبکتگین اسے دیکھتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور امیر نوح کی رکاب کو بوسہ دیا۔ امیر نوح نے بھی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

''سبکتگین! ہمیں تو تمہارا یہ پیغام ملا تھا کہ تم ہماری رکاب کو بوسہ نہیں دو گے۔''

''ارادہ تو یہی تھا لیکن آپ کو دیکھتے ہی مجھے اپنا آقا الپتگین یاد آگیا۔ وہ آپ کے خاندان کا غلام تھا۔ مجھے بھی اپنا غلام ہی سمجھیے۔''

مہکتی کلیاں

☆ ایسی شناسائی جو فوراً ہو جائے پچھتاوے کا باعث بنتی ہے۔

☆ زندگی بھر خبردار رہو، لوگوں کا ظاہر دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی اندازہ نہ لگانا۔

☆ سننے میں جلدی کرو لیکن بولنے اور غصہ کرنے میں تاخیر کرو۔

☆ غصے میں آدمی اپنا منہ کھول دیتا ہے اور آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

☆ کانٹوں سے ڈرنے والی انگلیاں پھولوں کی نرمی محسوس نہیں کرسکتیں۔

☆ خواہشات مہیب جنگل ہیں جن میں بھٹکتے ہوئے عمر بیت جائے گی مگر منزل کا رستہ نہیں ملے گا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

امیر نوح نے اس کے اس جذبے کی تعریف کی۔ خاطر مدارات کے بعد اصل معاملات پر بات چیت ہوئی اور دشمنوں سے نمٹنے کی تدابیر پر صلاح مشورے ہونے لگے۔ آخرکار یہ طے پایا کہ سبکتگین واپس غزنی جائے اور لشکر جرار تیار کرے۔

امیر نوح نے سبکتگین، اس کی اولاد اور متعلقین کو طرح طرح کی بیش بہا خلعتوں اور نوازشوں کے ساتھ رخصت کیا اور خود لشکر کشی کا ارادہ کرکے بخارا کی طرف روانہ ہوا۔

☆☆☆

خراسان کے بازاروں میں یہ افواہ برابر گردش کررہی تھی کہ سبکتگین اپنے آقا کا چھوڑا ہوا علاقہ دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

ابھی خراسان میں بہت سے پرانے لوگ موجود تھے جنہوں نے الپتگین کا دور دیکھا تھا۔ اسی خراسان میں سبکتگین کو امیر الامرا کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کی سخاوت اور ہمدردی کے قصے زبانوں پر آ گئے تھے۔ لوگ دبے دبے لفظوں میں کہہ رہے تھے اگر سبکتگین خراسان پر قابض ہوجائے تو خراسان کی خوش حالی دوبارہ لوٹ آئے گی۔ قہوہ خانوں سے لے کر بھٹیار خانوں تک یہی باتیں گردش کررہی تھیں۔ ان لوگوں کو سبکتگین کی امیر نوح سے ملاقات کا علم تو نہیں تھا البتہ وہ باتیں جو ابو علی ہجوری کے محل

میں ہورہی تھیں، وہ کسی نہ کسی ذریعے سے باہر آرہی تھیں۔ جگہ جگہ قائم چھوٹی چھوٹی سرائے کے داستان گو بھی باتوں باتوں میں ان اندیشوں کا اظہار کررہے تھے کہ جنگ ہونے والی ہے۔

جب ابوعلی ہجوری نے خوب اچھی طرح جانچ لیا کہ سبکتگین اس معاملے میں سنجیدہ ہے تو اس نے بھی اجلاس طلب کیا اور اپنے امیروں سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ اس نے اپنے امیروں کو مخاطب کیا۔

''اگر ہمارا مقابلہ امیر نوح سامانی سے ہوتا تو ہمیں چنداں پریشانی نہیں تھی لیکن سبکتگین کا اس کے ساتھ مل جانا تشویش کا باعث ہے۔ جے پال سے اس کی فتوحات نے اس کا حوصلہ بہت بڑھا دیا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں بھی کسی والیٔ ملک سے تعلقات استوار کرکے مدد کی درخواست کرنی چاہیے۔ آپ لوگ مشورہ کرکے بتائیں کہ کس والیٔ ملک کے پاس جائیں۔''

سرداروں نے اپنی اپنی رائے دینا شروع کی اور بات جرجان کے والی فخر الدولہ دیلمی پر جاکر ٹھہری۔

''جرجان اور بخارا میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ کبھی قابلِ ذکر تعلقات نہیں رہے ہیں۔ فخر الدولہ یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کا ساتھ دے گا۔''

ابوعلی ہجوری نے اس مشورے کو پسند کیا اور اپنے ایک امیر جعفر ذوالقرنین کو خراسان و ترکستان کے بیش قیمت تحائف دے کر جرجان روانہ کردیا۔ جواب میں فخر الدولہ دیلمی نے تحائف روانہ کیے اور یوں دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہوگیا۔

سبکتگین نے غزنی میں رہ کر لشکر جمع کرنا شروع کیا۔ جے پال سے فتوحات نے اس کی بہادری کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ پیشہ ور سپاہی جیتنے والوں کا ساتھ دیتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ مالِ غنیمت مل سکے۔ سبکتگین کی بہادری کے سب قائل تھے لہٰذا اس کی ایک آواز پر لوگ اس کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔ جب وہ خاطر خواہ لشکر جمع کرچکا تو لشکر لے کر بلخ پہنچ گیا۔ امیر نوح بھی بخارا سے روانہ ہوکر وہاں پہنچ گیا۔

ابوعلی ہجوری کو ان کے جمع ہونے کی خبر ملی تو وہ بھی ایک لشکرِ جرار لے کر معرکہ آرائی کے لیے نکلا۔ اس نے اپنے اتحادی کو خبر کردی۔ فخر الدولہ نے بھی اس کی مدد کے لیے دو ہزار سوار بھیج دیے۔ صرف دو ہزار کی تعداد دیکھ کر اسے افسوس تو بہت ہوا لیکن کیا کرتا۔

امیر سبکتگین نے ایک وسیع میدان جنگ کے لیے منتخب کیا اور صفیں ترتیب دے کر خود امیر نوح اور اپنے بیٹے سلطان محمود کے ساتھ فوج کے درمیان قلب میں کھڑا ہوگیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو امیر نوح کے لشکر نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ ابوعلی ہجوری کے سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ ابتدائی لمحوں ہی میں شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ابوعلی ہجوری میدان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتا پھر رہا تھا... بالآخر اس کی کوشش رنگ لائی۔ سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ انہوں نے بھرپور حملہ کیا اور ایک سخت جنگ کے بعد ابوعلی ہجوری کا میمنہ اور میسرہ امیر نوح کے دونوں دستوں پر غالب آگیا۔ امیر نوح کے قدم اکھڑنے لگے تھے کہ اچانک ایک واقعہ رونما ہوگیا۔ دارا ابن قابوس جو فخر الدولہ کے ساتھ آیا تھا، ابوعلی ہجوری کے قلب لشکر سے نکل کر حملہ آور ہوا مگر جب دونوں صفوں کے درمیان آیا تو اپنی سپر پیچھے کی طرف کرکے امیر نوح کے سامنے حاضر ہوا اور اس سے اجازت لے کر لشکر خراسان سے مقابلے کے لیے میدان میں آگیا۔ لشکر خراسان نے جب اس کی یہ غداری دیکھی تو بجا طور پر یہ سمجھا کہ ابن قابوس نے تنہا یہ غداری نہیں کی ہوگی بلکہ لشکر کا ایک بڑا حصہ اس کے ساتھ ہوگا۔ یہ سوچتے ہی کہ لشکر میں غداری ہوگئی ہے، بڑے بڑے امیر اور وزیر اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ سبکتگین اس صورت حال کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیدہ بہادروں کو اپنے ساتھ لیا اور دشمن پر حملہ کردیا۔ خراسانی لشکر اس اچانک حملے سے بدحواس ہوگیا اور سامنے کی طرف بھاگ نکلا۔ محمود نے ان بھاگنے والوں کا پیچھا کیا۔ ان میں سے بیشتر کو قتل کیا اور جو باقی بچے انہیں قید کرلیا۔

فائق اور امیر ابوعلی ہجوری نیشاپور کی طرف فرار ہوگئے۔

امیر نوح نے محمود (غزنوی) کو سیف الدولہ کا لقب عطا کرکے ابوعلی ہجوری کی جگہ امیر الامراء مقرر کیا اور خود بخارا کی طرف روانہ ہوا۔

سبکتگین اور محمود تعاقب کرتے ہوئے نیشاپور کی طرف روانہ ہوئے۔ قرائن سے یہی پتا چلتا تھا کہ ابوعلی ہجوری اور فائق نیشاپور گئے ہوں گے۔ اب امیر نوح کا لشکر جدا ہوچکا تھا۔ سبکتگین اکیلا تھا لیکن اس کی ہیبت اتنی تھی اور ابوعلی ہجوری کا لشکر منتشر ہوچکا تھا کہ سبکتگین کی آمد کی خبر

سنتے ہی دونوں بے تحاشا بھاگے اور جرجان جا کر دم لیا۔ فخر الدولہ دیلمی سے دوستانہ مراسم استوار ہو ہی چکے تھے۔ اس نے دو ہزار سواروں کے ساتھ اس کی مدد بھی کی تھی۔ اس نے ان دونوں شکست خوردہ امیروں کو خوش آمدید کہا اور آئندہ ان کی مدد کا وعدہ کر کے انہیں اپنے پاس ٹھہرالیا۔

سبکتگین ابھی نیشاپور ہی میں تھا کہ اسے غزنی کی طرف سے فکر لاحق ہوئی۔ فخر الدولہ سے اس کی پرانی رنجش تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں غزنی سے اس کی غیر حاضری فخر الدولہ کو حملے کی ترغیب نہ دے بیٹھے۔ اس نے محمود کو نیشاپور میں چھوڑا اور خود غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

فائق اور ابو علی ہجوری شاید ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے محمود کو اکیلا دیکھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ محمود کے پاس اس وقت بہت تھوڑا لشکر تھا۔ اس نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا لیکن دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی فوج کو بچالے گیا اور ایک مقام "قازن" کی طرف نکل گیا۔ ابو علی ہجوری نے تمام مال و اسباب قبضے میں لے لیا۔

سبکتگین نے غزنی پہنچ کر سانس بھی نہیں لی تھی کہ اسے اس افسوس ناک خبر کا علم ہوا۔ اس نے ایک زبردست لشکر اپنے ساتھ لیا اور نیشاپور کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ابھی "طوس" کے قریب پہنچا تھا کہ ابو علی ہجوری کے لشکر سے اس کا سامنا ہو گیا۔ دونوں لشکروں میں جنگ شروع ہو گئی۔ ابھی یہ جنگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ دور کہیں گرد و غبار اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ جب یہ گرد و غبار چھٹا تو چونکنے کی باری ابو علی ہجوری کی تھی۔ یہ کوئی اور نہیں سبکتگین کا بیٹا محمود تھا جو اپنے لشکر کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ امیر ابو علی ہجوری نے اپنے لشکر کے میمنہ اور میسرہ کے دونوں دستوں کو قلب لشکر سے ملا کر فائق کے لشکر کے ساتھ سبکتگین کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ سبکتگین نے نہایت پامردی سے اس حملے کا مقابلہ کیا اور میدان میں ڈٹا رہا۔ بس اتنی مہلت کافی تھی۔ محمود شیر کی طرح گرجتا ہوا دشمن کے سر پر آپہنچا۔ دشمن کے لشکر نے مقابلہ کیا لیکن زیادہ دیر قدم جمے نہ رہ سکے۔ ابو علی اور فائق اپنی جانیں بچا کر فرار ہو گئے۔ خراسان اور طوس کے درمیان ایک قلعہ "کلات" نام کا تھا وہاں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔

سبکتگین نے غیر ضروری سمجھا کہ قلعے کا محاصرہ کیے پڑا رہے۔

وہ محمود سے آج جتنا خوش ہوا تھا، اس نے پدرانہ شفقت سے محمود کو گلے لگا لیا۔

"میرے جانباز فرزند! آج جس طرح تو نے مجھے خطرے سے نکالا ہے اس سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ تیری دلیری دیکھ کر میں نے تجھ سے بہت سی امیدیں باندھ لی ہیں۔ لگتا ہے میرا دیکھا ہوا خواب اب تعبیر بن کر میرے سامنے آنے والا ہے۔"

"کیسا خواب، ابا جان۔"

"یہ خواب آج میں تجھے سناتا ہوں۔ تیری پیدائش سے ایک گھڑی پہلے میں نے خواب دیکھا تھا کہ میرے مکان کے آتش دان کے اندر سے ایک درخت نکلا اور اس قدر بلند ہوا کہ ساری دنیا اس کے سائے میں آ گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اس خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنے میں ایک شخص نے آ کر تیرے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ درخت آنے والا بچہ ہے۔ میں نے یہی سوچ کر تیرا نام محمود رکھا اور تیری تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ خواب پورا ہونے والا ہے۔ میرا تو اب چل چلاؤ ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تو ایک عظیم الشان حکمران بنے گا اور تیری سلطنت یہاں تک وسیع ہو گی کہ ایک دنیا تیرے انصاف کے سائے میں آرام و راحت حاصل کرے گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں اس وقت دریائے چناب کے کنارے واقع شہر سوہدرہ میں ایک مقامی ہندو حکمران سے برسرِ پیکار تھا۔ تیری پیدائش کی خبر ملتے ہی مجھے یہ خبر ملی تھی کہ میرے لشکر نے دریا کے کنارے واقع مندر کو مسمار کر دیا اور حریف راجا فرار ہو گیا۔ تیری ابتدا ہی ایک شاندار فتح سے ہوئی تھی۔ تو زندگی بھر فتوحات حاصل کرتا رہے گا۔"

"میری دنیا و آخرت تو آپ کے قدموں میں ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے خواب کی تعبیر پر پورا اترنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

کچھ ہی عرصے بعد والد کی شکر گزاری کے اظہار کے طور پر محمود نے غزنی میں ایک باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک بڑی عمدہ اور عالی شان عمارت تعمیر کروائی۔ جب یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو اس نے سبکتگین اور دوسرے ارکان کو اس باغ کے مشاہدے کے لیے طلب کیا۔ سبکتگین اس باغ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ارکان سلطنت نے بھی تعریف کی اور محمود کو طرح طرح کے تعریفی کلمات سے نوازا۔

جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو سبکتگین نے محمود کو مخاطب کیا۔

"فرزند من! اگرچہ یہ عمارت بہت خوبصورت ہے

لیکن ایسی عمارت تو تمہارے ملازم بھی بنا سکتے ہیں۔ بادشاہ کے شایانِ شان تو ایسی عمارت ہے جس کی مثال کوئی دوسرا نہ دے سکے۔“

”وہ کون سی عمارت ہو سکتی ہے جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں؟“

”اس عمارت سے مراد اہلِ علم کے دل ہیں۔ اس گھر کی زمین پر اگر تم اپنی محبت اور احسان کے بیج بوؤ گے اور وہ بار آور ہوں گے تو ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نیک نام روزِ حشر تک زندہ رہے گا۔“ سبکتگین نے جواب دیا۔

”میں آپ کی اس بات کو گرہ میں باندھوں گا اور اہلِ علم کی ہمیشہ قدر کرتا رہوں گا۔“ محمود نے کہا۔

”جے پال کی طرف سے ہمیشہ ہوشیار رہنا۔ وہ بدعہد ثابت ہو چکا ہے۔ بار بار عہد کرے گا اور بار بار مقابلے پر آئے گا۔“

یہ دونوں باپ بیٹوں کی آخری ملاقات تھی۔ محمود نیشاپور روانہ ہو گیا اور سبکتگین غزنی ہی میں رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ”ترمذ“ گیا ہوا تھا کہ پیمانۂ عمر نے لبریز ہونے کی خبر دی۔ بڑھاپا تھا، کمزوری تھی۔ بیمار ہوا تو پھر اٹھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ محمود بدستور نیشاپور میں تھا۔ کسی کو یہ گمان ہی نہیں تھا کہ بیماری، موت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اسے بلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

شیخ ابوالفتح جیسا فاضل شخص اس وقت اس کے ساتھ تھا جس کی دانائی سے اس کا جی بہلا رہتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں محوِ گفتگو تھے۔ دورانِ گفتگو سبکتگین نے شیخ ابوالفتح کو مخاطب کیا۔

”ہم انسان نازل شدہ مصائب کو دور کرنے کی تدابیر اور لاحق شدہ امراض سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ قصاب، بھیڑ کو اس کے بال کترنے کے لیے پہلی مرتبہ زمین پر پٹختا اور اس کے پاؤں مضبوطی سے باندھ دیتا ہے۔ بھیڑ اپنے اوپر ایک نئی مصیبت دیکھ کر زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور مرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے لیکن قصاب اپنے کام سے فارغ ہو کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور وہ خوشی سے اچھلنے کودنے لگتی ہے۔ دوسری مرتبہ پھر جب قصاب اسے پکڑتا ہے تو ایک مرتبہ پھر وہ شک و شبے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کبھی سوچتی ہے اسے ذبح کر دیا جائے گا، کبھی سوچتی ہے پہلے کی طرح چھوڑ دیا جائے گا اور جب اس مرتبہ بھی قصاب، بال کترنے کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ پھر خوش ہو جاتی ہے اور سوچتی ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تیسری مرتبہ جب قصاب اسے ذبح کرنے کے خیال سے زمین پر لٹاتا ہے تو اس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا۔ سوچتی ہے کچھ لمحوں کے بعد پہلے کی طرح آزاد کر دی جائے گی۔ اسی بے خوفی کے عالم میں اس کے گلے پر چھری پھیر دی جاتی ہے۔

”ہم انسان بھی چونکہ ہمیشہ طرح طرح کی مصیبتوں اور نت نئے امراض میں آئے دن مبتلا ہوتے رہتے ہیں اس لیے ہر مصیبت اور ہر مرض میں، اس سے رہائی کا خیال کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخری مصیبت، موت کا پیغام لے کر آتی ہے اور اس غفلت کے عالم میں ہمارے گلے میں موت کا پھندا ڈال کر ہمیں اس دنیا سے لے جاتی ہے۔“

وہ شاید اپنی موت کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ شاید اس کی یہ آخری مصیبت ہے، اس کے بعد موت کا پھندا ہے۔

اس کی موت کے بعد ہی اس کا بیس سالہ دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ اس کے جسم کو تابوت میں رکھ کر غزنی لایا گیا اور وہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

غزنی میں اس وقت محمود کا چھوٹا بھائی اسمٰعیل موجود تھا۔ اس نے فوراً حکومت سنبھال لی۔ محمود نے نیشاپور سے اس کے نام خط لکھا کہ حکومت میرے حوالے کر دو تاکہ میں تمہارے لیے بلخ اور خراسان سے باغیوں کو نکال باہر کروں لیکن اسمٰعیل نے اس خط پر کوئی توجہ نہیں دی لہٰذا محمود لشکر لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا اور ایک معمولی سی جنگ کے بعد حکومت حاصل کر لی۔

تخت و تاج حاصل کرنے کے بعد اس نے خود کو اس کام کے لیے وقف کر دیا جس کی دعا اس کے باپ نے کی تھی یعنی باطل کے خلاف جہاد۔

ماخذات

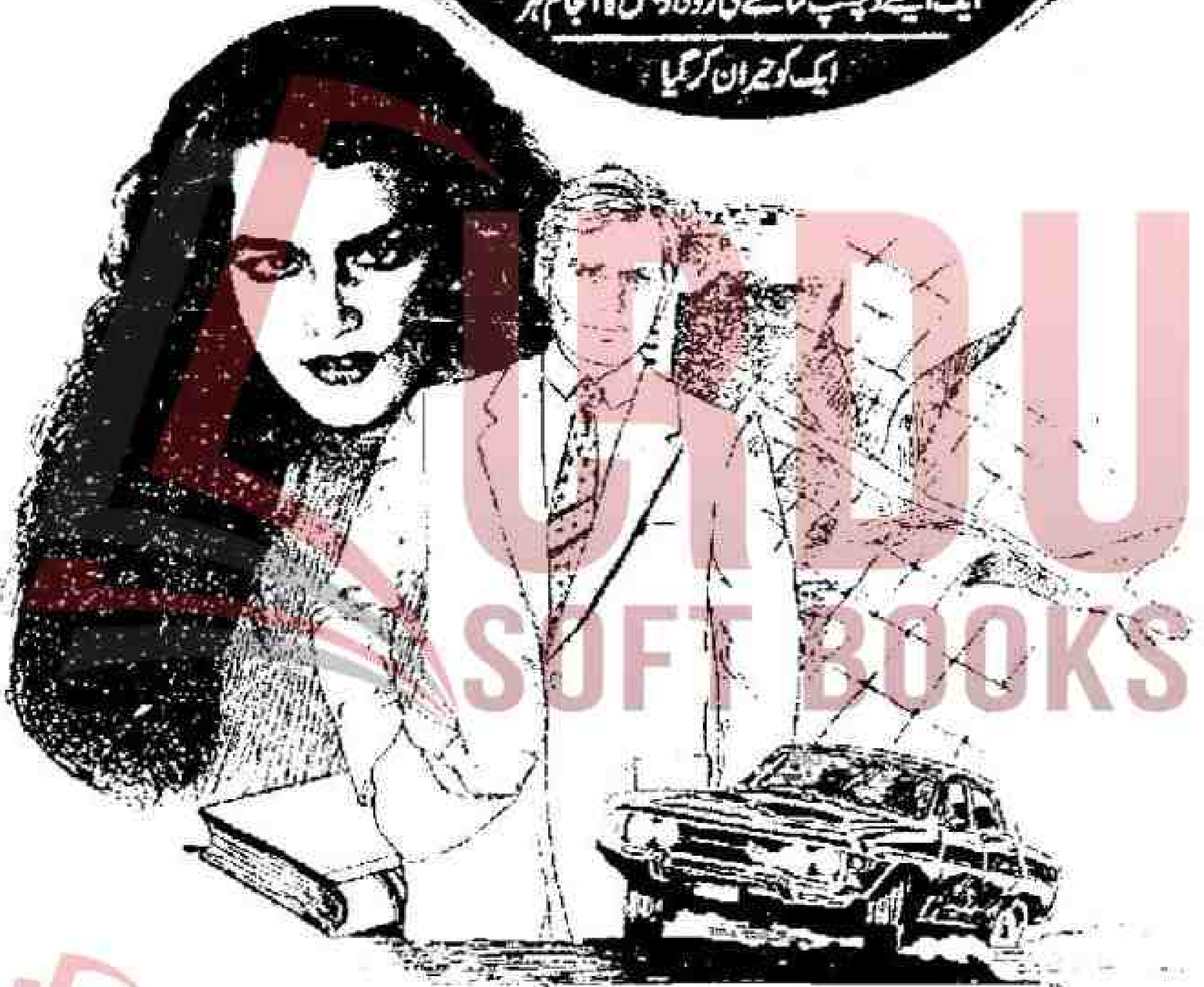
طبقاتِ ناصری، ترجمہ احمد علی شوق۔ طبقاتِ اکبری، ترجمہ محمد ایوب قادری
تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) تاریخ ہند۔ ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر۔ تاریخ ہند۔ ذکاءاللہ

تماشا

تنویر ریاض

کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن پھر بھی اتنا طویل سفر کرلیتا ہے کہ بولنے والا تھک جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ایک سے جڑا دوسرا جھوٹ پہلے سے بڑا اور جاندار ہوتا ہے لیکن بولنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ دوسروں کے سامنے جھوٹ بولتے بولتے انسان اپنی قدر کھودیتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ کی برف ایک نہ ایک دن پگھل جاتی ہے۔ کچھ یہی حال اس کا بھی ہوا جو خود کو بہت عقلمند سمجھ رہی تھی۔

ایک ایسے دلچسپ تماشے کی روداد جس کا انجام ہر ایک کو حیران کر گیا



وہ اپنے دوستوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو شادی کا خواب دیکھتے دیکھتے جوان ہوتی ہیں۔ وہ دو گواہوں کی موجودگی میں اپنے مرد سے شادی کر کے خوش ہونی چاہیے وہ کوئی بھی ہو جبکہ اس کی سہیلیاں ہمیشہ کسی مالدار اور خوبصورت شخص کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ وہ ان کی محرم راز تھی اور اس نے ان میں سے کئی ایک کی شادی میں دلہن کی سہیلی کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔

لیکن اس نے ان لڑکیوں سے جھوٹ بولا تھا، بالکل اسی طرح جیسے وہ دوسرے لوگوں سے غلط بیانی کرتی تھی۔

اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ اسے قدم قدم پر جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے اور یہ کہ اس نے کبھی اپنی شادی کے بارے میں خیالی پلاؤ نہیں پکایا کیونکہ یہ تصور اس کے خوابوں کے مطابق اب حقیقت میں بدلنے والا تھا۔ اس نے اس لباس کے بارے میں بھی کسی کو نہیں بتایا جس کا وہ تصور کیا کرتی تھی۔ سفید رنگ کا عروسی جوڑا جس میں کوئی موتی یا جھالر نہ ہو۔ بالکل اس کی ماں کے لباس کی ہو بہو نقل جو اس نے الماری میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ جب اس نے ماں کو اپنی دریافت کے بارے میں بتایا تو وہ پہلے ہنسی اور پھر شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے اس لباس کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔“ اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس سے میری بہت سی ناخوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے فوراً ماں سے پوچھا۔

ماں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔“

اس کی ماں اپنی بات پر قائم رہی اور وہ کبھی اس بارے میں نہ جان سکی۔ دوسرے روز ہی وہ لباس الماری سے غائب ہو گیا پھر اس نے دوبارہ اسے نہیں دیکھا لیکن وہ لباس اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا اور جوان ہونے تک وہ اسی کا خواب دیکھتی رہی لیکن اس نے کبھی کسی کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کیا اور اب شادی والے روز وہ بے حد مسرور تھی کہ اس لباس کی ہو بہو نقل بنوانے میں کامیاب رہی ہے کیونکہ اسے اس کا رنگ، بناوٹ اور دیگر جزئیات اچھی طرح یاد تھیں۔ اس کی ماں نے ہمیشہ اپنے لباس کی حقیقت چھپائے رکھی لیکن آج وہ اپنے تصور کے مطابق تیار کردہ لباس پہن کر اس کا آخری باب رقم کرنا چاہ رہی تھی۔

یہ ایک خوبصورت سوچ تھی۔ اس نے اپنا سر ہلایا۔ وہ کچھ بھاری پن محسوس کر رہی تھی جیسے یہ ایک اور جھوٹ ہو۔ جس طرح اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی، وہ بھی ایک ترتیب دیا ہوا جھوٹ تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنا نام یاد کرنے لگی جسے وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے استعمال کر رہی تھی۔ جیس سیڈر...... یہ ایک مختصر نام تھا جسے بہ آسانی یاد رکھا جا سکتا تھا۔ اب اس کا اصلی نام سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا جس سے اس نے کالج کی تعلیم مکمل کرانے کے دو سال بعد ہی چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔

برائن سے اس کی ملاقات ایک بار میں ہوئی جس کی منصوبہ بندی اس نے پہلے سے کر رکھی تھی لیکن اس میں اس کی عادت کا بھی کچھ دخل تھا کیونکہ جیس اپنی بیشتر شامیں ایسی ہی جگہوں پر گزارتی تھی۔ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ بھنی ہوئی مونگ پھلی کا پیکٹ اور اپنا پسندیدہ مشروب لے کر ایسی جگہ بیٹھ جاتی جہاں سے وہ ہر آنے والے پر نظر رکھ سکے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ وہ ڈیوٹی پر نہ ہوتے ہوئے بھی بار میں چلی گئی۔ ایسا عموماً ہفتے کی شب ہوا کرتا تھا لیکن باس کو یہ پسند نہیں تھا۔ اس لیے اس نے فارغ اوقات میں بار جانا چھوڑ دیا۔

کام بہت آسان تھا۔ اسے محض برائن کو باتوں میں لگانا تھا۔ اگر وہ اس کے لیے ڈرنک خریدتا ہے تو بہت اچھی بات ہے اور اگر نہیں تو کم از کم جیس کو اس کی طرف دیکھنا ضرور چاہیے مگر اس انداز میں کہ وہ اسے یاد رکھے۔ بظاہر یہ بہت آسان تھا۔ اس کی طرف دیکھو اور جب وہ اپنی نظریں تم پر مرکوز کرے تو دوسری طرف دیکھنا شروع کر دو۔ اس سے اتنا فاصلہ رکھو کہ درمیان میں ایک بار اسٹول ہی ہو۔ اپنا فون چیک کرو اور پھر قہقہہ لگاؤ۔

”بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔“ پھر وہ اس کی جانب مڑی تاکہ وہ اس کا میک اپ زدہ چہرہ دیکھ سکے جس پر اس نے بھرپور محنت کی تھی۔ ابھرے ہوئے پُرکشش رخسار، ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک، سبز آنکھیں اور شانوں پر جھولتے لہریے دار بال، وہ ہمیشہ سے زیادہ پُرکشش لگ رہی تھی۔ جیس ایسے زاویے سے جھکی کہ کشادہ گریبان سے بہت کچھ نمایاں ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس ہو جاتا اس نے اپنا فون درمیان میں رکھ دیا اور ایک بٹن دباتے ہوئے بولی۔ ”معاف کرنا، اس ویڈیو کی آواز کچھ زیادہ ہے۔“

یہ کسی سے بے تکلف ہونے کا ایک طریقہ تھا۔ اس تیس سیکنڈ کی ویڈیو میں ایک چھوٹا بچہ گانا گا رہا تھا اور جیسا کہ جیس کو توقع تھی، وہ گانا سنتے ہی مسکرانے لگا لیکن اس کا انداز تھوڑا سا مختلف تھا۔

”ہاں۔ یہ دلچسپ ویڈیو ہے۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کیا تم نے ابھی تک نہیں دیکھی؟“

جیس کو گفتگو آگے بڑھانے کے لیے ایک سرا مل گیا وہ بولی۔ ”نہیں لیکن یہ انٹرنیٹ ہے۔ جو چیز لاکھوں لوگوں کے لیے پرانی ہے، وہ کسی اور کے لیے نئی ہو سکتی ہے۔“

برائن نے اس کے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی سائڈ میں دیکھو۔ یہ بھی بہت مزاحیہ ہے۔ کیا تم

نے یہ ویڈیو دیکھی ہے؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا اور ویڈیو دیکھنے لگی پھر وہ اس کے لیے ڈرنک لے کر آیا اور دونوں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ جیس نے محسوس کیا کہ وہ پوری طرح اس کے سحر میں مبتلا ہو چکی ہے۔ دو دن بعد وہ ایک ریستوران میں کھانا کھانے گئے اور چوتھی ملاقات میں انہوں نے تمام حدیں عبور کرلیں۔ گو کہ اس کے دل میں برائن نے جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک پیارا اور مہربان شخص تھا لیکن اس نے اسے اپنا اصل نام نہیں بتایا کیونکہ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس سے سچی محبت کرنے لگی ہے لیکن تین ماہ بعد برائن نے یہ کہہ کر اسے حیران کردیا کہ کیا وہ اس کی ماں سے ملنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی ماں گلوریا چاروبیٹ شہر کی ممتاز شخصیت تھی۔ وہ یقیناً اس سے ملنا چاہے گی۔ یہ ایک اہم بات تھی یا کم از کم اسے کہانی کی شروعات کہا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

''جیس! تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت۔'' گلوریا نے شادی ہال کے خصوصی لیڈیز روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا جو دلہن اور اس کی سہیلیوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ دلہن کی خاص سہیلیوں سے آدھ گھنٹا پہلے ہی آگئی تھی۔ ان میں ایک برائن کی چھوٹی بہن نتاشا اور دوسری لنڈا تھی۔
جیس اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی۔''
''تم جانتی ہو جیس کہ میں کبھی غلط بیانی نہیں کرتی۔ میں نے تمہارے جیسی خوبصورت دلہن پہلے کبھی نہیں دیکھی اور یہ لباس تو بہت ہی شاندار ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ ہم نے اس کا انتخاب کیا۔''
جیس کی اگلی مسکراہٹ حقیقی تھی۔ گلوریا کو پورا یقین تھا کہ جیس نے وہی عروسی جوڑا زیب تن کیا ہوا ہے جو اس نے بارہ ہزار آٹھ سو ڈالر میں خریدا تھا۔ وہ اس حقیقت سے لاعلم تھی کہ جیس نے بعد میں اسے واپس کر کے ایک نسبتاً سستا اور ہو بہو ویسا ہی جوڑا ساڑھے تین ہزار ڈالر میں خرید لیا تھا۔
''مجھے بھی یہ لباس بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' جیس نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔
گلوریا نے جیس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ جیس کے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ ایک الگ بات تھی کہ کئی مردوں کو اس کا ہاتھ پکڑنے کا موقع ملا لیکن ایک مالدار

لطیفہ

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ''تمہارے مالی حالات کیسے ہیں؟''
دوسرا دوست۔ ''ہمارے گھر میں مالی ہی نہیں تو حالات کیسے ہوں گے۔''

☆☆☆

ایک شخص ہر روز تہجد کی نماز پڑھ کر گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگتا۔ ''یا اللہ مجھے اولاد دے دے۔'' پندرہ سال تک اس کا یہی معمول رہا۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کے پاس فرشتہ آیا اور اس سے کہا۔ ''خدا کے لیے پہلے شادی تو کرلو پھر دعا مانگنا۔''
مرسلہ۔ محمد شہباز ناز، سرگودھا

بوڑھی عورت جو اس کی ساس بننے والی تھی، نے جب اس کا ہاتھ پکڑا تو اسے کچھ یاد آنے لگا۔ اس موقع پر وہ کوئی ناخوشگوار مداخلت برداشت نہیں کرسکتی تھی لہٰذا اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرالیے۔
گلوریا ایک قدم پیچھے ہٹی اور جیس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''جانتی ہوں کہ بہت جلدی آگئی، لیکن اس کی ایک وجہ ہے۔''
جیس گھبراتے ہوئے بولی۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہوگئی؟''
گلوریا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو۔''
یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ جیس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر گلوریا نے فوراً ہی کچھ نہ بتایا تو وہ نہیں جانتی کہ اسے کیا کرنا ہے۔
یوں لگا جیسے گلوریا نے اس کی پریشانی بھانپ لی ہو۔ وہ بولی۔ ''معاملہ بہت ہی گڑبڑ ہے۔''
''بتاؤ کیا بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا تعلق برائن سے نہیں ہوگا۔''
گلوریا نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے ڈیئر۔ تم غلط سوچ رہی ہو۔ برائن بالکل ٹھیک ہے۔'' پھر اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''میں اپنے شوہر کی بات کررہی ہوں۔ وہ یہاں آرہا ہے۔''
جیس نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''تمہارا شوہر؟''
''میں اس کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں

کرتی۔" وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولی پھر آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی پشت جیس کی طرف تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ایسا شخص ہے جس سے میں ابھی تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی لیکن اس میں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ وہ مجھ سے دور رہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ یہاں آ رہا ہے۔"

پھر وہ اس کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ "مجھے بہت افسوس ہے جیس۔ اگر وہ یہاں آ گیا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ میں دیکھوں گی کہ کیا کر سکتی ہوں۔"

جیس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ "تمہارا شوہر اس شادی میں رخنہ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے بتا دیا۔ امید کرتی ہوں کہ سب ٹھیک رہے گا۔"

گلوریا ایک بار پھر جیس کی طرف بڑھی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ جیس کو اپنی انگلیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "جیس! تم واقعی حیرت انگیز ہو۔ کسی دن تم سے دل کھول کر باتیں کروں گی لیکن فی الحال ہمیں اس معاملے سے نمٹنا ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ گلوریا نے پرس میں جھانکا اور بولی۔ "شاید میرے وکیل کا فون ہے۔ مجھے اس سے بات کرنا ہوگی۔ میں بعد میں لڑکیوں کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

جیسے ہی وہ جیس کو تنہا چھوڑ کر لیڈیز روم سے باہر گئی تو جیس نے سوچا کہ وہ ناچنا شروع کر دے یا کوئی بچوں جیسی حرکت کرے لیکن اس طرح لباس خراب ہو جانے کا ڈر تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی خواہش پر قابو پایا اور چیٹ ایپ کے ذریعے باس کو پیغام بھیجنے لگی۔

"وہ راستے میں ہے۔"

دوسرے ہی لمحے جیس کے فون پر جواب آ گیا۔

"شاباش ایجنٹ ایم...... لیکن تمہیں مبارک باد بعد میں ملے گی۔"

جیس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اسے لگا کہ کمر سے بندھی ہوئی گن اس کی ران میں گھس گئی ہے۔ منصوبے کا اگلا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ گلوریا کا شوہر ہی اصل مسئلہ تھا اور اسی وجہ سے اس کام کو ترجیح دینا پڑی۔

یہ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے جب جیس کو باس کی طرف سے رات گئے ملنے والی ای میل پر عمل کرتے ہوئے وقت سے پہلے دفتر آنا پڑا۔ اس کے پہنچتے ہی باس لورین میک گی نے اس کی میز پر کئی تصویریں اور فائلیں رکھ دیں۔

"یہ تمہارا ہدف ہے۔" لورین نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی عمر پینسٹھ کے قریب تھی اور اس کے بالوں میں بے ڈھب طریقے سے کنگھی کی گئی تھی۔ اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ اگر کوئی نہ بتاتا، تب بھی جیس اس کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگا سکتی تھی۔

پھر لورین نے ایک سیاہ بالوں والی عورت کی تصویر پر انگلی رکھی جس کی عمر پچاس کے قریب تھی جبکہ دوسری تصویر ایک پچیس سالہ مرد کی تھی۔ اس کے سنہری بال تھے اور جسم کسی ٹینس کے کھلاڑی کے مانند تھا۔ جیس کو ایسے ہی مرد پسند تھے لیکن فی الوقت اس بات کی اہمیت نہیں تھی۔

"یہ اس کے مددگار ہیں۔" لورین نے کہا۔

جیس کو اس کی بات ہضم کرنے میں کچھ دیر لگی پھر ان تینوں کا تعلق اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ تھوڑی سی پُرجوش ہوئی پھر اس پر گھبراہٹ غالب آ گئی۔ وہ بولی۔ "تم چاہتی ہو کہ میں برائن یا گلوریا سے قریب ہو جاؤں؟"

لورین کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جس سے جیس ہمیشہ خوفزدہ ہو جاتی تھی کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ کوئی بہت ہی اہم بات ہے۔ ایسی بات جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

"دونوں......" اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

"لیکن پہلے تم کسے پھانسنا چاہو گی؟"

"برائن...... وہ میری ہی عمر کا ہے۔"

"اور تم اس سے ملنے کے لیے بار میں جانا چاہو گی۔ وہ بھی یہی کرتا ہے۔"

"اگر میں براہِ راست گلوریا سے قریب ہونے کی کوشش کروں؟"

"اچھی طرح سوچ لو۔ تم ایسا کیونکر کر سکو گی؟ کیا تم دونوں کا کوئی مشترکہ حلقہ ہے؟"

جیس نے چند لمحے لورین کے الفاظ پر غور کیا اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ ان دونوں کا ایسا کوئی مشترکہ حلقہ نہیں تھا۔

"پھر تمہیں ترتیب سے چلنا ہوگا۔ پہلے برائن سے تعلق بڑھاؤ پھر گلوریا اور اس کے بعد جیف۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ان کے درمیان طلاق ہوئی ہوگی۔" جیس نے کہا۔

"بالکل۔ طلاق ہو بھی نہیں سکتی۔" لورین نے وضاحت کی۔ "ایسی صورت میں وہ اس کے خلاف گواہی دے سکتی ہے۔ اس کے بعد اسے مالی نقصان بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جیف نے اس کے فنڈ کو جو سہارا دے رکھا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایسے لوگوں کے درمیان ایک

عمل انتظام ہے جو ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

''لیکن ایک متوقع قاتل سے شادی کرنا......''

لورین اپنی جگہ سے اٹھی اور جیس کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔'' پھر وہ اگلے پندرہ منٹ تک اسے اپنا منصوبہ سمجھاتی رہی۔ جیس نے بڑے غور سے اس کی بات سنی۔ اس دوران وہ کئی بار خوفزدہ ہوئی۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد لورین نے کہا۔

''اب تم کیا کہتی ہو؟''

''اگر میں نے یہ کام کرلیا تو میری ترقی ہوجائے گی؟''

''ہاں۔ تم فل ایجنٹ بن جاؤ گی۔''

اس کے باوجود جیس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے ایک اور سوال پوچھ لیا۔ ''اگر میں نے اس شخص سے شادی کرلی تو کیا یہ فوری طور پر ختم ہوسکتی ہے؟''

لورین ہنستے ہوئے بولی۔ ''ہم دیکھیں گے۔ فی الحال تم اپنی اہلیت ثابت کرو۔''

☆☆☆

جیس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ جیف اپنے سوتیلے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے آسکتا ہے جسے وہ اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا لیکن لورین کو پورا یقین تھا کہ جیف اتنی بڑی خاندانی تقریب میں ضرور آئے گا وہ اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں بھی گیا تھا جبکہ اس وقت بھی وہ ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ بازی میں مصروف تھے۔ لگتا ہے کہ اسے شادیوں میں جانے کا شوق تھا۔

جیس اس معاملے میں بڑی محتاط تھی۔ اس کی زبان پر کبھی جیف کا نام نہیں آیا۔ ایک بار غلطی سے اس نے برائن سے تذکرہ کردیا تھا جس پر وہ ناراض ہوگیا اور بولا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

''ٹھیک ہے۔'' جیس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''ہم کبھی دوبارہ اس کا ذکر نہیں کریں گے۔'' اور وہ بعد میں اپنی بات پر قائم بھی رہی۔

اس کے مقابلے میں گلوریا تھوڑی سی باتونی واقع ہوئی تھی۔ ایسے مواقع پر جیس ایک اچھی سامع بن جاتی اور کام کی معلومات نوٹ کرتی رہتی لیکن اس تمام گفتگو سے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ جیف فونکس میں رہ رہا تھا کیونکہ اسے بوسٹن کا سرد موسم پسند نہیں تھا۔ ان معلومات میں جو کمی رہ گئی تھی، اسے جیس نے فون کال ٹریس اور کمپیوٹر ہیکنگ کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی اور وہ جیف کے بارے میں بہت کچھ جاننے میں کامیاب ہوگئی۔

وہ بہت ہی برا شخص تھا اور صرف دولت کمانے یا عیاشی کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا اور اسے اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ دولت کیسے اور کس سے حاصل کی جائے۔ اس کی پہلی بیوی لنڈا شادی کے بیس سال بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ خوش قسمت تھی کہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب رہی۔ البتہ اس کی دو داشتاؤں اور تین کاروباری دوستوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ ان کی لاشیں بھی نہ مل سکیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے جیف صاف بچ گیا۔

لیکن اب جیف کا زوال شروع ہوچکا تھا۔ اسی لیے جیس کو طلب کیا گیا کہ وہ اس پر نظر رکھے۔ کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے کوئی جسمانی یا ذہنی بیماری لاحق ہے لیکن سب اس پر متفق تھے کہ وہ اپنی معمول کی سرگرمیوں سے دور ہوتا جارہا ہے اور جب وہ ایسا کرنے لگے تو غلطیاں کرنے لگتا ہے۔ جیسے وہ اپنے سوتیلے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کی غلطی کررہا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے جیس کا دل اندیشوں میں گھر گیا۔ کہیں وہ غلطی تو نہیں کررہی؟ اگر برائن یا گلوریا شادی سے پہلے اس کی حقیقت جان گئے تو کیا ہوگا؟ اگر جیف چلا گیا؟ اس سے پہلے کہ وہ اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرسکیں، وہ اس صورت حال سے کس طرح نمٹے گی۔

دروازے پر ایک دستک سنائی دی۔ ''اندر آجاؤ۔'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ میرے خدا! جیس تم واقعی بہت شاندار لگ رہی ہو۔'' یہ لوسی تھی جسے شادی کی تقریب میں بلانا پڑ گیا تھا۔

لوسی ایڈمز اس کی سوتیلی بہن تھی۔ ایک ہی باپ کی اولاد لیکن ان کی مائیں الگ الگ تھیں۔ ان کی عمروں میں سات سال کا فرق تھا۔ لوسی کا بچپن اور نوجوانی جیس کی نظروں سے اوجھل رہی۔ پہلی بار ان کی ملاقات اس وقت ہوئی جب جیس اپنے پیروں پر چلنا سیکھ رہی تھی۔ دوسری بار اسے خاندانی ہم آہنگی کی خاطر لوسی کے ہائی اسکول گریجویشن کی تقریب میں زبردستی جانا پڑا۔ جیس کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ پوری تقریب کے دوران لوسی کی ماں کی نظریں اسی پر جمی رہیں۔ وہ کیسے اس حقیقت سے آشنا ہوتی کہ یہ ''خاندانی ہم آہنگی'' اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باپ اور بہن سے جدا کردے گی۔

پھر اچانک ہی تین ماہ قبل اس کی ملاقات لوسی سے ایک بار میں ہو گئی۔ اس نے اسے فوراً ہی پہچان لیا لیکن وہ نیویارک میں کیا کر رہی تھی؟ اس کے گریجویشن کی تقریب تو مشی گن میں ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ وہیں رہ رہی ہو گی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' جیس نے پوچھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مشی گن میں رہتی تھیں؟''

لوسی نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں نے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ شہر چھوڑ دیا۔ وہ جگہ کسی جہنم سے کم نہیں۔ میں یہاں ملازمت کرنے آئی تھی۔''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیس کے کندھوں پر رکھ دیے اور خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''میری بہن...... یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو۔ ہم رابطے میں کیوں نہیں رہے؟''

جیس نے کہا۔ ''تم اس کی وجہ جانتی ہو۔''

لوسی کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ الجھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ڈیڈی کا کہنا ہے کہ تم خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔''

جیس اپنی بڑی بہن کو گھسیٹتی ہوئی بار تک لے کر آئی اور بولی۔ ''میرے لیے ایک ڈرنک لے کر آؤ پھر میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔''

وہ دونوں کافی دیر تک بار میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ جیس نے اسے تفصیل سے گھر چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ لوسی ان دنوں ڈوبونیٹ اینڈ سنز میں سینئر وائس پریذیڈنٹ کے طور پر کام کر رہی ہے۔

''کیا نام بتایا تم نے...... ڈوبونیٹ؟'' جیس نے کہا۔

''ہاں اور اسی وجہ سے میں یہاں نظر آ رہی ہوں۔ ان کے سان فرانسسکو آفس نے مجھے ملازمت دی تھی پھر مجھے نیویارک بھیج دیا گیا۔''

''گویا تم گلوریا چارویٹ کے ساتھ کام کرتی ہو۔'' جیس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''گلوریا۔ اس کی کیا بات ہے۔ ڈائنامیٹ سے کم نہیں۔ مجھ سمیت پورا دفتر اس سے ڈرتا ہے۔''

''مجھے ایسی ہی عورتیں پسند ہیں۔''

لوسی آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''تم گلوریا چارویٹ کو جانتی ہو؟''

''اس کے بیٹے سے میری منگنی ہوئی ہے۔'' جیس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' لوسی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً وہ تمہیں اس طرح نہیں جانتی ہو گی جیسے میں جانتی ہوں۔''

''بالکل'' جیس نے کہا۔

''کیا تم کوئی مختلف نام استعمال کر رہی ہو؟''

جیس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی بڑی بہن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ بولی۔ ''واقعی بڑی دلچسپ بات ہے۔ میں اسے ایک شرط پر راز میں رکھوں گی۔''

جیس نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

''میں تمہاری شادی میں دلہن کی سہیلی بنوں گی۔''

☆☆☆

اور اب لوسی یہاں موجود تھی۔ وہ جیس کو گلے لگا کر اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی اور اس بات پر خوش تھی کہ اسے اس شادی میں اپنے خاندان کی نمائندگی کا موقع ملا۔

جیس تھوڑا سا جھجکی اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے لباس پر شکنیں ڈال دو گی اور تم اتنی جلدی کیسے آ گئیں؟ میرا خیال تھا کہ تم بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ ہی آؤ گی۔''

''اوہ۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں سکی۔ یہ سب اتنا سنسنی خیز ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم میں سے ایک کی شادی ہونا تھی اور وہ میں نہیں ہو سکتی۔''

جیس کے پاس باتوں کے لیے وقت نہیں تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ لوسی بولنے سے باز نہیں آئے گی لہٰذا اس نے از راہِ مذاق کہا۔ ''کیا تم شادی پر یقین نہیں رکھتیں؟''

''کیوں نہیں لیکن میری عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے اور میں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا ہے لیکن میں کم از کم تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر تمہارا خواب پورا ہوتے تو دیکھ سکتی ہوں۔''

''جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں نے اس سے زیادہ احمقانہ بات نہیں سنی۔ تم تو ابھی پینتیس کی بھی نہیں ہو۔''

''امید کرتی ہوں کہ میں جس کیفیت سے گزر رہی ہوں، وہ تم کبھی نہ جان سکو۔'' لوسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ تم دلہن بن کر کتنی خوبصورت لگ رہی ہو مجھے تم پر فخر ہے۔''

جیس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ لوسی کا تبصرہ حقیقی محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اچانک لوسی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دوں۔ ہاں ایک بات اور...... گلوریا کا شوہر بھی یہاں موجود ہے۔''

''تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟''

''بالکل نہیں۔ جب میں تم سے ملنے اندر آئی تو وہ لابی کے نزدیک ہی ٹہل رہا تھا۔ میں یقین نہیں کر سکتی کہ اسے مدعو کیا گیا ہوگا۔''

''اسے نہیں بلایا گیا۔'' جیس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ گلوریا اسے مدعو کرتی۔''

''اس کے آنے سے دلچسپی بڑھ جائے گی۔'' لوسی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد جیس نے دل میں سوچا کہ شکر ہے، لوسی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کی نظر وال کلاک پر گئی۔ گلوریا کسی بھی لمحے واپس آسکتی تھی۔

فون کی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اسکرین پر نام دیکھا اور بولی۔ ''کیا بات ہے؟'' یہ کہہ کر وہ کمرے کے آخری کونے کی طرف چلی گئی تاکہ اس کی آواز باہر نہ جاسکے۔

''وہ جانتا ہے۔'' لورین نے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''وہ نہیں جانتا کہ یہ......''

''یہیں رک جاؤ۔ فون پر میرا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ تم سب لوگوں کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے۔'' جیس نے دھیمی آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ لمحہ بھر بعد لورین کا پیغام چیٹ ایپ پر آیا۔ ''معاف کرنا۔ مجھے خیال نہیں رہا۔ میں تھوڑی سی پریشان ہوں۔ ہمیں یہ پروگرام یہیں ختم کر دینا چاہیے۔''

''ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ میں کیا کروں؟ عروسی جوڑا اتاردوں اور آنسو بہاتے ہوئے برائن سے کہوں کہ اس سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں اس کے سوتیلے باپ کے بارے میں تحقیقات کر رہی ہوں۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں کہ میں اپنے وقار کی دھجیاں اڑائے بغیر کیسے اس قصے کو ختم کروں؟''

''بالکل، تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے تم یہ ظاہر کرو کہ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''میں کس طرح یہ ظاہر کر سکتی ہوں جبکہ تم نے ہی حقیقت میں مجھے یہ بات بتائی ہے۔''

جیس شدت سے چاہتی تھی کہ لورین اس بات کو سمجھ جائے۔ اسی لیے اس نے ڈرامائی اور بلند لہجہ اختیار کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی ماں پر چلا رہی ہو پھر اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو قابو کرتے ہوئے لکھا۔ ''میں معافی چاہتی ہوں۔''

''یہ میری غلطی ہے۔ میں نے ہی سب کچھ تباہ کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے سب حساب لگا لیا ہے لیکن جب جیف نے اس شادی کو خراب کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی نوعیت بدل گئی۔''

''مجھے خوشی ہے کہ ابھی ایٹمی جنگ دور ہے۔'' جیس نے پیغام ٹائپ کیا۔ ''جس کا مطلب ہے کہ سب کچھ مجھے ہی کرنا ہوگا۔ یہ تو بتاؤ کہ وہ کیسے جانتا ہے؟''

''اسے صرف یہ معلوم ہے کہ یہاں کوئی جاسوس موجود ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔''

''یہ بھی غنیمت ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم طنز کر رہی ہو......''

جیس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ٹائپ کیا۔ ''اس لیے کہ میں خوفزدہ ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بے خیالی میں اوپر اٹھایا جو کونے کی میز پر رکھے ہوئے گلدان سے جا ٹکرایا جس کے نتیجے میں وہ زمین پر گر کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ جیس ان ٹکڑوں کو اٹھانے کے لیے جھکی تو اس کے بائیں ہاتھ میں درد ہونے لگا۔ اس نے لکھا۔ ''میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گی۔ ہمیشہ کی طرح۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

''ہاں ایجنٹ ایم...... میں جانتی ہوں۔''

اس کے بعد لورین نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ جیس نے فون کو دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے گلدان کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور اسے فون پر دے مارا۔ وہ بھی اس کی ضرب سے تباہ ہوگیا۔ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ اگر کسی وجہ سے اسے اپنا فون ضائع کرنا پڑا تو شادی ہال کی تیسری منزل پر واقع ایک الماری کی سب سے اوپر والی دراز میں اسے تین تہوں میں لپٹا ہوا ایک فون مل جائے گا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور گلوریا دلہن کی سہیلیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئی جبکہ لوسی اس کے پیچھے تھی۔ ''کیا ہوا...... تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

جیس نے اپنی ہونے والی ساس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے خیالی میں میرا ہاتھ گلدان سے ٹکرا گیا۔ میں ٹھیک ہوں لیکن میرا فون یقیناً تباہ ہوگیا۔ تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟''

گلوریا کے چہرے سے پریشانی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ غصے نے لے لی۔ ''کیونکہ میرا احمق شوہر یہاں آگیا

ہے اور اسے کسی جاسوس کی موجودگی کا شبہ ہے۔"

"جاسوس!" جیس نے حیران ہوتے ہوئے کہا اور گلوریا کے ساتھ آئی ہوئی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔ ان سب نے ہلکے نیلے رنگ کے فینسی گاؤن پہن رکھے تھے۔

"ہاں جاسوس۔" گلوریا کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ "وہ اس کا تعلق فیڈرل ایجنسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ آخر جیف کو یہاں کیوں آنا پڑا؟"

تشا آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "امید ہے کہ وہ خاموش رہے گا اور ہم بہترین طریقے سے اپنا کام کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک شاندار شادی ہوگی۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جیس اس کی موجودگی میں بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ رہ رہی ہو لیکن اب بھی اس کی نظریں برائن پر تھیں اور وہ کسی وقت بھی اس سے جنسی تعلق قائم کر سکتی تھی۔ جیس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ 'وہ ایسی باتیں کیوں سوچ رہی ہے؟ تشا اگر چاہے تو بعد میں بھی یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ فی الحال خاموش رہے اور آگے کی طرف دیکھے۔

گلوریا نے پہلے تشا اور پھر جیس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ واقعی ایک شاندار شادی ہوگی۔ سمجھ لو کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔ تم سن رہی ہو جیس...... میرا مطلب اس شادی کو تباہ کرنا نہیں تھا۔"

"تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" جیس نے کہا اور دل میں سوچنے لگی۔ "تم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ہمارے ملنے سے پہلے تباہ ہو چکی تھی۔"

گلوریا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "پانچ منٹ بعد موسیقی شروع ہو جائے گی۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

جیس پہلے تشا اور پھر لوسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں کر لوں گی۔"

"ہاں۔ میں عہد کرتا ہوں۔" برائن نے پادری کے روایتی سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس نے جیس کا ہاتھ پکڑا جو سرد اور لجلجا ہو رہا تھا جبکہ اسے گرم اور مضبوط ہونا چاہیے تھا۔ وہ ایک طرح سے ریاکاری کر رہی تھی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی اور اسے امید تھی کہ دوبارہ ایسا نہیں کرے گی۔ برائن بہت پیارا اور پُرجوش لگ رہا تھا اور وہ بھی ایسا نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی تاکہ شادی کے پہلے اس کی چاہت کا ساتھ دے سکے لیکن جیسے ہی اس نے نشستوں کے درمیان بنے ہوئے راستے پر چلنا شروع کیا، اس کی نظر اپنے شکار پر چلی گئی۔

وہ بہت دبلا پتلا اور کمزور نظر آ رہا تھا جبکہ اخبارات، ٹیلی وژن اور انٹرنیٹ پر وہ کافی صحت مند اور حاقت ور دکھائی دیتا تھا۔ اس کا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔ اسے یقیناً کوئی بیماری لاحق ہوگی لیکن جیسے ہی وہ اس کے پاس سے گزری، اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور جیس کو اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک نظر آئی جیسے وہ اس کے لیے قابلِ توجہ ہو۔ جیف نے کچھ کہا۔ وہ اس کے الفاظ نہ سن سکی لیکن اس کی نفرت کو محسوس کر سکتی تھی۔ جیس حیران تھی کہ اس نے اتنی جلدی اس کے بارے میں اندازہ کیسے لگا لیا؟ کیا اس کا فون ٹیپ ہو رہا تھا یا وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کی باتیں سن رہا تھا؟ اس نے سوچا کہ کیا وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ جیف کو اس کی اصلیت کا پتا چل جائے؟ ہاں۔ وہ شدت سے اس کردار کا خاتمہ چاہ رہی تھی۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا، لیکن فوراً ہی اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ فی الحال اسے انتظار کرنا چاہیے۔

ہال میں برائن اور جیس کے درمیان عہد و پیمان ہوئے۔ جیس نے ایک بار پھر اس کے چہرے سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کہیں اسے شک تو نہیں ہو گیا لیکن ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ مہمانوں نے تالیاں بجائیں اور ہال میں تیز موسیقی گونجنے لگی۔ اس نے برائن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ اسے کس طرح حقیقت سے آگاہ کر سکتی تھی چنانچہ اس نے ایک بار پھر فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔

اگلے دو گھنٹے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ تمام مہمان کھانے پینے اور ڈانس میں مصروف تھے۔ جیس ایک مجسمے کے مانند اپنی نشست پر بیٹھی رہی پھر کسی نے اسے رقص کی دعوت دی۔ وہ جیف تھا۔ اس نے اپنے کندھے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ آہستہ سے حرکت کرتا ہوا آیا اور اسے کمر سے پکڑ کر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ جیس نے محسوس کیا کہ وہ بہت اچھا رقص کر رہا تھا۔

"تم نے اتنا اچھا رقص کہاں سے سیکھا؟" یہ پوچھتے ہوئے اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی لیکن یہ جاننا بھی ضروری تھا۔

"مجھے اس کی مشق ہو گئی ہے۔"

موسیقی کی دُھن تیز ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں میں

کوئی بات نہیں ہوئی۔ جیس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور اسے یقین تھا کہ وہ بھی انہیں سن سکتا ہے۔ اس کی کمر کے گرد جیف کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہوگئی تھی۔

”مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں اپنی بہو کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”انہوں نے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔“ جیس کھسیانی ہوتے ہوئے بولی۔ ”البتہ گلوریا نے ایک مرتبہ تمہارا ذکر کیا تھا۔“

جیف نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا!“ لیکن اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا۔ جیس کو محسوس ہوا کہ ان دونوں کے درمیان برقی رو جیسی کوئی چیز دوڑ رہی ہے۔ وہ تھوڑی سی پریشان ہوگئی۔

موسیقی رکی تو وہ بھی کہیں چلا گیا اور جیس تنہا رہ گئی۔ اسی وقت برائن آ گیا۔ ”وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ کیا اس نے تمہیں دھمکایا، کوئی تکلیف پہنچائی؟“

”نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔“ جیس نے برائن کا ہاتھ پکڑا اور اسے میز کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ”جو کچھ ہوا، مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا۔“

”میں نہیں مان سکتا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اسے ہماری شادی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

جیس خود بھی حیران تھی۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کا لباس پھٹ گیا۔ اس نے برائن سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔“

”جیس......

”وعدہ، جلدی آ جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے ایک ہاتھ اس جگہ پر رکھا جہاں سے لباس پھٹ گیا تھا اور لوگوں کے ہجوم سے بچتی ہوئی سیڑھیوں کی جانب چل دی۔ اس کے ذہن میں تیسری منزل پر واقع الماری تھی۔ راستے میں آنے والے کچھ لوگوں نے اسے مبارک باد دی۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ ”میرا لباس، اسے ٹھیک کر کے آتی ہوں۔“ کچھ اور لوگوں نے بھی مدد کی پیشکش کی لیکن اس نے جواب میں ہاتھ ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ کسی کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ لباس کا پھٹنا اس کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ اس طرح اسے اپنا اصل کام دوبارہ شروع کرنے سے چھٹکارا مل گیا۔

جیس نے پچھلی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کے پیروں میں جلن ہو رہی تھی۔ تیسری منزل لوگوں سے خالی تھی اور وہاں وہ صرف اپنی آواز محسوس کر سکتی تھی۔

وہ دائیں جانب مڑی اور ہال کے آخری سرے پر اسے وہ کمرا مل گیا جس کی اسے تلاش تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جیس جھجکی۔ اس نے اندر جھانکا لیکن یہ نہ جان سکی کہ وہاں کون ہے۔ وہ پیچھے ہٹنے ہی والی تھی کہ اس نے دروازے کے پیچھے سے ایک آواز سنی۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا۔“

دروازہ کھلا۔ ایک ہاتھ باہر آیا اور اس نے جیس کو اندر کھینچ لیا۔ سب سے پہلے اس نے لورین کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی جو معدوم ہو چکی تھی۔

”لورین نے تمہیں بھی نہیں بتایا کہ وہ میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی تھی۔“ اس نے کہا۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی نفسیاتی مریض ہے۔

جیس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جیف کو اپنی بے خبری کا ثبوت نہیں دینا چاہتی تھی۔ جیف نے اپنی گرفت تھوڑی سی کم کی لیکن اتنی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کروا سکے۔

”بولو......“ اس نے حکم دیا۔

جیس پھر بھی خاموش رہی۔ ”تمہیں بولنا ہوگا۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں آخری بار تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم مر جاؤ گی اور تمہارا نمبر آخری ہوگا۔“

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا لیکن اس کی مضبوط گرفت کے باوجود وہ جیف کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ ستر کا تھا لیکن اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آ رہا تھا۔ سوجی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، بھرائی ہوئی آواز...... اس کے بدن سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ وہ مرنے والا تھا اور اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر جیس کا خوف بھی دور ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی تو اس کی گردن پر جیف کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دماغ ہلکا...... اور ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔

اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ اس کے پیچھے تھا اور کسی بھی وقت دوسرا ہاتھ گردن میں ڈال کر اس کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ اس میں چند منٹ ہی لگتے۔ گو کہ جیس کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو اس کے جسم سے قریب کیا اور مزید کچھ سوچے بغیر

اپنے جوتے کی تیز نکیلی ایڑی اس کے پاؤں پر دے ماری۔ وہ چلایا۔ جیس نے دوبارہ ایسا ہی کیا۔ جیف کا بایاں ہاتھ اس کی گردن سے ہٹ گیا اور دائیں بازو کی گرفت بھی ڈھیلی ہوگئی۔ جیس اپنی جگہ پر گھومی اور اس نے جیف کو زمین پر دھکا دے دیا۔ جیف کی ٹانگ سے خون بہنے لگا تھا اور وہ شدید تکلیف میں مبتلا نظر آرہا تھا۔ اس کی ران کی شریان متاثر ہوئی تھی۔ یہ اس تربیت کا نتیجہ تھا جو جیس نے حاصل کی تھی اور اس کے لیے وہ لورین کی بھی شکر گزار تھی۔

لورین کا خیال آتے ہی اس نے اپنے جسم کو جیف سے دور کیا۔ اپنے موزے سے گن نکالی اور جیف کی دوسری ٹانگ کی شریان کو نشانہ بناتے ہوئے گولی چلادی۔ اس کی ٹانگ سے خون کا فوارہ ابل پڑا پھر اس نے فون تلاش کرکے نوگیارہ کو اطلاع دی۔ فائر کی آواز سن کر کمرے کے باہر لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ جب اس نے برائن کو دیکھا تو چکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

تشا سب سے پہلے اسے دیکھنے کے لیے اسپتال آئی۔ ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ معائنے کے لیے جیس کا ایک رات کے لیے اسپتال میں رہنا ضروری ہے۔ ایجنسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جیس کو مقدمات اور الزامات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس نے ابھی تک لورین کی موت پر دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ اس کی باس اس معاملے میں کیسے ملوث ہوگئی۔ اس کا پتا بعد میں چلنا تھا۔

"تم ہمیشہ سے ہی ناقابلِ اعتبار رہی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ دوبارہ تم سے واسطہ نہیں پڑے گا۔" تشا نے غصے سے کہا اور چلی گئی۔ چند منٹ بعد لوسی آئی اور بولی۔

"کیا تمہیں اصل نام سے پکار سکتی ہوں کیونکہ جیس میڈر تو مکمل جھوٹ تھا...... جیسے تمہاری شادی؟"

جیس نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ مجھے دوبارہ اسے سننے کا عادی ہونا پڑے گا۔"

لوسی اس کے سرہانے آن کھڑی ہوئی اور بولی۔ "میں کہنا چاہتی ہوں کہ تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بڑی مشکل میں بھی پھنس گئی ہو۔ بہرحال میں تمہاری تعریف کرتی ہوں۔ جو تم نے کیا، وہ میں نہیں کرسکتی تھی۔"

"مجھے خود حیرت ہے کہ میں نے اتنا کچھ کرلیا۔"

"شکر ہے کہ تم نے نکیلی ایڑی والے جوتے پہن رکھے تھے۔" لوسی نے اپنی آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

"سنو۔ برائن آرہا ہے۔"

"میں اس کا سامنا نہیں کرسکتی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ یہی مناسب ہے۔ تم نے اس سے شادی کی ہے۔"

لوسی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اب وہ اس کا شوہر تھا اور ایجنسی ان دونوں کی شادی منسوخ کرانے میں مدد دے سکتی تھی پھر برائن کا راستہ صاف ہوجاتا۔ اس کے پاس باز پرس کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ پھر گلوریا بھی پیچھے نہ رہتی۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ جیس سب سے زیادہ اسی کو یاد کرے گی۔

"اور تم اب بھی گلوریا کے ساتھ کام کرتی رہوگی۔" جیس نے اپنی بڑی بہن سے کہا۔

لوسی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "ہاں، مجھے یقین ہے کہ اب میری ترقی ہوجائے گی۔ تم اس بارے میں پریشان نہ ہو بلکہ کچھ بھی مت سوچو لیکن تمہیں برائن سے ضرور ملنا چاہیے۔"

لوسی کے جانے کے بعد جیس سوچنے لگی کہ اب اسے اپنے اصلی نام کا عادی ہونا پڑے گا۔ کیسا بھدا سا نام ہے کرسی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے تبدیل کرے۔ کرسٹل یا صرف کرس۔ وہ اس پر بعد میں سوچے گی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ آنے والا کون ہے۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اندر آجاؤ۔"

برائن کمرے میں داخل ہوا پھر ہچکچاتا ہوا اس کے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ "کاش میں کہہ سکتا کہ تم سے مل کر پچھتا رہا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ شاید ہم کوئی راستہ تلاش کرسکیں۔"

جیس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "نہیں برائن۔ یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم گھن چکر بن کر رہ جاؤ گے اور اس کی زد میں تمہارے خاندان کے لوگ بھی آجائیں گے۔ مجھ پر شاید مقدمہ چلے۔"

وہ اس کی بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔"

"مجھے افسوس ہے۔" جیس نے کہا۔ "جو کچھ تم جانتے ہو، معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جانتی تھی کہ اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔ شاید عدالت میں آمنا سامنا ہوجائے۔ اب وہ کبھی شادی نہیں کرسکے گی۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ جھوٹ کتنا مہنگا پڑے گا۔ کاش وہ برائن کو پہلے ہی سب کچھ بتادیتی۔

انسان اشرف المخلوقات... اپنے اوصاف، اخلاق و کردار اور عقل و شعور کی بنا پر ٹھہرایا گیا مگر... اس نے خود کو طاقت کے خانوں میں بانٹ کر...... ایک کمزور کے مقابلے پر برتر سمجھ لیا... یہ دانائی ہے یا نادانی، اس کا اندازہ زیر نظر تحریر پڑھ کر کیا جاسکتا ہے جس نے اپنی بات کو ایک تیز و تند سی رہائی دلائی وہ پھر نفرتوں کے زندان میں چلا گیا اور ثابت ہو گیا کہ ذہری شخصیات کبھی درست ماحول کو پروان نہیں چڑھا سکتیں۔

ایک ایسے معاشرے کی منظر کشی جہاں انسان جانور سے زیادہ بے قیمت ہے

ناسور

خفہ اقبال ظفر



مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس چوڑی چکلی سڑک پر دوڑے جارہی تھی۔ ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈر اونچی آواز سے چلا رکھا تھا۔ دسمبر کے آخری عشرے کی یہ شام اپنے گہرے سائے پھیلانے لگی تھی۔ گھڑی دیکھے بغیر اندازہ کرنا مشکل تھا کہ سورج افق پر پگھل رہا تھا یا ڈوب چکا تھا۔ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے کچھ مسافر ملکی حالات اور مہنگائی پر تبصرہ کررہے تھے۔ کچھ مسافروں کا موضوعِ سخن بڑھتی ہوئی سردی تھی جبکہ بعض مسافر قلعی سیٹ کی وحشت اور بس کے ہچکولوں سے سرور حاصل کرتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔

مسافروں سے لدی اس بس میں جن بیچاروں کو بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں مل سکی تھی، وہ بس کی چھت میں لگے ہوئے لوہے کے پائپ کو تھامے آڑے ترچھے بے ترتیب انداز میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی جسمانی حرارت سے سردی کا احساس مٹا رہے تھے۔ انہی لوگوں میں وہ بھی کھڑا

تھا۔ اس کے بدن پر باریک کپڑے کی شلوار قمیص جبکہ پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی۔ قمیص کی آستینوں کے بٹن غائب تھے۔ جس ہاتھ سے اس نے چھت کا پائپ تھام رکھا تھا، اس بازو کی آستین ڈھلک کر اس کی کہنی سے اٹکی ہوئی تھی اور سردی سے اس کا وہ بازو شل ہو رہا تھا۔ دوسرا بازو اس نے برابر کھڑے ہوئے مسافر کی گرم اونی چادر کے لٹکے ہوئے پلو میں دے رکھا تھا۔ اس کے حد درجہ بڑھے ہوئے بال اور خودرو جھاڑیوں کی طرح چہرے پر پھیلی ہوئی شیو نے اس کے حلیے کی ابتری میں اضافہ کر رکھا تھا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی مگر اپنی ظاہری حالت کی بنا پر وہ دگنی عمر کا دکھائی دیتا تھا۔ سردی سے اس کے ہونٹوں پر نیلاہٹ آرہی تھی۔ آنکھوں میں بیابان جیسی ویرانی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ کئی مسافر اسے مشکوک اور حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''ہاں بھئی! بغیر ٹکٹ سواری کون سی ہے؟'' کنڈیکٹر مسافروں کو چیرتا ہوا قریب آن کھڑا ہوا۔

برابر والے مسافر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور کنڈیکٹر کو اپنی منزل کا پتا بتایا، ساتھ ہی پیسے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

اسی لمحے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ایک نوجوان نے اس مشکوک دکھائی دینے والے مدقوق شخص پر پہلی سنگ زنی کی۔ ''اپنی اپنی جیبوں کا خیال رکھنا بھائیو! رن وے پر ایک جہاز بھی کھڑا ہے۔'' اس کا کسا ہوا جملہ بے جا بھی نہیں تھا۔ وہ حلیے سے واقعی نشے کا عادی یا کوئی چور اچکا ہی دکھائی دیتا تھا۔

''ہاں بھئی! ٹکٹ؟'' کنڈیکٹر ایک دم اس کے سامنے آگیا۔

وہ خالی خالی نظروں سے کنڈیکٹر کو دیکھنے لگا۔

''جلدی کر بھئی! پیسے نکال، کہاں جانا ہے؟'' کنڈیکٹر نے قدرے جھنجلا کر اسے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

جواباً وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ یوں جیسے کنڈیکٹر کے سامنے مٹی کی دیوار آگئی ہو۔ ایسے میں اسی سیٹ پر براجمان منچلے نوجوان نے طنز کا دوسرا پتھر پھینکا۔ ''یہ ٹکٹ کہاں سے لے گا؟ اسے تو اپنی جیب سے پڑیا کے پیسے دے دو۔''

اب کنڈیکٹر بھی بھنا گیا۔ اس نے گاڑھی زبان میں دو تین غلیظ گالیاں اس کے مدقوق چہرے پر تھوکیں اور بلند آواز میں کہا۔ ''اوئے! اسے چلتی بس سے دھکا دے دو۔''

کوئی چلایا۔ ''مارو سالے کو۔''

کسی نے کنڈیکٹر کا ارادہ بھانپ کر اپنی رائے دی۔ ''بس روکو اور یہیں اتار دو، جنگل میں ہی۔ معاشرے کے ناسور ہیں یہ نشئی لوگ۔''

ایک بھرائی ہوئی آواز گونجی۔ ''ارے! ملک کے حالات پہلے ہی خراب ہیں، یہ بہروپیا یا تو کوئی دہشت گرد ہے یا پھر کسی دشمن ملک کا جاسوس۔''

''سوچنا کیا ہے جی! بس روکو اور یہیں اتار دو اسے۔''

''ساری بس کو گندا کر رکھا ہے اس غلیظ نے۔''

کنڈیکٹر پر چاروں طرف سے مشوروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اب کنڈیکٹر کے حوصلے کی بھی تاب نہ رہی، اس نے زور سے بس کی چھت دھڑدھڑائی۔ پہلے ٹیپ ریکارڈر بند ہوا پھر ایک دم گاڑی کے بریک چرچرائے۔

''اوئے! کیا مصیبت ہے؟'' ڈرائیور نے جھنجلا کر کنڈیکٹر پر اپنا روایتی غصہ نکالا۔

''استاد! ایک جہاز بغیر ٹکٹ چڑھ گیا ہے سالا، نہ پیسے دیتا ہے، نہ کچھ بولتا ہے۔''

ایسے میں پھر ایک آواز ابھری۔ ''جہاز ہے، اڑ کر بس سے پہلے پہنچ جائے گا۔''

کنڈیکٹر کی پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی۔ ''چل اوئے! نیچے اتر، باپ کی گاڑی سمجھ کر چڑھا ہے جو بغیر ٹکٹ سفر کرے گا؟''

ساتھ ہی اس نے جہاز قرار دیے جانے والے مدقوق شخص کو بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ بس کے دروازے کے باہر کہر میں ڈوبی ہوئی رات اور بدن کو چیرتی ہوئی سردی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

''یار! یہ رکھو دس روپے، اسے یہاں ویرانے میں مت اتارو۔ کسی اگلے اسٹاپ پر اتار دینا۔'' ایک خدا ترس مسافر نے انسانوں سے بھری بس میں کنڈیکٹر کو دس روپے دے کر دل ہی دل میں لعنت بھیجی اور اس مدقوق چہرے والے کا ہاتھ پکڑ کر دروازے سے پیچھے کھینچ لیا۔

بس دوبارہ چل پڑی۔ اب خدا ترس مسافر سنگ باری کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ایک آواز ابھری۔ ''مجرموں کی مدد کرنے والے لوگ بھی معاشرے کے ناسور ہوتے ہیں۔''

بس کے عقبی حصے سے ایک آواز بخارات زدہ فضا میں سرسرائی۔ ''اگر ایسے خدا ترس لوگ ہمارے بیچ موجود نہ ہوتے تو یہ 'جہاز' کب کے سیدھے ہو گئے ہوتے۔''

پھر دبی دبی تنقید کا سلسلہ چھڑ گیا اور ساتھ ہی بس کے

ٹیپ ریکارڈر پر دوبارہ فلمی گیت چھڑ گیا۔

''جانا کہاں ہے تم نے؟'' کنڈیکٹر کو دس روپے دینے والے خداترس نے نشانۂ نفرت بننے والے سے پوچھا۔

وہ اس خداترس آدمی کو بھی ویسے ہی دیکھنے لگا جیسے کنڈیکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ خالی خالی نظروں سے۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو بولتا کیسے؟ وہ تو گویائی سے محروم تھا۔ بیگار کیمپ سے بھاگا ہوا ایک مظلوم..... جسے آج تیسرا دن تھا سفر کرتے، گالیاں سنتے اور لوگوں کی سنگ زنی کو سینے پر جھیلتے ہوئے۔ پھر بس کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ کنڈیکٹر نے آنے والے اسٹاپ کا اعلان کرتے ہوئے اترنے والے مسافروں کو آگاہ کیا۔ بس ایک جھٹکے سے ٹھہر گئی۔ شاید کسی مسافر کو یہاں اترنا ہی نہیں تھا، کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا مگر اب خداترس آدمی کے دیے ہوئے دس روپے کا پتھر بھی سرک گیا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس مدقوق شخص کو بازو سے پکڑا اور بس سے نیچے لڑھکا دیا۔ سیٹ پر براجمان منچلے نوجوان کا استہزائیہ قہقہہ بلند ہوا۔ ''چلو جی! خس کم جہاں پاک۔''

کسی اور کے سینے پر سے بھاری سل اتر گئی۔ ''سالا ناسور کہیں کا! رن وے پر اترا ہے نا، ابھی 'زوں' کی آواز نکالتا ہوا فضا میں اڑنے لگے گا۔''

بس چل پڑی اور آگے نکل گئی۔ وہ زمین پر لڑھکنے کے بعد اپنے بے جان وجود کو سمیٹتے ہوئے بمشکل کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا۔ اب وہ اسٹاپ پر کسی کھمبے کی طرح استادہ، چاروں طرف خالی الذہنی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ یہ غالباً دس بیس ہزار نفوس پر مشتمل آبادی کا کوئی قصبہ تھا۔ سڑک کے دو اطراف میں اچھی خاصی دکانیں تھیں جن میں سے بیشتر بند تھیں۔ سامنے ہی پان سگریٹ کے دو کیبن، چائے کا ایک ہوٹل اور پھول بتاشے بیچنے والے کی ایک بڑی سی دکان کھلی تھی۔ اس دکان پر ایک دو گاہک بھی کھڑے تھے جو گرم کپڑوں اور اونی چادروں میں ملبوس تھے۔

سردی اس کی رگ رگ میں اتر رہی تھی۔ اس کے ٹھٹھرے ہوئے بدن میں بھوک کی بھڑکتی ہوئی آگ سردی سے ماند پڑتی جا رہی تھی مگر چائے کا ہوٹل سامنے دیکھ کر ایک بار پھر اس کے خالی پیٹ میں بھاپ سی اٹھنے لگی تھی۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گالیوں، دھکوں، جھڑکیوں اور مسلسل کرب کے سوا کچھ بھی میسر نہیں آیا تھا۔ وہ بنا سوچے ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

''آوارا کُتا!'' اندر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اسے دیکھتے ہی اپنے ساتھی کے پہلو میں کہنی چبھوئی۔

''لگتا ہے بے چارہ 'تروڑ' میں ہے۔'' دوسرے شخص نے چائے کی لمبی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

وہ ان آوازوں سے بے نیاز سیمنٹ کی پختہ بھٹیوں پر رکھے ہوئے دودھ کے پتیلے کو دیکھ رہا تھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر دکاندار کے عقب میں نصب شدہ لکڑی کے تختوں والی الماری پر ٹھہر گئی۔ الماری میں شیشے کے مرتبان دھرے تھے جن میں کیک، بسکٹ اور خشک میوہ جات بڑے قرینے سے سجائے گئے تھے۔

''اسے ہٹا یار! پہلے ہی سردی میں گاہک نظر نہیں آ رہا، اوپر سے یہ کم بخت کھڑا ہو گیا ہے آ کر۔'' ہوٹل کے مالک نے ملازم سے کہا۔

ملازم نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے برابر میں لگے نلکے کی طرف دھکا دیا۔ ملازم کی وفاداری شاید ایسے ہی فرض کی ادائیگی سے مشروط تھی۔ وہ دھکا کھا کر کیچڑ میں منہ کے بل جا گرا۔ عقب میں دکاندار اور ہوٹل میں موجود گاہکوں کے ملے جلے قہقہے بلند ہوئے۔

بیگار کیمپ میں بھی ایک دن شاہ نواز نے کسی بات پر اسی طرح اسے دھکا دیا تھا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح اینٹوں کی تھپائی والے گارے میں جا گرا تھا مگر وہ تو بیگار کیمپ تھا جہاں شاہ نواز ڈیڑھ سو کے لگ بھگ اغوا شدہ بچوں کی ننگی پیٹھوں پر اپنی مرضی کے ہنٹر مارا کرتا تھا۔ وہ تو ظالم شاہ نواز اور اس کے بیگار کیمپ کو کئی سو میل پیچھے چھوڑ آیا تھا..... پھر یہ کیا تھا؟

اس نے کچھ سوچا پھر پلٹ کر ہوٹل کے مالک اور دوسرے تماشائیوں کو دیکھا۔ سبھی شاہ نواز جیسے دکھائی دیے۔ سرمو کوئی فرق نہیں تھا۔ اب وہ ہتھیلیوں کے بل برفیلی کیچڑ سے اٹھ کر بلند ہوا اور لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا انگ انگ نقاہت سے چور تھا۔ چار سال کی عمر سے اکیسویں سال تک اس نے بیگار کیمپ میں گدھوں کی طرح زندگی گزاری تھی۔ سولہ سولہ گھنٹے مشقت کرنے کے بعد دو روٹیوں اور دال کے کٹورے جیسی خوراک پر پلنے والے بدن میں بچا ہی کیا ہے، نقاہت کے سوا۔

وہ سڑک کے دائیں جانب قدرے اندھیرے کی طرف چل دیا۔ سامنے دو کتے ایک بند ہوٹل کے تنور کے ساتھ پڑی ہوئی ہڈیاں چچوڑ رہے تھے۔ تیسرا کتا تنور کی سیک میں دبک کر بیٹھا تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اسے دیکھ کر دونوں کتے ایک ایک ہڈی منہ میں دبا کر اندھیرے کی

طرف دوڑ گئے۔ تین ہڈیاں ابھی باقی پڑی تھیں۔ وہ ہڈیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ کتوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر کچھ بھی بچا ہوا نہیں تھا کہ جس سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا۔ بس اس کے منہ کا لعاب ذرا نمکین سا ہو گیا۔ تنور پر بیٹھے ہوئے کتے نے اس انداز سے اسے دیکھا جیسے وہ آدمی نہیں، اسی کی جاتی کا کوئی جناور ہو۔

منہ کا ذائقہ بدل جانے سے بھوک کا احساس اور بڑھ گیا۔ اب وہ باقاعدہ ہوٹل کے تخت کے نیچے ہڈیاں ڈھونڈنے لگا۔ ایک ہیجان اس پر طاری تھا، بھوک کا ہیجان!

پھٹے سے باہر نکلا تو اس کی جھولی میں کافی ساری ہڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ تنور پر بیٹھا ہوا کتا اچک کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ وہ تنور کی سیک میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہڈیوں پر بچے کھچے نمکین ریشے نوچ نوچ کر اپنے پیٹ میں اتارنے لگا۔ دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ تنور بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر پھر سڑک پر آ گیا۔ سردی اب اس کے حوصلوں کو مات دینے لگی تھی۔ گرتی ہوئی اوس نے اس کے کپڑے برف کی طرح سرد کر دیے تھے۔ اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹ تیز ہو رہی تھی اور دانت متواتر بج رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر دکانوں کی طرف دیکھا۔ مکمل اندھیرا تھا۔ البتہ قصبے کی آبادی کی طرف جانے والے رستے کے نکڑ پر گڑے ہوئے کھمبے سے ایک روشن بلب لٹک رہا تھا۔ بلب کی زرد روشنی اسے سردیوں کو گرما دینے والی دھوپ جیسی محسوس ہوئی اور وہ کھمبے کی طرف چل دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کھمبے کے نیچے بغلوں میں ہاتھ دبائے کھڑا کپکپا رہا تھا۔ دانت اسی طرح بج رہے تھے، ہونٹ متواتر نیلے ہوتے جا رہے تھے۔

اس نے اپنے سر سے ذرا اونچے لٹکے ہوئے بلب کو بے چارگی سے دیکھا اور اپنے وجود کو سکیڑ سمیٹ کر سوچتا آبادی کی طرف ہولیا۔ کسی کسی گھر کے باہر اجالا تھا۔ اکثر مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے...... ایسے ہی تاریک ماحول سے وہ موقع پاتے ہی بیگار کیمپ سے بھاگا تھا اور اجالوں بھری دنیا تک پہنچنے کی جستجو میں یہاں تک آن پہنچا تھا۔

تقدیر اس پر اچانک ہی مہربان ہو گئی تھی۔ بیگار کیمپ میں بھٹے کے جیل نما تہ خانے کا چوکیدار دروازہ کھول کر چارپائی باہر نکالنے کے لیے جونہی اندر گیا، وہ ستونوں کی آڑ لیتا ہوا تہ خانے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ صبح ہونے تک وہ مسلسل دوڑتا رہا۔ دن نکلے وہ بیگار کیمپ سے میلوں دور تارکول کی ایک چوڑی سڑک پر آ نکلا تھا۔ اس سڑک پر ہر طرح کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ چار فرلانگ دور اسے ایک پیٹرول پمپ دکھائی دیا تھا جہاں پہنچ کر وہ ایک ٹھہری ہوئی بس میں پہلی مرتبہ سوار ہوا تھا۔ پھر اس نے بیگار کیمپ اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھانے کی خاطر چار بسیں تبدیل کیں۔ چوتھی بس نے اسے کہر میں ڈوبی ہوئی تاریک رات میں دھکیل کر اس نامعلوم قصبے تک پہنچایا تھا۔

وہ گم صم گٹھری، لب بستہ گلیوں کے بیچ بغلوں میں ہاتھ دیے کپکپاتا ہوا چلتا جا رہا تھا اور ماضی کا سترہ سال پرانا سفر دل ہی دل میں طے کرتا جا رہا تھا۔ سترہ سال پہلے وہ ایسی ہی ایک بس میں اپنے ماں باپ اور چھوٹی بہن کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بس ایک پیٹرول پمپ پر ٹھہری تھی۔ مسافر ٹینکی سے ٹھنڈا پانی پینے کے لیے اتر رہے تھے۔ اس کا باپ بھی اس کی بہن کے لیے پانی لینے کی خاطر بس سے اترا تھا۔

وہ بھی اپنے باپ کے پیچھے پیچھے بس سے اترا اور......

پھر دوبارہ اس بس میں سوار نہیں ہو پایا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ شاہ نواز کے بیگار کیمپ میں تھا۔ ان سترہ برسوں میں اس نے کیا کچھ نہیں دیکھا تھا اور کیا کچھ نہیں سوچا تھا۔ ایک دن بدن کچھ زیادہ زخمی ہوا اور روح کچھ زیادہ گھائل ہوئی تو سوچتے سوچتے وہ ہیجانی انداز میں چیخ اٹھا اور شاہ نواز کو گالیاں دینے لگا۔ شاہ نواز کے ایک سانڈ جیسی جسامت والے ساتھی نے اسے زناٹے دار تھپڑ مارا تھا اور وہ چکرا کر مٹی کے تودے سے پھسلتا ہوا چالیس فٹ کی گہرائی میں جا گرا تھا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پانچ دن بعد سر کی پٹی تو کھل گئی تھی لیکن زبان میں لگی گرہ نہیں کھل سکی کیونکہ وہ کسی دماغی چوٹ کے باعث قوت گویائی سے محروم ہو چکا تھا۔ شاہ نواز کے خلاف زبان کھولنے کی یہ سزا ملی تھی اسے کہ اب وہ شاہ نواز کی گالیاں سن تو سکتا تھا مگر جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اب اس کی زبان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قفل پڑ چکا تھا۔ اظہار کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے اور اسے شاہ نواز کو گالیاں دینے کی پاداش میں گدھوں کی طرح جوت دیا گیا تھا......

پھر سال، کئی سال گزر گئے، شاید زندگی ہی گزر گئی تھی۔

بیگار کیمپ سے نکل کر وہ بے منزل تھا۔ وہ تو بس زیادہ سے زیادہ سفر کر کے شاہ نواز سے دور ہو رہا تھا۔

اچانک...... راستے میں پڑی ہوئی پختہ اینٹ سے اسے ٹھوکر لگی اور اس کے خیالات کا سلسلہ سردی کی چوٹ میں ٹھٹھر کر جم گیا۔ وہ آبادی میں کافی دور تک نکل آیا تھا۔ قصبے کی زندگی گرم لحافوں میں دبک کر سو رہی تھی اور وہ دور

ایک ٹیلے جیسی اونچائی پر بنے ہوئے گنبد کو دیکھتا ہوا گھسٹ رہا تھا۔ سینے میں امید کا ایک ننھا سا گرم جھونکا لپکا اور وہ قدرے تیز روی سے ٹیلے کی طرف بڑھ گیا۔ کوئی خانقاہ تھی یا کسی بزرگ کی قدیم درگاہ تھی۔ اب وہ مزار کی سیڑھیوں سے ہٹ کر اندھیرے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ...... سیڑھیاں چڑھ کر دائیں طرف رکھے ہوئے بڑے سے پرانے آہنی صندوق تک آگیا۔ اس صندوق کے اوپری حصے میں سکے اور نوٹ ڈالنے کے لیے جھری نما سوراخ بنے ہوئے تھے۔ اچانک دربار کے دروازے چرچرائے۔ وہ کسی بے عنوان خوف کے تحت لپک کر دروازے کے ساتھ بنے ہوئے ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ دروازے کی ناگوار چرچراہٹ تھمی، ایک صحت مند لمبا تڑنگا سفید پوش شخص باہر نکلا اور ہاتھ میں دبے ہوئے گچھے میں سے چابی ٹٹولتا ہوا صندوق کی طرف بڑھا۔

اس نے ستون کی اوٹ میں سے جھانکا اور نظر بچا کر دربار کے اندر داخل ہوگیا۔ دربار کے ماحول میں سیلن زدہ سی ٹھنڈک رچی ہوئی تھی۔ دم توڑتی ہوئی اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی مخصوص مہک نے اندر کے ماحول کو معطر کیا ہوا تھا۔ تین فٹ اونچے پختہ چبوترے پر بنی ہوئی قبر کو مختلف رنگوں کی بے شمار چادروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اسے اپنے بدن پر چپکا ہوا لباس برف کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سفید پوش آدمی صندوق خالی کر کے واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ جلدی سے قبر کے سرہانے کی جانب لپکا اور چھپ بیٹھا۔ دروازہ ایک بار پھر چرچرایا اور بند ہوگیا۔ سفید پوش آدمی قبر کے دائیں طرف والے حجرے میں داخل ہوگیا جہاں روشنی کی بساط پھیلی ہوئی تھی۔ حجرے میں دربار کا مجاور اپنے دو خادموں سمیت صندوق کی رقم گننے کے لیے بے چین بیٹھا ہوا تھا۔ سفید پوش نے دھاری دار رومال کی پوٹلی مجاور کے سامنے کھول کر کھنکتے سکے اور چھوٹے بڑے مڑے تڑے نوٹ ڈھیر کر دیے۔ مجاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

قبر کے سرہانے کی اوٹ میں چھپا پناہ گزیں قبر پر پھیلی ہوئی چادروں کو گھور رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی کیچڑ میں لت پت گیلی قمیص اتار کر ایک طرف پھینکی اور ایک ایک کر کے قبر کی چادریں دیوانگی آمیز مستعدی سے اپنے برہنہ بدن پر لپیٹ لیں۔ ان میں سے ایک چادر کو اس نے مفلر کی طرح اپنے سر اور گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ دیر اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ سردی کا جانکاہ احساس قدرے کم ہوگیا تھا۔ بدن پر لپٹی ہوئی چادروں نے اس کے بدن کو گرمانا شروع کر دیا تھا اور اس پر نقاہت آمیز غنودگی طاری ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند میں ایک طرف کو لڑھک گیا اور ماحول میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

روشن حجرے میں بیٹھے ہوئے مجاور اور تینوں افراد نے رات کے سکوت میں خراٹوں کی آواز سنی تو ان کے چہروں پر تشویش اور حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ خدام نے جلدی جلدی پھیلے ہوئے سکوں اور نوٹوں کو رومال میں باندھا اور خراٹوں کی آواز کی سمت دوڑ پڑے۔

دن نکلے قصبے کی زندگی بیدار ہوئی تو دربار کی سیڑھیوں کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ پہلی سیڑھی پر اکیس بائیس سال کے ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ اس کے بدن پر شلوار اور کندھوں پر کیچڑ میں لت پت ایک قمیص رکھی تھی۔ پیروں میں ربڑ کی ایک چپل تھی۔ رات بھر کی لہو جما دینے والی سردی میں لاش بالکل اکڑ گئی تھی۔ قصبے کی بھری آبادی میں کوئی اسے نہیں پہچانتا تھا۔ لوگ متاسفانہ اور سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک دربار کا بڑا اور بھاری دروازہ مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور مجاور اپنے خادموں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر لاش کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ”پتا نہیں کون تھا بے چارہ؟ قصبے میں پہلے تو کبھی نہیں دیکھا کسی نے......“

ایک خادم نے پُرتاسف لہجے میں کہا۔ ”شاید نشئی تھا کوئی، نہیں شاید...! سردی سے مرگیا بے چارہ!“

لوگ اپنے اپنے اندازے پیش کرنے لگے۔

”خاموش ہوجاؤ!“ مجاور کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”خدا اس کی مغفرت کرے۔ چاہے کوئی بھی ہو، آخر انسان ہی تھا۔ جلدی جلدی چندہ اکٹھا کرو۔ اس بدنصیب کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔ آخر ہم نے بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔“

”ہاں بھئی! موت برحق ہے۔ اللہ ہر کسی کو کفن اور قبر نصیب کرے۔“

مجاور نے رومال سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور اپنا دھاری دار رومال پھیلا دیا۔ غیر ارادی طور پر لوگوں کے ہاتھ اپنی اپنی جیبوں کی طرف رینگ گئے۔ دور مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں ناسور معاشرے سے پھسلتی ہوئی نوجوان کی اکڑی ہوئی لاش پر آکر ٹھہر گئیں۔

شیش محل

اسماء قادری

قسط: 21

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوؤں اور ناآسودہ تمناؤں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ بہ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ کئی پتی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رحمن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رحمن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ طوائف زادی چاند بانو فاروق سے محبت کرتی ہے۔ بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر رحمن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس رحمن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ رحمن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بجن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدر آباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کی ذمے دار بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ جولیٹ حویلی والوں پر انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو کر دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ فاروق کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ فاروق پر بملا کو قتل کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔ رحمن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ فاروق کی خواہش پر اوتم اگروال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ رحمن فاروق کو دیکھنے بندرگاہ جاتا ہے۔ واپسی میں ڈی ایس پی اور مجو کے گرگے اسے گھیر کر شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ ادھر فاروق کو پتا چلتا ہے کہ آغا لندن میں نہیں بلکہ کراچی میں ہے تو وہ جہاز سے اتر کر ایک ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہیں سے وہ کشتی سے ملنے جاتا ہے جہاں رحمن کو بسترِ مرگ پر پڑا دیکھتا ہے۔ رحمن دم توڑ دیتا ہے۔ فاروق اپنے دل میں تہیہ کرتا ہے کہ وہ دشمنوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر بلوائی حملہ کر دیتے ہیں جس میں حویلی کے تمام افراد مارے جاتے ہیں۔ صرف اسد اللہ، صفی اللہ اور آپا بیگم بچتے ہیں۔ ادھر جولیٹ پہلے ہی حویلی سے نکل چکی ہوتی ہے۔ جولیٹ جانی کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوتی ہے تو ہندو بلوائی ٹرین پر ہلا بول دیتے ہیں۔ جانی بھی اس حملے میں مارا جاتا ہے تاہم جولیٹ اتفاقی طور پر محفوظ رہتی ہے۔ نواب اسد اللہ بھی ہجرت کر کے لاہور آ جاتے ہیں۔ ادھر فاروق رحمن کے قاتلوں کو چن چن کر مارتا ہے۔ وہ رمیش، بھابیہ، مجو اور رفیکے کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ لاہور میں جولیٹ کو ایک مہربان خاتون اپنے زیرِ سایہ رکھتی ہیں۔ وہاں وہ اسد اللہ کو دیکھتی ہے۔ ادھر فاروق جس گھر میں چھپا ہوتا ہے وہاں پولیس دھاوا بول دیتی ہے جس میں گونوا اپنی جان سے جاتا ہے۔ فاروق بھاگ کر راجو سے مل جاتا ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے وکیل اشوک بجن سے ملاقات کرتا ہے۔ اسد اللہ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوتے ہیں، وہیں وہ ایک شناسا آواز پر چونک جاتے ہیں اور اسے پکارنے کی خواہش میں ان کے ہونٹ لرز اٹھتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"کراچی پہنچ کر فوراً ہمیں فون کیجیے گا۔ ہمیں آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔"

"ضرور کروں گی۔ آصفہ آنٹی اور انجلی نے بھی بہت تاکید کی تھی۔" اس نے ہدایت دینے والے کو یقین دہانی کروائی۔ اسد اللہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ جوان سے بچھڑ گئی تھی اور جانے کیوں انہیں چپکے سے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس طرح اچانک انہیں مل جانے کی یقین نہیں آتا تھا۔ وہ ان سے بس چند قدم کی دوری پر ہی تھی۔ اس نے سادہ سے پرنٹڈ شلوار قمیص کے اوپر چادر نما دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور اس سادگی میں بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پیاری کیسے نہ لگتی، اپنی اولاد تو انسان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر پیاری لگتی ہے اور وہ تو اس عورت کی نشانی تھی جسے انہوں نے خود سے بھی بڑھ کر چاہا تھا۔

"آپ کے پاس ہمارے گھر کا پوسٹل ایڈریس اور ابو کے آفس کا ایڈریس بھی محفوظ ہے نا۔ اگر کسی وجہ سے فون پر رابطہ نہ ہو سکے تو آپ ہمیں تار بھی بھیج سکتی ہیں۔" اس سے مخاطب افراد میں سے نسبتاً کم عمر لڑکے نے کہا تھا۔ اس نے ایک ادا سے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور مصنوعی غصے سے بولی۔

"اب تم دونوں بھائیوں نے مجھے کوئی ہدایت کی تو میں تمہیں ٹرین سے نیچے دھکا دے دوں گی۔ غضب خدا کا ...... مجھ سے چھوٹے ہو کر مجھے یوں ہدایتیں دے رہے ہو جیسے میں کوئی چھوٹی بچی ہوں۔"

"بچی نہیں تو کیا ہوا، ہیں تو ہماری پیاری بہن نا اور ہمیں اپنی بہن کی فکر ہے۔" اس بار بڑے لڑکے نے ہنس کر اس سے کہا تو وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ نے اسد اللہ کے دل میں ٹھنڈک سی اتار دی۔

"ٹرین چلنے ہی والی ہے۔ اب تم دونوں نیچے اتر جاؤ اور اچھے بچوں کی طرح سیدھے گھر جاؤ۔" وہ چند قدم کے فاصلے پر اسد اللہ کی موجودگی سے بے نیاز شریر لہجے میں ان دونوں لڑکوں سے مخاطب تھی۔

"اب ہم بچے بھی نہیں ہیں۔ کالج میں پڑھتے ہیں۔" چھوٹے لڑکے نے خود کو بچہ پکارے جانے پر برا منایا۔

"اچھا بابا نہیں بولتی بچہ، اب تو جاؤ۔" اس نے چھوٹے لڑکے کا کان ہلکے سے کھینچ کر باہر کی طرف اشارہ کیا تو اس بار وہ دونوں ہنس کر اسے گڈ بائے کہتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

وسل دیتی ٹرین نے بھی اب دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی طرف کی کھڑکی کھول کر انہیں دیکھنے لگی اور ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا۔ انہیں الوداع کہہ کر وہ اپنی نشست پر سکون سے بیٹھی اور پہلی بار اپنے ساتھی مسافروں کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ پہلے ہی مرحلے پر اس کی نظریں ٹھٹک گئیں۔ اپنی طرف ڈبڈبائی نظروں سے دیکھتے اسد اللہ کو دیکھ کر اس کا پورا وجود لرز اٹھا تھا۔ وہ تو ان سے بھاگ کر ہی کراچی جا رہی تھی۔ یہ گمان کب تھا کہ سفر کے آغاز میں ہی ان سے سامنا ہو جائے گا۔ اس روز جب وہ عاکف اور عاقب کے ساتھ انجلی کو لینے گئی تھی اور اس نے ایک کوٹھی کے باہر اسد اللہ کو دیکھا تھا تو اسی روز فیصلہ کر لیا تھا کہ جلد از جلد لاہور چھوڑ کر کراچی منتقل ہو جائے گی۔ ایک شہر میں رہ کر آمنا سامنا ہونے کے امکان سے بچنے کے لیے اس نے فرار کی راہ اختیار کی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی بیگم آصف علی اور ان کے پُرخلوص خاندان سے جدا ہونے کی تیاری کر لی تھی۔ چند دن بھی اسے انجلی کی وجہ سے رکنا پڑا تھا۔ اسے اس کے پریوار کے ختم ہو جانے کی اطلاع دینے اور اس صدمے سے سنبھالنے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ انجلی کی حالت کی وجہ بنا کر پچھلے دنوں اس نے گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالے تھے۔ اس طرح وہ اسد اللہ سے کہیں سامنا ہو جانے کے خدشے سے بچنا چاہتی تھی لیکن تقدیر کے آگے ہر تدبیر ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اس کا ان سے سامنا ہونا تقدیر میں لکھا تھا سو اب وہ یہاں ان کے روبرو تھی۔

ٹرین نے اب اپنی پوری رفتار پکڑ لی تھی لیکن وہ دونوں باپ بیٹی جیسے اپنی جگہ ساکت ہو چکے تھے۔ اسد اللہ جواب تک اس کے لیے تڑپتے رہے تھے، انہیں یاد آ گیا تھا کہ وہ ازخود انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی...... مگر کیوں؟ اس کی وجہ تو وہ خود جانتی تھی لیکن ان کی خواہش تھی کہ اب وہ خود ان سے مخاطب ہو اور اپنی مرضی سے ان کی طرف بڑھے۔ وہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف اسے خدشہ تھا کہ اب تک اسد اللہ کو اس کی حقیقت کا علم ہو چکا ہو گا۔ وہ فاروق کو لینے بمبئی گئے تھے اور فاروق اس کی بربادی کی داستان سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ فاروق نے اسد اللہ کو بھی اس کے بارے میں سب بتا دیا ہو گا اور وہ اسد اللہ کے سامنے اپنی زندگی کے اس شرمناک پہلو کو کھلا دیکھنے سے گریزاں تھی۔ یہ گریز، یہ خوف اس نے جوزف کے لیے محسوس نہیں کیا تھا حالانکہ اس کے نزدیک اسد اللہ اور جوزف کی ایک ہی جیسی حیثیت تھی۔

شاید وہ ڈرتی تھی کہ اسد اللہ اس کے ساتھ بیتے حادثے پر جوزف پر غفلت کا الزام لگائیں گے۔ دوسرے دونوں کا پس منظر بھی گریز کا ایک سبب تھا۔ جوزف ایک عام سا آدمی تھا جو خود پر ہوئے ہر ظلم وستم کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا تھا جبکہ اسد اللہ اس کے مقابلے میں بہت شان وشوکت اور اونچی ناک والے خاندان کا حصہ تھے۔ ان جیسی حیثیت رکھنے والے لوگوں کو تو معمولی معمولی باتیں بھی گراں گزرتی ہیں کجا اتنی بڑی بات...... لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ اسد اللہ کی آنکھوں میں آج بھی اس کے لیے وہی محبت ہے جو وہ روزِ اول سے محسوس کرتی آرہی ہے۔ ان کی ڈبڈبائی آنکھوں نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا پھر وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اسد اللہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہوگئے ہیں اور ان کے چہرے پر دکھ کی تحریر ہے۔ وہ تو خوشیاں لینے بمبئی گئے تھے۔ انہیں تو اپنے پیارے بھتیجے کو حویلی میں بسانے کی بہت چاہ تھی پھر کیا ہوا تھا کہ وہ خوش نہیں تھے؟ کیا وہ اپنے محبّ اللہ (فاروق) کو حویلی میں نہیں لاسکے تھے اور وہ یہاں کیا کر رہے تھے؟ حیدرآباد دکن سے اتنی دور وہ تنہا لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین میں کیوں سوار تھے؟ اس کے اندر سوالات اٹھتے رہے اور ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ایک عالمِ بے قراری میں اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کی طرف بڑھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور بے خودی کے عالم میں اس کے لیے اپنی بانہیں وا کردیں۔ وہ ''پاپا'' کہہ کر ان کی بانہوں میں سما گئی اور شدت سے رونے لگی۔ اسد اللہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ اب تک کھڑکی سے باہر جھانکتے محو نظارہ ثروت بیگ بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئے لیکن بنا کوئی دخل اندازی کیے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ لفظ ''پاپا'' نے انہیں چونکا دیا تھا لیکن وہ حیران تھے کہ سات پردوں میں رہنے والے خاندان کی بیبیوں میں سے وہ کون تھی جو کھلے منہ کے ساتھ یوں سرِ راہ اسد اللہ کو ملی تھی حالانکہ ان کی معلومات کے مطابق تو اسد اللہ صاحب اولاد ہی نہیں تھے۔

''کہاں چلی گئی تھیں آپ؟'' جذبات کے تلاطم سے نکل کر اسد اللہ نے رندھی ہوئی آواز میں جولیٹ سے پوچھا۔

''سوال نہیں کریں پاپا! میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔'' اس کے لہجے میں ایسی بے بسی تھی کہ اسد اللہ خاموش ہوگئے۔ انہیں یاد آیا کہ حویلی میں انہیں جولیٹ کا جو خط ملا تھا، اس میں بھی اس نے ان سے اسی طرح کی درخواست کی تھی۔

''آپ کی یہی خواہش ہے تو ہم آپ سے کوئی سوال نہیں کرتے لیکن آپ کو یہ یقین دہانی ضرور کرواسکتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی جان سے زیادہ پیاری ہیں اور ہم کسی صورت بھی آپ سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔'' اسد اللہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ اسی وقت انہیں ثروت بیگ کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔

''جولیٹ بیٹی! یہ آپ کے چچا جان ثروت بیگ ہیں۔ ہم ان کے خاندان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں اور اب زندگی کو نئے سرے سے جینے کی جدوجہد میں معروف ہیں۔''

''آداب چچا جان۔'' تعارف ہوتے ہی جولیٹ نے فوراً ثروت بیگ کے روبرو سر جھکا دیا لیکن وہ اس کرب کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی جو اسد اللہ کے لہجے میں کروٹیں لے رہا تھا۔

''جیتی رہے بیٹی۔ اللہ آپ کو سدا خوش اور آباد رکھے۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ثروت بیگ نے بہت خلوص سے دعا دی۔ وہ اسد اللہ کے دکھ سے واقف تھے اس لیے ان کی بیٹی کی حیثیت سے ملنے والی اس لڑکی کو دعا دینا ان پر لازم تھا۔

''یہ ہماری بہت ہی پیاری بیٹی جولیٹ اسد اللہ ہیں ثروت بیگ۔ ہم ان کے متعلق تفصیلات سے آپ کو فرصت کے لمحات میں آگاہ کریں گے۔'' ثروت بیگ نے جس طرح مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا، ان کی حیثیت اب سگے بھائیوں جیسی ہی ہوگئی تھی، اس لیے اسد اللہ نے ان کے ساتھ کسی قسم کی دروغ گوئی کرنے کے بجائے واضح کر دیا کہ جولیٹ ان کی سگی بیٹی ہے جس کے متعلق سچائی سے وہ انہیں کسی مناسب موقع پر آگاہ کریں گے۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ ہمارے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ یہ آپ کی دختر ہیں اور آپ ان سے ملاقات ہوجانے پر خوش ہیں۔'' ثروت بیگ نے وقار سے جواب دیا۔

''حویلی میں سب کا کیا حال ہے؟ آپ تنہا یہاں کیسے آگئے؟'' جولیٹ بہت دیر سے دل میں مچلتے سوالات کو زبان پر لائی۔

''حویلی......!'' حویلی کے ذکر پر اسد اللہ کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔

''سب ٹھیک تو ہے پاپا؟'' ان کے انداز نے اسے

مزید پریشان کیا۔

''کیا بتائیں بیٹی اور کیسے بتائیں؟ جو بیت گئی وہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ ہمیں یاد ہے لیکن دل میں آپ کے روبرو سنانے کی تاب نہیں ہے۔'' اسد اللہ خود پر گزری کو سنانے کے خیال سے ہی نڈھال ہونے لگے۔

''پلیز پاپا! مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟ آپ تو محب اللہ کو واپس حویلی لانے کے لیے بمبئی گئے تھے نا...... پھر کیا ہوا؟ کیا وہ آپ کے ساتھ واپس آنے پر راضی نہیں ہوئے یا کوئی اور مسئلہ ہے؟''

وہ جن حالات میں اسد اللہ سے جدا ہوئی تھی، ان ہی کی روشنی میں ان سے سوالات کر رہی تھی۔

''محب اللہ سے ہماری ملاقات ہی نہیں ہوسکی۔ ہمارے بمبئی پہنچنے سے قبل ہی وہ لندن روانہ ہو چکے تھے۔ ہم نے سوچا کہ کچھ دن بمبئی میں اپنے دوست ڈی سوزا کے گھر قیام کر کے محب اللہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر حیدر آباد سے بھائی جان کی کال آگئی اور انہوں نے ایسی اندوہناک خبر سنائی کہ ہمیں سب کچھ بھول بھال کر حیدر آباد کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ وہاں پہنچے تو علم ہوا کہ ہم بری طرح لٹ چکے ہیں۔'' اتنا بتا کر اسد اللہ کی زبان نے ایک بار پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ سر جھکا کر اپنے آنسو ضبط کرنے لگے۔ ثروت بیگ نے قریب آکر ان کے شانے پر دلاسا دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا اور پھر جولیٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''ہمارا خیال ہے بیٹی کہ اس المناک اور انسانیت سوز واقعے سے آپ کو واقف کرنے کا ناگوار فریضہ ہم انجام دے دیتے ہیں۔ ہم محرم راز ہیں، ہماری اس جسارت پر آپ کے والد کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔''

''پلیز چچا جان! آپ ہی بتا دیں کہ وہاں کیا ہوا؟ میں تو اپنے پیچھے وہاں سب کچھ بالکل ٹھیک چھوڑ کر روانہ ہوئی تھی۔'' جولیٹ کا دل کسی انہونی کا سوچ کر بری طرح دھڑکنے لگا۔

ثروت بیگ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حویلی پر حملے کی المناک داستان سنانے لگے۔ اس داستان کو سنتے جولیٹ کا وجود پتھر ہو گیا۔ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ بھلا وہ کیسے مان سکتی تھی کہ وہ اس کے حق میں ڈٹ کر کھڑی ہو جانے والی پھپھی عالیہ، وہ تیکھے مزاج والی عشرت جہاں، وہ ذمے دار و بردبار سا اس کا کزن حبیب اللہ، اس کی شوخ و شنگ بیوی اور ان کے پیارے پیارے بچے، وہ اسے نئی زندگی کی طرف بلانے والا راست گو شخص آصف خان اور وہ ہر پل خدمت بجا لانے کو تیار رہنے والے ملازمین ان میں سے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ حویلی لوٹ لی گئی تھی جس کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ سارے لوگ پیوند خاک ہو چکے تھے جنہیں ابھی شاید برسوں جینا تھا، جو جینا چاہتے تھے اور جن کے پاس جینے کے لیے سارے لوازمات بھی موجود تھے۔ موت کیا ایسی ہی حیرت انگیز، بے یقین کر دینے والی اور انہونی شے کا نام ہے جو ان لوگوں کو اچانک دبوچ لیتی ہے جنہوں نے کبھی اس سے مڈبھیڑ کا بھی تصور نہیں کیا ہوتا اور ان لوگوں کو چوم کر زندگی کی طرف واپس دھکیل دیتی ہے جنہیں اس سے گلے ملنے کی شدید چاہ ہوتی ہے۔ وہ خود ایک مثال تھی، دہلی سے لاہور آنے والی ٹرین میں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا تھا لیکن موت اس کے قریب سے چپکے سے پہلو بچا کر نکل گئی تھی اور حویلی...... حویلی سے بھی تو وہ عین اس رات روانہ ہو گئی تھی جس رات بلوائیوں سے اپنی عزتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے حویلی کی مستورات نے ایک اندھے کنویں میں کود کر اپنی جانیں قربان کر ڈالی تھیں۔ وہ حویلی میں ہوتی تو اپنے باپ کے خون کی لاج رکھنے کے لیے یقیناً خود بھی اس کنویں میں چھلانگ لگا دیتی لیکن وہ اس رات حویلی میں نہیں تھی کہ ابھی موت کو اسے اپنے سنگ لے جانا منظور نہیں تھا۔ ابھی اسے جینا تھا اور پتا نہیں کتنا جینا تھا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹی؟'' اس کا دماغ چکر پھیریاں کھا رہا تھا اور وجود بالکل ساکت تھا۔ اتنا ساکت کہ اس پر پتھر کے کسی مجسمے کا گمان ہونے لگا۔ داستان سنانے والے ثروت بیگ کو اس کی حالت نے تشویش میں مبتلا کیا تو وہ گھبرا کر اس سے پوچھنے لگے۔

''میں ٹھیک ہوں چچا جان بس شدید شاک لگا ہے مگر آپ اطمینان رکھیے، میں خود کو سنبھال لوں گی۔'' ثروت بیگ کا اظہار تشویش اسے اپنی کیفیت سے باہر لایا اور اس نے اسد اللہ کے متعلق سوچا کہ وہ اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف سے گزر رہے ہوں گے اور انہیں ثروت بیگ سے زیادہ تشویش ہوگی کہ اس موقع پر وہ کس ردعمل کا مظاہرہ کرے گی۔ اس نے اپنی بلند آواز سے رونے کی خواہش کو نظر انداز کیا اور بڑی حوصلہ مندی سے دکھ کے بوجھ سے ٹوٹتے بکھرتے اسد اللہ کی پشت پر اپنا ایک بازو پھیلا کر ان کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ اب اس کی آنکھیں بے آواز

آنسو بہارہی تھیں لیکن وہ خود اسد اللہ کے لیے زندگی کا استعارہ اور جینے کا سہارا بنی انہیں بہ زبانِ خاموشی حوصلہ اور دلاسا دے رہی تھی۔

☆☆☆

آج کتنے دنوں بعد اڈے کا دروازہ کھلا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ اس کھلے دروازے پر کسی کی آمد پر استقبال کی نہیں گولو کی میت کی روانگی کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ ساری فضا آہ و بکا اور سسکیوں سے گونج رہی تھی۔ اشوک بچن نے ایک بار پھر اپنی وکالت کا کرشمہ دکھایا تھا اور گولو کی لاش کی وصولی اور رامو کی ضمانت قبل از گرفتاری کے علاوہ اڈے کے گرفتار افراد کی ضمانت کروانے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا۔ دراصل ان میں سے کسی فرد پر بھی کوئی سنگین نوعیت کا الزام نہیں تھا۔ پولیس کے اصل مطلوب افراد ربن اور فاروق تھے اور دونوں ہی منظر سے غائب تھے۔ ربن کے متعلق تو پولیس کو خود بھی علم تھا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے بلکہ خود پولیس نے ہی تو اپنے حلیف غنڈوں کے ساتھ مل کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا اس لیے ربن صرف کاغذات کی حد تک ہی پولیس کو مطلوب تھا اور انہیں عملاً اس کی کوئی تلاش نہیں تھی لیکن فاروق کا معاملہ دیگر تھا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور مہیش، بھائیہ سیٹھ، مجو اور فیکے کے قتل کے شبے میں پولیس کو شدید مطلوب تھا۔ اسی لیے گولو کی میت کے موقع پر بھی پولیس اس کی بو سونگھتی پھر رہی تھی۔ ملکی حالات ابتر تھے۔ جگہ جگہ قتل و غارت اور فتنہ و فساد ہو رہا تھا اور پولیس والوں کی سخت ڈیوٹیاں لگی ہوئی تھیں لیکن پھر بھی فاروق کی گرفتاری کے معاملے کو یکسر نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔ کسی نہ کسی طور اس کی تلاش جاری تھی کہ ربن کے قتل میں ملوث راٹھور کو خدشہ تھا کہ اس واقعے کے تقریباً تمام اہم کرداروں کے خاتمے کے بعد اب اسی کا نمبر ہے اور وہ فاروق کا ہاتھ اپنی گردن تک پہنچنے سے قبل اسے جکڑ لینے کا خواہش مند تھا۔ فاروق خود بھی اس کی اس خواہش کو سمجھتا تھا اس لیے بہت محتاط تھا۔ گولو کے جنازے میں شریک نہ ہونے کا تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اس نے خود کو بہت ہوشیاری سے سکھ کے روپ میں چھپالیا تھا۔ گھنی ڈاڑھی مونچھیں، بڑا سا پگڑ، ناک پر موٹا سا مسا...... اس سب کے پیچھے اس کا چہرہ نظر ہی کہاں آرہا تھا کہ کوئی اسے شناخت کر پاتا۔ وہ دوست دشمن سب کے لیے اجنبی ہوگیا تھا۔

وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ محلے کے افراد کے علاوہ مختلف اڈوں کے لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ گولو کی پولیس کی گولی سے موت سب کے لیے ایک المیہ تھی تو اڈے والوں پر گزری کو جاننے کا تجسس بھی دلوں میں تھا۔ لوگوں کے اتنے بڑے ہجوم میں فاروق کی سکھ کے بھیس میں موجودگی کو کون محسوس کرپاتا۔ وہاں تو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب موجود تھے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے خود کو اس ہجوم میں شامل کر رکھا تھا۔ اڈے کے لوگوں سے زیادہ اس نے خود کو عام لوگوں کے قریب رکھا ہوا تھا۔ دکھ سے اس کا سینہ بری طرح سلگ رہا تھا لیکن اس نے اپنی آنکھوں کو برسنے سے روکا ہوا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے گولو کے جسم کو وقتِ رخصت ڈھیروں بوسے دے لیکن اس نے بس نگاہوں سے اسے چوم لینے پر قناعت کر رکھی تھی۔ یہ قناعت اس کی مجبوری تھی۔ وہ کھل کر دکھوں کو روتا تو اس کا اصل ظاہر ہو جاتا اور ابھی ربن کا ایک قاتل زندہ تھا، ابھی وہ شخص زمین پر سانس لے رہا تھا جس کی وجہ سے معصوم گولو لقمۂ اجل بنا تھا۔ ابھی کیتھرائن پولیس کی کسٹڈی میں تھی جس نے منہ بولا رشتہ نبھانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا، ابھی دلدار آغا بمبئی سے دور کراچی میں زندگی کے مزے لوٹ رہا تھا جسے اس کے انجام تک پہنچائے بغیر وہ جولیٹ سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔

اس کے شانوں پر ذمے داریوں کا بھاری بوجھ تھا اور جن پر اتنی ذمے داریاں ہوں ان کے پاس دکھوں پر کھل کر رونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسے بھی ایک بار پھر اپنے سارے آنسو اپنے اندر اتارنے پڑے تھے۔ رامو بھی اڈے کی چوکی پر بیٹھا ربن کے نائب کے فرائض وقار سے انجام دے رہا تھا۔ اس روز فاروق کے ساتھ فرار ہونے والے وجے اور بجو بھی اڈا کھلنے کی خبر سن کر اپنی روپوشی ختم کرکے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ فاروق کے ساتھ ضرور رہے تھے لیکن کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا اور انہیں گرفتاری کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ سارا بچھڑا کنبہ ایک جگہ جمع ہوگیا تھا لیکن اس حال میں کہ کنبے کا سربراہ باقی نہیں رہا تھا اور وہ سب کنبے کے سب سے لاڈلے بچے کو اس کے ابدی سفر پر رخصت کرنے کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔ ربن کی موت کا تو ابھی ان چند گنے چنے لوگوں کے سوا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ یہ خبر عام ہوجاتی تو وہاں ایک کہرام مچا ہوتا۔ ربن کے چاہنے والے اپنا گریبان چاک کر ڈالتے، کتنوں ہی سے ان کے حواس چھن جاتے، چنانچہ ایسے حالات میں جبکہ ابھی کرنے کو بہت کام باقی تھے حقیقت آشناؤں نے حقیقت چھپالینے کا کڑا فیصلہ کیا تھا جو کچھ بیتا

تھا، وہ انہوں نے اپنے دلوں پر سہہ لیا تھا اور مسلسل سہہ رہے تھے لیکن کسی اور کو اس دکھ میں حصے دار نہیں بنایا تھا کہ یہی وقت کا تقاضا تھا۔

سسکیوں اور آہوں میں گولو کی میت کو اس کے آخری مقام پر پہنچانے کے بعد لوگ کڑوی روٹی کھا کر رخصت ہونے لگے تو فاروق کو بھی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کا ٹھکانا مالا کا چھوٹا سا گھر ہی تھا جہاں رامو کو خود کسی وقت اس سے رابطہ کرنا تھا۔ رامو کے فوری طور پر اڈے سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اسے تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملاقات کرنی تھی۔ ربن اور فاروق کی غیر موجودگی کے سلسلے میں اٹھنے والے سوالات کے جواب دینے تھے، اپنے ٹوٹے بکھرے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانا تھا، اڈے کے جامد ہو جانے والے معاملات کو پھر سے رواں کرنا تھا۔ ذمے داریاں ہی ذمے داریاں تھیں۔ فاروق اس کی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اسی لیے کیتھرائن کے سلسلے میں بہت زیادہ بے چین ہونے کے باوجود خود پر بہت ضبط کیے ہوئے تھا۔ اشوک بچن نے صاف بتا دیا تھا کہ کیتھرائن بری طرح پھنسی ہوئی ہے اور پولیس کسی صورت اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ ربن کی لاش کو خفیہ طور پر مُردہ خانے سے نکلوانے اور فاروق اور اس کے ساتھیوں کو پناہ دینے جیسے سنگین الزامات کی صورت میں اس کی رہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور فاروق کو اسے پولیس کی حراست میں برداشت کرنے کے لیے خود پر کڑا جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ پولیس والوں کا کردار یوں بھی کبھی پسندیدہ نہیں رہا تھا اور اس وقت تو ان کا حال چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح تھا۔ اپنی اس کیفیت میں وہ لوگ کیتھرائن سے اپنے مطلب کی معلومات اگلوانے کے لیے اس کو تشدد کا نشانہ بھی بنا سکتے تھے اور وہ بے چاری جانتی ہی کتنا تھی۔ زیادہ سے زیادہ پولیس اب تک گزری پر اسے فاروق کے خلاف گواہ ہی بنا سکتی تھی نا لیکن یہ تو اسے بھی علم نہیں تھا کہ فاروق اس وقت کہاں ہے اور پولیس کو سب سے زیادہ اسی ایک سوال کے جواب کی تلاش تھی۔ اس سوال کے چکر میں کیتھرائن پولیس کی درندگی کا نشانہ بن جاتی تو یہ فاروق کی روح پر ایک اور تازیانہ ہوتا۔ اپنی روح کو ایسے کسی زخم سے بچانے کے لیے وہ عملی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ سب کچھ طے تھا بس رامو کا انتظار تھا۔ وہ مدد کے لیے اپنی نفری اور ضروری سامان مہیا کرتا جب ہی کچھ ہو سکتا تھا۔

مالا کے گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں فاروق انتظار کے کرب سے گزر رہا تھا۔ شام کے ڈھل کر رات میں تبدیل ہونے اور رات کے گہرے ہونے کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے امتحان تھا۔ مالا حقِ میزبانی ادا کرنے کے لیے اپنے طور پر پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس نے لفظوں سے فاروق کا دکھ بانٹنے کی کوشش بھی کی تھی اور وقتاً فوقتاً چائے، شربت اور کھانا پیش کر کے اپنے اچھا میزبان ہونے کا ثبوت بھی دیتی رہی تھی لیکن فاروق کی سوئی اب کیتھرائن کی رہائی پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ گولو کے دکھ سے بھی گزر گیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ دکھوں کا یہ سلسلہ دراز نہ ہونے پائے۔ ربن اور گولو کے بعد وہ کیتھرائن کے آگے شرمسار نہ ہو کہ وہ وقت پر اس کے کام نہیں آسکا۔ وہ اب کوئی لاش نہیں دفنانا چاہتا تھا اس لیے کیتھرائن کی آزادی کا شدت سے خواہاں تھا۔ اللہ، اللہ کر کے انتظار کی جاں گسل گھڑیاں گزریں اور رامو نے گھر میں قدم رکھا۔ فاروق نے بے تابی سے اس کا استقبال کیا۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“ سوال کرتے ہوئے اسے اپنی ہی آواز وحشت زدہ لگی۔

”ٹھیک ہے۔ سالا ایک پولیس کا سپاہی اڈے کی نگرانی کرتا تھا۔ اپن کے آدمی پہلے ہی تاڑ لیے تھے۔ سالا بھکاری بن کر اڈے کے دروازے کے سامنے جما ہوا تھا۔ اپن کا آدمی لوگ نے ٹھڈے مار کر علاقے سے ہی نکال دیا کہ ادھر اڈے سے اجازت لیے بنا بھیک مانگنا بھی الاؤ نہیں ہے۔ بھاگ گیا...... کی اولاد۔ اس کے بعد بھی اپن بہت سنبھل کر اور آگے پیچھے دیکھ کر نکلا ہے۔ باقی بندوں کو بھی بول دیا تھا کہ آگے پیچھے کا دھیان رکھ کر نکلنا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ سب تھانے والی چورنگی کے آس پاس جمع ہو جائیں گے۔“

رامو نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا اور اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر پیٹ کے ساتھ بندھے پستولوں میں سے ایک کو علیحدہ کر کے فاروق کے ہاتھ میں تھمایا۔ لوہے کی ٹھنڈک نے فاروق کے اندر سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ آتشیں ہتھیاروں کے استعمال سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اڈے کی دنیا میں سب سے زیادہ چاقو کو ہی قابلِ بھروسا سمجھا جاتا تھا لیکن ربن نے زمانے کے بدلتے ڈھنگ دیکھتے ہوئے محدود تعداد میں ان ہتھیاروں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یہ ہتھیار اڈے میں ہی بہت خفیہ طور پر چھپائے گئے تھے اور پولیس اڈے کی اچھی خاصی تلاشی لینے کے باوجود ان تک

رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اس کی خواہش پر رامو نے ان ہتھیاروں کو ان کی جگہ سے نکالا تھا۔ آج انہیں جو مہم درپیش تھی، وہ بڑی خطرناک تھی اور انہیں ان ہتھیاروں کے استعمال کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

"موٹر کا کیا بنا؟" فاروق نے اس سے دوسرا سوال کیا۔

"بیوک مل گئی ہے۔ ٹیم (ٹائم) پر پاس میں موجود رہے گی۔"

"اندر کتنے بندے ہوں گے؟"

"ہیڈ محرر کے علاوہ چار سے چھ سپاہیوں کے ہونے کی خبر ہے۔ دو سارا ٹیم گیٹ پر پہرا دیتے ہیں، باقی اندر ہوتے ہیں۔" اس نے فاروق کو وضاحت سے جواب دیا۔

"تم تیار ہو جاؤ تو پھر اوپر والے کا نام لے کر نکلتے ہیں۔" فاروق نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے رامو سے کہا۔ وہ ابھی تک اسی سکھوں والے حلیے میں تھا جس میں اس نے گولو کی میت میں شرکت کی تھی۔ اس کے کہنے پر رامو نے بھی اپنا حلیہ تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ مالا اس کی مدد کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں رامو بالکل بدل گیا اور اس کی جگہ وہاں ایک تنو مند سکھ کھڑا دکھائی دینے لگا۔ حلیوں کی تبدیلی کے بعد وہ گھر سے نکلنے لگے تو مالا تانبے کی تھالی میں ایک مٹی کا دیا، گیندے کے پھول اور جانے کیا کچھ سجا کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ رات کے اس پہر وہ دونوں کسی خطرناک کام سے روانہ ہو رہے ہیں اس لیے خوف اور پریشانی سے اس کا خوبصورت چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ اس سفید چہرے کے ساتھ اس نے ان دونوں کی آرتی اتاری اور رامو کے ماتھے پر تلک لگانے لگی لیکن رامو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ بغیر اصرار کیے ایک طرف ہٹ گئی اور انہیں باہر جانے کا راستہ دیا۔

"فکر مت کریں بھابی! میرے جیتے جی آپ کے پتی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور جلد آپ دوبارہ انہیں اپنے سامنے دیکھیں گی۔" فاروق نے پل بھر مالا کے قریب رک کر اسے تسلی دی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹ کچھ کہنے کی خواہش میں لرز کر رہ گئے۔ فاروق اس منظر سے نظریں چرا کر آگے بڑھ گیا۔ رامو اس سے پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے چوک پر پہنچے۔ یہاں دو تین تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے ایک تانگے کا انتخاب کر کے اس کے مالک سے اپنے مطلوبہ تھانے چلنے کا معاملہ طے کیا اور سفر شروع ہو گیا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور اس رونق کا نام و نشان نہیں تھا جسے بمبئی کا خاصہ سمجھا جاتا تھا۔ رات گئے تک جاگتے رہنے والے شہر کی رونقیں ماند پڑ گئی تھیں۔ بمبئی میں حالات کے کافی حد تک سنبھل جانے کے باوجود وہ پہلے سی بات نہیں تھی۔ شاید یہ ملک کے دوسرے حصوں سے مسلسل آنے والی فساد کی خبروں کا اثر تھا کہ لوگ بلا ضرورت گھر سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔

ایسے میں ان کا تانگا تنہا سڑک پر دوڑتا تھا تو اس کے ٹاپوں کی آواز دور دور تک پھیلتی چلی جاتی تھی۔ وہ دونوں تانگے کی پچھلی نشست پر بالکل خاموش اور جامد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا رویہ دیکھتے ہوئے تانگے والے کو بھی کچھ بولنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ تانگا تھانے والی چورنگی کے پاس رکوا کر رامو نے کرایہ ادا کیا اور پھر دونوں پیدل چلتے ہوئے تھانے کے مضبوط اور آہنی گیٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ رامو نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی بجائی تو جواب میں گیٹ پر لگی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر ایک سپاہی نے باہر جھانکا اور لہجے کو کڑک دار بنا کر پوچھا۔

"کون ہے اوئے۔ کیا کام ہے؟"

"ہمارے گھر چوری ہو گئی ہے، اس کی رپورٹ لکھوانی ہے۔" فاروق نے طے شدہ بہانہ بتایا۔

"اتنی رات کو کوئی پرچہ نہیں کٹتا، صبح آنا۔" سپاہی نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

"صبح تک دیر ہو جائے گی بھرا! ایس پی صاحب نے کہا ہے تھانے پہنچ کر فوراً رپورٹ لکھواؤ۔ میں خود بھی وہاں فون کر دوں گا۔" فاروق نے سادہ سے لہجے میں جو بات کہی، اس نے سپاہی کو چونکا دیا۔

"ایس پی صاحب کے کیا لگتے ہو تم؟"

"وہ میرے چچا کے گہرے دوست ہیں۔" وہ اپنے انداز گفتگو سے خود کو ایک پڑھا لکھا لیکن سادہ مزاج جوان ظاہر کر رہا تھا۔ سپاہی پر اس کے انداز گفتگو سے زیادہ ایس پی کے حوالے نے اثر ڈالا اور اس نے بغلی گیٹ کھول کر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر آئے تو دیکھا گیٹ کے ساتھ رکھی بینچ پر دوسرا سپاہی لیٹا خراٹے لے رہا ہے۔ ایک طرف کرسی بھی رکھی ہوئی تھی جس پر ماچس اور بیڑیوں کا پیکٹ دھرا تھا۔ سارا سیٹ اپ صاف سمجھ آ رہا تھا۔ یقیناً گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے دونوں سپاہیوں نے باری لگائی ہوئی تھی۔ ایک جاگتا تھا تو دوسرا سوتا تھا۔ انہیں اندر بلانے والے نے تھانے کے چھوٹے سے احاطے سے انہیں اندرونی عمارت تک پہنچایا اور اندر موجود اپنے کسی ساتھی کو

آواز دے کر اسے ہدایت دی کہ ان دونوں کی ہیڈ محرر صاحب سے ملاقات کروادی جائے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دے دی کہ وہ دونوں ایس پی صاحب کے شناسا ہیں۔ اندر والے سپاہی نے اس اطلاع کے بعد خوش دلی سے ان کا استقبال کیا اور برآمدے میں پڑی ایک بینچ پر بٹھا کر خود ایک کمرے کے اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد ان کی اندر طلبی ہوئی اور انہیں ہیڈ محرر کے روبرو پہنچادیا گیا۔ وہ موٹی توند والا روایتی پولیس والا تھا جس کی آنکھوں کا خمار بتا رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی نیند سے جگایا گیا ہے۔ وردی بھی کچھ بے ترتیب تھی اور عجلت میں بدن پر چڑھائے جانے کی گواہی دے رہی تھی۔

''پدھاریے سردار جی اور ذرا تفصیل سے بتایئے کہ کس حرام جادے نے سرداروں کے گھر چوری کی جرأت کی۔ جارام پیارے ذرا جلدی سے تین کپ چائے تو لے آ۔'' موٹا ہیڈ محرر بیک وقت ان دونوں اور اپنے سپاہی سے مخاطب ہوا۔

''کوئی اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔'' رامو اور فاروق نے ابھی تک کرسیوں پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سپاہی اپنے افسر کے حکم پر باہر جانے لگا تو رامو نے اس کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا کر اسے باہر جانے سے روکا۔ حیران پریشان افسر و ماتحت کچھ سمجھ پاتے، اس سے پہلے ہی وہ دونوں اپنے پستول نکال چکے تھے۔ ہیڈ محرر نے پھر بھی تھوڑی پھرتی دکھانی چاہی اور اپنی میز کی دراز کھولنے کی کوشش کی۔ فاروق نے فوراً ہی اس کی پشت پر پہنچ کر اپنی پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگادی اور دھیمی آواز میں غرا کر بولا۔

''کوئی حرکت نہیں۔ ورنہ اپنی جان سے چلے جاؤ گے۔''

ہیڈ محرر نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا اور کانپتی آواز میں بولا۔ ''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''صرف اتنا کہ تم ہماری ہر ہدایت پر عمل کرو۔''

''یہ تھانہ ہے۔ ادھر غنڈا گردی کرکے تم بہت پچھتاؤ گے۔'' اس نے ڈرانے کی کوشش کی۔

''تم ہمارے بجائے اپنی چنتا کرو سوامی جی اور اگر جان کی امان چاہتے ہو تو سیدھی طرح ہماری باتوں پر عمل کرو۔ ہمارا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم جان کی بازی لگا کر یہاں آئے ہیں اور جان دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں لیکن تمہارے پیچھے تو تمہارے بیوی بچے، گھر بار وغیرہ ہوگا اور تمہیں ان سب کے لیے جینے کی چاہ بھی ہوگی تو پھر کیوں بے کار میں حجت کرتے ہو۔'' فاروق نے تھوڑے نرم گرم لہجے میں اسے سمجھایا تو اس بار اس نے ہتھیار ڈال دیے اور لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔

''ٹھیک ہے بتاؤ۔ تم اپن سے کیا چاہتے ہو؟''

''اس کمرے کی چابی جہاں تم نے سسٹر کیتھرائن کو رکھا ہوا ہے۔'' فاروق نے فوراً اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''اوہ...... تو کیا تم فاروق دادا ہو؟'' ہیڈ محرر نے مڑ کر اس کی شکل غور سے دیکھی۔

''اس وقت تو میں صرف موت کا فرشتہ ہوں اور اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تمہیں نرک (دوزخ) تک پہنچانے میں ذرا دیر نہیں کروں گا۔'' اس نے ہیڈ محرر کی کنپٹی پر نال کا دباؤ کچھ اور بڑھایا۔

''دے...... دیتا ہوں چابی۔ اسے تو ہٹاؤ۔'' اس نے گھبرا کر کہا اور اپنی بیلٹ کے ساتھ بندھے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی الگ کرکے اس کے حوالے کی۔

''اب تو باہر جا اور ادھر سامنے ہی کھڑے ہوکر اپنے ساتھیوں کو آواز دے کہ صاحب سب کو اپنے کمرے میں بلاتا ہے۔ یاد رکھنا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو، تو اور تیرا یہ بلڈاگ کے منہ والا صاحب دونوں مارا جائے گا۔'' سپاہی کو کور کیے کھڑے رامو نے اس مرحلے پر اپنی خاموشی کو توڑا اور اپنے پستول سے اسے ہلکا سا ٹھوکا لگاتے ہوئے حکم دیا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ کیا کہتا، اس کی تو اپنی جان مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے ڈالی۔ سپاہی مرے مرے قدموں کے ساتھ باہر کی طرف بڑھا۔

''بس ادھر دروازے کے باہر ہی رک جانا اور وہیں سے آواز لگا دینا۔'' رامو نے اسے ہدایت دی اور اس کے پیچھے ہی آگے بڑھا۔ سپاہی تو کمرے سے باہر نکل گیا لیکن وہ دروازے پر پڑی چق کے ساتھ لگ کر اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ سپاہی نے اس کی ہدایت پر مکمل عمل کیا اور دروازے سے دو قدم آگے جاکر رکنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا۔ اس نے تین مختلف نام پکارے تھے۔ ایک آدمی تو پہلی پکار پر ہی سامنے آگیا جبکہ دوسرے کی آمد اس وقت ہوئی جب دوسری بار پکار پڑ چکی تھی۔

''سکھیا کدھر ہے؟'' سپاہی نے اپنے آنے والے دونوں ساتھیوں سے تیسرے کے بارے میں دریافت کیا۔

"سو رہا ہے۔ تم بولو، تم کیوں آدھی رات کو آوازیں لگا رہے ہو؟" دوسرے نمبر پر آنے والے سپاہی نے جماہی لیتے ہوئے بے زاری سے پوچھا۔ یقیناً وہ بھی نہیں بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس طرح بلائے جانے پر اس کے شغل میں خلل پڑا تھا اسی لیے بیزار تھا۔

"اسے اٹھا کر لاؤ۔ اندر صاحب سب کو بلاتا ہے۔" سپاہی نے اس سے کہا اور پہلے آجانے والے سپاہی کو اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کر کے خود پلٹ گیا۔ اندر رامو تیار تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے، اس نے انہیں اپنے پستول کی زد پر لے لیا اور کرسی پر بیٹھے ہیڈ محرر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"حوالدار جی! ذرا جلدی سے ہتھکڑیوں کی دو جوڑی تو نکالو۔ آج ذرا تمہارے سپاہیوں کو چور بناتے ہیں۔" ہیڈ محرر کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن فاروق نے اسے رکنے کا اشارہ کر کے خود دراز کھولی اور سب سے پہلے بالکل سامنے پڑا ریوالور نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ ہتھکڑیاں بھی اسی دراز میں پڑی تھیں، اس نے ایک جوڑی رامو کی طرف اچھال دی جس نے نہایت پھرتی سے دونوں سپاہیوں کا ایک ایک ہاتھ پکڑ کر انہیں ایک ہی ہتھکڑی سے جکڑ دیا۔ نئے آنے والے سپاہی نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ فاروق نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ یہ وہی سپاہی تھا جو انسپکٹر وکرم کی نمک حرامی کے بعد بھی اڈے کا وفادار رہا تھا اور بروقت بہت سی اطلاعات اڈے تک پہنچا کر اڈے والوں کی مدد کرتا رہا تھا۔ ربن کی ہلاکت والی رات وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا اس لیے کوئی مدد بھی نہیں کر سکا تھا لیکن اب اس نے ایک بار پھر ان کی مدد کی تھی۔ وہی تھا جس نے تھانے میں موجود سپاہیوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔ ان دو کو ہتھکڑی لگا کر فارغ ہونے تک باہر قدموں کی آواز دروازے تک آچکی تھی۔ رامو دروازے کے ایک طرف ہو کر کھڑا ہوگیا۔ جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے، پشت سے اس کے نشانے کی زد پر تھے۔ کمرے کا نقشہ دیکھ کر دونوں بری طرح چونکے اور فطری طور پر پلٹ کر باہر جانے کی کوشش کی لیکن پشت پر پستول سنبھالے کھڑے رامو کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"کوئی آواز نہیں ورنہ یہ چل جائے گا اور جب یہ سالا چلتا ہے تو آدمی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتا ہے۔" اس نے انہیں دھمکایا۔ اس دھمکی سے ایک تو مرعوب ہوگیا

اصل بچت

عید آرہی تھی۔ شوہر نے سوچا اخراجات پر کچھ کنٹرول کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی دن سے اس نے بچت کی مہم شروع کر دی اور دفتر سے واپس آتے وقت بس میں بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ جب وہ ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا تو اس نے بیوی کو یہ خوشخبری سنائی۔ "بیگم آج میں بس کے پیچھے بھاگ کر گھر پہنچا ہوں۔ اس طرح میں نے 20 روپے بچا لیے ہیں۔"

بیوی بولی۔ "اگر تم ٹیکسی کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے تو اصل بچت تب ہوتی۔ آئندہ کے لیے یہ بات پلے سے باندھ لو۔"

اداس لمحوں کے لیے

ٹچ موبائل...... اشاروں کی زبان۔

اگر محبوبہ سے شادی نہ ہو سکے تو یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ انگور کھٹے ہیں۔

انڈین ڈرامے...... ساس بہو کو جھگڑا سکھانے کی اکیڈمی۔

سیاست...... امیر ہونے کی سیڑھی۔

* ایک دوست دوسرے دوست سے۔ آج کل بیویاں شوہروں سے کیوں ہانڈی پکواتی ہیں...... تاکہ نمک مرچ کم ہونے کے الزام سے بچ سکیں۔

(مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال)

شادی کے بعد

لڑکی۔ "جانو تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے سارے دکھ بانٹ لوں گی۔"

لڑکا۔ "مگر میری زندگی میں تو کوئی دکھ نہیں ہے۔"

لڑکی۔ "میں شادی کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔"

مرضی

استاد۔ "جس آدمی کو سنائی نہ دیتا ہو اس کو انگریزی میں کیا کہیں گے؟"

شاگرد۔ "سر جی جو مرضی کہہ لیں۔ اس نے کون سا سن لینا ہے۔"

مرسلہ: جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

لیکن جو سب سے آخر میں آیا تھا اور جس کا نام سکھیا لیا گیا تھا، اس نے تھوڑی تیزی دکھانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں کی نسبت تھا بھی مضبوط جسامت اور ڈیل ڈول کا مالک۔ وہ یقیناً اندر کہیں بڑے آرام سے سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پڑے سرخ ڈورے اور قمیص کی آستینوں اور گریبان کے دو کھلے ہوئے بٹن گواہی دے رہے تھے کہ وہ کس طرح اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا اور بلاوے پر بڑی عجلت میں قمیص پہن کر اپنے افسر کے سامنے حاضر ہونے آیا تھا لیکن حاضری لینے کے لیے کوئی اور موجود تھا۔ اپنی جسمانی طاقت کے زعم میں سکھیا، رامو کے ہاتھ میں موجود پستول کو خاطر میں نہیں لایا اور اس کے پستول پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ یقیناً وہ خاصا پھرتیلا تھا لیکن رامو کے سامنے اس کی پھرتی چلنے والی نہیں تھی۔ رامو نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے لات چلائی اور پوری قوت سے زیر ناف دے ماری۔ اس کی لگائی گئی ضرب اتنی شدید تھی کہ سکھیا بلبلا کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی نے اضطراری طور پر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن رامو نے ہاتھ میں تھامے پستول کے دستے سے اس کی کھوپڑی بجا ڈالی۔ وہ بے چارہ فوراً ہی لہرا کر نیچے گر گیا۔ رامو اسے دیکھے بغیر سکھیا کی طرف متوجہ ہوا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پے در پے لاتیں مارتا چلا گیا۔ سکھیا مضبوط اعصاب کا مالک تھا جو اس کی مار کھا کر بھی چیخنے چلّانے کے بجائے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس صورتِ حال پر ہیڈ محرر اور دوسرے سپاہیوں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

"پلیز، یہ سب مت کرو۔" ہیڈ محرر نے التجا کی۔

جواب میں فاروق نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھے اور ٹیبل کلاتھ کھینچ کر اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا پھر یہ ٹکڑے اس نے ہیڈ محرر سمیت اس کے سپاہیوں کے منہ میں ٹھونسنے شروع کر دیے۔ اپنے مددگار سپاہی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے اسے افسوس تھا لیکن اس کے بچاؤ کے لیے بہت ضروری تھا کہ اس کے ساتھ بھی غیر جانبدارانہ سلوک کیا جائے تاکہ بعد میں اس پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ اس نے ان سب کے پیر بھی باندھ دیے تھے اور اب وہ مکمل طور پر حرکت کرنے سے مفلوج تھے۔ حرکت وہ پہلے بھی نہیں کر رہے تھے کہ آتشیں ہتھیاروں کا رعب ہی بہت تھا۔ یہ وہ زمانہ نہیں تھا جب ہر سپاہی اسلحے سے لیس ہوتا۔ تھانے کے عملے کے پاس بس گنتی کے چند ہی ہتھیار ہوتے تھے اور عوام کے لیے پولیس کی وردی اور سپاہی کے ہاتھ میں موجود ڈنڈا ہی کافی ہوتا تھا۔

فسادات کے بعد سپاہیوں کو مسلح ضرور کیا گیا تھا لیکن یہ بھی فیلڈ میں عملی طور پر کام کرنے والے سپاہیوں کا حال تھا۔ بمبئی کے اس پُرسکون علاقے کے تھانے میں اپنی معمول کی ڈیوٹی بھگتاتے سپاہیوں کو بھلا رات کے اس پہر اسلحے سے لیس ہو کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اسلحہ ہوگا، وہ بھی انہوں نے کہیں احتیاط سے رکھا ہوا ہوگا چنانچہ رامو اور فاروق نے صرف دو پستولوں کے زور پر پورے عملے کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ گیٹ پر جو دو بیٹھے پہرا دے رہے تھے، ان کی طرف سے بے فکری تھی کہ معلوم تھا ان کا بھی انتظام ہو چکا تھا اور تھانے کے باہر جمع ہونے والے ان کے ساتھیوں نے ان کے اندر داخل ہونے کے کچھ دیر بعد ہی اپنی کارروائی شروع کر دی ہوگی۔ انہیں بس ایک چھوٹا سا ڈراما کرنا تھا۔ وہ تھانے کے گیٹ کے عین سامنے کھڑے ہو کر پی کر آؤٹ ہو جانے والے شرابیوں کی نقل کرتے اور تھانے کا گیٹ بجاتے کہ انہیں انصاف دلایا جائے۔ ان کا شور شرابا سن کر پہرے والے سپاہیوں کو متوجہ ہونا پڑتا اور ان میں سے کم از کم ایک ضرور باہر نکلتا۔ بس پھر وہ موقع ملتے ہی ان سپاہیوں کو قابو کر لیتے۔ اس ڈرامے کو پہلے اس لیے اسٹیج نہیں کیا گیا تھا کہ فاروق اور رامو سکون سے ہیڈ محرر تک پہنچ کر کارروائی کر سکیں۔ باہر پہلے ہی ہنگامہ ہو جاتا تو اندر والے بھی متوجہ ہو جاتے اور صورتِ حال اتنی آسانی سے ان کے قابو میں نہ آتی جیسے اب آگئی تھی۔

"ایک کپڑا اس کے منہ میں بھی ٹھونس شہزادے اور تو جا کر رجسٹر کو لے کر آ۔ ادھر زیادہ دیر ٹھہرنے کا نہیں ہے۔" ابھی تک سکھیا کی ٹھکائی لگاتے رامو نے فاروق کو ہدایت دی تو اس نے فوراً عمل کیا۔ پٹائی کھاتے ہوئے سکھیا کا ضبط اب جواب دینے لگا تھا اور وہ چیخیں مار رہا تھا۔ اس کی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے ہی رامو نے یہ حکم دیا تھا۔ فاروق نے اس کی ہدایت پر عمل ضرور کیا لیکن حیران تھا کہ رامو سکھیا کے ساتھ اتنی بے دردی سے کیوں پیش آ رہا ہے۔ ذرا سی مزاحمت پر اتنی سزا ناقابلِ فہم تھی لیکن اس نے رامو کے کام میں دخل نہیں دیا کہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ ناقابلِ فہم نظر آنے والے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہوگی۔ رامو ربن کا نائب تھا اور ربن کے نائب کا کوئی عمل خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔ فاروق کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آگے بڑھ گیا۔ علاقے کا تھانہ ہونے کی وجہ

سے ان کا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے عمارت کے نقشے سے اچھی طرح واقف تھا۔

حاصل شدہ معلومات کے مطابق کیتھرائن کو اس برآمدے کے آخری سرے پر واقع کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اصولاً تھانے والے اس طرح کسی خاتون کو قید کر کے رکھنے کے مجاز نہیں تھے۔ وکیل اشوک بچن نے بھی ان لوگوں کو پیشکش کی تھی کہ وہ اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کر کے کیتھرائن کو خواتین کی جیل منتقل کروا سکتا ہے لیکن اس وقت تک کیتھرائن کو تھانے سے فرار کروانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ تھانے کی نسبت جیل سے کسی کو فرار کروانا بہت مشکل کام ہوتا ہے اسی لیے انہوں نے اشوک بچن کی پیشکش ٹال دی تھی اور صرف اتنا انتظار کیا تھا کہ پولیس کی تحویل سے گولو کی لاش وصول کر کے اس کی تدفین کر دی جائے۔ اپنے اس فرض کی ادائیگی کے بعد انہوں نے فوری طور پر کارروائی کر ڈالی تھی، وہ بھی کچھ اس طرح کہ پولیس والوں کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ سلاخوں والی کوٹھری کے سامنے سے گزرا تو وہاں موجود قیدی جاگ رہے تھے۔ تھانے میں ہونے والی ہلچل کو یقیناً انہوں نے بھی محسوس کر لیا تھا اور اب سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فاروق وہاں سے گزرا تو انہوں نے ایک پگڑ پوش سکھ کو ہاتھ میں پستول لیے جاتے دیکھ کر خوف محسوس کیا اور ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ فاروق نے ان کی طرف توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔

کیتھرائن والے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے چابی سے تالا کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے اندازے سے دیوار پر ہاتھ مار کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور باری باری بٹن دباتا چلا گیا۔ آخر کمرے میں لگا ایک زرد سا بلب روشن ہو گیا۔ اس زرد روشنی میں اس نے چھوٹے سے متعفن کمرے کے ایک کونے میں کیتھرائن کو پڑا دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن اچانک روشنی ہو جانے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں اور وہ فوری طور پر اندر آنے والے کو دیکھنے کے قابل نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر فاروق کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں اسے گرفتار کیا گیا تھا۔ لباس بے حد میلا ہونے کے علاوہ کچھ مقامات سے پھٹ بھی گیا تھا۔ بال بے حد الجھے ہوئے اور گندے ہو رہے تھے۔ چہرے اور ہاتھ پیروں کا بھی یہی حال تھا۔ لگتا تھا وہ جب سے یہاں آئی ہے، اسے نہانا تو دور کی بات، منہ ہاتھ دھونے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔ اس پر سے وہ جس فرش پر لیٹی ہوئی تھی، وہ بھی اتنا گندا تھا کہ لگتا تھا برسوں سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ فاروق کو اس کے چہرے پر چند خراشیں بھی دکھائی دیں جس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں تشدد کا نشانہ بنائی جاتی رہی تھی۔

''کیتھی......'' اس نے پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھ کر بہت محبت سے پکارا تو اس کی چندھیا جانے والی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ سامنے بڑی سی داڑھی اور پگڑی والے سکھ کو دیکھ کر وہ ذرا سی حیران ہوئی لیکن پھر اس نے جان لیا کہ اس حلیے کے پیچھے وہی مہربان ہے جس کی آواز سن کر اس نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ بے اختیار ہی اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی۔

''فاروق بھائی!''

''میں تمہیں یہاں سے لے جانے کے لیے آ گیا ہوں میری بہن۔ تھوڑی سی ہمت کر کے اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔'' فاروق نے خود بھی اسے سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی۔ چند دنوں میں ہی وہ بہت کمزور ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد حلقے سے بن گئے تھے۔ فاروق کے سہارے کے باوجود وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ہی چل رہی تھی۔ اس کی اس ابتر حالت پر فاروق کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا۔ اس سے محبت نبھانے کے لیے وہ بے چاری نازک سی لڑکی اس حال تک پہنچ گئی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لگائے وہ ہیڈ محرر کے کمرے تک پہنچا تو وہاں رامو ابھی تک سکھیا کی دھنائی لگا رہا تھا۔ نیم جان سکھیا میں اب اتنی ہمت بھی باقی نہیں رہی تھی کہ رحم کی بھیک ہی مانگ سکے۔ اس کے ساتھی آنکھوں میں خوف و دہشت لیے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ بھی بند تھے اس لیے وہ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

کیتھرائن نے سکھیا کو دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں سے نفرت جھلکنے لگی۔

''دیکھ لے بٹیا! جس نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اپن نے اس کی ایک ہڈی بھی ثابت نہیں چھوڑی ہے۔ تو بول تو اپن اس کی گردن توڑ کر کام ہی تمام کر دیتا ہے۔'' ان دونوں کو آتا دیکھ کر رامو نے سکھیا کو چھوڑا اور کیتھرائن سے مخاطب ہو کر بولا۔ کیتھرائن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور اس نے لب بھینچ کر سر کو نفی میں جنبش دی۔

''تو کہتی ہے تو چھوڑ دیتے ہیں سالے کو پر اب تیری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ اپن تیرے کو بٹیا بولے ہیں اور

بیٹیوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔'' اس نے قریب آکر کیتھرائن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو فاروق کو اس پر ربن کا گمان ہوا۔ وہ بالکل اسی لب و لہجے میں بات کر رہا تھا جس میں ربن بولتا تھا۔ فاروق کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ ربن اب کہاں تھا...... اب تو ساری زندگی یوں ہی دوسروں کے اندر اسے تلاشتے ہوئے گزرنی تھی لیکن اسے اس بات سے بہرحال اتفاق تھا کہ رامو ربن کا بہترین جانشین ہے اور اس میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ ربن کے بعد اڈے کی چوکی سنبھال سکتا ہے۔ ربن نے کچھ دیکھ کر ہی تو اسے اپنا نائب مقرر کیا تھا اور ایک طرح سے جو والے اڈے کی چوکی پر اسے ہی سیاہ و سفید کا مالک بنا کر بٹھا رکھا تھا۔

''چل اب نکلتے ہیں ادھر سے۔ دیر ہوگئی تو مشکل نہ پڑ جائے۔'' رامو کی بات پر وہ اپنے خیال سے چونکا۔ باہر کا نقشہ ان کی توقع کے مطابق ہی تھا۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے دونوں سپاہی ایک جانب بندھے ہوئے پڑے تھے اور بے ہوش دکھائی دیتے تھے۔ ان کی جگہ وجے اور اس کے ایک ساتھی نے لے رکھی تھی۔ باقیوں کے بارے میں انہیں علم تھا کہ وہ باہر کہیں قریب میں ہی چھپے ہوں گے کہ اگر ضرورت پڑے تو مدد کو آسکیں۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں پولیس کی کوئی گشتی ٹولی ستانے یا کسی واقعے کی رپورٹ کرنے تھانے نہ پہنچ جائے لیکن خیر گزری کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وجے نے آگے بڑھ کر ذیلی دروازہ کھولا اور پہلے خود باہر نکل کر مخصوص انداز میں زور سے سیٹی بجائی۔ سیٹی کے ردعمل میں فوراً کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی نیلے رنگ کی بیوک گیٹ کے سامنے آرکی۔

''تم لوگ اب واپس اڈے پر چلے جاؤ۔'' پہلے کیتھی اور فاروق گاڑی میں سوار ہوئے پھر رامو بھی وجے کو ہدایت دیتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ان کا سارا پروگرام طے شدہ تھا اور خوش قسمتی سے وقت کے درست حساب کتاب کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ راستے میں ان کی کسی پولیس پارٹی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور وہ سیدھے رامو کے رہائشی علاقے میں پہنچ گئے۔ گاڑی تنگ گلی کے اندر نہیں جاسکتی تھی اس لیے اسے کونے پر ہی روک دیا گیا اور وہ تینوں پیدل گھر کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور خاصا قابلِ بھروسا آدمی تھا اور اس نے پوری کارروائی کے دوران منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ اس ڈرائیور اور گاڑی کا انتظام اشوک بچن کی مدد سے کیا گیا تھا۔ اشوک کو ان کے منصوبے کے بارے میں تو پورا علم نہیں تھا لیکن اس نے ڈرائیور کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اپنی آنکھیں اور زبان بند کر کے صرف اتنا کرے جتنا اس سے کہا جائے۔ ڈرائیور کو بالکل بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ انہوں نے تھانے کے اندر جا کر کیا کارروائی کی ہے۔ کچھ اندازے اس نے ضرور لگائے ہوں گے لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

رامو مالا کو دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا انتظام کر چکا تھا اور موجودہ مکان میں وہ ان کی آخری رات تھی۔ ڈرائیور نے کسی کا اصل چہرہ دیکھا تھا اور نہ ہی اسے کسی کا نام معلوم تھا اس لیے وہ کسی کو کچھ بتاتا تو کیا...... یوں بھی وہ ہلکے پیٹ کا ہوتا تو اشوک بچن ان کے کام کے لیے اسے نہ بھیجتا۔ ڈرائیور میں اشوک بچن جیسی حیثیت کے آدمی کے خلاف کہیں کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی سی ان کی بھی مجبوری تھی کہ انہیں گاڑی مع ڈرائیور درکار تھی۔ کیتھی کو تھانے سے نکال کر وہ ٹیکسی یا تانگوں کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ وقت کی بچت ذاتی گاڑی کی صورت میں ہی ممکن تھی۔ سو تھوڑا سا رسک لے لیا تھا۔ رات اپنے بالکل آخری پہر میں تھی اور گلی بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی۔ وہ تینوں خاموشی اور احتیاط سے چلتے ہوئے مالا کے مکان تک پہنچے۔ کیتھرائن کو اب بھی فاروق نے سہارا دیا ہوا تھا۔ مالا ان کی منتظر تھی۔ ہلکی سی دستک پر ہی اس نے دروازہ کھول دیا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ وہ لوگ بیٹھک میں پہنچے تو فاروق کیتھرائن سے بولا۔

''تمہیں ذرا ہمت سے کام لینا ہوگا کیتھی! ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں فوری طور پر بمبئی کو چھوڑنا ہوگا اور اس کے لیے میرے اور تمہارے حلیے کی تبدیلی بہت ضروری ہے۔ تم مالا بھابی کے ساتھ چلی جاؤ، یہ تمہاری مدد کریں گی۔'' پھر وہ مالا سے مخاطب ہوا۔

''بھابی پلیز اسے لے جائیں اور تیار کروانے کے ساتھ کچھ کھلا پلا بھی دیں۔ مجھے لگتا ہے اسے اتنے دنوں سے کچھ ڈھنگ سے کھانے پینے کو نہیں ملا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں فاروق بھائی۔ وہ موٹا سنسیا مجھے مارتا بھی تھا اور مجھے کھانے پینے کو بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ لوگ مجھ سے آپ کا پتا پوچھتے رہتے تھے۔'' بتاتے ہوئے کیتھرائن کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو برس پڑے۔ اس نازک سی لڑکی نے پولیس کی تحویل میں بڑا سخت وقت گزارا تھا اور اب بھی اسی کے زیر اثر تھی۔

"اپنے کو سب پتا ہے بٹیا! اپن اسی لیے تو اس سکھیا کا ایسا حال کیے تھے۔ اب تو دیر نہ کر۔ ٹیم (ٹائم) پر تیرا ادھر سے نکلنا ضروری ہے۔" رامو کا انداز دلاسا دینے والا تھا۔ کیتھرائن آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو رامو فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اپن تیرے کو ایک بات بتائیں؟"

"وہ کیا؟" فاروق نے سر پر موجود پگڑی اتار کر رکھ دی تھی اور اب اپنے چہرے سے ڈاڑھی مونچھیں الگ کر رہا تھا۔ اسے اس حلیے میں پولیس والوں سمیت کئی قیدیوں نے بھی دیکھا تھا اس لیے اسے ختم کرنا ضروری تھا اور اب وہ ایک نیا روپ دھارنے کو تیار تھا۔

"اس...... سکھیا نے ہی اپنے گولو پر گولی چلائی تھی۔ سالا تھانے میں اپنے ساتھیوں کے سامنے بڑکیں مارتا پھرتا تھا کہ کیسا پکا نشانہ لگایا ہے۔ اپنے آدمی نے اور ساری باتوں کے ساتھ یہ بات بھی اپنے تک پہنچادی تھی۔ اپن چاہتا تو ایک گولی مار کر اس کا کام تمام کر دیتا پر اس سے حساب پورا نہیں پڑتا۔ اسے کیتھی پر ہاتھ اٹھانے کی سزا بھی دینی تھی اور دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بھی بنانا تھا۔ اب...... کا بچہ زندہ تو رہے گا پر ساری زندگی اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا نہ ہاتھوں سے کچھ کام لے سکے گا۔" سکھیا کے لیے بڑی بڑی گالیاں نکالتا ہوا رامو فاروق کو بتا رہا تھا اور وہ گم صم سا سن رہا تھا۔ رامو نے کتنی خاموشی سے اس کے حصے کا ایک قرض اتار دیا تھا۔

"بس جا اب تو بھی نکلنے کی تیاری کر۔ زیادہ ٹیم نہیں ہے۔ بھاگ نے ساتھ دیا تو صبح تک کسی کو تھانے میں ہوئی کارروائی کا پتا نہیں لگے گا۔ اپن نکلنے سے پہلے ٹیلیفون کا تار بھی توڑ دیے تھے۔ پر تیرے کو پتا ہے کہ اپن کے دھندے میں آدمی کو ہر بری سے بری گھڑی کے لیے تیار رہنا ہوتا ہے۔" رامو نے بڑی شفقت سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے اس سے کہا تو اس کو گلے میں آنسوؤں کا گولا سا پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ آج دوسری بار اسے رامو پر ربن کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ رامو جو کبھی کبھار ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کر لیا کرتا تھا، بالکل ربن کی طرح سنجیدہ اور متین شخصیت میں ڈھل گیا تھا۔ یقیناً ایسا اس لیے تھا کہ اب ان کے سروں پر ربن کا ہاتھ نہیں رہا تھا اور رامو کو پوری طرح احساس تھا کہ اسے ہی اب ربن کی ذمے داریاں اٹھانی ہیں۔ اس کی حالیہ کارکردگی بھی اس بات کا ثبوت تھی۔ اتنی پھرتی اور ذہانت سے اس سے قبل بھی رامو نے کوئی کام شاید ہی کیا ہو۔ کام تو وہ پہلے بھی کرتا تھا لیکن ربن کی ہدایات کے مطابق۔ پہلی بار آزادانہ طور پر سب کچھ انجام دے کر اس نے اپنی اہلیت ثابت کر دی تھی۔ فاروق اس منصوبے کا حصے دار ہونے کے باوجود اس حد تک حقائق سے واقف نہیں تھا جتنا رامو باخبر تھا اور اس نے اپنی باخبری کا پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

آنسوؤں کو اپنے اندر اتارتا فاروق اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسے جو نیا روپ دھارنا تھا اس کی تیاری مکمل تھی۔ ذرا دیر میں وہ سفید پاجامے پر ہلکے زرد رنگ کا کرتا اور سفید نہرو ٹوپی لگائے ایک نئے روپ میں کھڑا تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی مونچھوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا جبکہ سر کے بال بھی تراش کر بہت چھوٹے کر لیے گئے تھے۔ یہ سب پہلے ہی سے کیا گیا تھا لیکن سکھوں والی بڑی سی پگڑی اور گھنی ڈاڑھی مونچھ کی وجہ سے پتا نہیں چل رہا تھا۔ دائیں گال پر چسپاں موٹے سے سیاہ مسّے اور آنکھوں پر لگی موٹے گول شیشوں والی عینک نے بھی اس کی شخصیت کو خاصا تبدیل کر دیا تھا۔ ماتھے پر اس نے روایتی ہندوؤں کی طرح تلک لگا رکھی تھی اور ہاتھ میں بھی کچھ رنگین دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی اس تیاری کے دوران رامو نے بھی اپنا بہروپ ختم کر لیا تھا اور اپنے اصل روپ میں آ گیا تھا۔ مالا اس دوران چائے اور ہلکا پھلکا ناشتا تیار کر کے لے آئی تھی۔ صبح بس ہوا ہی چاہتی تھی اور رامو چاہتا تھا کہ وہ لوگ کچھ نہ کچھ کھا پی کر ہی روانہ ہوں۔ کیتھی کے بارے میں مالا نے بتایا تھا کہ وہ بہت بھوکی تھی اور اس نے اسے اچھی طرح کھلا پلا دیا تھا۔ فاروق کے ناشتا کرنے کے دوران کیتھی بھی وہاں آ گئی۔ اس نے زرد اور سرخ رنگ کے امتزاج کی بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی۔ تیاری سے قبل اس نے مالا کے مشورے پر نیم گرم پانی سے اچھی طرح غسل کیا تھا اس لیے خاصی تروتازہ لگ رہی تھی۔ مالا نے اس کے بالوں میں بیچ کی مانگ نکال کر چوٹی باندھی تھی اور مانگ میں سیندور بھرا تھا۔ چہرے پر خاصا شوخ میک اپ اور ماتھے پر بندیا تھی۔ ناک، کان اور گلے میں زیور کے علاوہ سیاہ موتیوں والا منگل سوتر بھی ڈلا ہوا تھا اور دیکھنے میں وہ کوئی نوبیاہتا دلہن لگ رہی تھی۔

......

فاروق اسے اپنے ساتھ دہلی لے جا رہا تھا۔ اس کا بمبئی میں رہنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ چھپنے کو وہ کچھ دن مالا کے گھر پر ہی چھپ کر رہ سکتی تھی لیکن یہ کچھ دنوں کی روپوشی کا معاملہ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد پولیس کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتی پھرتی اور اس کے لیے بمبئی

کی زمین تنگ پڑ جاتی اس لیے انہوں نے فوری طور پر اسے بمبئی سے نکال دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں بھی اسے عارضی طور پر رہنا تھا۔ فاروق نے طے کرلیا تھا کہ اسے اب ہندوستان میں رکھنا ہی نہیں ہے۔ وہ اسے پاکستان بھجوا دیتا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے خوف سے آزاد ہوجائے۔ ملک کی تبدیلی یقیناً کیتھی کے لیے ایک بڑا فیصلہ ہوتی لیکن فاروق کو یقین تھا کہ وہ اس کا مان رکھتے ہوئے اس کا فیصلہ قبول کرلے گی۔ یوں بھی ہندوستان میں اس کا کوئی خاندان تو موجود نہیں تھا، بس کچھ دوست احباب ہی تھے اور انسان کیتھی جیسی ہمدرد و پُرخلوص طبیعت کا مالک ہو تو ہر جگہ اپنے لیے دوست بنا سکتا ہے۔ وہ بھی بنا لیتی اور یہاں سے دور خوف و اندیشوں سے آزاد ایک نئی زندگی کا آغاز کردیتی۔ فی الحال اسے یہ سب نہیں بتایا گیا تھا۔ ابھی اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ دورانِ سفر کسی کے پوچھنے پر وہ اپنا نام دھنتی بتائے گی۔ دیگر تفصیلات یوں ہوتیں کہ وہ بمبئی کی رہنے والی ہے جس کا سسرال دہلی میں ہے۔ اس کا کچھ ماہ قبل ہی بیاہ ہوا ہے اور وہ کچھ دن میکے میں گزارنے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ واپس سسرال جارہی ہے۔

یہ سب باتیں اسے تیار کرنے کے دوران مالا نے سمجھائی تھیں۔ مالا رامو کی ہدایات پر عمل کررہی تھی۔ اس نے کیتھرائن کو مشورہ دیا تھا کہ کوشش کرے کہ راستے میں کسی سے زیادہ بات چیت کی نوبت نہ آئے۔ اس کے لیے وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کچھ دیر سو بھی سکتی ہے۔ سفر کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات کسی بہت ہی کھوجی طبیعت کے باتونی ہمسفر سے واسطہ پڑجاتا ہے۔ خواتین میں یہ صلاحیت ذرا ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے اور نوبیاہتا دلہن ویسے بھی زیادہ دلچسپی کا مرکز ہوتی ہے اس لیے کسی ہمسفر خاتون کا کیتھی کے سر ہوجانا قریب از امکان تھا۔ ایسی صورتِ حال میں اسے بہت زیادہ جھوٹ بولنے پڑتے اور وہ گڑبڑا کر غلطی بھی کرسکتی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ کم سے کم بات چیت پر اکتفا کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے سفر آج کل خطرناک نہ ہوتا تو وہ لوگ اسے برقع پہنا دیتے۔ فی الحال تو یہی روپ سب سے اچھا تھا۔ شوخ میک اپ اور لباس و زیورات میں اس کی اصل شخصیت کافی حد تک چھپ گئی تھی۔ روانگی سے قبل مالا نے اس کا روایتی ہندو عورتوں کی طرح ہلکا سا گھونگھٹ بھی نکال دیا۔ وہ ایک دوسرے سے گلے مل کر روانہ ہوئے تو آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''ادھر ستار بھائی سے ضرور ملنا۔ یاروں کا یار ہے۔ جو کام بولو گے، کروا دے گا۔ ابھی اپن کو ادھر کام سنبھالنے کا نہیں ہوتا تو تیرے ساتھ ہی چلتا۔ اپن کو اڈے کی چوکی پر بیٹھنے کا شوق نہیں ہے پر وہ جو سالے ادھر بیٹھ کر راہ دیکھتے ہیں' ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا بھی ضروری ہے۔ دادا باپ کے ماند چاہتا تھا سالوں کو اپن ایسے رُلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا انہیں۔ اڈا دادا کی نشانی ہے اسے مٹنے نہیں دینے کا ہے۔ تو اگر تھوڑا صبر کرلے تو اپن ادھر کا ٹھیک کرکے تیرے پاس پہنچ جائے گا۔ اس حرام...... کو تو اپن بھی معاف کرنے والا نہیں ہے۔'' رامو، فاروق کے گلے سے لگا ایک سانس میں بولتا جارہا تھا۔ اصل میں انہیں علم ہوگیا تھا کہ دہلی کے خراب حالات کے پیش نظر راٹھور کو وہاں بھجوا دیا گیا تھا۔ ربن کے قتل میں بنیادی کردار ادا کرنے والوں میں سے اب راٹھور ہی باقی رہ گیا تھا اور فاروق اسے انجام تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا۔ بمبئی سے نکل کر دہلی جانے کے فیصلے کی بنیادی وجوہ میں سے ایک وجہ راٹھور کی وہاں موجودگی بھی تھی۔ دوسرے وہاں ربن کے پرانے دوست ستار کی موجودگی سے بھی انہیں کافی مدد مل سکتی تھی۔ وہ کیتھرائن کو پاکستان بھجوانے میں بھی مدد کرسکتا تھا۔

''کچھ مت بولو استاد! تم اور میں ایک دوسرے کے اندر باہر کا حال اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا یہاں رہنا کتنا ضروری ہے اور تم جانتے ہو کہ مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ دادا کے قاتلوں کا دھرتی پر ایک ایک سانس مجھ پر بھاری ہے۔ دادا کا قرض چکائے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس قرض کا بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ نہ تو مجھے جولیٹ کی خبر لینے کا ہوش ہے اور نہ ہی یہ جاننے کی فرصت کہ میرے چچا جان جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے بمبئی چلے آئے تھے، ان کی کوئی خبر لے سکوں۔ اس لیے تم مجھے صبر کرنے کا مت کہو، بس یہ دعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔ کامیابی کے بدلے جان بھی چلی گئی تو یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔'' اسے وجے کی زبانی علم ہوچکا تھا کہ اسد اللہ اسے ڈھونڈتے ہوئے بمبئی آئے تھے لیکن ربن کی موت کے صدمے سے نڈھال اس کے پاس اس بات کی فرصت ہی نہیں تھی کہ ان سے رابطہ کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کچھ سوچ پاتا۔ ربن کی محبت ہر خونی اور قلبی رشتے پر بھاری تھی۔ ہاں بس ایک کسک سی تھی جو وہ باقی لوگوں کے لیے محسوس کرتا تھا لیکن اس کسک کے ساتھ تو اسے جینے کی عادت ہوگئی تھی۔ خونی رشتوں سے جدائی کوئی آج کا قصہ نہیں تھی اور جولیٹ تو کبھی اس کے قریب آئی ہی نہیں تھی۔

”مرنے کی بات مت کر شہزادے۔ اپن کا کلیجا کٹنے لگتا ہے۔“ رامو نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

جواب میں فاروق بس ذرا سا مسکرا کر رہ گیا۔

”بس اب انہیں جانے دو رامو! لیٹ ہو گیا تو مشکل ہو جائے گا۔ بھگوان ہے نا رکھشا کے لیے۔“ مالا نے رامو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے وقت گزرنے کا احساس دلایا تو بادلِ ناخواستہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ گلی کے نکڑ پر ڈرائیور گاڑی سمیت ان کا منتظر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے ایک جوڑے کو یہاں سے اسٹیشن پہنچانا ہے اس لیے فاروق اور کیتھرائن گاڑی کے قریب پہنچے تو وہ نئی صورتیں دیکھ کر چونکا نہیں۔ اسے اپنی ڈیوٹی سے مطلب تھا اور مسافر بھی اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے اس لیے صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں اسٹیشن تک کا فاصلہ بہت خاموشی سے طے ہوا۔ اس خاموشی میں کتنے طوفان کروٹیں لے رہے تھے، یہ کون جان سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی کتنی بے درد ہے پھر بھی انسان کے اندر سے زندہ رہنے کی خواہش نہیں نکلتی اور وہ اپنے زندہ رہنے کا خراج دیتا رہتا ہے۔ ہندوستان سے آئے مہاجرین کے اس کیمپ میں بھی انسانوں کا ایک سمندر تھا جو کسی نہ کسی طرح اپنی جانیں بچا کر لے آیا تھا لیکن انسانوں کے اس سمندر میں سے مشکل ہی سے چند لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنوں کی دائمی جدائی کا صدمہ نہیں اٹھایا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ظلم، زیادتی اور بربریت کی خونچکاں داستانیں تھیں۔ کسی کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا تو کسی کی گود خالی ہوگئی تھی، کوئی ایسا تھا کہ پورا خاندان گنوا کر محض اپنی جان ہی بچا کر لاسکا تھا۔ مال و زر لٹنے کا غم اور فکرِ فردا بھی اپنی جگہ تھی لیکن ان ساری تلخ حقیقتوں کے باوجود وہاں زندگی اپنے ضروری لوازمات کے ساتھ جاری و ساری تھی۔ وہی صبح اٹھتے ہی پیٹ کا دوزخ بھرنے کی فکر شروع ہو جاتی تھی۔ لوگ ایک ایک روٹی کے لیے آپس میں لڑتے تھے۔ اپنی گود سونی ہو جانے کے غم سے نڈھال مائیں بھی کسی نہ کسی طرح حلق سے نیچے نوالے اتار ہی لیتی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ غم آدمی کو کھا جاتا ہے لیکن غم میں بھی آدمی کا کھانا پینا نہیں چھوٹتا۔ غم سے نڈھال آدمی ایک، دو، تین، چار...... آخر کتنے وقت کا فاقہ کر سکتا ہے۔ آخرکار آنتوں کو نوچتی بھوک اسے زہر معلوم ہونے والا نوالہ بھی حلق سے نیچے اتار لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سو اس کیمپ میں بھی صبح سے رات تک پیٹ بھرنے کی فکر کی جاتی تھی۔

اس مسئلے کے حل کے بعد بھی کئی مسائل تھے۔ کئی لوگوں کو طبی امداد کی ضرورت تھی، کوئی بلوائیوں کے حصے سے بچ کر زخمی حالت میں آیا تھا، کسی کو راستے کی صعوبتوں نے نڈھال کر دیا تھا۔ پیٹ کی بیماریاں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ دور دراز گاؤں دیہاتوں سے پاپیادہ آنے والوں کو ملنے والی ناقص اور ناکافی غذا نے ہیضہ، اسہال اور پیچش جیسی بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچھ مریض اسپتالوں میں منتقل کیے گئے تھے۔ کچھ کو کیمپ میں رضا کارانہ طور پر کام کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیمیں طبی امداد دیتی تھیں۔ دواؤں اور دیگر سہولیات کا فقدان بھی ان کے حوصلوں کو پست نہیں کرتا تھا لیکن ان کے خلوص اور محنت کے باوجود کیمپ میں اموات کا سلسلہ جاری تھا۔ مرنے والوں کی تجہیز و تکفین و تدفین کے انتظامات بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا اور مسائل کے اس انبار سے نمٹنے کے لیے کچھ باہمت اور پُرخلوص لوگ مسلسل کوشاں رہتے تھے۔ ان باہمت رضا کاروں میں جولیٹ بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ لاہور سے بیگم آصف علی اور ان کے شوہر عنایت علی کا حوالہ لے کر آئی تھی اس لیے اسے آسانی سے رضا کاروں کی ایک ٹیم میں جگہ مل گئی تھی۔ وہاں رضا کاروں کی ضرورت بھی تھی لیکن ستم یہ تھا کہ رضا کاروں کی بھیڑ میں بھی کچھ موقع پرست اور سنگ دل لوگ شامل ہوگئے تھے۔ راشن، دواؤں اور دیگر ضروری سامان کی چوری اور ہیر پھیر کا سلسلہ جاری تھا۔ جوان لڑکیوں کے غائب ہونے کے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے اور کچھ بہت گھٹیا اور غلیظ لوگ بنیادی ضروریات کی فراہمی کے بدلے مجبور عورتوں کی عصمتوں کا سودا بھی کر رہے تھے، اسی لیے انتظامیہ کے مخلص لوگ رضا کاروں کے انتخاب میں بھی احتیاط سے کام لے رہے تھے لیکن ان ہی کے درمیان ایسے لوگ بھی تھے جو ایسے کرپٹ عناصر کی پشت پناہی میں مصروف تھے۔

ان سب چیزوں کو دیکھتی جولیٹ دکھی دل کے ساتھ ان مہاجرین کی خدمت میں مصروف تھی جو فی الحال صرف اور صرف ہمدردی کے مستحق تھے۔ اس کیمپ میں اس کے لیے سب سے خوش کن منظر وہ ہوتا تھا جب کوئی بچھڑے ہوؤں کی تلاش میں آنے والا وہاں کسی اپنے کو پا لیتا تھا۔ تاریخ کی اس اتنی بڑی ہجرت میں کئی لوگ اپنے خاندان سے بچھڑ گئے تھے اور دن بھر... کیمپ میں ایسے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا جو اپنے بچھڑے ہوؤں

کی تلاش میں وہاں آتے تھے۔ کامیابی سے ہمکنار ہونے والوں کی جذباتی کیفیت اور خوشی کے آنسو جولیٹ کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو بھر دیتے تھے۔ یہاں کام کرتے ہوئے وہ اپنی ذات اور دکھوں کو خاصی حد تک فراموش کر چکی تھی۔ مہاجرین کے اس... کیمپ میں کام کرنے کے لیے اس نے اسد اللہ سے خصوصی اجازت لی تھی۔ انہوں نے اس کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اسے کھلے دل سے اجازت دے دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بے شک وہ ان کا خون ہے لیکن اس نے حویلی سے دور ان کی روایتوں کے خلاف تربیت پائی ہے۔ وہ حویلی کی ان پردہ دار عورتوں میں شامل نہیں رہی تھی جن کے پیر کا ناخن بھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھا تھا اور انہوں نے اس کی بے پردگی کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ وہ اس بات پر ہی قانع بلکہ شکر گزار تھے کہ ان کی بیٹی ہمدرد و نیک طبیعت کی مالک ہے اور اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ انہوں نے اور ثروت بیگ نے فی الحال ایک ہوٹل میں عارضی قیام کر رکھا تھا۔ امید تھی کہ جلد کلیم کی منظوری سے انہیں رہائش گاہیں الاٹ کر دی جائیں گی۔ اس کے بعد دونوں حضرات اپنے اپنے خاندان کے افراد کو لاہور سے مستقلاً کراچی منتقل کر لیتے۔ جولیٹ سے انہوں نے وعدہ لیا تھا کہ وہ رہائش گاہ ملنے کے بعد ان کے ساتھ ہی قیام کرے گی اور اب اچانک انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ وہ اتنے دکھی تھے کہ جولیٹ کے لیے انکار ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ کچھ کچھ دل کو یہ اطمینان بھی تھا کہ فاروق لندن جا چکا ہے اور اس کا یہاں آنا بہت مشکل ہے اس لیے اس کی بربادی کی داستان اسد اللہ کو سنانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن وہ اس سب کے بیچ ولدار آغا سے انتقام لینے کے ارادے کو نہیں بھولی تھی۔ بس ایک طرح سے اس نے آغا کو مہلت دے دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آغا کو مارتی تو خود اسے بھی سزا بھگتنی پڑتی چنانچہ مرنے سے پہلے کچھ اچھا کرنے کی خواہش اسے مہاجر کیمپ لے آئی تھی۔ اسے امید تھی کہ کچھ عرصے بعد یہ خانماں برباد کہیں نہ کہیں اپنا ٹھکانا بنا کر نئی زندگی کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیمپ سے رخصت ہو کر لوگوں کے شہر میں بسنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس سلسلے کا اختتام ہو جاتا تو پھر وہ اپنی انتقام کی خواہش بھی پوری کر لیتی۔ اسے لگتا تھا کہ اللہ نے جواب تک آغا کی رسی دراز کر رکھی تھی تو اس کا سبب یہی تھا کہ اللہ کو اس سے دکھی انسانیت کی خدمت کا کام لینا تھا۔ ہاں، اب وہ اللہ کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسلام کے مطالعے اور بیگم آصف علی جیسی نیک خاتون کی صحبت نے اسے اسلام اور مسلمانوں سے کافی قریب کر دیا تھا۔ وہ ماننے لگی تھی کہ جو مسلمان اسلام کی تعلیمات سے قریب ہیں، وہ اچھے انسان بھی ہیں۔ پیدائشی مسلمان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فرق اس تعلیم و تربیت کا تھا جو اسلام کی روشنی میں ہوئی تھی۔ جن کی تربیت عمدہ تھی وہ عمدہ مسلمان اور انسان تھے اور جن میں تربیت کا فقدان تھا، وہ بس نام کے مسلمان تھے اور انہیں اسلام کے حقیقی تشخص کا آئینہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

زندگی کے تجربات اس کی سوچ کو پختگی بخش رہے تھے اور وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ سنجیدگی سے زندگی کو برتنے لگی تھی۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ زندگی یوں برباد کر دینے والی شے نہیں ہے۔ آدمی جب تک زندہ ہے، اسے زندگی کو عمدگی سے برتنا چاہیے ورنہ اس کے حصے میں محض شرمندگی اور پچھتاوے ہی آتے ہیں۔ پچھتاووں سے بچنے کے لیے اس نے انسانیت کی خدمت کی راہ چنی تھی کہ بنانے والے نے بھی دردِ دل کے واسطے ہی انسان کو پیدا کیا ہے۔ کیمپ میں اس کا وقت بہت مصروف گزرتا تھا۔ دفتری امور انجام دینے کے علاوہ بھی وہ بہت سے معاملات دیکھتی تھی اور لوگوں کے مسائل سے باخبر رہنے کے لیے خیموں کے درمیان گھوم پھر کر بھی جائزہ لیتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ یہی کام کر رہی تھی کہ اس نے قادر شاہ نامی آدمی کو ایک خیمے کے اندر گھستے ہوئے دیکھا۔ جولیٹ کے علم میں تھا کہ اس خیمے میں ایک تنہا لڑکی رہ رہی ہے۔ سنجیدہ اور خاموش مزاج رکھنے والی وہ لڑکی بہت ہی قناعت پسند تھی اور کھانے پینے سے لے کر اپنی کسی بھی دوسری ضرورت کے لیے دستِ سوال دراز نہیں کیا کرتی تھی۔ البتہ اس نے یہ پیشکش کر رکھی تھی کہ اس کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو اسے ضرور بتایا جائے۔ آج کل بھی وہ رضاکارانہ طور پر بچوں کے لیے سویٹر بننے کا کام کر رہی تھی۔ سردیاں بس آیا ہی چاہتی تھیں اور اس لڑکی نے خود یہ تجویز دی تھی کہ موسم کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے سب سے پہلے چھوٹے بچوں کے لیے سویٹر تیار کیے جائیں کیونکہ بچے موسم کے اثرات سے جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی تجویز کو سراہتے ہوئے جولیٹ نے خود اپنے ذاتی خرچے پر اون اور مختلف ناپ کی سلائیاں وغیرہ منگوائی تھیں اور اس لڑکی کے علاوہ بھی چند دوسری خواتین کو اس کام میں شامل کر لیا تھا لیکن اس لڑکی کے کام کی رفتار

دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور چند دنوں میں ہی وہ کئی چھوٹے چھوٹے خوبصورت سوئٹر تیار کر کے جولیٹ کے حوالے کر چکی تھی۔ قادر شاہ کو اس لڑکی کے خیمے میں جاتے دیکھ کر جولیٹ کا ماتھا ٹھنکا۔ قادر شاہ اچھی شہرت کا مالک نہیں تھا۔ وہ ان افراد میں شامل تھا جو... کیمپ میں راشن، بستر اور دیگر اشیائے ضرورت کی تقسیم پر مامور تھے اور سننے میں آیا تھا کہ اس سلسلے میں وہ خاصی بدعنوانی سے کام لے رہا ہے اور صرف ان لوگوں کو ہی نوازتا ہے جو اس کی زبانی خوشامد کرنے کے علاوہ اسے خوش رکھنے کے لیے عملی کارروائیاں بھی کرتے ہیں۔ ان عملی کارروائیوں کی تفصیل ایسی تھی کہ جولیٹ اسے مذکورہ لڑکی کے خیمے میں جاتے ہوئے دیکھ کر نا صرف ٹھٹکی بلکہ فوراً ہی سن گن لینے خیمے تک بھی جا پہنچی اور کان لگا کر اندر ہونے والی گفتگو سننے لگی۔ اندر قادر شاہ بول رہا تھا۔

”کیوں اپنی جوانی کو مشقت میں برباد کرتی ہے۔ تیری ان نازک اور خوبصورت انگلیوں میں اون سلائیوں کے بجائے ستار کے تار ہی تھرکتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ چل، میں تجھے تیری صحیح جگہ پہنچادوں گا۔ اس چھوٹے سے خیمے میں کیا دھرا ہے۔ ڈھنگ سے سونے اور کھانے پینے تک کو تو ہے نہیں۔ ادھر فردوس بائی کا ایسا عمدہ بالا خانہ ہے، بڑے بڑے رئیس اور سیٹھ آتے ہیں اس کے بالا خانے پر۔ روپیا بارش کی طرح برستا ہے، وہاں تو بھی روپے کی اس برسات میں بھیگ کر عیش کرنا۔“ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے سن کر جولیٹ کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ قادر شاہ کے بارے میں ایک بات یہ بھی سننے میں آئی تھی کہ وہ کیمپ سے لڑکیاں سپلائی کر رہا ہے لیکن کوئی پکا ثبوت نہیں ملا تھا۔ دوسرے اسے کچھ بااثر شخصیات کی سرپرستی بھی حاصل تھی اس لیے اس کا۔ کیمپ میں داخلہ بند نہیں ہوا تھا اور وہ مزے سے یہاں دندناتا پھرتا تھا۔

”روپیہ پیسا، عیش و آرام ہم نے بہت دیکھا ہے اور ہمارے دل میں اب ان چیزوں کی کوئی چاہ نہیں ہے۔ آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ہم جہاں ہیں وہاں بہت خوش ہیں۔“ قادر شاہ کو اپنی پیشکش کے جواب میں صاف انکار سننے کو ملا۔

”ایسا تو نہ کہو جانی! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ یوں دنیا سے منہ موڑ کر بیٹھ جاؤ۔ کچھ اپنے استادوں کی محنت کا ہی خیال کرو۔ یہاں سوئٹر بُن بُن کر تم ان کی ساری محنت کو مٹی میں رول رہی ہو۔“ قادر شاہ کے الفاظ سے جولیٹ کو اندازہ ہوا کہ وہ اس لڑکی کو پہلے سے ہی جانتا تھا اس لیے غصہ آنے کے باوجود اس نے دخل اندازی میں عجلت سے کام نہیں لیا اور تحمل سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔

”ہم نے آپ سے کہا ہے نا کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے، ہم یہاں خوش اور مطمئن ہیں۔“ اس بار بولنے والی کے لہجے میں شدید جھنجلاہٹ تھی۔

”بڑے تیور دکھا رہی ہے۔ تیرے پاس اب بچا ہی کیا ہے جس کے بل پر نخرا کرتی ہے۔ میں تو تیری ماں سے پرانی جان پہچان کی وجہ سے تجھ سے اتنی ہمدردی کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تو سکون سے چار پیسے کما لے ورنہ چاہوں تو ادھر سب کو تیری حقیقت بتادوں پھر دیکھنا کہ کیسے رلتی ہے۔ ادھر لفنگوں کی کمی نہیں ہے۔ روز دو چار مفت کی کھانے آ جائیں گے۔“ قادر شاہ نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا تو جولیٹ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ خیمے کا پردہ اٹھا کر غصے میں بھری اندر داخل ہوئی۔ اس کی آہٹ سن کر قادر شاہ چونکا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس نے اس کی باتیں سن لی ہیں پھر بھی انجان بن کر بناوٹی لہجے میں بولا۔

”ارے میڈم! آپ یہاں اچانک کیسے چلی آئیں؟“

”اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا چاہیے کہ تم ایک تنہا لڑکی کے خیمے میں کیا کر رہے ہو؟“ جولیٹ نے کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”یہ لڑکی میری پرانی شناسا ہے۔ میں ذرا اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو بتائے۔“ قادر شاہ نے بے نیازی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”مجھے بے وقوف مت بناؤ قادر شاہ! میں نے خود تمہاری باتیں سنی ہیں۔ تم اس بے چاری کو گھٹیا ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ ہراساں بھی کر رہے تھے۔ میں نے اوپر کمپلین کر دی تو تمہاری اس کیمپ سے چھٹی ہو جائے گی۔“ اس بار جولیٹ نے بغیر کسی لگی لپٹی کے قادر شاہ کو جھاڑا۔

”ارے جانے دیں میڈم! قادر شاہ کی چھٹی کرنا آسان نہیں ہے۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کی اس لاڈلی کا یہاں سے بوریا بستر گول کروادوں۔ اس گندگی کی پوٹ کو کوئی بھی یہاں رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ بمبئی کی مشہور طوائف زمرد بائی کے کوٹھے کی طوائف چاند بانو ہے۔ اس کا کیا کام کہ یہیں اپنے خیمے میں بیٹھے بیٹھے دھندا کر رہی ہو۔ ایسی گند کو... کیمپ میں رکھنے کے

بجائے اس کے اصل ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے تو کیا برائی ہے۔'' قادر شاہ اپنے مکروہ لب و لہجے میں بولتا جارہا تھا اور سیاہ چادر میں لپٹی چاند بانو کے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ وہ شدید بے بسی کی کیفیت میں بے آواز آنسو بہارہی تھی۔

جولیٹ نے اس کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کی اور نہایت رکھائی سے قادر شاہ سے بولی۔

''اس مسئلے پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تم یہاں سے جاؤ اور مجھے اس لڑکی سے بات کرنے دو۔''

''خیال سے میڈم! کہیں اکیلے اکیلے ہی لونڈیا کے دام کھرے نہ کرلینا۔'' قادر شاہ خیمے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔

''شٹ اَپ۔'' جولیٹ غصے سے چلائی لیکن وہ مکروہ ہنسی ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ جولیٹ نے اس کی پشت پر ایک قہر بھری نظر ڈالی اور پھر روتی ہوئی چاند بانو کی طرف متوجہ ہوکر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دینے لگی۔

''اس میں بھلا ہمارا کیا قصور ہے کہ ہم نے ایک بالا خانے پر آنکھ کھولی اور وہاں پرورش پائی۔ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے سینے میں بھی ایک دل ہے اور ہم بھی عزت کی زندگی کی چاہ رکھتے ہیں۔ اسی چاہت میں ہم نے ہجرت کا عذاب سہا ہے۔ سوچا تھا اس پاک سرزمین پر ہم نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے اور روکھی پھیکی کھا کر عزت کی زندگی جئیں گے لیکن ہماری بدنصیبی نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہم سوچتے تھے کہ اب کون ہوگا جو اس داغدار حسن کا طلب گار بن کر آئے گا لیکن دنیا کو کسی طرح چین نہیں ہے۔ اب بھی لوگ کٹھ پتلی کی طرح ہمیں اپنے اشاروں پر نچانا چاہتے ہیں۔'' جولیٹ کی ہمدردی پاکر وہ بُری طرح پھٹ پڑی اور مزید بلک بلک کر رونے لگی۔

جولیٹ نے اپنے دل میں اس کے لیے شدید ہمدردی محسوس کی اور یہ جان لینے کے باوجود کہ وہ ایک طوائف زادی ہے، اس سے بدگمان نہیں ہوئی۔ اسے یقین آگیا تھا کہ چاند بانو نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے اور وہ سچ مچ عزت کی زندگی کی خواہاں ہے۔ چاند بانو کے وہاں گزرتے شب و روز اس کے قول کی تصدیق کرتے تھے۔ وہ دھندا کرنے کا ارادہ رکھتی تو ہمہ وقت خود کو چادر میں لپیٹے، اپنے خیمے تک محدود رہ کر اون سلائیوں میں نہ الجھی رہتی۔ مرد کو لبھانے اور لوٹنے کا ارادہ رکھنے والیوں کی ادائیں ہی مختلف ہوتی ہیں اور وہ تو کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ داغدار چہرے کے باوجود وہ بھرپور نسوانی حسن کی مالک تھی اور اپنی جسمانی خوبصورتی کے بل پر اب بھی بہت سے گاہک بنا سکتی تھی لیکن اس کو ایسی کوئی کوشش کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہ تو قادر شاہ جیسا بدطینت شخص تھا جس نے اسے شناخت کرلیا تھا اور اپنے ناپاک عزائم کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے آپہنچا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ اگر تم عزت سے رہنا چاہتی ہو تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم خود کو مضبوط اور بہادر بنالو۔ میں بھی تمہارا پورا خیال رکھوں گی۔'' جولیٹ نے پورے خلوص سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تو چاند بانو کا دکھا ہوا دل ہمدردی پاکر اور بھی رقیق ہوگیا اور وہ مزید شدت کے ساتھ رونے لگی۔ جولیٹ نے بڑی ہمدردی اور محبت سے اسے سنبھالا اور جب وہ کافی حد تک پُرسکون ہوکر اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی تو اس سے بولی۔

''اگر تم چاہو تو مجھے اپنی زندگی کی داستان سنا سکتی ہو۔ اس داستان کی روشنی میں مجھے تمہارا مقدمہ لڑنے میں آسانی رہے گی اور میں یہاں کی انتظامیہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہوسکوں گی کہ اگر تم عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو قادر شاہ جیسے کسی شخص کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ تمہاری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔'' اس کی بات سن کر چاند بانو ذرا دیر کے لیے خاموش رہی پھر ایک آہ بھر کر گویا ہوئی۔

''ہماری داستان بھی ہماری دنیا کی بہت سی لڑکیوں جیسی ہی ہے۔ ہم اپنی ماں سے ایک نواب زادے کی جنونی محبت کے نتیجے میں وجود میں آئے لیکن ہمارے باپ کے عزت دار خاندان نے ہمیں اپنے باپ کے نام سے محروم کردیا۔ ماں نے کنواری دوشیزہ کہلانے کی خاطر کبھی ہمیں اپنی بیٹی تسلیم نہیں کیا اور چھوٹی بہن ظاہر کرکے اپنے مستقبل کے لیے ہماری مخصوص تربیت کرتی رہی۔ وہ ہمیں فلمی دنیا کا ستارہ بنانا چاہتی تھی اور اس کی یہ خواہش پوری ہونے کی راہ بھی نکل آئی تھی لیکن اس سے قبل ہی ہم مرضِ عشق میں مبتلا ہوگئے۔ وہ ایسے تھے کہ ہم نے انہیں دیکھا تو بس اپنا سب کچھ ان کے سامنے ہار بیٹھے لیکن ہماری قسمت کی ستم ظریفی کہ ان کا دل ہی ان کے پاس نہیں تھا جو ہم اس تک رسائی حاصل کرپاتے۔ ہم بس ان سے عشق کرتے رہے اور اس عشق نے رقیبوں کو جنم دینا شروع کردیا۔ ایک جنونی امیرزادی نے رقابت کی انتہا پر پہنچ کر ہمیں جان سے مروانے کی کوشش کی۔ گاڑی کے حادثے میں ہماری جان تو بچ گئی لیکن ہم اپنی خوبصورتی اور ماں کو کھو بیٹھے۔ کوٹھے پر ساتھ رہنے والی بہنوں جیسی سہیلی نے ان کڑے دنوں میں

ہمارا ساتھ دیا۔ ہمارے محبوب نے بھی اپنی استطاعت کی حد تک ہماری دلجوئی کی اور یوں ہم نے کسی نہ کسی طور زندگی گزارنی شروع کردی۔ کچھ رگوں میں دوڑتے عزت دار باپ کے خون کا اثر تھا اور کچھ ہمارے عشق کا کمال کہ ہم عزت دار زندگی کی چاہ میں مبتلا ہوگئے اور خوش نصیبی سے ہماری خواہش پوری بھی ہوتی رہی۔ ہم ایک بے رنگ لیکن محفوظ زندگی گزارتے رہے۔ ہمیں ایک خطرناک معاملے میں اپنے محبوب کا ساتھ دینا پڑا تو احساس ہوا کہ ہماری بمبئی میں موجودگی خود ہمارے محبوب کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ہمارے عشق کو انہیں مشکل میں ڈالنا گوارا نہیں تھا اس لیے ہم نے جدائی کا کرب سہنے کا فیصلہ کرلیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان فضاؤں کو چھوڑ کر جہاں وہ بستے تھے، ایک قافلے کے ساتھ یہاں چلے آئے۔ اب ہمارے دل میں دنیا کی کسی نعمت کی چاہ نہیں ہے۔ ہم بس ان کی سلامتی کی دعائیں کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ہمیں روکھی سوکھی کھا کر عزت سے زندگی کے دن پورے کرنے دے۔‘‘ اس نے اپنی داستانِ حیات مختصر الفاظ میں سنائی تو جولیٹ دنگ رہ گئی۔ چاند بانو کے چہرے سے اس کی کم عمری ظاہر تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ زندگی کے کئی تجربات سے گزر چکی تھی اور عشق جیسا روگ پال کر طلب دنیا سے بھی بے نیاز ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے محض دو مقاصد متعین کیے تھے۔ ایک اپنے محبوب کے لیے دعا مانگنا، دوسرے عزت کی زندگی گزارنا اور یہ دنیا اتنی ظالم تھی کہ اسے اپنی یہ معمولی خواہشیں پوری کرنا بھی مشکل ہورہا تھا۔ چاند بانو کی ہمدردی میں ڈوبے اسے چاند بانو کے اس اَن دیکھے محبوب پر بھی غصہ آیا جو اتنی پیاری لڑکی کی محبت کی قدر نہیں کرسکا۔ اگر وہ اسے اپنا لیتا تو بھلا وہ کیوں دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے یوں رلتی پھرتی۔ اپنے اس غصے کا اس نے چاند بانو کے سامنے اظہار بھی کردیا۔

’’ایسا مت کہیے میڈم جی! ہم پر کڑا وقت پڑا تھا تو انہوں نے ہمیں سہارا دینے کی پیشکش کی تھی لیکن ہم نے خود ہی ان کی یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ محض ہمدردی میں اپنے دل پر جبر کریں۔ ہم نے عشق کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اپنے مقصود و مطلوب کے سوا کسی کو زندگی کا ساتھی بنانا بہت کڑی آزمائش ہے۔ ہم اپنے محبوب کو اس آزمائش میں کیسے مبتلا کرتے اس لیے دل چاہتے ہوئے بھی ان کا سہارا قبول نہیں کیا۔ اصل میں ہمارا عشق ان سے کسی شے کا طلبگار ہے ہی نہیں۔ ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ وہ جہاں رہیں، خوش رہیں اور اللہ ان کے گھر اور دل دونوں کو آباد رکھے۔‘‘ بولتے ہوئے چاند بانو کے چہرے پر ایک عجیب سا نور تھا۔ جولیٹ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ ایسا عشق، ایسی بے غرضی اس نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ یہ اتنی چھوٹی سی لڑکی محبت کی کس معراج پر تھی کہ اس کا پورا وجود نور میں ڈوبا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی بول پڑی۔

’’بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے تم اتنے خلوص، شدت اور بے غرضی سے چاہتی ہو۔‘‘

’’خوش قسمت تو ہم ہیں کہ انہوں نے ہمارے اس جذبے کی کبھی توہین نہیں کی اور ہمیشہ ہمارے جذبے کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک طوائف زادی کے لیے اتنا بھی بہت ہے۔ ہاں کبھی کبھی ہمیں اس لڑکی کی بدنصیبی پر افسوس ہوتا ہے جسے ان جیسا شخص ٹوٹ کر چاہتا ہے اور وہ ان کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔‘‘ وہاں قناعت و شکر گزاری کا عجب عالم تھا اور فکر تھی تو بس اتنی کہ اس کا محبوب خوش رہے۔

’’تم جتنی شدت سے دعائیں کرتی ہو، مجھے یقین ہے کہ ان دعاؤں کی بدولت وہ لڑکی بھی ایک نہ ایک دن مائل ہو ہی جائے گی لیکن میری مانو تو تھوڑی دعا اپنے لیے بھی کرلیا کرو۔ دینے والا تمہیں بھی تو تمہارے دل کی خوشی عطا کرسکتا ہے۔‘‘ جولیٹ نے اسے اکسایا۔

’’دینے والا تو بن مانگے بھی دے سکتا ہے، ہم کیوں اپنے عشق میں طلب کی کھوٹ شامل کریں؟‘‘

چاند بانو کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی۔ جولیٹ اس بار کچھ نہیں بول سکی اور اسے حوصلہ دیتی ہوئی تھپکی دے کر اس کے خیمے سے باہر نکل گئی۔ چاند بانو کے اتنے سچے عشق نے اس کے دل پر عجیب ہی اثر کیا تھا اور ایسے میں نہ جانے کیوں اسے وہ یاد آیا جو اپنے لبوں سے کچھ نہ کہتا تھا لیکن جس کی نگاہیں بولتی تھیں کہ ہم تمہیں چاہتے ہیں۔ اس نے ان بولتی نگاہوں کو ہمیشہ نظرانداز کیا تھا کہ اس کے نزدیک وہ ایک غنڈا تھا۔ کاش اس وقت اسے معلوم ہوتا کہ وہ تو بہت اونچی شان والا محب اللہ تھا لیکن اس کے پاس ایسی گوہر شناس نگاہ تھی ہی کہاں کہ وہ ظاہر کے بجائے باطن کو تلاش کرپاتی۔ اس نے تو عارف جیسے کنکر کو ہیرا سمجھ کر اپنانا چاہا تھا اور وہ پہلی ہی آزمائش میں محبت کے دعوے سے دست بردار ہوگیا تھا۔ آزمائش تو محب اللہ عرف فاروق کی بھی نہیں کی تھی اس نے اور نہ ہی اس مرحلے سے گزرنا چاہتی تھی۔ اس کے دل نے خواہش کی کہ کاش اسے بھی چاند بانو جیسی قناعت، توکل اور بے نیازی نصیب ہوجائے اور وہ بھی

سب کچھ ترک کر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر زندگی تمام کر سکے۔

☆☆☆

''بڑی آگ لگی ہوئی ہے یہاں۔ سالے انسانیت بھول کر درندے بن گئے ہیں۔ روزانہ خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ گلی، کوچے، سڑکیں سب خون سے رنگ گئے ہیں۔ سرکار آ کر شانتی، شانتی کا بھاشن دیتی ہے لیکن سالے سرکاری آدمی خود ایک نمبر کے...... ہیں۔ یہ خود چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کاٹ کر ڈال دیا جائے۔ ان کی بدنیتی کا اندازہ اسی بات سے لگاؤ کہ پولیس فورس میں موجود مسلمانوں کی ڈیوٹیاں یہاں نہیں لگائی جا رہیں۔ گنتی کے دو چار ہی مسلمان افسر کام کر رہے ہیں اور وہ بھی بہت خوف زدہ ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مسلمان پولیس افسر کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ سنا ہے بے چارہ ملک اور قوم کی ہمدردی میں کہیں اور سے اپنا ٹرانسفر کروا کر یہاں خدمت کے لیے آیا تھا اور بڑی محنت اور ایمان داری سے اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ ڈیوٹی کرتے ہوئے ہی بے چارے کو شہید کر دیا۔ بے چارہ مسلمانوں کو لے جانے والی ایک ٹرین کو بلوائیوں کے حملے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی نے اسے ہی گولی مار دی اور گولی مار کر بھی...... کو سکون نہیں ملا۔ بے چارے کی لاش کا بھی حلیہ بگاڑ دیا۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دیں۔ دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے اور بھی جانے کیا کیا، کیا۔ بڑی مشکل سے پولیس فورس اس کی لاش حاصل کر پائی اور راتوں رات چھپتے چھپاتے پولیس کی نگرانی میں دو چار لوگوں نے اسے قبرستان میں دفن کیا۔ بس اس ایک واقعے سے ہی اندازہ لگا لو کہ یہاں کیا حال ہے اور بے چارے مسلمان کس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ ہندوؤں کا بھیس بدل کر یہاں آئے۔ اب تو یہی لگتا ہے کہ یہ دیش بس ہندوؤں اور سکھوں کا ہی ہے اور جنونی بلوائی سارے مسلمانوں کو کاٹ کر ڈال دینا چاہتے ہیں۔'' وہ کیتھرائن کو ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر خود ستار بھائی سے ملنے آیا تھا اور وہ بڑے رنج و غصے کی کیفیت میں اسے یہاں کا احوال سنا رہے تھے۔

''سارے ملک کا یہی حال ہے بھائی! کہیں کم تو کہیں زیادہ فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ بمبئی میں بھی اب پہلے سی رونقیں باقی نہیں رہی ہیں لیکن یہاں سے پھر بھی کچھ بہتر ہی حال ہے۔ مجھے اپنی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے بمبئی چھوڑنا پڑا۔ بمبئی کی پولیس میری بو سونگھتی پھر رہی ہے اور میں جس لڑکی کے ساتھ دہلی آیا ہوں، وہ بھی سخت خطرے میں ہے۔ میں اسے یہاں سے پاکستان بھجوا دینا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ کے تعلقات سے کام بن جائے گا۔'' فاروق نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''تم نے کہا ہے تو کام ضرور ہوگا۔ ربن کے اڈے سے آئے کسی بندے کی بات ٹالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم یہ بتاؤ کہ صرف لڑکی کو نکالنا ہے یا تم بھی ساتھ جاؤ گے؟'' ستار بھائی دادا ہونے کے باوجود صاف ستھری زبان میں بات کرتا تھا تو یقیناً یہ دہلی کے ماحول کا اثر تھا۔

''صرف لڑکی کو بھجوانا ہے۔ میرے ذمے تو ابھی کچھ حساب کتاب باقی ہے، اسے چکتا کر کے ہی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ رامو استاد کے مشورے پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ ربن دادا سے پرانی دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے میری مدد ضرور کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک کہا رامو نے۔ دادا یاروں کا یار ہے۔ ہمیں کبھی بمبئی میں کوئی کام پڑا تو ربن نے ہمارا پورا ساتھ دیا۔ اب ہم اس کے آدمی کا ساتھ کیسے نہیں دیں گے۔ تم بس یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟'' ستار بھائی نے پُرجوش انداز میں اسے جواب دیا۔

''بمبئی سے ایک پولیس افسر راٹھور ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہے۔ اسے یہاں سے اگلے جہان میں ٹرانسفر کرنا ہے۔'' فاروق کے لہجے میں خود بخود ہی سفاکی در آئی۔ راٹھور جیسے مکار اور سفاک آدمی کے لیے اس کے دل میں نفرت ہی اتنی تھی کہ اس کے لب و لہجے میں تبدیلی ایک فطری سی بات تھی۔

''ایس پی راٹھور کی بات کر رہے ہو نا تم؟ پچھلے کچھ دنوں سے اس کا نام بہت سننے میں آ رہا ہے کہ وہ سرکار کی سونپی ہوئی ڈیوٹی بھول کر الٹا بلوائیوں کو شہ دینے میں مصروف ہے۔ کسی جگہ بلوائی کارروائی کرتے ہیں تو اس کی ہدایت پر پولیس اتنی دیر سے مدد کے لیے پہنچتی ہے کہ وہاں کسی کو مدد کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور بلوائی اپنا کام پورا کر کے بھاگ چکے ہوتے ہیں۔ سنا ہے اسے اوپر والوں کی آشیرباد حاصل ہے اور وہ ان ہی کے اشاروں پر کام کر رہا ہے۔'' ستار بھائی کو راٹھور کے بارے میں خاصی معلومات حاصل تھیں۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سرکار نے وردی دے کر پولیس فورس میں ایک قاتل اور خونی کو بھرتی کر رکھا

ہے اور اسے اس کی ایسی خدمات کے صلے میں نوازا بھی جارہا ہے۔ بمبئی میں وہ ڈی ایس پی تھا، اب ایس پی ہوگیا ہے۔ یہاں جو کچھ کررہا ہے، اس کے بدلے شاید ڈی آئی جی یا آئی جی بنادیا جائے گا لیکن اب میں اسے مزید مہلت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ کو اس سانپ کا سر کچلنے میں میرا ساتھ دینا ہوگا ستار بھائی۔"

فاروق کے لہجے میں آنچ سی تھی۔

"بالکل ساتھ دیں گے لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کیوں اس کے اتنے خلاف ہوگئے ہو؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" ستار بھائی نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

"اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس نے مجھ سمیت اڈے کے ہر آدمی کو یتیم کر ڈالا ہے۔" فاروق نے بڑے کرب سے جواب دیا تو ستار بھائی بھونچکا رہ گیا۔ فاروق کی یہاں آمد کے ساتھ ہی اس نے رسمی خیر خیریت دریافت کرتے ہوئے ربن کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا اور اسے خیال آرہا تھا کہ اس وقت فاروق نے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔ خود اس نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کا ذہن اس الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ اتنے خراب حالات میں فاروق بمبئی سے یہاں کیوں آیا ہے۔ گفتگو کرنے پر اس کی یہاں آمد کی وجوہات سامنے آگئی تھیں لیکن پھر بھی اسے لگ رہا تھا کہ فاروق کی بات کا جو مطلب اسے سمجھ آیا ہے، وہ کچھ غلط ہے اور اس سے سمجھنے میں غلطی ہورہی ہے۔

"کیا مطلب؟ کس کی بات کررہے ہو تم؟" اس کی آواز حیرت کی زیادتی سے پھٹ گئی۔

"دادا کی، ربن دادا کی...... اس خونی بھیڑیے راٹھور نے قاتلوں کے ٹولے کے ساتھ مل کر دھوکے سے دادا کو گھیر کر مار ڈالا۔" اپنی بات کی وضاحت کرتے فاروق کا لہجہ دکھ کی زیادتی سے چٹخنے لگا پھر وہ دھیرے دھیرے ستار بھائی کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ یہ سن کر ستار بھائی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر خود پر قابو پا کر بولا۔

"ربن کی موت صرف تم لوگوں کا نقصان نہیں ہے۔ میں نے بھی اس کے جانے سے ایک بہترین دوست کو کھویا ہے اور میں بھی اس کے قاتل کا دردناک انجام چاہتا ہوں۔ بولو...... کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلے تو مجھے اپنے ساتھ آئی لڑکی کو یہاں سے نکالنا ہے۔ وہ میری منہ بولی بہن ہے اور اس نے اس رشتے کو نبھانے کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں کہ اس کی اپنی ذات خطروں میں گھر گئی ہے۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے میں اسے یہاں سے روانہ کردینا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اپنا مدعا دہرایا۔

"سمجھو یہ کام ہوگیا۔ اس کے آگے کیا کرنا ہے، وہ بولو؟" ستار بھائی کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ فاروق اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے اسے آگاہ کرنے لگا اور ستار بھائی بغور اس کی باتیں سنتا ہوا سر کو ہلکی جنبش دیتا رہا۔

☆☆☆

"کیسی ہو چاند بانو؟" جولیٹ کی نرم آواز سن کر اون سلائیوں میں الجھی چاند بانو کی موٹی انگلیوں کی حرکت رک گئی اور اس نے سر اٹھا کر جولیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فقط ایک مسکراہٹ سے اس کے سوال کا جواب دیا اور خود پوچھنے لگی۔

"دو تین دن سے آپ نظر نہیں آرہی تھیں۔ نصیب دشمناں مزاج تو اچھے ہیں؟"

"میں اپنے والد کی خواہش پر ان کے ساتھ لاہور گئی ہوئی تھی۔ وہاں میرے والد کی بیمار پھپھی ان کے ایک دوست کے ہاں مقیم تھیں۔ والد صاحب کو یہاں کراچی میں ایک اچھی کوٹھی مل گئی ہے۔ وہ اپنی پھپھی جان کو لاہور سے اس کوٹھی میں منتقل کرنا چاہتے تھے اس لیے مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ میں ان کی مدد کرسکوں۔ والد کی پھپھی یعنی میری دادی اس حد تک علیل ہیں کہ بستر سے ہل بھی نہیں سکتیں اس لیے انہیں یہاں منتقل کرنے میں ہمیں خاصی مشکل پیش آئی۔"

جولیٹ اس کے قریب ہی دری پر بیٹھ گئی اور اسے اپنی چند روزہ غیر حاضری کے سبب سے آگاہ کیا۔ قادر شاہ والے واقعے کے بعد اس کی چاند بانو سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی اور وہ روزانہ بطور خاص اس سے ایک بار مل کر اس کی خیریت ضرور دریافت کرتی تھی۔ پس پردہ یہ مقصد بھی کارفرما تھا کہ قادر شاہ کو علم رہے کہ چاند بانو بالکل بے آسرا نہیں ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ زور زبردستی کی کوشش نہ کرے۔ لاہور جا کر بھی اسے چاند بانو کی فکر رہی تھی لیکن اسداللہ کی خواہش ٹالنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا پھر یہ خدشہ بھی تھا کہ اس کے انکار کی صورت میں انہیں گمان ہوتا کہ وہ ان کی پھپھی ندرت جہاں کے لیے دل میں کسی قسم کی کدورت رکھتی ہے حالانکہ سچ یہ تھا کہ اس نے ان سمیت حویلی کے ہر اس فرد کو معاف کردیا تھا جس نے جوزفین اور

خود اس کی دل آزاری کی تھی۔

مرجانے والوں کے لیے دل میں کدورت رکھ کر کچھ حاصل بھی نہیں تھا اور ندرت جہاں تو مُردوں سے بھی زیادہ بدتر حالت میں تھیں۔ جولیٹ ان سے ملی تو کتنی دیر تک ان کا ہاتھ تھامے روتی رہی۔ انہیں دیکھ کر اسے زندگی کی بے ثباتی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ حسن، جوانی، دولت، عزت، مرتبہ، مقام...... کوئی بھی شے تو پائیدار نہیں تھی اور انسان ایسا نادان کہ ان فانی چیزوں پر اکڑتا اور غرور کرتا پھرتا ہے۔

ندرت جہاں نے بھی اپنے ہر ظلم، زیادتی اور غرور کی سزا پالی تھی اور شدید جسمانی و ذہنی اذیت سے گزر رہی تھیں۔

جولیٹ ان کے لیے اپنے دل میں کوئی شکوہ کیا رکھتی وہ تو ان کی حالت پر رنجیدہ خود آنسو بہاتی رہی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں لیکن اس نے ان کی آنکھوں میں ندامت و پشیمانی کی تحریر دیکھی تھی اور اسے یوں لگا تھا کہ وہ آنکھوں کی زبان میں ہی اس سے معافی مانگ رہی ہوں۔ وہ اتنی سخت دل نہیں تھی کہ انہیں معاف نہیں کرتی۔ اس نے ان کے ہاتھوں اور ماتھے پر بوسے دے کر انہیں اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور لاہور سے کراچی تک کے سفر میں بھی ان کا بھرپور خیال رکھا تھا۔

اس بار سفر کے لیے اسد اللہ نے ہوائی جہاز کا انتخاب کیا تھا اس لیے وقت کی خاصی بچت ہوگئی تھی اور کراچی آ کر بھی جولیٹ کو دن کا کچھ حصہ اور پوری رات ان کے ساتھ ٹھہرنے کا موقع ملا تھا۔ ندرت جہاں کی حالت کے پیشِ نظر اسد اللہ پہلے ہی ایک نرس کا انتظام کر چکے تھے اس لیے آج صبح کیمپ آتے ہوئے اسے یہ پریشانی لاحق نہیں تھی کہ اس کے پیچھے کوئی ان کا خیال رکھنے والا نہیں ہوگا۔ ہاں اس نے یہ ضرور طے کرلیا تھا کہ اب وہ دن رات ...کیمپ میں گزارنے کے بجائے شام کو واپس چلی جایا کرے گی کہ اس کے اپنے خاندان کے بچے کھچے افراد کو بھی اس کی توجہ اور محبت کی ضرورت تھی۔

مادی وسائل کے اعتبار سے وہ لوگ اب بھی خوش قسمت تھے اور حیدرآباد جیسی شان و شوکت نہ سہی پھر بھی بہت کچھ حاصل تھا۔ جو کچھ انہوں نے کھو دیا تھا، اس کے بعد مادی آسائشات کی اتنی اہمیت رہی بھی نہیں تھی اور وہ ان آسائشات کے مقابلے میں جذباتی سہارے کے محتاج تھے۔ جولیٹ نے انہیں یہ سہارا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ثروت بیگ کا خاندان بھی اس کے ساتھ تھا۔ خواتین مستقل ندرت جہاں کی مزاج پرسی کرتی رہتی تھیں اور ثروت بیگ، صفی اللہ کو غم اور مایوسی کے خول سے نکالنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اسد اللہ نے البتہ خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا اور نئی زندگی کو جاری و ساری رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے تھے۔ جولیٹ کے مل جانے سے ان کے اندر ایک نئی توانائی اور ولولہ پیدا ہوگیا تھا اور وہ غموں کے درمیان بھی مسکرانے لگے تھے۔

”اللہ تعالیٰ آپ کی دادی کو شفا عطا فرمائے۔ ہم نماز میں بھی ان کے لیے دعا کریں گے۔“ چاند بانو نے اپنی انگلیوں کو جنبش دیتے ہوئے دوبارہ سویٹر بننے کا عمل شروع کیا اور آہستہ سے بولی۔ ہجرت کے بعد اس میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ اس نے پابندی سے نماز پڑھنی شروع کردی تھی اور اللہ سے لو لگالی تھی۔ وہ جو دل کی ہر دھڑکن میں بستا تھا نظروں سے دور ہو کر دل سے اور بھی قریب ہوگیا تھا اور اس کی سلامتی اور زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے وہ اپنے مالک کے حضور پابندی سے سربسجود رہنے لگی تھی۔

”تمہارے خلوص کے لیے شکریہ۔ یہ بتاؤ کہ میرے پیچھے قادر شاہ نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟“ اس نے چاند بانو سے وہ بات پوچھی جسے پوچھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔

”اس جیسے لوگ اتنی آسانی سے کب پیچھا چھوڑتے ہیں۔ اب اس نے براہِ راست ہمیں تنگ کرنا چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے اور... کیمپ میں ہمارے خلاف ہرزہ سرائی شروع کردی ہے۔ وہ ہر ایک کو بتاتا پھرتا ہے کہ ہم ایک طوائف زادی ہیں اور اس... کیمپ میں بھی اپنا دھندا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے رویوں کو تو آپ جانتی ہی ہیں، انسان کے موجودہ افعال و اعمال کو نظر انداز کرکے اسے ماضی کے آئینے میں ہی دیکھتے رہتے ہیں اور طوائف تو ہمارے معاشرے کا وہ کردار ہے جس کی ذات میں سب کے لیے کشش بھی ہوتی ہے اور اسے لعن طعن بھی کی جاتی ہے۔ یہاں بھی جو بدطینت ہیں، وہ ہمیں تنگ کرتے اور گناہ کی ترغیب دیتے رہتے ہیں اور جو نیکوکار ہیں، وہ ہمارے خلاف ہوگئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمیں اس کیمپ سے نکال دیا جائے۔“

اس کے سوال کا مفصل جواب دیتی ہوئی چاند بانو کی خوبصورت آنکھوں میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ جولیٹ کو اس کے حالات جان کر شدید دکھ ہوا اور قادر شاہ پر غصہ بھی آیا کہ اس کی تنبیہ کے باوجود اس نے چاند بانو کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے نکالی جائے اور پھر وہ اسے آسانی سے زیر کرلے۔ ایسے لوگ اتنے ہی

مکار اور چالاک ہوتے ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ چاند بانو یہاں رہی تو کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے گی اور وہ مختصر عرصے کی آشنائی میں ہی اس کے لیے اپنے دل میں ایسے نرم جذبات محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے کوئی نقصان اٹھاتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی، سو فوراً ہی ایک فیصلے پر پہنچ گئی اور چاند بانو سے بولی۔

''تم میرے ساتھ میرے گھر چلو چاند بانو۔ میرا گھر بہت بڑا ہے۔ تم وہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔''

''ہم ...... آپ کے گھر؟'' چاند بانو نے حیرت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں تم۔'' جولیٹ نے اسے یقین دلایا۔

''ہم آپ کے گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ شریفوں کے گھر میں بھلا کسی طوائف زادی کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ آپ کے والد کو اعتراض ہوگا۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''میرے والد ایک انسان دوست اور ہمدرد انسان ہیں۔ انہیں تمہارے اپنے گھر میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ہم تمہیں اپنے گھر رکھ کر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ انسان کا انسان پر حق ہوتا ہے اور خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ حق ادا کرنے کی توفیق عطا کی جاتی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، جب میں پاکستان پہنچی تو بالکل تنہا اور بے آسرا تھی پھر ایک نیک اور ہمدرد خاتون بیگم آصفہ علی اور ان کے خاندان نے مجھے سہارا دیا۔ خوش قسمتی سے میری اپنے والد سے ملاقات ہوگئی اور یوں میں ایک بار پھر اپنے خاندان کا حصہ بن گئی لیکن مجھ پر انسانیت کا قرض تو باقی ہے نا۔ تمہیں اپنے گھر میں پناہ دے کر میں وہی قرض اتارنا چاہتی ہوں۔''

اس نے چاند بانو کو سمجھایا۔ حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اسے زندگی میں جن چند لوگوں نے متاثر کیا تھا، ان میں سے بیگم آصفہ علی کا کردار خاصا ممتاز تھا۔ اسد اللہ کے ساتھ لاہور جانے پر اس نے وقت کی قلت کے باوجود بیگم آصفہ علی سے ملاقات کی تھی اور اسے ان کے گھر جا کر بہت خوشی ملی تھی۔ ایک تو وہ سب تھے ہی اتنے محبت کرنے والے مخلص لوگ کہ ان سے ملنا اچھا لگتا تھا، دوسرے وہ انجلی کے حوالے سے بھی بہت خوش ہو کر واپس لوٹی تھی۔ انجلی بھی چند دنوں میں ہی بیگم آصفہ علی کی شخصیت کی اسیر ہو گئی تھی اور اس نے فیصلہ سنایا تھا کہ وہ بھوپال جا کر اپنے ننھیالی رشتے داروں کو تلاش کرنے کے بجائے ان ہی کے گھر میں رہنے کو ترجیح دے گی۔ اس کے اس فیصلے میں یقیناً عاکف کی محبت کا بھی دخل تھا لیکن فی الحال انجلی نے اس حوالے سے کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔ خود بیگم آصفہ علی نے ہی جولیٹ کو بتایا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ انجلی کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر اسے اسلامی تعلیمات نے متاثر کیا اور اس نے قبولِ اسلام کر لیا تو وہ اسے اپنی بہو بنانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گی۔ ساتھ ہی انہوں نے انجلی کو تعلیم و ہنر سے لیس کر کے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عاکف اور انجلی کے تعلق کو کسی منطقی انجام تک پہنچائے بغیر انجلی کو ہمیشہ اپنے گھر میں رکھنا پیچیدگیوں کو جنم دے سکتا ہے اس لیے اگر انجلی مسلمان ہو کر عاکف کی زوجیت میں آ گئی تو ٹھیک ورنہ وہ اسے حق دیں گی کہ وہ اپنی پسند کے مطابق زندگی کا ساتھی منتخب کرلے۔ فیصلے کی گھڑی آنے سے قبل وہ اسے اس لائق بنانا چاہتی تھیں کہ وہ کسی مجبوری کے عالم میں اپنے لیے زندگی کی راہیں مقرر نہ کرے۔ جولیٹ ان کی اس سوچ سے متاثر ہوئی تھی اور اب خود چاند بانو کا سہارا بننا چاہتی تھی تاکہ اسے بھی وہ زندگی جینے کا موقع مل سکے جس کی وہ اپنے دل میں تمنا رکھتی ہے۔

''اگر ہمیں آپ کے گھر میں کشادہ دلی سے قبول کر لیا جاتا ہے تو پھر بھلا ہمیں وہاں رہنے میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو بس ایک سائبان چاہیے جہاں ہم عزت سے اپنی زندگی کے دن پورے کر سکیں۔ ہماری زندگی میں اب محبت، خدمت اور عبادت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ محبت اور عبادت ہم اپنے محبوب کے لیے کرتے ہیں اور خدمت اس لیے کہ اپنے لیے توشۂ آخرت جمع کر سکیں۔ سنا ہے ہمارے رب کو اپنے بندوں کی خدمت کرنا بڑا پسند ہے۔ یہاں کیمپ میں رہ کر ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ آپ کے گھر میں رہ کر بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک ہوسکا ہم آپ کی دادی جان کی خدمت بھی ضرور کریں گے۔'' چاند بانو کے لہجے میں ممنونیت ہی ممنونیت تھی۔ اصل میں وہ بہت پریشان تھی کہ اگر قادر شاہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تو وہ کیا کرے گی۔ گناہ کی زندگی گزارنا اسے گوارا نہیں تھا اور دنیا اسے عزت سے جینے نہیں دے رہی تھی، ایسے میں جولیٹ کی پیشکش اس کے لیے آسمانی مدد تھی جسے قبول کرنے میں اس نے بہت زیادہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''بس پھر تم تیار رہنا، شام کو گھر واپس جاتے ہوئے

میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گی۔'' جولیٹ بولتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایسا لگا تھا کہ کوئی برتن بڑی زور سے زمین پر پھینکا گیا ہو پھر فوراً ہی مغلظات بکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز بہت واضح نہیں تھی پھر بھی جولیٹ کو شناسائی کا احساس ہوا۔ وہ ابھی غور ہی کر رہی تھی کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ ساری آوازیں چاند بانو کے برابر کے خیمے سے آرہی تھیں۔ جولیٹ نے سوالیہ نظروں سے چاند بانو کی طرف دیکھا۔

''دو دن سے یہی تماشا ہو رہا ہے۔ کسی عزت دار خاندان سے تعلق رکھنے والے بھائی بہن ہیں۔ بھائی کے دونوں پیر اور ایک ہاتھ کٹ گیا ہے۔ بے چارہ سارا وقت بستر پر پڑا رہتا ہے۔ بہن رات کو کہیں چلی جاتی ہے اور صبح واپس آتی ہے تو بھائی کی غیرت تڑپنے لگتی ہے۔ بہن کو گالیاں بکنے کے ساتھ جو ہاتھ میں آتا ہے پھینک کر مارنے کی کوشش کرتا ہے۔'' چاند بانو نے دکھی سے لب و لہجے میں اسے بتایا تو وہ خود بھی افسردہ ہو گئی۔ عجیب عجیب رنگ دیکھنے کو مل رہے تھے اس خانماں بربادوں کی بستی میں۔ وہ جو طوائف زادی تھی، مشکلات کے باوجود عزت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی تھی اور کوئی شریف زادی تھی جو جانے کن وجوہات کی بنا پر پیشہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''اللہ کرے تو مر جائے، یہاں سے نکلے تو کوئی بس تجھے کچل ڈالے۔ تو ہمیشہ کے لیے کہیں دفع کیوں نہیں ہو جاتی..... کیوں روز میری روح پر چرکے لگانے کے لیے واپس آجاتی ہے۔'' اب شاید کوئی شے اس کی دسترس میں نہیں رہی تھی جو وہ عورتوں کی طرح کوسنے اور بددعائیں دینے پر اتر آیا تھا۔ اس بار جولیٹ کو اس کی آواز سن کر جیسے کوئی کوڑا سا لگا اور وہ تڑپ کر بے ساختہ ہی برابر والے خیمے کی طرف بڑھی۔

''آپ کے لیے واپس آتی ہوں۔ میں واپس نہ آؤں تو کوئی آپ کے حلق میں دو لقمے کھانا اور پانی ڈالنے والا نہ ہو۔ اپنا جسم دوزخ میں جلاتی ہوں تو آپ کے لیے دوائیں اور کچھ پھل لے آتی ہوں اور آپ ہیں کہ روز ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔'' سسکیاں لیتی لڑکی بھائی کو اس کے کوسنوں کا جواب دے رہی تھی۔

''کس نے کہا ہے تجھ سے یہ سب کرنے کے لیے۔ مر جانے دے مجھے بھوکا بلکہ ایسا کر کہ کہیں سے مجھے تھوڑا سا زہر لا دے۔ میں وہ زہر کھا لوں گا تو تیری اور میری دونوں کی جان اس عذاب سے چھوٹ جائے گی۔'' اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ معذوری کا عذاب سہتا ایک عزت دار بھائی اپنی بہن کو پیشہ کرتے دیکھ کر ڈپریشن میں مبتلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

''کیسے بھوکا مرنے دوں میں آپ کو۔ ہم بہنوں کو تو اماں نے شروع سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ بھی اکلوتے بھائی کو کھلا کر خوش رہنے کی تربیت دی تھی۔'' اس بار لڑکی کا لہجہ زہرخند ہو گیا۔ جولیٹ سے مزید صبر نہیں ہوا اور وہ پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گئی۔ اس کی پہلی نظر زمین پر گھٹنوں کے بل اپنا ماتھا تھام کر بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ لڑکی کے قریب ہی زمین پر ایک اسٹیل کا گلاس پڑا تھا جو یقیناً اسے مارنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ گلاس کے کنارے نے لڑکی کے ماتھے پر چھوٹا سا کٹ لگا دیا تھا اور وہ ہاتھ رکھے وہاں سے نکلنے والے خون کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔ لڑکی سے ہٹ کر اس کی نظریں چارپائی پر لیٹے شخص پر جا ٹکیں۔ کون تھا وہ.....؟ ضیائی رنگت، بڑھی ہوئی شیو، میل بھری آنکھوں اور سر کے گندے اور الجھے ہوئے بالوں میں وہ شخص کون تھا؟ وہ تو اسے پہچان کر بھی نہیں پہچان پا رہی تھی۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس شخص کو ایسی بے بسی اور بے کسی کی حالت میں دیکھے گی۔ وہ بھی آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ آخر بہت مشکل سے اس کے ہونٹوں نے جنبش کی اور وہ لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔

''جولی تم اور یہاں؟''

''تم یہاں کیسے عارف..... وہ بھی اس حال میں؟''

جولیٹ لپک کر اس کے قریب پہنچی۔ بستر پر لیٹے بے بس، نحیف و نزار عارف کو دیکھ کر اسے بالکل بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس شخص نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور محبت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کی کشتی بھنور میں پھنسی دیکھ کر اسے حالات کے بے رحم تھپیڑے کھانے کے لیے سب سے پہلے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

''میرا سب کچھ ختم ہو گیا جولی! میرا پورا خاندان لٹ گیا۔ ابا کی دکان پر کسی نے آگ لگا دی اور وہ بھی اسی آگ میں جل کر مر گئے۔ ان کے بعد اماں وہاں رہنے پر راضی نہ ہوئیں اور پاکستان آنے کی رٹ لگا دی۔ میں چاروں بہنوں اور اماں کے ساتھ پاکستان آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہوا تو ٹرین پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ اماں، زاہدہ اور عابدہ نے میری نظروں کے سامنے اپنی جانیں دیں۔ میں ان کو بچانے کے لیے کیا کر پاتا کہ میں تو خود.....

آن گنت زخم کھا کر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ شاہدہ کو بلوائی میری نظروں کے سامنے ہی اٹھا کر لے گئے اور میں اپنی جگہ پڑا سسکتا رہا۔ اس سے چھوٹی ماجدہ نے سیٹ کے نیچے گھس کر اپنی جان بچائی اور بعد میں بھی میرے مُردہ تن کو گھسیٹتی رہی۔ ہاتھ بلوائیوں نے کاٹ دیا تھا۔ پیروں کو زخم خراب ہو جانے کی وجہ سے بعد میں اسپتال والوں نے کاٹ ڈالا اور اب میں بستر پر پڑا بے بسی اور بے غیرتی کی زندگی گزار رہا ہوں۔'' عارف کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ان آنسوؤں میں شرمندگی اور کرب دونوں شامل تھے۔ وہ جس نے بھی جولیٹ کو اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ اس کا دامن داغ دار ہو گیا تھا، اب تقدیر کا عجب وار سہہ رہا تھا۔ مرنے والوں پر تو آدمی ایک دفعہ صبر کر لیتا ہے لیکن یہ تو اس کے لیے اذیت کا پہاڑ تھا کہ اس کی ایک بہن کو بلوائی لے گئے تھے اور دوسری اپنی راتیں کہیں باہر گزار رہی تھی۔

''حوصلے سے کام لو عارف...... قسمت میں جو لکھا تھا، وہ ہو گیا۔ اب تمہیں آگے کے حالات سے نمٹنے کے لیے خود کو سنبھالنا ہوگا۔'' عارف پر گزری سن کر اس کا دل بھی افسردہ ہو گیا تھا پھر بھی وہ اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اب میں کیا کسی کو سنبھالوں گا۔ کسی طرح یہ سانسوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو میری جان اس دن رات کے عذاب سے چھوٹے۔'' اس کے لہجے میں شدید مایوسی اور تلخی تھی۔ گھریلو ناچاقیوں اور معاشی مسائل کی وجہ سے اس کا مزاج پہلے ہی ذرا ٹیڑھا تھا اور اب اتنے بڑے حادثات سے گزر کر تو وہ بالکل بھی نارمل نہیں تھا۔ معذور اور لاغر جسم کے ساتھ بستر پر پڑے پڑے جینا یوں بھی ہر ایک کے لیے آزمائش ہی ہوتا ہے اور وہ تو اس لیے بھی مر مر کر جی رہا تھا کہ اس کی غیرت پر ہر روز تازیانہ لگ رہا تھا۔ اس کی عزت دار بہن اس کی نظروں کے سامنے ایک پیشہ ور عورت بن گئی تھی۔

''میں تم سے پھر بات کروں گی۔ ماجدہ کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے، پہلے اس کی مرہم پٹی کروا کر لے آتی ہوں۔'' عارف کی باتیں اور اس کا حال جولیٹ کا اپنا دل برا کر گیا تھا اور فی الحال اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کن الفاظ میں عارف کی تسلی و تشفی کروائے اس لیے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ ماجدہ کو حقیقتاً بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ وہ اب تک ہتھیلی سے ماتھے کے زخم کو دبائے خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے الجھی ہوئی سی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ گلاس کے کنارے سے لگنے والا چھوٹا سا کٹ شاید زیادہ گہرا تھا اس لیے خون ابھی تک نہیں رکا تھا اور اس کی ہتھیلی سے ٹپک کر قطرہ قطرہ نیچے گر رہا تھا۔

''تم میرے ساتھ آؤ ماجدہ۔'' اس نے عارف کے پاس سے ہٹ کر ماجدہ کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میکانکی انداز میں اس کے ساتھ جانے کے لیے اپنے قدم اٹھائے۔

''جولیٹ......'' وہ دونوں ابھی خیمے کے خارجی حصے میں ہی تھیں کہ پیچھے سے عارف نے پکارا۔ جولیٹ نے اس کی پکار پر پلٹ کر اسے دیکھا۔

''میں نے تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں کیا تھا، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' اس کی آنکھوں اور لہجے میں گہری شرمندگی تھی۔ جولیٹ نے ایک نظر اس کے وجود پر ڈالی۔ اپنی مرضی سے حرکت کرنے سے قاصر لاغر اور بیمار جسم کے مالک اس شخص کے پاس اب رہا ہی کیا تھا کہ اس سے اس کی [illegible] تا یا اس کے لیے اپنے دل میں کوئی کدورت رکھی جاتی۔

''میں تمہیں پہلے ہی معاف کر چکی ہوں عارف! میرے حوالے سے تم اپنے دل پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔ تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے بھی تکلیف ہوگی۔'' وہ بے حد رسان سے عارف کو جواب دینے کے بعد ماجدہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر نکل گئی اور اپنی نگرانی میں ایک نرس سے اس کے زخم پر بینڈیج کروانے کے بعد اسے اپنے ساتھ اپنے عارضی دفتر میں لے آئی۔ وہاں اس کے ساتھ دو تین لوگ اور بھی کام کرتے تھے لیکن فی الحال ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے ماجدہ کے لیے جوس منگوا کر اسے پینے کے لیے دیا۔

''آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔ میں بھی آپ کو پہچان چکی ہوں۔ عارف بھائی ہم بہنوں سے اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ وہ تو آپ کی اتنی تعریفیں کرتے تھے کہ ہمیں لگتا تھا دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی اچھی لڑکی موجود ہی نہیں ہے پھر پتا نہیں کیا ہوا، بھائی بہت چپ چپ رہنے لگے۔ انہوں نے اپنی بمبئی والی جاب چھوڑ کر کلکتے میں نوکری کر لی۔ چھٹی پر گھر آتے تب بھی آپ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ سچی بات ہے ہمیں خود بھی اس بات کا زیادہ خیال نہیں تھا۔ ہم اپنے ہی مسائل میں الجھے رہتے تھے۔ ابا کی تلخ مزاجی، اماں کے آنسو، بہنوں کی شادی کے مسائل یہ سب باتیں ہی اس وقت اتنی بڑی لگتی تھیں کہ لگتا تھا دنیا میں

...م سے بڑھ کر دن اور مصیبت زدہ ہوں اور نہیں ہے۔ ابا کی دردناک موت کے بعد ہجرت کے عذاب سے گزر رہے تھے۔ حقیقی معنوں میں جانا کہ دکھ اور مصائب کیا ہوتے ہیں۔ ماں باپ اور بہنوں کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے والی ایک تنہا لڑکی کو اپنے اکلوتے بھائی کی زندگی بچانے کے لیے کن کن عذابوں سے گزرنا پڑا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی۔ اسپتال میں میرے جیسے دکھی بہت لوگ تھے۔ وہاں روزانہ جانے کتنی ہی اموات ہوتی تھیں۔ عارف بھائی کی حالت بھی بہت خراب تھی اور علاج کے لیے کوئی ڈھنگ کا انتظام ہی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے تڑپتے رہتے اور اسپتال والے درد کی چند گولیوں اور معمولی مرہم پٹی سے بہلاتے رہتے۔ پھر مجھے کسی نے بتایا کہ یہاں تمہارے بھائی کا ڈھنگ کا علاج ممکن نہیں۔ بھائی کا علاج کروانا چاہتی ہو تو رقم کا انتظام کرو۔ میں رقم کہاں سے لاتی۔ ہم ویسے ہی سفید پوش لوگ تھے۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی ساتھ لے کر چلے تھے، وہ بھی بلوائیوں نے راستے میں لوٹ لی۔ میں بے بسی سے آنسو بہاتی اپنے اکلوتے بھائی کو موت کے منہ میں جاتا دیکھتی رہتی۔ میرے پاس تو کھانے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے اور کئی کئی وقت کے فاقے کے بعد کہیں سے امداد میں آیا ہوا کھانا کھانے کو ملتا تھا۔ بھائی کے علاج کے لیے رقم کہاں سے لاتی۔ پھر وہیں کسی نے جسم فروشی کی راہ دکھائی۔ بھائی کی زندگی بچانے کے جنون میں، میں نے حرام کو بھی اپنے لیے حلال جانا اور خود کو جہنم میں جھونک دیا لیکن مجھ سے فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی تھی۔ بھائی کے زخم خراب ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں کو ان کی دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑیں۔ خرچہ تو بہرحال اس میں بھی آیا اور میں اپنا تن بیچ کر انتظام کرتی رہی۔ بھائی کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں رات کو آرام کرنے کے لیے... کیمپ چلی جاتی ہوں لیکن کسی بدفطرت نے انہیں حقیقت بتا دی اور اب وہ دن رات کڑھتے اور مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ اسپتال سے چھٹی کے بعد بھی انہیں اچھی غذا اور دواؤں کی ضرورت ہے جس کے لیے یہاں... کیمپ میں کوئی انتظام نہیں ہے اور مجبوراً مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جو ان کی غیرت کو گوارا نہیں ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ خالی غیرت سے نہ پیٹ بھرتا ہے، نہ علاج ہوتا ہے اور نہ ہی تن ڈھانپنے کو ڈھنگ کا کپڑا ملتا ہے۔“

ماجدہ کا لب و لہجہ تلخ ہو گیا۔ جولیٹ دکھ اور افسوس سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ یہ واقعی نہایت دکھ کی بات تھی کہ حالات نے ایک عزت دار گھرانے کی لڑکی کو جسم فروشی پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال کر خود کو ایسی زندگی کے حوالے کر دیا تھا جو کسی بھی غیرت مند بھائی کو گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ عارف گھریلو حالات اور ناچاقیوں سے دلبرداشتہ رہتا تھا لیکن اس کی سوچ کا محور و مرکز بہرحال اس کا گھر ہی تھا۔ اسے اپنے گھر والوں سے محبت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی چاروں بہنوں کی مناسب گھروں میں شادیاں ہو جائیں۔ بڑی تینوں معمولی شکل صورت کی تھیں اس لیے ان کے رشتوں میں بھی زیادہ مسئلہ تھا لیکن ماجدہ کی اچھی شکل صورت کی وجہ سے اسے امید تھی کہ ماجدہ کو اچھا رشتہ مل جائے گا لیکن اچھی شکل صورت ہی ماجدہ کے لیے وبال بن گئی تھی اور بدنظروں کی نظر میں آ کر وہ غلط راہوں پر چل نکلی تھی۔

”تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے ماجدہ؟“ اس خیال کے تحت کہ ہو سکے تو وہ ماجدہ کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر دے گی، اس نے اس سے دریافت کیا۔

”تعلیم......؟“ ماجدہ کے ہونٹوں پر ایک زہرآلود مسکراہٹ ابھری اور بولی۔ ”شروع کی دو تین جماعتوں تک ہی مجھے اسکول جانا نصیب ہوا تھا پھر تنگ حالات کی وجہ سے اماں نے گھر بٹھا لیا کہ لڑکی ذات کو اسکول بھیج کر کیا فائدہ...... کون سا اس سے نوکری کروانی ہے؟ ہاں، بیٹے کو انہوں نے ہر حال میں پڑھوایا کہ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرے گا تو گھر کے حالات بدل جائیں گے اور وہ بیٹیوں کو اچھا جہیز دے کر ان کے گھروں میں رخصت کر سکیں گی لیکن اماں کے خواب خواب ہی رہے۔ عارف بھائی کی نوکری اتنی شاندار نہیں تھی کہ گھر میں کوئی بڑی تبدیلی آ پاتی۔ اماں پھر بھی پُرامید تھیں کہ بھائی وقت کے ساتھ ترقی کر لیں گے لیکن پھر سب کچھ بدل گیا۔ نہ اماں رہیں اور نہ ان کے خواب۔ بس میں ہوں جو ان کے لاڈلے بیٹے کے نیم مردہ وجود کا بوجھ بھی ڈھوتی ہوں اور ان کی گالیاں اور مار پیٹ بھی سہتی ہوں۔“ اس کے لفظ لفظ میں کڑواہٹ تھی۔ جولیٹ کو اندازہ ہوا کہ اچھی تربیت سے محروم ماجدہ زندگی کی اس آزمائش کے لیے نہایت ناموزوں تھی اور اس کے غلط روش اختیار کرنے کے پیچھے حالات کے جبر کے علاوہ اس کی شخصیت کی کجی کا بھی دخل تھا۔

”تعلیم نہیں ہے تو کوئی نہ کوئی ہنر تو آتا ہوگا۔ سویٹر بننا...... کپڑے سینا یا پھر کوئی اور ہنر جس کے ذریعے تمہاری آمدنی کا بندوبست کیا جا سکے۔“ اس کی شخصیت کو کافی حد تک سمجھ جانے کے باوجود جولیٹ نے اسے ایک موقع اور

دینے کی کوشش کی۔

"میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور سارے کام اماں اور بڑی بہنیں کر کے دے دیا کرتی تھیں اس لیے میں نے بھی دل لگا کر کچھ سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ویسے بھی ان کاموں سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ میں دن رات اپنی آنکھیں پھوڑوں گی تو بھی مشکل سے ہی پیٹ بھرنے کا انتظام ہو سکے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"تم ہمت کر کے کام شروع تو کرو۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہارے لیے مناسب وظیفہ مقرر کروادوں۔" جولیٹ نے اسے ایک اور پیشکش کی۔

"ٹھیک ہے، میں سوچوں گی۔ ابھی چلتی ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا اتنا خیال کیا۔" ماجدہ نے بے دلی سے اسے جواب دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بات کو ٹال کر جارہی ہے اور محنت کشی کی زندگی گزارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس نے بچپن سے اپنے گھر میں تنگ دستی دیکھی تھی اور جانتی تھی کہ معمولی آمدنی کے ساتھ انسان کو بہت ترس ترس کر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اس نے پہلی بار گھر کی محدود دنیا سے اڑان بھری تھی اور رنگ و بو کی دنیا نے اس کی آنکھیں چکا چوند کردی تھیں۔ وہ جسم پر عمدہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ، کان اور گلے میں نقلی ہی سہی زیورات موجود تھے۔ پیر میں سینڈل بھی اچھی کوالٹی کی تھی اور ظاہر ہے اس کو یہ سب اپنی راتیں دوسروں کو بیچنے کے بدلے میں ملا تھا۔

جولیٹ نے اس کے اور عارف کے زیر استعمال خیمہ بھی دیکھا تھا۔ وہاں سونے کے لیے چار پائیاں تھیں اور ان پر صاف ستھرے بستر ڈلے ہوئے تھے۔ عارف کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی جس پر پھل، دوائیں اور پانی کا جگ وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ نئے چمکتے ہوئے برتن اور دو تین جستی صندوق بھی موجود تھے۔ ایسا ساز و سامان کیمپ میں رہنے والوں میں سے شاذ و نادر ہی کسی کے پاس تھا۔ ماجدہ کے برابر والے خیمے میں مقیم چاند بانو کی مثال اس کے سامنے تھی۔ اس کے خیمے میں فرش پر صرف ایک بوسیدہ دری بچھی ہوئی تھی جس پر اس کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا اور سونا جاگنا سب ہوتا تھا۔ برتنوں کے نام پر بھی... کیمپ سے ہی ملی ہوئی صرف ایک پلیٹ اور گلاس موجود تھا اور اس کا کل سامان کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھری میں بندھا ایک کونے میں رکھا رہتا تھا۔ یہ فرق اس لیے تھا کہ ایک نے دولت و آسائشات کو چھوڑ کر عزت کی زندگی کا انتخاب کرلیا تھا اور دوسری اب غربت کا عذاب سہنے کو تیار نہیں تھی اور خود کو بکاؤ مال بنا کر مطمئن تھی لیکن عارف تو بہن کی اس روش سے خوش نہیں تھا۔ بے بسی کے عالم میں بستر پر پڑا وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا اور اپنے اندر کا غصہ نکالنے کے لیے ماجدہ کو گالیاں بکتا تھا۔

ماجدہ چلی گئی اور جولیٹ سوچتی رہی کہ وہ عارف کے لیے کیا کرسکتی ہے۔ بے شک عارف نے مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن انسانیت کا تقاضا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی مدد ضرور کرے۔ مدد کا طریقہ فی الحال اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاند بانو کی طرح وہ اسے اسد اللہ کی کوٹھی میں لے جا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ نہ تو وہ ماضی میں عارف سے اپنے تعلق کی نوعیت کو اسد اللہ کے سامنے لانا چاہتی تھی اور نہ ہی اس تعلق کے ٹوٹنے کی وجہ بیان کرسکتی تھی۔ عارف کی جو ذہنی حالت تھی اس سے بھی کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اسد اللہ کو سب اگلا پچھلا سنا ڈالے۔ اسے عارف کے لیے جو کچھ کرنا تھا، اپنے تحفظات کو سامنے رکھ کر کرنا تھا اس لیے کوئی بھی جذباتی فیصلہ کرنے سے قبل اس نے تھوڑا غور و خوض کرلینا ہی مناسب سمجھا اور سر جھٹک کر اپنے فرائض کی انجام دہی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

کیتھرائن کی خوبصورت آنکھوں میں نمی اور چہرے پر اداسی تھی۔ وہ دہلی کے ہوائی اڈے پر فاروق کے روبرو کھڑی ہوئی تھی اور اس کا چھوٹا سا سفری بیگ اس کے قدموں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ ستار بھائی نے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے فوری طور پر اس کی روانگی کا انتظام کردیا تھا۔ حالات اب بھی ٹھیک نہیں تھے۔ ریل گاڑیوں کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ہوائی اڈے کا رخ کرنے والے مسلمانوں کو بھی نشانہ بنایا جارہا تھا اس لیے کیتھی اور فاروق نے ابھی تک اپنا ہندوؤں والا حلیہ تبدیل نہیں کیا تھا۔ حالات کو قابو میں کرنے کے لیے کئی دنوں سے شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا لیکن اب کرفیو میں وقفے کے اوقات بڑھا دیے گئے تھے۔ اس وقفے میں ہی فاروق ٹیکسی میں کیتھرائن کو ہوائی اڈے چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کیتھی کو پاکستان چلے جانے پر قائل کیا تھا۔ کیتھی کے لیے ہندوستان چھوڑنا مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ فاروق کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی سگی بہن کی طرح ہی اس کے لیے... فکرمند تھی اور چاہتی تھی کہ مشکل وقت میں اس کے نزدیک رہے۔ فاروق نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا تھا کہ وہ